

سنگرزشت کچی

2017

مجله

A contact loved ones.

ایک رابطہ اپنوں سے
Aik Rabta Apno Se.



www.PakistaniPoint.Com

خود اعتمادی: بکھرتے گھر کو قتل سے بچالینے والی لڑکی کی جج جیانی
نوائے غلیل: اپنی محنت سے اپنی دنیا سنوارنے والے لکڑی کی ٹامہ
آپاجی: اس قد کار کی زندگی کا ٹکس جس نے اردو ادب کو نئی راہ دی



07 شاعر شاہی

ادارہ

ایک صفحہ میں مکمل مختصر مختصر
ایک نادر روزگار کا تعارف

43 آپاجی

مختصر مہدی

اردو ادب میں بائبل
عجیبے والی ناول نگار کا تذکرہ

85 نیابت برتندے

مختصر احسن سالانہ

ان پرندوں کا تذکرہ
جو معدوم ہو رہے ہیں

125 فن پارے

مختصر آزاد

دور دراز خطے میں بکھرے
آرٹسٹ کا تذکرہ

08 شہر خیال

مختصر مہدی

آپ کی باتیں آپ کے خیال آپ
کے مشورے اور آپ کے سوال

71 جون کی شخصیت

مختصر احسن سالانہ

اس ماہ سے جبری اہم
شخصیات کا ذکر خاص

107 بابائے ہندی فلم

مختصر مہدی

پاکستانی فلمی دنیا کے
ایک اہم ہدایت کار کی تحسین

127 شمشال ٹوڑو

مختصر احسن سالانہ

جانبوں کا شکار ایک
انگ انگ انداز کی داستان

16 نوائے خلیل

مختصر مہدی

اس ادیب کا احوال زریست
جو قسمت بنانے کا ذکر

80 موت کے روبرو

مختصر احسن سالانہ

موت بالکل سائے
آکھڑی ہوئی تھی

119 سدا بہار صدا کار

مختصر مہدی

وہ پاکستان کی سلی وین کی
دنیا کا ایک مشہور نام تھا

147 کتب خانے

مختصر احسن سالانہ

معلومات کے شائقین
کے لیے تحفہ خاص

153 ہنری ملایح

مختصر مہدی

مستدرسین کتب
ڈالنے والے کا ذکر

119 جنونی

مختصر احسن سالانہ

وہ اس کی خاطر
جنونی ہو گیا تھا

237 گم شدہ

مختصر مہدی

اس کی ملاقات ایک
بہشتی ہوئی روح سے ہو گئی تھی

247 جیسی کرنی

مختصر احسن سالانہ

اس نے جو کچھ کیا
اس کا پھل سنے آیا

153 ناسور

مختصر مہدی

ایک معصوم نوجوان کی
لوہو گرمانے والی داستان

229 قرض

مختصر احسن سالانہ

ایک دل دکھا
دینے والی سچ بیانی

257 ایک موقع

مختصر مہدی

خدا ہر ایک کو ایک
موقع ضرور دیتا ہے

277 آئیڈیل

مختصر احسن سالانہ

ان لوگوں کے لیے سبق جو
آئیڈیل تلاش کرتے ہیں

150 خود اعتمادی

مختصر مہدی

اس نے خود اعتمادی سے
نئے معجزے کو بجا لایا

250 اسیر ذات

مختصر احسن سالانہ

ایک مکار بھائی اور
معصوم بہن کی سچ بیانی

277 تیرا بھائی

مختصر مہدی

بڑے بولنے والے کا نتیجہ کتنا
خطرناک نکلا

287 پارچے

مختصر احسن سالانہ

دنیا بھر کے مختلف مہتممات
پر معلومات آشنا فانی پارچے

● کتابت میں شائع ہونے والی ہر چیز کے علاوہ حق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے
کا استعمال یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔
تمام اشتہارات نیچے دی گئی بنیاد پر شائع کئے جاتے ہیں۔ ادارہ اس لحاظ سے کسی بھی طرح سے ذمہ دار نہ ہوگا۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور
تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر
ادارہ درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

شاعر شاہی

بھارت میں ایک شہر ہے۔ اسی ضلع میں ایک معروف گاؤں ہے مومن آباد۔ یہاں بڑے بڑے علماء و سوادہ پیدا ہوئے۔ اسی گاؤں میں سیف محسنی رہا کرتے تھے جو نہایت بہادر تھے اور صف شکنی میں اپنا جواب نہیں دیتے لیکن کم سن تھے۔ محفل میں بھی خاموش رہتے تھے۔ ترک الخسل تھے لیکن تعلیم سے نابلد تھے۔ انہی کے گھر 652 ہجری میں ایک بچے نے جنم لیا، وہ تو امی تھے مگر اس بچے کو تعلیم یافتہ دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی لیے ایک ساتھ دو دو تالیف مقرر کر رکھے تھے۔ دو دو دھانے والے ہوں تو پھر بچہ بھی تعلیم میں زیادہ دلچسپی لینے لگتا ہے۔ اس کے نانا عمار الملک بھی اس بچے میں کچھ زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ گوکہ نانا سلطانی سے محروم تھے لیکن حقیقت میں وہی سلطان تھے۔ انہوں نے ہی پورے ہندوستان کو جو صلیبی سے قابو میں کر رکھا تھا اور تخت کی آڑ میں تمام حکم نامے دے دی جاری کرتے تھے۔ دوسو ترکی اور دوسو ہندی غلام وہیں ہزار سواران کی سرکار میں تھے۔ ہر تہوار پر ان کی طرف سے کھانا و قیاسیم ہوتا۔ بادہ پچی خانے سے کبیرت جتنا جوں کو کھانا ملتا تھا۔ ستر برس تک ان کا داب و دودھ رہا۔ نانا کے انتقال کے وقت وہ ہوش مند ہو چکا تھا۔ اس لیے اس نے شہزادہ قتل خان عرف بھجو (علاء الدین محمد بن اعزاز الدین شکی خان قطب)۔ خان اعظم سلطان بلبن کا بھتیجا کی مصاحبت میں چاہا گیا۔ دو سال تک وہ شہزادے کی سرکار میں رہا۔ کئی تعیندے اس کی شان میں کیے۔ ہمیشہ وہ شہزادے کی مجلس میں حاضر رہتا اور اپنی خوش بیانی سے حاضرین کو مسرور کرتا۔ ایک روز بادشاہ (سلطان غیاث الدین بلبن) کا چھوٹا بیٹا بفرخان، خان معتمد قتل خان کے ہاں مہمان آیا (یہ دونوں چچا زاد تھے) بھجنہ نمیموں کے شمس الدین ویر اور قاضی امیر بھی ساتھ تھے۔ خان معتمد کی مصاحبت میں صرف وہی تھا۔ بفرخان کے مصاحب چیمبر مہاذ کرتے تو وہی قتل خان کی جانب سے جواب دیتا۔ اس نے بفرخان کے مصاحبوں کا قافیہ تک کر دیا تھا۔ اس نے لطافت و دھڑاقتوں سے محفل کو گرم کیا تھا۔ اس کی حاضر جوابی سے خوش ہو کر بفرخان نے سونے سے بھری تھالی اس کے سامنے رکھ کر کہا کہ یہ آپ کے بادہ پچی خانے کا خرچ ہے۔ قتل خان کو یہ امر شائق گزرا۔ اس نے قتل خان سے معذرت بھی کی لیکن قتل خان کا دل صاف نہ ہوا۔ بعد اس قدر بڑا حاکم اس کی معافی کی فکر ہونے لگی۔ اس نے اپنی عزت خان سے معذرت بھی کی لیکن قتل خان کا دل صاف نہ ہوا۔ بعد اس قدر بڑا حاکم اس کی معافی کی فکر ہونے لگی۔ اس نے اپنی عزت بچانے کے لیے شہر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا اور وہ بے سرو سامانی میں سامانے کی جانب چل پڑا (سامانے کا حاکم بفرخان تھا جو سلطان غیاث الدین بلبن کا دوسرا بیٹا تھا) وہ سامانے پہنچا تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور وہ ہم خاص مقرر ہو گیا۔ ابھی اس کا دور مدح تھا کہ بفرخان نے اپنے لشکر کے ساتھ کھنونی کی جانب کوچ کیا۔ 678 ہجری میں لشکر دہلی سے نکلا تھا کہ قاعدہ سلطانی پہنچا اور حکم ہوا کہ بفرخان مع لشکر سیاہ شاہی سے مل جائے۔ وہ بھی لشکر کے ساتھ سیاہ شاہی سے مل گیا۔ چلتے چلتے ایک سال گزر چکا تھا لیکن کھنونی ابھی بھی دور تھا (کھنونی بنگالے کا قدیم اسلامی دارالسلطنت تھا جو حاکم شاہر سے کئی کوس دور تھا اور اس شہر کو "مگدھ" بھی کہتے تھے جو اب ویران پڑا ہے) اس شہر پر ظفر الملک تھا۔ اسے بفرخان نے شکست دی تو شاہ ہند کی جانب سے وہ علاقہ بفرخان کو دے دیا گیا۔ بفرخان کے مصاحب شمس الدین ویر اور قاضی امیر کی خواہش تھی کہ وہ بھی بفرخان کے دربار سے شریک رہے مگر اس نے واپسی کا قصد کر لیا اور شاہی سیاہ کے ہمراہ دہلی لوٹ آیا۔ دہلی میں قان الملک (خان شہید) کا رخ کی صورت داخل ہو رہا تھا۔ اس کی سنخوری کی شہرت اس تک بھی پہنچ چکی تھی، اس نے اسے دربار میں بلا کر نہ دیکھنے کا خلعت بخشا اور ملتان ساتھ چلنے کی فرمائش کر دی۔ وہ خان شہید کی سیاہ کے ساتھ ملتان کے لیے چل پڑا۔ ملتان میں زبردست معرکہ ہوا اور شہزادہ شہید ہو گیا۔ وہ بھی گرفتار ہو گیا۔ اسے جب دربار میں پیش کیا گیا تو اسے سنخورد ہونے کی وجہ سے رہا کر دیا گیا۔ وہ واپس دہلی آ گیا۔ کچھ دنوں تک وہ اپنے آپ کی ملاقات مومن پور عرف چٹالی میں رہا پھر اسی عرصے میں سلطان عادل غیاث الدین کی وفات ہوئی (685ھ) اور دولت معز کی کام پلند ہو گیا، اسے دربار میں طلب کیا گیا۔ دربار میں ملک نظام الدین کا دور دورہ تھا اور وہ اس سے پر خاش رکھتا تھا۔ اسے خوف ہوا کہ کہیں نظام الدین اسے نقصان نہ پہنچا دے اس لیے اس نے قان خاں کے زیر سایہ پناہ لی۔ امیر نے اسے زبردستی عطا کیا۔ ابھی کچھ ہی دن گزرے تھے کہ نظام الدین جنت کو سدھارا اور اسے دربار میں طلب کر لیا گیا۔ خلعت نمہ کی عطا ہوا۔ وقت تیزی سے گزرنے لگا اور اس کی سنخوری کا چرچا پڑنے لگا۔ اس کے اشعار زبان زد عام بننے لگے اور اس دوران وہ دربار شاہی کے ساتھ دربار باطنی میں بھی حاضری دینے لگا۔ حضرت نظام الدین اولیاء کا قریب پا کر وہ انہی کے رنگ میں رہنے لگا۔ با 8 خرمال 725ھ کو وہ شاعر شاہی دہلی میں ہی راہی ملک مدھ ہوا۔ اسے لوگ امیر خسرو کے نام سے جانتے ہیں۔

☆☆☆

ماہنامہ
کربلائی
بے ریب
بے ریب

مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

شعبہ اشعار

تلفون نمبر: 0333-2256789

♦♦♦

قیمت فی نسخہ: 60 روپے بڑا ڈرامہ 800 روپے

بانی و مدیر: عذرا رسول

مقام اشاعت: 63-64 ایف ایس ٹنشن

پتہ: ٹنشن ٹنشن ٹنشن ٹنشن

تلفون: 75500

فیکس: 75500

ایم ایس پی: 75500

بانی اعلیٰ: عذرا رسول

تلفون: 74200

بانی اعلیٰ: عذرا رسول

بانی اعلیٰ: عذرا رسول

بانی اعلیٰ: عذرا رسول

بانی اعلیٰ: عذرا رسول

بانی اعلیٰ: عذرا رسول

بانی اعلیٰ: عذرا رسول

قارئین کرام!
السلام علیکم

"میں نے ہاتھ کے اشارے سے نیکی روکی۔ طارق روڈ چلنے کا کہا اور پچھلی سیٹ پر بڑھے گیا۔ نیکی کچھ آگے بڑھی، ایک بڑی بی مثل کاک برقع میں سڑک پار کر رہی تھیں۔ ذرا نیور نے بریک لگا دیا، مین اسی وقت عقب سے ہارن کی آواز سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا، سرخ رنگ کی چھتری اچھڑت کار سے بھناتا ہوا ایک نوجوان اترا۔ نیکی کے پاس آ کر اس نے ایسے مونی کی جالی، مینی اور لڑکی سے ہاتھ اندر کر لے لیتی، والے لی ٹرون پڑ کر بولا۔ "باب کی سڑک سمجھا ہے ابھی نکرو جاتی۔"

نیکی والے نے گردن چھڑا کر نوجوان کو دیکھا، اس کے چار حاندو بے پر منکر بنا کر بولا۔ "مرا ایک عورت سامنے آگئی تھی۔" نوجوان بڑبڑاتا ہوا واپس چلا گیا، نوجوان کی حرکت پر میں نے اسے برا بھلا کہنا شروع کر دیا کہ یہ کہاں کی شرافت ہے۔ ایک ذرا سی غلطی پر گردن پکڑ لی۔ گالیاں دیں۔ ذرا نیور بڑبڑایا جسے دیکھو غریب پر چڑھ دوڑتا ہے جیسے غریب کی کوئی عزت ہی نہیں ہے۔ "میں اس کی باں میں ہاں ملانے لگا۔ نیکی آگے بڑھی۔ ابھی کچھ ہی دور گئی تھی کہ سڑک کے درمیان ایک رکشا کھڑا نظر آیا۔ شاید یہ ایک اس کا انجن بند ہو گیا تھا۔ رکشا ذرا نیور اسے اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نیکی والا بھناتا ہوا اترا اور کار والے نے مانی کی سے بھی مونی جالی کہتے ہوئے رکشے والے کو تھاپا رسید کر کے بولا۔ "ابھی ایک سیٹ ہو جاتا تو..."

یہ مٹی کہانی ہمارے معاشرے کا آئینہ نقی و کھانی، رہی ہے۔ ہر ایک اپنے سے کمزور پر رعب و ڈانٹ کر رہی ہے۔ ہے اور دعوئی ہے کہ ہم ایک اچھے معاشرے کی طرف ہیں۔ ہمارا صبر و تحمل سے ہمارا معاشرہ بن جائے یا نہیں...

معراج

شہر خیال

رہتے ہیں۔ انتہائی تاثیر سے ان کی تعداد کو کم کیا جاسکتا ہے۔ "بیت بازی" میں ایسے اشعار پڑھنے کو ملے۔ اب ڈراما تذکرہ ہو جائے تو کیا، ان کا راندو دیکھو، "تذکرہ غنی اور غفلت کی وجہ سے برباد ہوئی ایک لڑکی کی داستان" بھی۔ پڑھ کر افسوس ہوا۔ افسوس کرایے واقعات ہمارے معاشرے میں۔ "میں۔۔۔" ایک اچھی تحریر بھی۔ "عیم نے بغیر تپتے ڈرامے بات پر مگر چھوڑ دیا اور اس کی بیوی نے بھی جرم کیا کہ اپنا پاسکی کو نہ بتایا۔ بہر حال اچھا دیکھو کہ دوسری سے کسی لیکن دونوں مل گئے۔ "موت کا کنواں" پڑھ کر افسوس ہوا۔ افسوس آئینہ کے سانپ ہر رنگ پختے رہتے ہیں۔ "فیصلہ" صرف ایک کہانی کی محسوس ہوئی۔ بہر حال سیم نے دونوں کو اپنا کردار یا دلی کا ثبوت دیا۔ باقی شمار وزیر مظلوم ہے۔ اس امید پر تیسرہ لکھ دیا کہ کسی طرح وقت پر پہنچ جائے۔

ملا محمد عمران خان بھٹمرے تھمتے ہیں۔ "عجم خیال میں نظر دوڑائی تو خاطرہ مجھزار کو کرکسی صدارت پر برا جان پایا، تبصرہ بھی شاعر تھا۔ اچانک میں سفار صا حبیب کا تبصرہ بھی خوب تھا۔ بہت پند آیا۔ اس کے علاوہ رشاد احمد احوال، سلیم رشید، رانا محمد شاہ، آفاق احمد، انور عباس، شاد اور عبد الباقی، رہی کے خیالات بھی اچھے لگے۔ اس بار قیصر خان غیر حاضر تھے۔ (تقریباً سبھی خطوط پر یہ پریس جانے کے بعد ملا جس میں کئی اہم شخصیت کے خطوط تھے) اب آتے ہیں جج بیاضوں کی طرف۔ "سبکی جج بیاضی" "برادرت" بہت اچھی تھی۔ تعلیمی اداروں میں کس طرح طلباء کو خیالات کی زندگی کو تسخیر کیا جا رہا ہے، پرفسوں کی بات ہے۔ اب تعلیمی ادارے بھی ایسی گھنٹی سناؤں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ "خشخ" میں بدلتے ہوئے

رہتے ہیں۔ انتہائی تاثیر سے ان کی تعداد کو کم کیا جاسکتا ہے۔ "بیت بازی" میں ایسے اشعار پڑھنے کو ملے۔ اب ڈراما تذکرہ ہو جائے تو کیا، ان کا راندو دیکھو، "تذکرہ غنی اور غفلت کی وجہ سے برباد ہوئی ایک لڑکی کی داستان" بھی۔ پڑھ کر افسوس ہوا۔ افسوس کرایے واقعات ہمارے معاشرے میں۔ "میں۔۔۔" ایک اچھی تحریر بھی۔ "عیم نے بغیر تپتے ڈرامے بات پر مگر چھوڑ دیا اور اس کی بیوی نے بھی جرم کیا کہ اپنا پاسکی کو نہ بتایا۔ بہر حال اچھا دیکھو کہ دوسری سے کسی لیکن دونوں مل گئے۔ "موت کا کنواں" پڑھ کر افسوس ہوا۔ افسوس آئینہ کے سانپ ہر رنگ پختے رہتے ہیں۔ "فیصلہ" صرف ایک کہانی کی محسوس ہوئی۔ بہر حال سیم نے دونوں کو اپنا کردار یا دلی کا ثبوت دیا۔ باقی شمار وزیر مظلوم ہے۔ اس امید پر تیسرہ لکھ دیا کہ کسی طرح وقت پر پہنچ جائے۔

ملا محمد عمران خان بھٹمرے تھمتے ہیں۔ "عجم خیال میں نظر دوڑائی تو خاطرہ مجھزار کو کرکسی صدارت پر برا جان پایا، تبصرہ بھی شاعر تھا۔ اچانک میں سفار صا حبیب کا تبصرہ بھی خوب تھا۔ بہت پند آیا۔ اس کے علاوہ رشاد احمد احوال، سلیم رشید، رانا محمد شاہ، آفاق احمد، انور عباس، شاد اور عبد الباقی، رہی کے خیالات بھی اچھے لگے۔ اس بار قیصر خان غیر حاضر تھے۔ (تقریباً سبھی خطوط پر یہ پریس جانے کے بعد ملا جس میں کئی اہم شخصیت کے خطوط تھے) اب آتے ہیں جج بیاضوں کی طرف۔ "سبکی جج بیاضی" "برادرت" بہت اچھی تھی۔ تعلیمی اداروں میں کس طرح طلباء کو خیالات کی زندگی کو تسخیر کیا جا رہا ہے، پرفسوں کی بات ہے۔ اب تعلیمی ادارے بھی ایسی گھنائی سازشوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ "خشش" میں بدلتے ہوئے

رہتے ہیں۔ انتہائی تاثیر سے ان کی تعداد کو کم کیا جاسکتا ہے۔ "بیت بازی" میں ایسے اشعار پڑھنے کو ملے۔ اب ڈراما تذکرہ ہو جائے تو کیا، ان کا راندو دیکھو، "تذکرہ غنی اور غفلت کی وجہ سے برباد ہوئی ایک لڑکی کی داستان" بھی۔ پڑھ کر افسوس ہوا۔ افسوس کرایے واقعات ہمارے معاشرے میں۔ "میں۔۔۔" ایک اچھی تحریر بھی۔ "عیم نے بغیر تپتے ڈرامے بات پر مگر چھوڑ دیا اور اس کی بیوی نے بھی جرم کیا کہ اپنا پاسکی کو نہ بتایا۔ بہر حال اچھا دیکھو کہ دوسری سے کسی لیکن دونوں مل گئے۔ "موت کا کنواں" پڑھ کر افسوس ہوا۔ افسوس آئینہ کے سانپ ہر رنگ پختے رہتے ہیں۔ "فیصلہ" صرف ایک کہانی کی محسوس ہوئی۔ بہر حال سیم نے دونوں کو اپنا کردار یا دلی کا ثبوت دیا۔ باقی شمار وزیر مظلوم ہے۔ اس امید پر تیسرہ لکھ دیا کہ کسی طرح وقت پر پہنچ جائے۔

ملا محمد عمران خان بھٹمرے تھمتے ہیں۔ "عجم خیال میں نظر دوڑائی تو خاطرہ مجھزار کو کرکسی صدارت پر برا جان پایا، تبصرہ بھی شاعر تھا۔ اچانک میں سفار صا حبیب کا تبصرہ بھی خوب تھا۔ بہت پند آیا۔ اس کے علاوہ رشاد احمد احوال، سلیم رشید، رانا محمد شاہ، آفاق احمد، انور عباس، شاد اور عبد الباقی، رہی کے خیالات بھی اچھے لگے۔ اس بار قیصر خان غیر حاضر تھے۔ (تقریباً سبھی خطوط پر یہ پریس جانے کے بعد ملا جس میں کسی اہم شخصیت کے خطوط تھے) اب آتے ہیں جج بیاضوں کی طرف۔ "سبکی جج بیاضی" "برادرت" بہت اچھی تھی۔ تعلیمی اداروں میں کس طرح طلباء کو خیالات کی زندگی کو تسخیر کیا جا رہا ہے، پرفسوں کی بات ہے۔ اب تعلیمی ادارے بھی ایسی گھنائی سازشوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ "خشش" میں بدلتے ہوئے

نوائے خلیل

ڈاکٹر ساجد امجد

ضرورتوں کے محاذ پر وہ تنہا تھا، دل ریزہ ریزہ تھا، غم و الم کی یورش تھی اور کوئی ہرسان حال نہ تھا، ضبط کے پل صراط پر کھڑا وہ سوچ رہا تھا کہ اس جھلستی دھوپ میں صرف اعلیٰ ہمتی ہی اسے اُکے بڑھا سکتی ہے۔ اسی عزم نے اسے مہمیز کیا اور اس نے تعلیم کے میدان میں قدم مضبوط کرنا شروع کر دیے۔ پھر وہ وقت بھی آگیا کہ اسے اردو کے اہم قلمکاروں میں شمار کیا جانے لگا۔

اردو کے ایک معروف قلم کار کا دلچسپ زندگی نامہ

گواریں نیام میں چلی گئیں، میدانوں میں شہر آباد ہو گئے، تہذیب نے دامن پھیلا دیا جس نے چاہا اس کی آغوش میں آیا۔ طور طریقے، انداز بدل گئے گوار چھوڑتے ہی ہاتھ قلم اٹھانے کے لیے چل گئے۔ یہ سب ہوا لیکن اچانک نہیں ہوا۔ دس سلیس گزریں تو زمین بدلی آسمان بدلا۔ یہ ایک خاندان کی کہانی ہے جو افغانستان سے آیا تھا۔ یہ کہانی سردار سالار خاں سے آگے بڑھ کر حافظ قادر بخش تک پہنچی تھی۔ گوار کی نوک قلم کی نوک میں تبدیل ہو گئی تھی اور جو کچھ تبدیل ہوا وہ اپنی جگہ۔

ہندوستان کے سلطان بہلول لودھی نے عثمان حکومت سنبھالی تو اپنی مضبوطی کے لیے اپنے ہم قوم پشانوں کو افغانستان سے لاکر ہندوستان میں بسانے کا فیصلہ کیا۔ آنے والوں میں سردار سالار خاں بھی شامل تھے۔ ان کی شجاعت کے صلے میں سلطان نے انہیں ایک بڑی جاگیر عطا کی جس میں تھیں دیہات شامل تھے۔ اس نسبت سے ان سے گاؤں کا نام ”سی دہ“ یعنی تیس دیہات پڑ گیا۔

سردار سالار خاں سینے پر بھادری کا تتھا سجائے سلطان کا ماتھ دیتے اور شجاعت کے جھنڈے گاڑتے۔ ان کے بعد ان کی اولاد نے بھی اسی پیشہ پاسبانہ گری کو

دینے کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے انجمن اصلاح معاشرت قائم کی۔ بعد میں اس انجمن کا نام اصلاح المسلمین تجویز ہوا۔ اسی انجمن کے تحت سرائے میر، اعظم گڑھ میں ایک مدرسہ درست اصلاح کا سنگ بنیاد بڑی دھوم دھام سے رکھا گیا۔ انہوں نے مولانا شبلی نعمانی سے مدرسے کی سرپرستی کے لیے درخواست کی۔ مولانا نے نہ صرف سرپرستی قبول کر لی بلکہ اس کا نصاب بھی مرتب فرمایا۔ گویا چلتی کواریں بالکل ہی نیک آلود ہو گئیں اور اس خاندان کا رخنہ مذہبی علوم کا مرکز بن گیا۔

مولانا محمد شفیع نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد دوسری شادی لازمی ہو گئی کیونکہ پہلی بیوی سے دو بچے تھے اور انہیں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس بیوی سے بھی پانچ بچے، چار بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئی۔

سب سے چھوٹا بیٹا 9 اگست 1927ء کو سلطان پور میں پیدا ہوا۔ اس کا نام خلیل الرحمن رکھا گیا۔ اسی بچے کو دنیائے ادب میں خلیل الرحمن اعظمی کے نام سے مشہور ہونا تھا۔

خلیل نے ہوش سنبھالا تو گھر کی فضا مذہبی ہی دیکھی۔ باپ عالم دین تھے لہذا ابتدائی تعلیم کے لیے گھر سے دور جانا نہیں پڑا۔ والد کی عمر اس میں قرآن پڑھنے بیٹھ گئے۔ گھر پر ہی اردو کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ کچھ دور نہیں تھا کہ خلیل کو مذہبی تعلیم کے لیے مدرسے میں بٹھا دیا جاتا۔ اس کی تیاریاں بھی ہو چکی تھیں کہ اس کے والد کے چچا زاد بھائی حافظ عبدالقادر تشریف لائے۔ مولانا محمد شفیع نے اپنا عقیدہ ان پر ظاہر کیا۔

”میں خلیل کے بارے میں آپ سے مشورہ کرنے والا تھا۔“

”کیا ہوا۔ کیا کرو یا خلیل نے؟“

”میں نے شکایت نہیں مشورہ کہا ہے۔“

”وی تو پوچھ رہا ہوں کیسا مشورہ؟“

”صاحب زادے نے پوری تیاری کر لی ہے اب چاہتا ہوں اسے مدرسے کے مولوی کے سپرد کر دوں۔“

”بھائی صاحب، اب وقت تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے۔ جب تک یہ بڑا ہوگا وقت اور بدل چکا ہوگا لہذا میرا مشورہ یہ ہے کہ یہ مدرسے کی بجائے کان کی تعلیم حاصل کرے۔“

”شاید آپ یہ چاہتے ہیں کہ یہ مذہب سے دور چلا جائے۔“

”خدا نخواستہ میں یہ کیوں چاہوں گا۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ آنے والے وقتوں میں کالج کی تعلیم ہی کام آئے گی۔ رہی مذہب سے دوری کی بات تو تمہارے گھر کی فضا مذہبی ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ خلیل مذہب سے دور چلا جائے۔ اگر گیا تو اسے سیدھا کرنے کے لیے ہم بھی یہیں ہیں تم بھی یہیں ہو۔“

عبدالقادر خاں کی یہ بات خلیل کے والد کی سمجھ میں آگئی۔ خلیل کو قریبی گاؤں ”مینا پارہ“ کے پرائمری اسکول میں داخل کرادیا گیا۔

خلیل کے گھر میں مذہب کا ہر وقت چرچا رہنے کے علاوہ علم و ادب کا اثر بھی کم نمایاں نہیں تھا۔ مولانا محمد شفیع ادب کا نہایت سلحشا ہوا ذوق رکھتے تھے۔ عقیم آباد (پنڈہ، بہار) کے شعرا کی محبتوں میں بیٹھ چکے تھے۔ خود بھی شاعر تھے۔ شاہ محمد اکبر ابو الطحانی دانا پوری سے مشورہ سخن بھی کر چکے تھے۔ حافظ ایسا تھا کہ بحر طویل کے نعتیہ قصائد پورے کے پورے یاد تھے۔ والدہ کا حال بھی یہ تھا کہ معمولی تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود نظم و نثر کی کب پڑھ سکتی تھیں۔ رات کو جب سب بچے سوئے کے لیے لیتے تو ڈیڈی زبیر احمد کے ناولوں سے اقتباسات سنایا کرتی تھیں۔

خلیل کے چچا حافظ عبدالغفار بھگسی آدمی تھے۔ انہوں نے فارسی کی اچھی استعداد ہم پہنچائی تھی۔ فارسی کے سیکڑوں اشعار یاد تھے۔ کبھی باڑی کرنے کے باوجود مجلس گرم رکھتے اور قصہ گوئی و لطیف گوئی سے محفلیں آباد رکھتے تھے۔ کئی ادبی رسائل گھر پر آتے تھے جو کم سن خلیل کی نظروں سے گزرتے تھے۔ وہ ان سے پوری طرح مستفید نہیں ہو رہا تھا لیکن دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی جو آئندہ اس کے کام آنے والی تھی۔ وہ ابھی دینی کتابوں کے سمجھنے کے لائق نہیں تھا لیکن حافظ ایسا قوی تھا کہ جہاں کوئی اچھا شعر سننے کو مل جاتا اسے یاد کر لیتا اور گاؤں کی پگڈنڈیوں پر گاتا پھرتا۔ ایک دن وہ کھیتوں کے درمیان دوڑتا ہوا چار ہاتھ اور دو گوی شعرا کی زبان پر تھا جسے وہ ترنم سے پڑھتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ گاؤں کا ایک شخص شیر خلیفہ بھی اسی راستے سے گزر رہا تھا۔ اس نے خلیل کو منگھٹا تے ہوئے دیکھا تو اس کے سامنے آگیا۔ ”خلیل..... تو بڑا اچھا گاتا ہے۔“

”میں گانہیں رہا ہوں۔ ایک شعر تھا جسے ترنم سے

پڑھ رہا تھا۔“

”چلو یہی سہی۔ تم شعر بھی کہتے ہو؟“

”جا چا، میں کہاں شاعری کر سکتا ہوں۔ یہ تو کسی کا شعر تھا جو مجھے یاد ہو گیا تھا۔ ایسے بہت سے شعر مجھے یاد ہیں۔“

”یار تجھے شاید یقین نہ آئے۔ میں شعر کہتا ہوں۔“

”برہا“ اور ”چکرا“ (دیہاتی اصناف) میں بہت سے شعر کہہ رکھے ہیں۔“

”اچھا“ خلیل نے کہا۔ ”مگر تم تو پڑھے لکھے بھی نہیں ہو۔“

”میں تو کمال ہے۔ یقین نہیں تو سناؤں؟“

”ابھی نہیں۔ میں تمہارے کمر آؤں گا۔ آرام سے بیٹھ کر سنوں گا۔“

”چل جی۔ تیری مرضی۔“ شیر خلیفہ نے کہا۔

خلیل اسی طرح دوڑتا ہوا گھر تک آگیا۔ راستہ کٹ گیا تھا لیکن شیر خلیفہ اس کے ذہن سے نہیں اترتا تھا۔ وہ رات بھر اس کے بارے میں سوچ سوچ کر اس پر رشک کرتا رہا۔ دوسرے دن اسکول گیا اور واپسی میں اپنے گھر آنے کی بجائے شیر خلیفہ کے گھر پہنچ گیا۔

شیر خلیفہ نے وعدے کے مطابق اسے اشعار سنائے اور وہ عادت کے مطابق اپنی کاپی پر لکھتا رہا۔ شیر خلیفہ کو اس کی یہ عادت بڑی اچھی لگی۔

”یار تو ایک کام کر۔“

”کچھ بچا چا۔“

”تجھے معلوم ہے میں لکھتا تو جانتا نہیں۔ شعر کہتا ہوں۔ بہت سے بھول بھی جاتا ہوں۔ تو کبھی کبھی آجایا کر میرے اشعار لکھ دیا کر۔“

”آجایا کر دوں گا چا چا۔“

وہ پابندی سے ان کے گھر جانے لگا اور بڑے شوق سے ان کے اشعار کی رات رات راکھیں دیتا رہا۔

تموڑے دن نہیں گزرے تھے کہ خلیل کو کبھی شوق ہوا کہ شاعری کرے۔ سوال یہ تھا کہ کیا شاعری کرے۔ وہ اپنے سوچے اس کیاری کی طرف گیا جو اس نے اپنے اصرار سے لگائی تھی۔ اس بھلوانی کو دیکھتے ہی اسے نظم لکھنے کا خیال آیا۔ اپنے کمرے میں آیا اور نظم لکھنے بیٹھ گیا۔ چند منوں کی محنت کے بعد نظم تیار ہوئی۔ یہ نظم والد نے سنی تو بہت خوش ہوئے اور بے اختیار کہہ اٹھے۔ ”تمہارے گھر

سوانحی خاکہ

نام: خلیل الرحمن
مشہور نام: خلیل الرحمن اعظمی
والد: مولانا محمد شفیع

تاریخ پیدائش: 9 اگست 1927ء
وطن: سیدھا سلطان پور، علی گڑھ
تعلیم کا میں: سرائے میر، اعظم گڑھ، علی گڑھ

یونیورسٹی

تعلیمی قابلیت: ایم اے اردو۔ پی ایچ ڈی
زوجہ: راشدہ خلیل

بچے: کامران، سلمان، مدنان
بیٹی: ماما طرہ

استاد شاعری: شاد مارنی

وفات: یکم جون 1978ء
تدفین: علی گڑھ

شعری مجموعے

کاغذی بحر بن، نیا عہد نامہ، زندگی اسے زندگی
تغیید
اردو میں ترقی پسند تحریک۔ ٹکروں۔ مقدمہ کام
آتش۔ زادہ نگاہ۔ مضامین نو۔

میں بھی ایک شاعر پیدا ہو گیا ہے۔“

خلیل کو شاعر ہونے کا ثبوت دیتا تھا لیکن ابھی نہ اس کی عمر ایسی تھی نہ تعلیم۔ ابھی تو اس نے درجہ چہارم پاس کیا تھا۔ درجہ چہارم پاس کرنے کے بعد اسے سرائے میر کے مڈل اسکول میں داخل کرادیا گیا۔ یہاں اسے یہ آسانی تھی کہ ”مدرسہ اصلاح“ کی لائبریری اس کی دسترس میں تھی بلکہ دوسروں کے مقابلے میں اس مدرسے پر اس کا اختیار زیادہ تھا۔ اس لیے کہ یہ مدرسہ اس کے والد کی کوششوں سے قائم ہوا تھا۔ اس لائبریری کے محررین میں بھی اس کے بھائی شامل تھے۔

وہ جب پہلے دن لائبریری میں گیا تو یہ دنیا ہی اس کے لیے نئی تھی۔ ہر طرف کتابیں دیکھ کر اس کا دل چل گیا۔ لگتا تھا تمام کتابیں ایک ہی سانس میں ختم کر دے لیکن یہ کیسے ممکن تھا۔ کبھی ایک کتاب کا ٹال کبھی دوسری کی طرف

لکھتا تھا۔ کچھ میں نہ آتا تھا کہ کس کتاب سے اپنے مطالعے کا آغاز کرے۔ لائبریرین بہت دیر سے اس کی یہ حالت دیکھ رہا تھا۔ وہ اسے جانتا تھا اس لیے آرام سے بیٹھا تماشا دیکھ رہا تھا اور لائبریری کے کسی بھی گوشے میں جانے پر معترض نہیں ہو رہا تھا۔ اگر سمجھ رہا تھا تو یہ کہ بچہ ہے اس کو اس کے مطلب کی کوئی آسان کتاب نہیں مل رہی ہے۔ اس نے غلیل کو اپنے پاس بلایا۔

”غلیل میاں، تمہارے مطلب کی کتاب لائبریری کے دوسرے حصے میں ہوگی۔ بچوں کی کتابیں وہیں رکھی ہیں۔“

”مجھے بچوں کی نہیں بڑوں کی کتابوں سے مطلب ہے۔“

”کس مضمون سے دلچسپی ہے؟“

”شاعری۔“

”شاعری کی کتابیں یہ رکھی تو ہیں۔“ لائبریرین نے اقبال کی بانگ درا نکال کر اسے دی۔ وہ کچھ دیر ان نظموں کو پڑھتا رہا اور اپنی عادت کے مطابق پسندیدہ اشعار اپنی کاپی پر اتارتا رہا۔ لائبریرین اسے جانتا تھا اس لیے لائبریری سے باہر لے جانے کی اجازت بھی مل گئی۔

اس دور میں اس نے اقبال، میکسٹ، اکبر، جوش، سیاب، جگر وغیرہ کے مجموعے پڑھے۔ بہت سے ناول اور افسانے بھی پڑھا۔

نثر کے اس مطالعہ کے نتیجے میں اسے خود بھی لکھنے کا شوق ہوا۔ لکھنے سے پہلے وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اپنی تحریر کو اشاعت کے لیے کہاں بھیجے گا۔ وہ اس دور میں شائع ہونے والے رسائل سے ناواقف نہیں تھا۔ کئی رسائل بچوں کے لیے بھی شائع ہوتے تھے۔ ان میں بجنور سے نکلنے والا ”غنی“ بھی تھا۔ غلیل نے رات بھر جاگ کر ایک مضمون لکھا۔ اور غنی بجنور کو بھیج دیا۔ اسے اپنے قلم پر اعتماد تھا اور یقین تھا کہ یہ مضمون ضرور شائع ہوگا۔

اک دن اس کے نام ڈاک سے ”غنی“ کا شمارہ آیا۔ اس نے فہرست دیکھی تو خوشی سے جموم اٹھا۔ اس کا نام غلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ اس کا مضمون تعریفی نوٹ کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ رسالے کے ساتھ ایک خط بھی آیا تھا جس میں استدعا کی تھی کہ وہ ایسے مضامین بھیجتا رہے۔ اس نے ایک مضمون ”نیائیکل“ کے نام سے لکھا اور ”غنی بجنور“ کے نام

روانہ کر دیا۔ اس کا یہ مضمون نہ صرف شائع ہوا بلکہ انعام کا حق دار بھی ٹھہرا۔

اس انعام نے اس کا حوصلہ بڑھایا اور پوری طرح لکھنے کی طرف مائل ہو گیا۔ اس کی شہرت دیکھ کر کئی اور لڑکے اس کے قریب آ گئے۔ انہیں بھی مضمون نگاری کا شوق تھا۔ ان سب نے مل کر ایک قلمی رسالہ ”بیداری“ کے نام سے نکالا جس میں وہ خود بھی لکھتا تھا اور دوسرے ساتھیوں سے بھی مضامین لکھواتا تھا۔

اس کی ان ادبی سرگرمیوں نے اساتذہ کو بھی اس کا مدارج بتا دیا۔ نصائی سرگرمیوں میں بھی اسے امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ اس کی ان خصوصیات کو دیکھتے ہوئے اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے اس کے والد کو بلا دیا اور انہیں مشورہ دیا کہ اگر وہ غلیل کو انگریزی اسکول میں بھیج دیں تو اس کی ذہانت ایسی ہے کہ مستقبل میں وہ انام پیدا کرے گا۔

اس کے والد نے اس مشورے کی سخت مخالفت کی۔ ”جناب یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں اسے دھڑ سے کی بجائے اسکول تک لے آیا ہوں اتنا ہی بہت ہے۔ معاف کیجیے گا میں اسے انگریز نہیں بنا سکتا۔“

”جناب میں تو آپ کو وقت کی ضرورت کا احساس دل رہا تھا۔ آگے آپ کی مرضی۔ دیے اچھا ہے کہ آپ گھر میں مشورہ کر لیں۔“ ہیڈ ماسٹر نے کہا۔

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ میں مشورہ کر کے آپ کو بتاؤں گا۔“

اس وقت تک انگریزی تعلیم کا آغاز ہو گیا تھا۔ علی گڑھ کالج قائم ہو چکا تھا لیکن اوسط درجے کے مسلمان اب بھی اپنے بچوں کو انگریزی پڑھانے سے گریزاں تھے اور مولانا مفتی کو عالم دین تھے۔ ان کا ایک مخصوص دینی پس منظر تھا، انہیں یہ رائے قبول کرنے میں تامل تھا لیکن جب غلیل کے چچا عبدالقادر تک یہ بات پہنچی تو انہوں نے مولانا مفتی کو سمجھایا۔ وقت کی نزاکت کا احساس دلایا۔ غلیل کی ذہانت اور شاندار مستقبل کے قہیدے بڑھے تو مولانا مفتی غلیل کو ہائی اسکول بھیجے پر رضامند ہو گئے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ پہلے وہ ”مدرسۃ الاصلاح“ میں رہ کر عربی، فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کر لے۔

مدرسۃ الاصلاح میں چند ماہ کی تعلیم کے بعد غلیل کو شبلی نیشنل اسکول اعظم گڑھ میں داخل کر دیا گیا۔ وہ اپنے ادبی و مذہبی پس منظر کے ساتھ اس گڑھ چلا گیا۔

اس نے اپنی تعلیمی حیثیت یہاں بھی برقرار رکھی اور بلند ہی اساتذہ کی آنکھوں کا تار این کیا۔ تمام اساتذہ اس کی ذہانت اور کنگن کے معترف ہو گئے۔ ایک واقعے نے تو اس کی قابلیت کے گویا جھنڈے ہی کا ڈوبے۔ واقعہ یوں ہوا کہ حساب کے استاد نے الجبرا کے کچھ سوالات حل کرنے کے لیے دیے۔ غلیل نے ان سوالوں کو بندھے کے طریقے سے بہت کم حل کیا اور استاد کے سامنے پیش کر دیا۔

استاد نے دیکھا۔ جواب درست تھا۔ کوئی غلطی بھی نہیں رہی تھی لیکن فارمولہ وہ نہیں تھا جو کلاس میں بتایا گیا تھا۔ استاد نے غلیل سے پوچھا تم نے یہ کیسے کیا؟ غلیل نے اپنا طریقہ انہیں بتایا اور بتایا کہ اسے یوں بھی حل کیا جاسکتا ہے۔ اس کی اس حد تک لڑائی جیتا تاکہ حیرت بھی ہوئی اور اس نے غلیل کو انہوں نے اس کا تذکرہ کیا۔

اس کے والدین نے اسے انعام دیا۔ اس کی طبیعت لی گئی اور وہ مطالعہ کی مانت گرفت کر لیا۔ اور اس نے اپنے ادارہ ”المصنفین“، ”المعلم گڑھ“ سے کتاب خانے کا افتتاح کر لیا۔

”وہاں میں اپنی تعلیم شخصیات سے سیکھتا رہا۔“ اس کے والد اور مرشد۔ انہوں نے زیادہ فائدہ نہیں ان کی صحبت سے ہوگا۔

وہ اس کتب خانے کی سر پابندی سے کرتے لگا۔ اس کی مضمون نگاری کا آغاز مڈل اسکول ہی میں ہو چکا تھا۔ ہائی اسکول میں آنے کے بعد اس شوق کو بیک لگ گئے۔ دارالمصنفین کے کتب خانے میں اس کی ملاقات مولانا عبدالباری آسی سے ہوئی۔ مولانا نے اس کی ساری باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کی حوصلہ افزائی فرمائی اور اسے لکھنے کی طرف مائل کیا۔

اس نے ”مولانا غلیل الرحمن مستقیمی“ کے نام سے بچوں کے پرچوں ”پیام“، ”دلی“، ”پھول“، ”لاہور اور“ ”غنی“ نامی مجلے میں بھی دلچسپ مضامین لکھے۔

”مستقیمی“ وہ اس مناسبت سے تھا کہ ضلع اعظم گڑھ میں تھا۔ سرائے میر کے نزدیک واقع ان کے کاؤں کا نام ”سیدھا سلطان پور“ تھا۔ سیدھا کا ترجمہ عربی میں مستقیم ہوتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے نام کے ساتھ مستقیمی لکھتا تھا اور مولانا اس مناسبت سے تھا کہ اس کا تعلق ایک عالم دین اور عالم اہل علم سے تھا۔

غزل

راستہ چرچ ہے اور ہم سفر کوئی نہیں سب مرے ہم شکل ہیں مجھ سا مگر کوئی نہیں ایک پرچما میں نہ جانے کب سے میرے ساتھ ہے جسم اس کے سیکڑوں ہیں اور سر کوئی نہیں اس جہاں میں میرے ہونے کی گواہی کون دے اک ہجوم اور اس میں جہم معتبر کوئی نہیں شہر کی سڑکوں پہ آخر کس نے جادو کر دیا سائے ہی سائے یہاں ہیں اور سحر کوئی نہیں اپنے حصے میں رہا بس خود کھائی کا غذاب اس جہاں سے اس جہاں کا نامہ بر کوئی نہیں آ مری دوران آنکھوں میں سدا آباد رہ اے مرے خواب جواں تیرا مگر کوئی نہیں

☆.....☆.....☆

ایسا جانے کیا ہے جادو کیا اس میں دل کشی ہے کہ نہ کوئی ہو تو وہ بھی ہم سا ہی آدمی ہے پڑا ہوا مضامین ہیں اب اس نے فہرست کے پس درمیاں میں حامل دیوار دوقی ہے گرد مال لب سے پتلون پہ جم رہی تھی جی بھر کے رو لیے تو آنکھوں میں روشنی ہے سب سوئے اپنی اپنی چادر میں منہ چپا کر اک مری بے بسی ہے جواب بھی جانتی ہے ہم نے تو ہر قدم پر ٹھوکر لگائی اس کو یہ نامراد دنیا کیا اور چاہتی ہے اس جھوٹ سے بالآخر کب تک نیاہ ہو گا جب دل ہے زخم خوردہ ہو توں پہ کیوں بکسی ہے

مستقیمی بعد میں اس کے نام کے ساتھ ”مولانا“ کا سابقہ اور ”مستقیمی“ کا لاحقہ ختم ہو گیا۔ ”مستقیمی“ کے بجائے ”غلی“ ہو گیا لیکن بے تکلف احباب اسے عرصہ تک مولانا کہتے رہے۔

وہ امتیازی خبروں سے پاس ہوتا ہوا اعلیٰ کلاسوں میں پہنچ گیا۔ اس کے باپ کو اس سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں لیکن اب ان کی صحت کرنے کی تھی۔

وہ میٹرک میں تھا کہ اسے یہ رون فرسانہ خبر ملی کہ اس کے باپ پر فاق کا حملہ ہوا ہے۔ اس نے اسکول سے

چٹیاں لیں اور گاؤں پہنچ گیا۔ اس کا باپ بستر پر تھا۔ حالت ٹھیک نہیں تھی لیکن خلیل کو اس سبکی کا احساس نہیں تھا۔ اس کے بڑے بھائی نے بھی باور کرایا کہ والد صاحب بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے لہذا وہ چند دن گاؤں میں گزارنے کے بعد اعظم گڑھ لوٹ آیا۔

مولانا شفیق کی حالت روز بروز بگڑتی گئی۔ مولانا نے دو شادیاں کی تھیں اور دونوں سے اولادیں تھیں۔ جب مولانا کی بیماری نے طول پکڑا اور بچنے کی امید نہ رہی تو دونوں بیویوں کی اولادوں میں جائیداد کے معاملات پر جھگڑے ہونے لگے۔ سب سے سولے کے سوالات اٹھنے لگے۔ نوبت مقدمہ بازی تک پہنچ گئی۔ خاندان کے دیگر بڑوں کی وجہ سے معاملہ وقتی طور پر دب گیا لیکن دلوں میں دراڑیں ایسی پڑ گئیں کہ بھائیوں میں جو اتحاد تھا پارہ پارہ ہو کر رہ گیا۔ خلیل ان حالات سے بے خبر امتحان کی تیاری میں مصروف تھا کہ والد کے انتقال کا نارٹا۔ امتحان میں صرف ایک دن رہ گیا تھا۔ وہ والد کی تدفین میں شریک نہ ہو سکا۔ اک جہنم کی طرح تھا یہ مرا گھوارہ اس جہنم میں مرے باپ نے دم توڑ دیا ٹوٹ کر رہ گئے بچپن کے سہانے بچنے مجھ سے منہ پھیر لیا جیسے مری شونی نے

☆☆☆☆

امتحان سے فارغ ہونے کے بعد وہ گاؤں گیا تو دنیا ہی بدل چکی تھی۔ وہ جس محبت و شفقت کا عادی ہو چکا تھا اس سے محروم ہو گیا۔ باپ کا بستر خالی تھا۔ خاندان میں نفسا نفسی تھی۔ آپس کے اختلافات نے گھر کو جہنم بنا دیا تھا۔ یہ جہنم اس وقت مزید گرم ہو گیا جب اس نے مزید تعلیم کے لیے علی گڑھ جانے کا ارادہ کیا۔ اس فرسودہ خاندان میں علی گڑھ کا نام بھی آنکھ نشاں کی طرح چلا۔ سوتیلے بھائی تو پنی جگہ اس کے اپنے بھائی کی مخالفت پر اتر آئے۔ طرح طرح کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ کسی نے کہا میٹرک سے آگے پڑھنے کی ضرورت کیا ہے۔ کسی نے علی گڑھ کا کالج کے ہماری اخراجات کی طرف توجہ دلائی۔ وہ ہر طرح کے طعنے برداشت کرتا رہا لیکن اپنی ضد سے باز نہ آیا۔

یہ جو بڑی ہی آئی کہ وہ شیلی کا کالج اعظم گڑھ میں داخلہ لے لے جہاں کم خرچ سے کام چل سکتا تھا لیکن اس پر علی گڑھ جانے کی دھن ایسی سوار تھی کہ اس نے اعلان کر دیا۔ ”میں علی گڑھ جاؤں گا یا پھر پڑھائی چھوڑ دوں گا۔“

اس کی ضد کے آگے سب کو ہتھیار سمجھنے پڑے۔ اسے کچھ رقم فراہم کی گئی اور اسے علی گڑھ بھیج دیا گیا۔

علی گڑھ جانے سے پہلے وہ اعظم گڑھ گیا۔ عبدالباری آسی اسے سلیمان ندوی کے پاس لے گئے۔ سید صاحب یونیورسٹی کورٹ کے رکن تھے۔ انہوں نے خلیل کو نواب صدر پار جگہ کے نام سفارشی رقعہ دیا۔ ”حالی رقعہ ایک مذہبی گھرانے کے صاحب زادے ہیں۔ اب تک تمام امتحانات امتیازی نمبروں سے پاس کرتے چلے آئے ہیں۔ شعر و ادب سے بھی لگاؤ ہے۔ کئی مضامین رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ ان کے والد کا شمار ”مدرستہ الاملاص“ کے بانیوں میں ہوتا ہے مگر اب ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ مالی اعتبار سے بھی یہ گھرانہ خوش حال نہیں۔ اگر انہیں ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے وقفہ جاری کر دیا جائے تو ان کا تعلیمی سفر آسان ہو جائے گا۔“

نواب صدر پار جگہ ایجوکیشنل کانفرنس کے روح رواں تھے۔ لہذا توقع تھی کہ کانفرنس کی طرف سے عربی کا ایک وظیفہ مل جائے گا۔

خلیل یہ رقعہ لے کر علی گڑھ پہنچا اور نواب صاحب کے یہاں حاضر ہو گیا۔ نواب صاحب نے رقعہ دیکھا۔ خلیل سے دو چار سوالات کیے۔

نواب صاحب کی کرم نوازی سے یونیورسٹی میں داخلہ بھی مل گیا اور وظیفہ بھی منظور ہو گیا۔

اس قلیل وقفے سے ان کے اخراجات پورے نہیں ہو سکتے تھے۔ تھوڑے دنوں بعد ہی انہیں احساس ہو گیا کہ اس وظیفے میں اس کا گزارہ نہیں ہو سکتا۔ ایسے میں اسے وہ خط یاد آیا جو شیلی کا کالج کے پرنسپل بشیر احمد صدیقی نے رشید احمد صدیقی کے نام دیا تھا۔ اس زمانے میں ”ڈیوٹی سوسائٹی“ کی طرف سے قرض دیا جاتا تھا اس خط میں اسی ”قرض“ کی سفارش کی گئی تھی۔

اس نے یہ خط رشید احمد صدیقی کی خدمت میں پیش کر دیا۔ انہوں نے خطا خطا کیا اور حکم دیا۔

”میرے پاس اس وقت آئیے گا جب آپ کو ڈیوٹی سوسائٹی سے قرض کی ضرورت ہو۔“

یہ حوصلہ افزا جواب تھا لہذا اسے جب قرض کی ضرورت پڑی رشید صاحب کی خدمت میں پہنچ جاتا۔ وظیفے قرض کی رقم اور بھائیوں کی امداد کے قلیل اس کے تعلیمی سفر کا آغاز ہو گیا۔ یونیورسٹی کے تعلیمی ماحول اور

ادبی سرگرمیوں نے اس کی صلاحیتوں کو اجاگر بنی۔ اس ماحول میں رہتے ہوئے اس کی ادبی صلاحیتوں نے ابھرنی لگی۔

وہ انٹرمیڈیٹ میں تھا کہ ایک دن اچانک اس نے اپنے دل میں ایک ایسی غلط محسوس کی جیسے اسے کسی سے محبت ہو گئی ہے۔ یہ سارا کھیل اس کی قوت تخیل کا تھا۔ ایک تصوراتی محبوبہ تھی جو اس کے حواس پر چھا گئی تھی۔ نہ تو اس کی ذہل و صورت تھی اور نہ لڑکی نام اور نہ اسے محبوبہ کے بارے میں کچھ پتہ تھا۔ اسے کوئی شہنائی دور کا تھا لیکن ہاسٹل میں رہتے ہوئے تنہائی کا المناذہ تھا۔ یہاں وہ کئی ساتھیوں کے ساتھ رہتا تھا۔ رات گئے تک کمرے میں ہلہ گھا ہوتا رہتا۔ جب ذرا خاموشی ہوتی تو وہ بستر پر چلا جاتا۔ تصوراتی محبوبہ خیالوں میں آجاتی اور پچھلے پہر تک جاگن رہتا۔

کئی بار وہ قلم ہاتھ میں لے کر پینے لگا۔ اسے لگا کہ وہ کسی کے نام لپا چوڑا خط لکھتا جاتا ہے۔ مگر سوچتا رہا کہ کیا حماقت ہے۔ کس کو خط لکھوں اور کہاں لکھوں؟

وہ اسی کیفیات سے گزر رہا تھا کہ ایک روز وہ کسی ارادے کے بغیر پچھلی بیچ پر جا کر پینے لگا۔ اس نے ٹوٹ بک نکالی اور کچھ لکھنے لگا۔ کلاس ختم ہوئی تو وہ ایک لکھ لکھ چکا تھا۔ یہ اس کی پہلی یا قاعدہ لکھ تھی۔ اس کا آغاز یوں ہوتا تھا۔

بیکر حسین و حیا آہ یہ تصویر تیری میری تخیل کا ہے ایک ادھورا شاہکار اس نے اس لکھ کا عنوان ”نقش نامقام“ رکھا اور اشاعت کے لیے ”نیا دور“ بنگور کی مدد سے ممتاز شیریں کو بذریعہ ڈاک ارسال کر دی۔

ممتاز شیریں نے یہ قلم پسند کیا اور نیا دور میں شائع کر دی۔

وہ بچوں کے رسائل میں چھپتا رہا تھا لیکن کسی ادبی رسالے میں یہ پہلی نظم جو شائع ہوئی تھی۔ اسے پہلی مرتبہ یقین ہوا کہ وہ ایسی شاعری کر سکتا ہے جو دوسروں کو متوجہ کر سکتی ہے۔ اب تو اس پر شاعری کا جیسے جنون سوار ہو گیا۔ چلتے پھرتے نظمیں نازل ہونے لگیں۔

اس زمانے میں عجیب عجیب نظمیں کہیں۔ ”ن لیفا کی افسانیں“ ”آدرش“ ”انجمنی سائے“ ”تخیل کے دہانے“ ”نایام کے نام“ ”جس دوام“ وغیرہ۔ اس نے یہ نظمیں صرف لکھیں نہیں مختلف رسائل میں شائع بھی کرائیں۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ عصر حاضر کے شعرا

”اقتباس“

تخلیقی ادب میں موضوع ادیب کے ذہن کی قوت اختراع اس کے کائناتی مشاہدے اور اس کے شخصی رد عمل سے آمیز ہو کر ایک نئی کیفیت اختیار کرتا شروع کرتا ہے۔ اب وہ ایک سادہ موضوع سے ہٹ کر ادیب کا ذہنی اور حسی تجربہ بن جاتا ہے۔ اسی تجربے کو ہم ”مواد“ کہتے ہیں۔ مواد شوہن کی ایک منزل سے گزرتا ہے جسے بعض لوگوں نے تخلیقی عمل سے تعبیر کیا ہے۔ یہاں تک کہ تکمیل اور تخلیق کا مقام آ جاتا ہے اور مواد صورت پذیر ہو جاتا ہے۔ صورت پذیر ہونے سے پہلے مواد سیال شکل میں ہوتا ہے اور اس میں کوئی عضو یا قوت وحدت نہیں ہوتی۔ مگر قوت میں تبدیل ہونے کے بعد ہی مواد ایک زندہ وجود کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

(اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک) ”خراج“

میں زندگی میں صرف دو آدمیوں کے دست و پالے ملے اور یادداشت سے متاثر بلکہ مرعوب ہوا ہوں۔ ایک تو قاضی عبدالودود اور دوسرے خلیل الرحمن خلیل اعظمی..... قاضی صاحب کی طرح خلیل کا حافظہ بھی غضب کا تھا۔ برسوں قبل پڑھی ہوئی کتاب کا حوالہ وہ اس طرح دیتے جیسے انہوں نے وہ کتاب کچھ دیر پہلے ہی پڑھی۔ کلاسیکی اور جدید ادب پر ان کی براہ نظر تھی۔

کس قسم کی نظمیں لکھ رہے ہیں اس نے ادبی دنیا، ہالیوڈ، نیا ادب، سانی اور ادب لطیف وغیرہ کا مطالعہ شروع کر دیا جن میں نئے ادیب جدت طرازیوں کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

اس کی یہ تمام نظمیں روانوی تھیں۔ ایک ایسی ہستی کے گرد گھومتی تھیں جس کا مخاطب گوشت پوست کا زندہ نہ تھا بلکہ خیالی محبوبہ تھی۔ ظاہر ہے ایسی شاعری ذہاب تو نہ کہتی تھی۔ زندہ تجربے کی حامل نہیں۔

اسے اس زندہ تجربے کی طرف لانا تھا۔ وہ جلد ہی ترقی پسند تحریک سے ملا۔ ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی نظموں میں رومان نے ساتھ انقلاب کا اضافہ ہو گیا۔

اس نے پہلی گڑھ میں قدم رکھا تھا تو علی گڑھ میں ابن بطوطہ تحریک، تم ہو چکی تھی۔ علی سردار جعفری وغیرہ گرفتار

ہو گئے تھے اور یونیورسٹی سے نکال دیے گئے تھے لیکن جب معین احسن جذبی پیکرار ہو کر شعبہ اردو میں آئے تو انہوں نے اپنی شخصیت اور شاعری سے بہت سوں کو متاثر کیا اور نوجوان طلبہ ان کے گرد جمع ہو گئے۔ خلیل بھی ان سے ملاقات کا خواہاں ہوا۔

خلیل نے اور جذبی کے گرد اکٹھے ہونے والے طلبہ نے جذبی کے ایما پر انجمن ترقی پسند تحریک کی ایک مرتبہ پھر داغ بیل ڈالی۔ انجمن کا دفتر بند ہو چکا تھا۔ سرگرمیاں ماند پڑ گئی تھیں لیکن انجمن کے بعض حامی علی گڑھ میں موجود تھے۔ لہذا جب خلیل اور ساتھیوں نے انجمن کا احیا کیا تو انجمن بہت جلد علی گڑھ میں مقبول ہو گئی۔ انجمن کے باقاعدہ اجلاس ہونے لگے اور ان جلسوں کی رودادیں ”محاذ“ بمبئی میں اشاعت کے لیے بھیجی جاتیں۔ ان جلسوں میں باہر سے بھی ادیب بلائے جاتے۔

یہ خلیل کی زندگی کا سنہری دور تھا ایک ایسا دور جس میں اس پر مطالعہ کا جنون سوار تھا اور نظموں کا رنگ تبدیل ہو گیا تھا۔ انقلاب اور رومان کل مل گئے تھے بلکہ انقلاب کی اہمیت بڑھ گئی تھی۔ نظموں کا انداز خطیبانہ ہو گیا تھا۔

محفل غیر میں اب یہ تری یادوں کی کرن مسکراتی ہوئی اس طرح بعد ناز آئی جھنجٹا اٹھے پھر اک بار مری روح کے تار لیکن اے دوست ابھی مجھ کو طلوع نو کے خیر مقدم کے لیے رات کے اس پچھلے پہر اک نئے دور سے دوچار بھی تو ہوتا ہے سن تو لو غور سے وہ رات کہ دل کی دھڑکن تیر کی اپنے لیے جیسے کفن بنتی ہو جیسے اب داوی دھرا کی رگیں ٹوٹتی ہوں جیسے تھمتی ہوئی اب باد خزاں چلتی ہو جب تک راہ میں ہے قافلہ صبح بہار ابھی صیاد سے بھی آنکھ ملانا ہے مجھے جب تک چاک نہیں ہوتا ہے یہ پردہ شب گیت زنجیر کی جھنکار پہ گاتا ہے مجھے

☆☆☆

اک طرف عظمت اسلاف کا ماتھے پہ غرور اور اک سمت وہ افلاس کے پچھلے ہوئے جال ناتواں باپ مرا جرم مصیقتی کا شکار ماں کی آنکھوں سے نکپتے ہوئے سارے ارماں

قرض کے بوجھ سے جینے کی انگلیں باہال وقت کی دھندیں لینے ہوئے کچھ پیار کے گیت مہر و اخلاص زمانے کی جفاؤں سے ٹٹھال بھائی بھائی کی محبت میں نزلے سے شکوک نگہ غیر میں جس طرح انوکھے سے سوال ایک ہنگامے پہ موقوف تھی گھر کی رونق مفلسی ساتھ لیے آئی تھی اک جنگ و جدال فائدہ مستی میں بکھرتے ہوئے سارے رشتے تنگ دستی کے سب ساری فضاں بے حال

☆☆☆

یہ نظم بھی نظا ہر اس کے خاندان کی ایک کہانی معلوم ہوتی ہے لیکن اس کے پس منظر میں اس کی ترقی پسندی موجود ہے۔ اک خاص سماجی شعور ہے جو اس کے ترقی پسند نظریات کی ترجمانی کرتا ہے۔

اسی سماجی شعور نے فیض کو یہ کہنے پر مجبور کیا تھا۔ ”مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ“ خلیل نے بھی ترقی پسندی کی دھن میں عشق پر سماج کو فوجیت دی۔

میں تمنا کے کھلونوں سے بہت کھیل چکا
اس محبت میں بھی اب جی نہیں لگتا میرا
مشورہ ہے مری وحشت کا کہیں بھاگ چلو
چل کے اس شہر سے اس گھر سے کہیں دور بسو
الوداع اے مرے خوابوں کی حسیں شہزادی
یوں سمجھتا یونہی جھوٹا سا کوئی قصہ تھا

☆☆☆

یہ نظم
وہ چھپتی چلی جاتی ہے جیسے تاریکی
وہ ڈوبتا چلا جاتا ہے کائنات کا دل
وہ ایک ہاتھ بڑھا جیسے چھینٹا چاہے
کوئی اذان مرے عشق کے تخیل کی
یہاں تو شام اودھ بھی اسیر ہے جیسے
نہ جانے کیا ہے کہ بے کیف سی فضاؤں میں
ترا خیال بھی اب رنگ بھر نہیں سکتا
مری نگاہ میں ہیں اب بھی وہ ترے گیسو
مگر ابھی تو یہ منظر سنور نہیں سکتا

☆☆☆

جوانی کا جوش تھا۔ صرف نظموں پر گزرا نہیں ہو سکتا

تھا۔ وہ ملی طور پر سیاست میں حصہ لے رہا تھا۔ وہ اور باقر مہدی کے ساتھ طلبہ کے ایک جتنے کے ہمراہ ایک جلوس میں شرکت کے لیے دہلی گیا حالانکہ حکومت نے اسے بلیک لسٹ کر رکھا تھا۔

وہ اور باقر مہدی ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے نعرے لگاتے سڑکوں پر سے گزر رہے تھے۔ شام کو مشاعرہ تھا گاندھی جی اور محمد علی جوہر پلیٹ فارم پر اکٹھے بیٹھے تھے۔

وہ ایف اے کا امتحان دے چکا تھا۔ اس وقت اسے دو مسائل کا سامنا تھا۔ پہلا مسئلہ قرض کی ادائیگی کا تھا جو امتحان کے زمانے میں اس پر چڑھ گیا تھا۔ دوسرا مسئلہ بی اے میں داخلے کا تھا۔ ان مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اس نے دہلی کا رخ کیا اور ڈاکٹر حسین سے مل کر جامعہ ملیہ دہلی میں ملازمت کر لی۔ یہ ادارہ ایک چھوٹی سی برادری تھی۔ وہ بھی اس برادری میں شامل ہو گیا۔ اسے چھٹیوں تک یہ ملازمت کرنی تھی اس کے بعد اسے بی اے میں داخلے کے لیے علی گڑھ جانا تھا۔

اسی دوران ہندوستان تقسیم ہو گیا۔ آزادی آئی مگر خون میں نہائی ہوئی۔ ہر طرف قتل و غارتگری کا بازار گرم تھا۔ بڑے پیمانے پر ہجرت کا سفر شروع ہو گیا تھا۔ مسلمان آبادیوں کی آبادیاں پاکستان کی طرف ہجرت کر رہی تھیں۔ دہلی میں ہر طرف خطرہ ہی خطرہ تھا۔ اس نے بھی بہتر سمجھا کہ دہلی چھوڑ کر علی گڑھ چلا جائے۔ وہ اور باقر مہدی ٹرین میں سوار ہوئے۔ گاڑی نے دہلی اسٹیشن چھوڑا دی تھا کہ ٹرین ہندو بلوایوں کے حملے کا شکار ہو گئی۔ ہندو غنڈے دھمکتے ہوئے ڈبے میں داخل ہوئے اور ٹھیل کے سامنے آکھڑے ہوئے۔

”تم مسلمان ہو؟“

ٹھیل اس وقت اپنی جان بچانے کے لیے جھوٹ بول سکتا تھا لیکن اس کی غیرت ایمانی نے یہ گوارا نہیں کیا۔ اس نے ٹوک کر جواب دیا۔ ”ہاں میں مسلمان ہوں۔“ یہ سنتا تھا کہ بلوایوں نے ایک ساتھ کئی چھڑے اس کے جسم میں بیوست کر دیے۔ دھکی ہو تو ایسی۔ یہ دیکھتے ہی باقر آگے بڑھا۔

”میرے دوست کو تم نے مار دیا۔ اگر وہ مر گیا تو پھر میں زندہ رہ کر کیا کروں گا۔ اب دیکھتے کیا ہو، لو مجھے بھی مار ڈالو۔“ کسی نے آگے بڑھ کر اس پر بھی بھجڑا دیا۔

ٹرین رک چکی تھی۔ بلوایوں نے ان دونوں کو اٹھا کر جناہل کے پاس پھینک دیا۔ دونوں کی خوش قسمتی تھی کہ ریلوے کا ایک ملازم باقر، ریلوے پٹرول کا معائنہ کرتے کرتے وہاں پہنچ گیا۔ دیکھا کہ دونو جوان زخمی حالت میں پڑی کے پاس پڑے ہیں۔ اس نے فوراً غصیلانگو اور ازراہ انسانیت دونوں کو اٹھا کر جامع مسجد دہلی پہنچا دیا۔

باقر مہدی کو کچھ ہوش تھا۔ اس نے باقر سے کہا کہ ان کے زخمی ہونے کی اطلاع جامعہ ملیہ پہنچا دی جائے۔ خلیل کے چھوٹی زاد بھائی اصغر احسن اصطلاحی جامعہ میں درس دیتے۔ وہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی مدد سے خلیل کو پولیس کی گاڑی میں جامعہ لائے اور ان کا علاج معالجہ کرایا۔ خوش قسمتی سے دونوں کو کاری ضربیں نہیں آئی تھیں۔ دونوں کی حالت کچھ تسخلی تو رفیع احمد قدوائی کے ہمراہ انہیں علی گڑھ روانہ کر دیا۔

اس نے صحت یاب ہوتے ہی بی اے میں داخلے لیا اور ہاسٹل میں رہنے لگا۔ ان دنوں اس کی سیاسی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی علی گڑھ شاخ کا جنرل سیکریٹری ہو گیا تھا۔ اس کی رہنمائی میں انجمن نے نفاذ کے جوہر کو توڑا اور وقت کے سانکن تالاب میں کئی لہریں پیدا کیں۔ خلیل کی سرگرمیاں گونا گوں تھیں۔

یہی زمانہ اس کی شاعری کے عروج کا بھی تھا۔ گلی گلی مری رسوائیوں کے چمچے ہیں کہاں کہاں لیے پھرتی ہے بوئے آوارہ وہ ان دنوں بدشعور، نازنیوں میں بے انتہا مقبول ہو رہا تھا۔ باذوق گھرانوں کے دروازے اس پر کھلے ہوئے تھے جہاں خواتین اس کا کلام سننے کے لیے چشم براہ بنتی تھیں۔ وہ نغمے بکھیر رہا تھا اور سامعین گوش برآواز تھیں۔

کچھ ان کی باتیں کچھ اپنی باتیں کہتی ہیں یونہی اب غم کی راتیں جانے یہ دن پھر آئیں نہ آئیں کچھ اور اشارے کچھ اور گھاتیں

بار بار تیرے نامرا دوں کو موت آواز دے کے پچھتی سا رہا ہوئی انہیں جھوٹ موت کا قصہ کہ ایک شخص محبت میں کامیاب رہا

ایسی راتیں بھی ہم پہ گزری ہیں تیرے پہلو میں تیری یاد آئی

تجھ سے کم واقف تھے تو روز کا ملنا ہوتا تھا تجھ کو جانا تجھ کو چاہا وقت فب و بجز ہوئے

جرم محبت مجھ تک ہی رہتا ان کا بھی دامن الجھا ہوا ہے

اگرچہ اور بھی نیتے اٹھے قیامت کے ترا شباب ہی عالم میں آفتاب رہا

اس کی یہ قبولیت اپنی جگہ لیکن ٹرین میں ہونے والے قاتلانہ حملے نے اس کی شخصیت کو اندر سے توڑ پھڑا دیا تھا۔ وہ راتوں کو گہری نیند نہ لے سکتا تھا۔

عنا۔ اس کے بہت سے پرانے ساتھی علی گڑھ سے جا چکے تھے۔ اس کیفیت نے اسے تنہائی کے خوف میں جھلا کر دیا۔ بھائیوں کے رویے اور گھر کے حالات نے اسے باغی کر دیا۔ اس نے سوچ لیا کہ اب گاؤں کے گھر میں اس کا کوئی نہیں حالانکہ گاؤں میں اس کی ماں تھی۔ اس نے گاؤں کی طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔

تنہائی کے اس اندھیرے سفر میں وہ شاید اتنی دور نکل جاتا کہ واپسی ممکن نہ ہوتی۔ اس اندھے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے کلیات میر اس کے ہاتھ لگ گئی۔ اس نے مطالعہ میر شروع کیا تو اس پر داخلی دنیا کے کئی در پیچے کھل گئے۔ میر کا مطالعہ میر سے ملاقات سامنہ گیا۔ گویا میر تقی میر اس کے غم کا مار بن گئے۔ وہ ان کی صحبت میں بیٹھ کر تنہائی کے غذاب سے نجات حاصل کرنے لگا۔

اس دور میں اس نے جو فراموش کہیں ان میں بھی میر کا رنگ نظر آنے لگا۔

جن گلیوں میں اٹھتی صاحب آپ بہت بدنام ہوئے پھر بھی آپ وہیں جاتے ہیں اس میں کیا داناں ہے اس میر کا طرز اپنانے پر غور ہے۔

اے طرز اپنانا سب نے کیوں ہے اعزاز کہاں اٹھتی صاحب آپ کی فراموشی سن کر تب حراں ہیں

میں نے ملت کو خراج عقیدت پیش کرنا بھی اس کا

میر کے رنگ میں شعر کہے تھے کہ یہ کیا سودا ہے اٹھتی اس سورج کے آگے کتنے دیے بے نور ہوئے

وہ ابھی میر کی شاعری سے بھل ہی رہا تھا کہ اس کی تنہائی کے تالاب میں ایک لہر کا اور اضافہ ہوا۔ وہ پرانی کتابوں کی تلاش میں اکثر ریل سٹیشن کی طرف نکل جاتا تھا اور کباڑیوں کی دکانوں کو چھانٹتا تھا۔ اسی چھان بین میں اسے آتش کا دیوان مل گیا۔ اس نے بے دلی سے اسے خرید لیا۔

بے دلی سے اس لیے کہ اس کے دل میں قدیم شاعری کی طرف سے تصعب تھا لیکن ”آتش“ زیادہ قدیم نہیں تھا اور اس سے پہلے میر تقی میر کی کلیات پڑھ چکا تھا۔ اس لیے آتش کا دیوان خرید لیا اور جھاڑ پونچھ کر اس کی ورق گردانی شروع کر دی۔ ایچھے اشعار پر نشان لگا تا گیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ آتش پڑھ لکھتا چاہتا ہے یا ان شعروں کے جواب میں نوٹیں لہنا چاہتا ہے۔ وہ کوئی سی نوٹیں یہ ضرور تھا کہ وہ آتش لے تا تھا اور ہاتھ۔

اس نے دو تہوں کو انتظار تھا کہ دلیپ وہ اب آتش کے رنگ میں غریب کینے کا آغاز کرتا ہے لیکن اس مرتبہ اس کا میدان زیادہ وسیع نظر آیا۔ اس مرتبہ اس آتش کی کسی زمین میں غزل کہنے کی بجائے ”آتش کی شخصیت“ کے عنوان سے ایک مضمون لکھ ڈالا۔ ڈرتے ڈرتے کچھ دوستوں کو سنایا بھی اور پھر یہ طے ہوا کہ اسے ”نگار“ میں اشاعت کے لیے نیاز فتح پوری کے پاس بھیج دیا جائے۔ یہ کوئی معمولی شورہ نہیں تھا۔ علامہ نیاز فتح پوری کے مقام و مرتبہ کی دنیائے ادب قائل تھی۔ ان کے پرچے ”نگار“ میں نہایت اعلیٰ شخصیات کی تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ خلیل اعظمی کو امید بھی نہیں تھی کہ اس کی یہ طالب علانہ کاوش کسی قابل سمجھی جائے گی لیکن جب اگلے ہی شمارے میں اس کا یہ مضمون شامل اشاعت کر لیا گیا تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی اس نے رسالہ بفل میں دیا اور باقر مہدی کے پاس پہنچ گیا۔

”تم نے نگار دیکھا۔“

”دیکھنا کیا ہے۔ تمہارا مضمون شائع ہوا ہوگا۔“

”تمہیں کیسے معلوم؟“

”تمہارے چہرے کی خوشی بتا رہی ہے اور میر سے ہی شورے سے تو تم نے اپنا مضمون نگار کے لیے بھیجا تھا۔“

”یار، مجھے یقین نہیں تھا کہ میر مضمون شائع ہو جائے گا۔“

”جہیں اپنی صلاحیتوں کا علم ہی نہیں۔“ باقر مہدی

نے کہا۔ ”اب تم ایسا کرو کہ اس سلسلے کو ٹوٹنے نہ دو۔ لو ہاگرم
ہے ایک چوٹ اور مارو۔“
”کیا مطلب؟“

”بھئی مطلب یہ کہ کوئی تنقیدی مضمون اور لکھنواور نیاز
صاحب کی خدمت میں ارسال کر دو۔“

”تمہیں معلوم ہے میں تنقید کا آدمی نہیں۔“
”تم ثابت کر چکے ہو کہ تم ہو۔ نیاز جیسے بزرگ تمہیں
تسلیم کر چکے ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ تمہیں بھول جائیں
ایک مضمون اور لکھو۔“

”سوچ رہا ہوں اب کیا لکھوں۔“
”آتش کی شاعری کے اور پہلو بھی ہوں گے۔ ایک
ایک کر کے اٹھاتے جاؤ اور لکھتے جاؤ۔ ایک ہی شخصیت پر
چند مضامین جمع ہو جائیں گے تو باقاعدہ کتاب بھی بن سکتی
ہے اور تم باہر خوب حیدر علی آتش کہلا سکتے ہو۔“

خلیل نے اس وقت اس شورے کو مذاق ہی سمجھا ہو
کا لیکن ہاشل کے کمرے میں آکر وہ آتش کی شاعری کا جائزہ
لینے لگا۔ کئی دن تک وہ نشان زدہ اشعار کا جائزہ لیتا رہا اور
چھوٹے چھوٹے نوٹس لیتا رہا اور پھر مضمون لکھنے بیٹھ گیا جب
مضمون مکمل ہو گیا تو اس نے مضمون کی پیشانی پر سرخی جما
دی۔ ”آتش کے بنیادی تصورات۔“

اس کا یہ مضمون نیاز فتح پوری کے اس نوٹ کے ساتھ
شائع ہوا۔

”اس حقیقت کا اظہار کرنا ہی پڑے گا کہ جناب
اعظمی جس وقت نگاہ و احسان نظر سے کام لے رہے ہیں وہ
آتش کے باب میں اس وقت تک کسی صاحب قلم کی طرف
سے غاہ نہیں ہوئی تھی اور ان کا یہ جوش حد درجہ لائق تحسین و
ستائش ہے۔“

اس مضمون کی اشاعت کے بعد اور تعریفی پس منظر
کے ساتھ اسے یقین ہو گیا کہ وہ تنقیدی ذہن رکھتا ہے اور
اس نے اس سلسلے کو آگے بڑھایا۔

آتش سے متعلق اس نے کئی مضامین تو اتار کے ساتھ
سلسلہ وار شائع کرائے۔

آتش کے کلام کا نئیاتی پس منظر
آتش کی عشقیہ شاعری
آتش کا فن
آتش کا تصوف

اس کے سلسلہ وار مضامین کی اشاعت ہوئی تو کئی

بزرگ نقادوں نے اس کی کاوش کو سراہا۔ فراق گورکھپور
نے خلیل کو ایک خط بھی لکھا۔

”پچھلے دس سال میں آتش کے بارے میں جو کچھ
سوچ رہا تھا۔ ان خیالات کو آپ کے مضمون میں پا کر عجیب
غریب مسرت ہوئی۔“

آتش پر اس کے مضامین جب ایک کے بعد ایک
شائع ہونے لگے تو بابائے اردو مولوی عبدالحق، مولانا
سلیمان ندوی، اثر لکھنوی جیسے بزرگوں نے اس کی تعریف
میں خطوط لکھے اور اسے داد دی۔ خود نیاز فتح پوری نے رشید
احمد صدیقی کو لکھا کہ علی گڑھ کے یہ کون صاحب ہیں جن کے
مضامین آتش پر ہیں۔

اس خط کے ملتے ہی رشید احمد صدیقی کو اس کی جتنی
ہوئی اور یہ جان کر اسے بڑا تعجب ہوا کہ یہ دی طالب علم ہے
جو یونیورسٹی کے قرض لینے کے لیے انہیں گھبراتا ہے۔
پھر تو وہ ایسے مہربان ہوئے کہ اپنے کمرے کے دروازے اس پر
کھول دیے اور صاف کہہ دیا کہ تم ہر وقت میرے کمرے آ سکتے
ہو بس اپنا نام بتا دیا کرو میں فوراً تمہیں بلا دوں گا۔

اس نے اپنے مضامین کو نظر ثانی کے بعد اشاعت
کے لیے پیش کر دیا مگر اس کی اشاعت 1959ء میں ممکن ہو
سکی۔ یہ کتاب (مقدمہ کلام آتش) انجمن ترقی اردو ہند، علی
گڑھ نے شائع کی۔

مقدمہ کلام آتش کے پہلے باب میں آتش کے
حالات زندگی بیان کیے گئے تھے اور مختلف ماخذ کی مدد سے
ان کی زندگی اجمار نے کی کوشش کی تھی۔ اس نے آتش کی
زندگی کو اس کی تمام جزئیات سمیت پیش نہیں کیا بلکہ آتش کی
زندگی کی صرف ان جزئیات کو مد نظر رکھا جو اس کے کلام کے
مطالعے میں اہمیت رکھتی تھی۔

”آتش کا فن“ کے عنوان سے تینوں ابواب میں اس
نے آتش کی شاعری کو ترقی پسند اقدار اور ادبی اقدار کے
حوالے سے جانچنے کی کوشش کی۔

اس کتاب کا پیش لفظ آل احمد سرور نے تحریر کیا۔
”یہ مقالہ حرف آخر کی اہمیت نہیں رکھتا مگر آتش کے
فکروں کی خصوصیات کو پرکھنے کی پہلی بڑی کوشش ہے۔“
ان مضامین کی پذیرائی نے اسے تنقید نگاری کی طرف
راغب کیا اور وہ آتش کی شاعری سے نکل کر دوسرے شعرا کی
طرف متوجہ ہوا۔

اس نے فراق کی کتاب ”اندازے“ پر بھی تو قدیم

شاعری کی طرف سے تہنات دور ہونے لگے۔ اسے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ جس شاعری کو وہ گل و ہل کی شاعری سمجھ کر نظر انداز کرتا رہا تھا اس میں بھی بیش بہا خزانے چھپے ہوئے ہیں۔ اس نے کلاسیکی شاعری کا مطالعہ شروع کر دیا۔ ہر مطالعے کے بعد ایک مضمون اپنے خیالات کے اظہار کے لیے تحریر کر دیا۔ یوں مختلف مضامین مثلاً غالب اور مصرعہ، بہادر شاہ ظفر ایک نئے زاویے سے، خواجہ میر درد شیعہ شاعری کے آئینے میں، داغ، کائن، مومن، جوش، آجادی، جاز کی شاعری میں عورت کا قصور جیسے مضامین نگار میں آئے۔ جسے اس نے ”فکر و فن“ کے نام سے کتابی شکل میں پیش کر دیا۔

ظہیل نے ان مضامین میں بہت سی گہری نکوئیں اور نئے مطالعے پیش کیے۔ اس کا ایک اور تنقیدی مجموعہ ”زاویہ نگاہ“ شائع ہوا۔ اس مجموعے میں تنقیدی مضامین شامل کیے گئے تھے۔ اردو تنقید کے مسائل، جگر مراد آبادی، اختر الایمان، سرسید کے ادبی تصورات، اردو شعر و ادب میں ملی گڑھ کا حصہ، اردو نظم کا نیا رنگ و آہنگ، فراق گورکھپوری، ابوالکلام آزاد کے مکاتبات۔

ان مضامین میں سے اردو نظم کا نیا رنگ و آہنگ حقیقی نوعیت کا ہے۔ اس میں ظہیل نے اردو نظم کے سلیب کی بعض کڑیوں کو دریا یافت کیا ہے جو نظروں سے اوجھل ہو گئی ہیں۔ اسی طرح ابوالکلام کے مکاتبات، سرسید کے ادبی تصورات، اردو شعر و ادب میں ملی گڑھ کا حصہ بھی حقیقی نوعیت کے ہیں مگر ان مضامین میں ظہیل کی تنقیدی بصیرت ہر جگہ جلوہ گر نظر آتی ہے۔

ظہیل کی خوبی یہ تھی کہ اس نے تنقید کو ردیاتی اور میکانیکی انداز سے نجات دلائی اور اسے ایک بالکل نئے راستے پر ڈال دیا۔

اس کا ایک مضمون ”بہادر شاہ ظفر“ ادب لطیف میں شائع ہوا ہے۔ یہ مضمون قاضی عبدالغفار کو بہت پسند آیا۔ انہوں نے رقتہ رقت اسے بلایا اور بہت تعریف کی اور کہا کہ جس نظر سے تم نے بہادر شاہ ظفر پر تنقید کی ہے وہ بالکل نئی چیز ہے اور بہت ہی قابل قدر۔ میری خواہش ہے کہ اس نظر سے ظفر کے کلام کا ایک انتخاب مرحبہ لکھو۔ اس نے اسے انجمن سے شائع کرادوں گا۔

ظہیل نے اپنا نام ترین کی لہر سے، اس میں شامل کر

لیا۔ ظفر کا ایک ایسا انتخاب کیا جو ظفر کے انفرادی رنگ و خا بر کرتا تھا۔ اس میں ظفر کے مخصوص رنگ جن کا ماحدہ تمام کلام موجود تھا۔ اس انتخاب میں ظفر کا لب و لہجہ شاہ نصیر اور ذوق کے دبستان سے الگ ہو جاتا تھا۔

اس کے بعد اس نے ”نئی نظم کا سفر“ کے نام سے ایک انتخاب مرتب کیا۔ اس نے اعتبار نقد کے نام سے فراق گورکھپوری کے کلام کا انتخاب بھی شائع کیا۔

☆☆☆

وہ کامیابی سے اپنا تعلیمی و تحقیقی سفر جاری رکھے ہوئے تھا کہ ایک غلط پالیسی نے انجمن ترقی پسندی کو مشکل میں ڈال دیا۔ آزادی کے بعد سے ہی کیونسٹ پارٹی میں بعض غلطیوں کی تہ لیاں آنے لگی تھیں۔ جب سی بی جوش کی جگہ رند پورے کیونسٹ پارٹی کے سیکریٹری مقرر ہوئے تو انہوں نے پارٹی کوئی لائن دی۔ ان کی لائن یہ تھی کہ ملک کوئی نئی آزادی ملی ہے۔ ریاستی ڈھانچا کمزور ہے اس لیے اسے آسانی سے توڑا جاسکتا ہے اور انقلاب برپا کیا جاسکتا ہے۔ یہی پالیسی انجمن ترقی پسند مصنفین پر بھی اثر انداز ہوئی۔

اس پالیسی کے تحت پنجاب، بنگال اور تلنگانہ میں کیونسٹ تحریکات کا آغاز ہوا۔ انجمن نے بھی ان تحریکات میں بھرپور حصہ لیا۔ تلنگانہ کی تحریک سب سے بڑی جوش اور بھرپور تھی۔ اس تحریک کی سرگرمیاں دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا جیسے انقلاب دروازے پر گھڑا دستک دے رہا ہے۔ جاگیرداروں کے مظالم سے تنگ آکر زمینوں پر قبضہ کر لیا تھا اور اس قبضے کی برقراری اور حفاظت کے لیے ہتھیار سنبھال لیے تھے۔ قاتلوں پر قبضہ کر لیا اور نظم و نسق کسانوں نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

اس صورت حال میں ترقی پسند ادیب خاصے بڑے جوش تھے اور انقلابی تقابلیں لکھ رہے تھے۔ ظہیل انظمی نے بھی نظم لکھی۔

آج دیکھو وہ تلنگانہ سے ایک صحیح موڈار ہوئی آج دھرتی مری گنار ہوئی آج تو جیسے ہمتا کے پہاڑوں نے کارا رہے ہیں آج تو جیسے ایلرا کے انہی کھنڈروں نے لکڑا رہے ہیں آج خمدوم کے ہاتھوں میں دیکھے ہوئے سورج کا مسین پرچم ہے حکومت نے تلنگانہ کی تحریک کو سختی سے کچلنے کا حکم دے

دیا۔ اس حکم کے تحت انجمن ترقی پسند مصنفین کو بھی خلاف قانون قرار دے دیا گیا اور پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ اس کی زد میں انظمی بھی آیا۔

ظہیل اور باقر مہدی ان دنوں جذبی کے مکان کے ایک ہرونی کمرے میں رہتے تھے۔ اس روز بھی وہ حسب معمول اسی کمرے میں تھے اور سوئے ہوئے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ باقر کچھ کچھ جاگ رہا تھا۔ پولیس والوں نے ظہیل کو دریا یافت کیا۔ یہ آواز اتنی بلند تھی کہ ظہیل بیٹھ پڑا۔ اس نے بکس میں کپڑے اور چند کتابیں رکھی اور باہر نکل کر پولیس کی جیب میں جا بیٹھا۔ اس نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ باقر پولیس والوں سے الجھ رہا ہے۔ اسے بھی مزاحمت کرنی چاہیے تھی۔

باقر نے اسے جیب میں بیٹھے ہوئے دیکھا۔ کچھ دیر تو باقر کی بکس میں کچھ نہ آیا۔ پھر جیسے اسے ہوش آگیا ہوا اس نے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ ترقی پسند زعمہ ہاد۔ ظہیل زعمہ ہاد۔ انقلاب زعمہ ہاد۔ ظہیل کی جانب سے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا گیا۔ اس نے کسی نعرے کا جواب بھی نہیں دیا۔ بس وہ حیرت و سرست سے باقر کو دیکھ رہا تھا۔

باقر نے اسی رات ظہیل کی گرفتاری پر نظم لکھی۔

دوسرے روز پونہ رسی کے انجمن رنگ ہل میں ہوا۔ وہاں باقر نے یہ نظم پڑھی۔ اس جلسے میں ظہیل کو لڑائی نہیں لگائی گئی اور اسے سیاسی شہید کا درجہ دیا گیا۔


ظہیل گرفتار ہو کر جیل جا چکا تھا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ ظہیل بی اے کے امتحان میں کیسے شریک ہو۔

ڈاکٹر ذاکر حسین ملی گڑھ جیل کے معائنے کے لیے آئے تو باقر مہدی چند دیگر طلبہ کے ساتھ ڈاکر حسین ملے کے لیے گیا۔ ڈاکر صاحب واپسی کے لیے اپنی گاڑی میں بیٹھ بیٹھے تھے کہ باقر نے ان سے سوال کیا، کیا ظہیل کو امتحان میں بیٹھنے کی اجازت ملے گی؟ ڈاکر صاحب نے سنی ان سنی کر دی اور کار میں بیٹھنے لگے۔ باقر نے ان کا راستہ روک لیا۔

”آپ اتنا کرم کریں کہ ظہیل کو امتحان میں شرکت کی اجازت دلا دیں۔“ ڈاکر حسین کوئی جواب دیے بغیر واپس پلے جیل میں گئے اور جیلر سے مل کر واپس آئے۔

”آپ فکر نہ کریں۔ ظہیل کو امتحان میں شرکت کی اجازت مل جائے گی۔“

جاسوسی ڈائجسٹ



دیکھتے جن کی گرم ہوا میں
جانفزا جاسوسی کی شغلی فضا میں

● **نبیلا دائرہ**
کی شہنی خیز داستان **امجد رفیس** کی تلاش میں ابولہب جو لانے والوں

● **انگاریے**
شریف کئی کو بدحاش بنے پر جو کچھ دینے والے قانون جنس منہ کی یکمائی
جسے لینے والے ہڈیاں سلسلہ **ظاہر جاوید مغل** کے قلم سے

● **آوارہ گرد**
چلچلاتی دھوپ میں بے آسرا تہا سفر کی آبلہ پانی...
عبدالرب بھٹی کی طبع آزمائی

● **سورق کی کھانا نیال**

● **بھلا رنگ**
رگ دے میں اچھل چاہیے والے رنگ تکراروں کی جلیب سا زیاں

● **دوسرا رنگ**
کابل کی ہونہر نیوی معاملات میں کاسیال کار شیکر نظروں کی تہہ جگر نیل

● **آوارہ گرد**
چلچلاتی دھوپ میں بے آسرا تہا سفر کی آبلہ پانی...
عبدالرب بھٹی کی طبع آزمائی

● **سورق کی کھانا نیال**

● **بھلا رنگ**
رگ دے میں اچھل چاہیے والے رنگ تکراروں کی جلیب سا زیاں

● **دوسرا رنگ**
کابل کی ہونہر نیوی معاملات میں کاسیال کار شیکر نظروں کی تہہ جگر نیل

حال میں کہ مالی حالات بھی اس کے حق میں نہیں تھے۔ اس پر کئی کئی دقت کے فاقے گزر رہے تھے اور وہ سیاسی تقصیریں لکھ لکھ کر نوجوان طبقے کو اپنے حق میں ہموار کر رہا تھا۔

جب رام پور میں سخت گیر ریاست میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ قائم کرنے کا سوال آیا تو سب پر گھبراہٹ طاری تھی۔ شاد عارفی نے عبدالحی تاپاں کی معرفت یہ بظاہر نامکن کام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور یہ شاخ رام پور میں قائم ہوئی۔ اس کے تحت چلے ہوئے گئے۔ اس کی نظمیں اس ماحول میں آگ لگنے لگیں۔

یہ ماحول صاحب غلیل نے رام پور کی زمین پر قدم رکھا۔ جاوید کمال کے گھر پہنچے ہی اس نے شاد صاحب سے ملنے کی ضد شروع کر دی۔ جاوید کمال اسے لے کر نکلا اور کئی پتلی پتلی گھوٹوں سے گزرنے کے بعد وہ مطلوبہ مکان پر پہنچ گیا۔

شاد صاحب باتوں کی کھری چار پائی پر لینے ہوئے تھے۔ جتنے کی نے منہ سے کئی ہوتی تھی۔ فرخ پر شاگرد ”چوسر“ کہنے میں مصروف تھے۔ مگر کی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔ کچھ تو ناچھوٹا فرنیچر اور چار پائی تھا باقی سنانے کا راج تھا۔ غلیل کو ان کی حالت دیکھ کر افسوس ہوا کہ اتنا بڑا شاعر اور اس حال میں۔

غلیل کے پہنچنے اور تعارف ہونے کے بعد باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ شاگردوں نے چوسر لپیٹ کر کھڑی۔ غلیل کو یہ چٹیاں رام پور میں گزرائی تھیں۔ وقت ہی وقت تھا۔ لہذا شاد صاحب سے طویل ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

شاد نے بعض قدیم شعرا کے بارے میں غلیل کے تعصبات کو بہت حد تک ختم کر دیا۔ وہ باتوں باتوں میں ذوق، داغ، امیریت اور نظام رام پور کی دیگرہ کے ایسے ایسے شعر سناتے اور ان کے نکات بیان کرتے کہ غلیل کو قائل ہونا پڑتا۔

چند ملاقاتوں کے بعد غلیل نے ان سے درخواست کی کہ وہ اسے اپنا شاگرد بنالیں۔ پہلے تو وہ انکار کرتے رہے لیکن جب وہ بعد ہوا تو فرمایا۔ ”اچھا اپنی بیاض لاؤ۔“ یوں غلیل، شاد کا شاگرد بن گیا۔

☆☆☆

ان دنوں ڈاکٹر ذاکر حسین مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر تھے۔ انہیں پنڈت نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد

کی سرپرستی حاصل تھی۔ پنڈت نہرو اور ان کی حکومت کی کیونسٹوں نے ہزار کرکھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے پنڈت نہرو کی مرضی کے مطابق پانچ لاکھوں کو یونیورسٹی سے نکال باہر کیا۔ بعض نام زیر غور تھے۔ ان میں غلیل کا نام بھی تھا۔ رشید احمد صدیقی کو مظلوم ہوا تو وہ ڈاکٹر صاحب سے ملے اور انہیں باور کرایا کہ یہ لاکھ شیعہ اردو کا خیر ہے۔ آئندہ جاکر یونیورسٹی کا نام بلند کرے گا۔ اگر اسے نکال دیا گیا تو ہم ایک جوہر قاتل کو مٹی میں ملا دیں گے۔

یوں خطرہ ٹل گیا اور غلیل یونیورسٹی میں نکارہا۔ غلیل کی سرگرمیاں جاری رہیں اور بالآخر ایم اے کا امتحانی امتیاز سے پاس کیا۔

یہ ایسی ڈگری تھی کہ اس کے بعد وہ علی گڑھ سے باہر پیکر رشپ حاصل کر سکتا تھا۔ کئی جگہوں سے خطوط بھی آئے جن میں اس کو پیکر رشپ کی پیشکش کی گئی تھی۔ کچھ دوستوں نے یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ پاکستان چلا جائے وہاں اردو کے لیے سنہری مواقع ہیں۔ وہ اکیلا ہی نہیں بلکہ تھا تھا۔ مگر سے نکلنے کے بعد لوٹ کر نہیں گیا تھا۔ کسی بھائی سے کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ پاکستان ہجرت کر جانے میں کوئی چیز مانع نہیں تھی لیکن رشید احمد صدیقی نے ختم دیا کہ وہ مسلم یونیورسٹی کزنٹ کی ایڈیٹر شپ قبول کر لے۔ رشید صاحب کے اس پر بڑے احسانات تھے۔ وہ ان کا حکم ٹھکرا نہیں سکتا تھا۔ اس نے تمام مواقع نظر انداز کر کے ڈیڑھ سو روپے ماہوار کی یہ نوکری قبول کر لی۔

غلیل نے چارج سنبھالنے ہی کزنٹ کو انتہائی جدلیوں سے روشناس کیا۔ اس سے پہلے کزنٹ میں رجسٹرار آفس کے نوٹس وغیرہ چیتے تھے۔ غلیل نے اس میں ادب کو بھی شامل کیا اور اس کا معیار بلند کرنے کی کوشش کی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی یہ جدلیاں علی گڑھ تحریک کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوں گی لیکن یہ سلسلہ ایک سال سے زیادہ نہ چل سکا۔ اس کا کیونسٹ پارٹی پر پسند ہونا یہاں بھی آڑے آیا اور لوگوں نے اسے استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا۔ اس نے رشید احمد صدیقی کے نام خط لکھا اور ملازمت چھوڑ دی۔

”میں نے خود اپنے لیے ایک سزا تجویز کی ہے وہ یہ کہ مجھے اس ملازمت سے سبکدوش فرمایا جائے یہ اقدام آپ کے لیے بھی مفید ہوگا اور میرے لیے بھی۔ آپ کزنٹ کے لیے ایک معقول ایڈیٹر تلاش کر سکیں گے اور میں اپنے

لیے ایک بہتر ملازمت۔“

ملازمت چھوڑنے کے بعد وہ ایک ایسے معاشی بحران میں مبتلا ہو گیا جس سے کئی سال تک اس کا چچا نہیں چھوٹا۔ لڑائے کی رہائش گاہ چھوڑنی پڑی کہ کرایہ ادا کرنے کے لیے رقم نہیں تھی۔ تھک ہار کر اپنے دوست ابو سعید زیدی کے ساتھ ہاشل میں رہنے لگا۔ رہنے لگا کیا کہ بس دن بھر زینیں تاپنے کے بعد شام کو ہاشل میں آ جاتا تھا۔ اس کی حالت دیوانوں جیسے ہو رہی تھی۔

پھر ایک دن علی گڑھ کی سڑکیں اسے دیکھنے کو ترس گئیں۔ احباب فکر مند تھے کہ دیوان کہاں چلا گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ اپنی چٹائی پر اور قلمی دنیا میں قسمت آزمائی کر رہا ہے۔ ان دنوں غلیل کی فانی دنیا ہر شاعر کو گھلے اکا رہی تھی لیکن اس کی ملازمت اس میں اتنی تھک و دو کہ بعد میں وہ ناکام باہر آئی۔ وہ تو لائنیں لے لے اس کی ملاقات حنیف ناشاد سے ہوئی۔ وہ خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ مسیحی ماہنامہ ”ماہنامہ“ کو تھا کہ حنیف ناشاد اسے کام کا آدمی دیکھ کر اپنے ساتھ ٹھائی بہار کے ایک دور افتادہ گاؤں میری کھجی لے گئے۔ اس دوست نے اسے غلط راہ پر ڈال دیا۔ اسے اب ڈوش کی بات پڑ گئی۔

اس دوست کے نام سے غلیل نے کئی خوب صورت نظمیں چھپوائیں یا اسے لکھ کر دیں جو ہمیشہ کے لیے اس کی بات بن گئیں۔

علی گڑھ میں اس کی تلاش ہو رہی تھی۔ دوستوں کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ بالآخر رشید احمد صدیقی نے اسے دھوکہ کھلا اور علی گڑھ میں شعبہ اردو میں ایک پوسٹ پر اسے بلالیا۔ اس وقت شعبے میں دو بامیاں تھیں، ایک مشتعل اور ایک عارضی۔ خیال تھا کہ نایل کا تقرر مستقل اسامی پر ہو جائے گا لیکن آل احمد سرور نےصوبے محمد حسن کو لے آئے اور مشتعل جگہ پر محمد حسن کا تقرر ہو گیا اور غلیل کو عارضی جگہ ملی جو رشید الاسلام کی رخصت کی جے سے خالی ہوئی تھی۔ (بعد میں وہ مشتعل پیکر ہو گیا)

یہ ملازمت عارضی تھی لیکن خوشی اسلام پانچ سال کے لیے انگشتان گئے تھے اس لیے اسے ایک گونہ اطمینان حاصل تھا۔ اس کی آوارگی میں بھی کمی آئی۔ بیروں میں ایک ایسی ہی پڑ گئی تھی۔ اپنے مرتبے کا پاس تھا اپنی ذمہ داریوں کا ناطہ۔ اب وہ سیاست سے کاٹا لائق ہو چکا تھا۔ معاشی حالات نے اسے نئی زندگی عطا کر دی۔

اس ملازمت کا ایک نقصان بھی ہوا۔ اس پر تخلیقی جمود سا طاری ہو گیا۔ بہت دن سے کوئی نظم، کوئی غزل، کوئی شعر نہ ہو سکا تھا کہ ایک رات ایسا ہوا کہ سوتے میں اس کی آنکھ کھل گئی۔ جس طرح بھوک لگتی ہے اسی طرح ایک نظم نے اسے جگا دیا جو ابھی لکھی نہیں گئی تھی۔ تخلیقی چشمہ پھوٹا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے کاغذ قلم سنبھالا اور لکھنے بیٹھ گیا۔ اسے سوچا ہی نہیں پڑا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے مصرعے خود بخود چلے آ رہے ہیں۔

ختم مکمل ہوئی تو عنوان بھی خود بخود چلے ہوا۔ ”نیا نظم“

اس نظم کے بعد شعری سلسلہ شروع ہو گیا۔ پے پے پے نظمیں ہونے لگیں۔

دو سال بعد 1955ء میں جب اس کی نظموں کی تعداد بہت کم تھی اس نے اپنی بعض باتنامہ اور مکمل منظومات اور تازہ کلام مرتب کر کے ”کاغذی جہیز“ کے نام سے شائع کر دیا۔ اس مجموعے میں اس نے اپنی کوئی سیاسی نظم شامل نہیں کی۔ وہ ان نظموں کو اپنی ناجائز اولاد قرار دے رہا تھا۔ یہی اس کا ”نیا ختم“ تھا۔

اس مجموعے میں شامل اس کی یہ نظمیں اس کی انفرادی روح کی داستان تھیں۔ ایک خود نوشت سوانح تھی، ایک آئینہ تھیں جن میں اس کی شخصیت پہچانی جاتی تھی۔ یہ مجموعہ یادوں اور خوابوں کا حسین مجموعہ تھا۔ ان نظموں کا رد و مانوی لب و لہجہ اسے نوجوانوں کا پسندیدہ شاعر بناتا تھا۔

مری داستانوں کے دلچسپ کردار سنان گھوٹوں کے رنگین قصے یہ سب میرے پیچھے چلے آ رہے ہیں کہ جیسے کوئی روٹھے ہوئے آدمی کو مٹا کے بڑے پیار سے تھپ تھپائے

.....

تیرے اک جانے پر..... لیکن میرا یہ کیا حال ہوا ہے اپنے آپ سے میں روٹھا ہوں میرا دل خود مجھ سے خفا ہے میرے کان بھی مری باتیں مجھ سے آج نہیں سنتے ہیں مگر میں اتنی تاریکی ہے آنکھیں ساتھ نہیں دیتی ہیں

مختلف غذاؤں کی مختلف اقسام کھانے

کوئی ایک غذا ہمارے جسم کی تمام ضروریات کو پورا نہیں کر سکتی، اس لیے صحت مندر بننے کے لیے ہمیں ملی جلی غذا لینا ہونی چاہیے۔ مختلف غذاؤں کا مختلف اجزاء ان کے مرکب مہیا کرتی ہیں۔ قسم قسم کی غذاؤں کا مرکب ان تمام ضروری اجزاء کو حاصل کر سکتے ہیں جن کے بغیر جسم کی نشوونما اور قوت مدافعت پیدا نہیں ہو سکتی۔

روٹی، چاول، دلیے اور آلو جیسی نشاستہ دار غذاؤں ہمارے باقاعدہ اور بے قاعدہ کھانوں کا اہم جزو ہونی چاہئیں۔ یہ غذاؤں توانائی کے ساتھ ساتھ وٹامن، پروٹین، ریشر اور معدنیات فراہم کرتی ہیں اور بہت کم چکنائی دیتی ہیں۔ اگر ان غذاؤں کے ساتھ ہم چکنائی یا شکر شامل نہ کریں تو یہ بڑی مقدار میں کیلوریز بھی مہیا نہیں کرتیں۔

مرسلہ: نوید اصغر۔ سرگودھا

جانے پر آمادہ کر لیں گے۔

خلیل جشن میں شریک ہونے کے لیے ہمیں کیا تو جشن کی تقریب میں مولانا دونوں (خلیل اور پرواز) کو ایک طرف لے گئے۔ درمیان میں وہ چل رہے تھے اور دونوں طرف دونوں بھاٹی تھے۔ مولانا نہایت مخلصانہ نصیحتیں کر رہے تھے۔ قرآن وحدیث کے حوالے دے کر ”قطع رحمی“ کے خلاف تقاریر کر رہے تھے۔ نہایت جذباتی انداز میں گھر کی یاد دل رہے تھے۔ ماں کے حقوق بتا رہے تھے۔

اس تقریر نے خلیل کے دل پر اثر کیا اور اس نے اپنے رویے پر نظر ثانی کرنے کا وعدہ کیا۔ جشن کی تقریب ختم ہوئی تو خلیل نے اپنے بھائی سے ملاقات کی۔ معافی طلبی ہوئی۔

”میں گھر کی کچھ زیادہ خدمت تو نہیں کر سکتا۔ ہاں اپنے تمام بھائیوں کی اولاد کی تعلیم کی ذمہ داری لیتا ہوں۔“

پرواز اصلاحی اس پیشکش سے بھی خوش ہوئے اور اس خیال سے بھی کہ خلیل کا دل بھائیوں کی طرف سے صاف ہو گیا۔ ابھی اتنا ہوا ہے جلدی وہ گھر (گاؤں) آئے گا اور دوسرے رشتہ داروں سے بھی ملے گا۔

پرواز اصلاحی گھر گئے تو خاندان والوں سے اس

اے مرے سن و سال کے حاصل میرے آئین کے نویدیدہ گلاب میرے معصوم خواب کے ہم شکل میری مریم کے سائے شاداب صبح حقیقی کا سلام تجھے زندگی تجھ کو کہتی ہے آداب اے مری روح فن کے عکس جمیل تجھ کو میری سی زندگی نہ ملے جو نہ میں ہو سکا وہ تو ہو جائے کاش تو میرا جانشین نہ بنے میں تصور میں بھی جہاں نہ گیا ان دیاروں میں تیرا نام چلے

(اپنے بچے کے نام) اسی سال اس کا تنقیدی شاہ کار یعنی آتش پر اس کا سلسلہ مضامین ”مقدمہ کلام آتش“ کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ بھی کئی تنقیدی تخلیقات شائع ہوئیں۔

☆☆☆

ہمیں میں اعجاز صدیقی اپنے رسالے ”شاعر“ کا جشن منا رہے تھے۔ خلیل کا جو تعلق رسائل و جرائد سے تھا انہیں اور اس کی شہرت کو مدنظر رکھتے ہوئے خلیل کو بھی اس جشن میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ غالباً اعجاز صدیقی کو یہ احساس تھا کہ خلیل کے تعلقات اس کے گھروالوں کے ساتھ خوش گوار نہیں ہیں اور یقیناً یہ احساس بھی رکھتے ہوں گے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے گھروالوں سے اس کے تعلقات ٹھیک کرادیں۔ خلیل کے بڑے بھائی پرواز اصلاحی ان دنوں ہمیں میں مقیم تھے۔ اعجاز صدیقی نے انہیں بھی مدعو کیا۔ صلہ صفائی کے لیے مولانا محمد خاں شہاب مالیر کو ٹلوی سے درخواست کی۔ مولانا نے پرواز اصلاحی سے ملاقات کی اور خلیل کے ساتھ گھروالوں کی نجاتی کے بارے میں دریافت کیا۔ پرواز نے جواب میں خلیل کے بن باس کی ساری کٹھنا سنا دی۔ خلیل آخری بار 49ء میں گاؤں گیا تھا۔ اور اب 62ء آ گیا تھا۔ خلیل نے گاؤں کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا تھا جبکہ اس کی ماں ابھی زندہ تھی۔ اسے ماں کی محبت بھی گاؤں نہ ملے جا سکی تھی۔ وہ اپنے بھائیوں خاص طور پر سوتیلے بھائیوں سے سخت ٹالنا تھے۔ مولانا نے تمام حالات سننے اور پرواز سے وعدہ کر لیا کہ وہ خلیل کو گھر

کے گھر آئیں گے۔ خلیل کا رشتہ اپنے گھروالوں سے ایسا ٹھنکا تھا کہ اس شادی میں بھی اس کے خاندان کا کوئی فرد شریک نہ ہوا۔ شادی میں چند دوستوں کے سوا کوئی شامل نہ تھا۔ شادی کا تجربہ اس کے لیے معقول اور مفید ثابت ہو اور اس کی زندگی اطمینان سے گزرنے لگی۔ اطمینان ہوا تو بہت سے تحقیقی کام بھی انجام دیے جانے لگے۔ ”مجھے خوشی ہے کہ نہ صرف مجھے راشدہ جیسی بیوی ملی جو میری زندگی کو سنوار دے گی بلکہ پورا خاندان شرافت اور محبت کا ایسا نمونہ ہے جس کی اس دور میں مثال نہیں ملتی۔ مجھے وہ سکون ملا ہے جو مجھے اپنے وطن کی مٹی میں نہ ملے گی۔“ اس شادی نے اسے سکون بھی دیا اور نظم و ضبط بھی سکھایا۔ اس دور میں جو نظمیں اس نے لکھیں ان میں بھی زندگی کی خوشیاں جھلکے پڑ رہی تھیں۔

چھوٹا موٹا مگر خوب صورت سا گھر گھر کے آئین میں خوشبو سی پھیلی ہوئی منہ دھلائی سویرے کی پہلی کرن سائیاں پہ امرتیل مہکی ہوئی کھڑکیوں پہ ہواؤں کی آغلیاں روزن در سے چمکتی ہوئی ردنی شام کو باہا باکا سالستا دھواں ہاں پڑے کے بٹنی ہوئی لکشی اب انٹہ میں کوئے دیکتے ہوئے بڑوں کی سہانی دھر راگنی

(سایہ دار) اسی گھر بلی سکون کا نتیجہ تھا کہ اس نے شادی کے صرف ایک سال بعد ہی ”ترقی پسند ادبی تحریک“ کے موضوع پر مقالہ لکھ کر ٹی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور خلیل الرحمن اعظمی سے ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی ہو گیا۔

یہ پچاس سالہ تاریخ کا نہایت پھیلا ہوا موضوع تھا لیکن خلیل نے اسے نہایت خوب صورتی سے سینا اور تاریخی حقائق کا حق ادا کر دیا۔ اسی لیے اس مقالے کو ترقی پسند تحریک کے حوالے سے بھی اور اردو کے تحقیقی و تنقیدی سرمائے کے حوالے سے بھی خاصا اہم قرار دیا گیا۔

1959ء میں اس کا بیٹا کامران خلیل پیدا ہوا۔ وہ خوشی سے مجموعہ انشا اور ان اشعار کے ذریعے اس کا استقبال کیا۔

سارے روزن سارے در پہ سج سب دروازے بند پڑے ہیں اس کی زندگی کا لالہ ابالی پن ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ رات گئے سڑکوں پر گھومنا اب بھی اس کا مشغلہ تھا۔ جب شہر سو جاتا تو وہ سڑکوں پر نکل آتا۔ سنانوں میں سنا بن کر گھومتا رہتا۔ مکتانٹا رہتا، شہر کہتا رہتا۔ سگریٹ پر سگریٹ چھونکتا رہتا۔ کب گھر لوٹنا ہے گھر سے نکل کر بھول ہی جاتا تھا۔ 1957ء کے ایک مہینے کی کسی تاریخ کا قصہ ہے کہ سہیل عظیم آبادی نے اپنی آمد کی اطلاع دی۔ وقت بھی بتا دیا اور یہ تاکید بھی کر دی کہ وہ گھر پر رہے۔ خلیل حسب معمول گھر سے نکلا تو وہ ابھی کا راستہ ہی بھول گیا۔ وہ رات گئے واپس آیا تو سہیل چند روز سے اس کا منتظر تھا۔ خلیل کو اپنی کوتاہی پر شرمندگی ہوئی۔

اس رات کو تو سہیل نے مناسب نہ سمجھا کہ اس سے کوئی بات کرے لیکن صبح ہوئی تو سہیل نے اسے سمجھایا۔ ”تمہاری یہ حالت اس لیے ہے کہ تمہاری زندگی کا مرکز نہیں ہے۔ جب تک تمہاری شادی نہیں ہو جاتی تمہاری حالت سدھرنے والی نہیں۔“

”میری جان یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آنے والی ایسی ہو جو میری آوارگیوں میں حریف اضافہ کر دے۔“

”ایسے اندیشے کیوں پالتے ہو؟“

”مجھ اکیسے، خلیل کو بھی دے گاؤں؟“

”یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ تمہارے لیے لڑکی میں ڈھونڈوں گا۔“

”ٹھیک ہے تم کوشش کرو۔ میں تیار ہوں۔“

خلیل کو یا تو شادی کا خیال تک نہیں آیا تھا یا اب اتنا سنجیدہ ہو گیا کہ سہیل کو خط لکھ کر بار بار یاد دہانی کرانے لگا۔

”آپ میری شادی کے معاملے میں ابھی تک سست رفتاری سے کام لے رہے ہیں۔ دیکھیے اگر کریوں میں میرا معاملہ کہیں نہ کہیں انجام کو پہنچا دیتا..... میں اس زندگی سے بہت گھبرا گیا ہوں۔ میری شادی مٹی کے آخر میں ہو جانی چاہیے۔“

سہیل نے یہ سنجیدگی دیکھی تو پہلی ہی محبت کے حکیم محفوظ الدین کی صاحبزادی راشدہ مریم سے اس کا رشتہ طے کر دیا۔

راشدہ مریم 12 نومبر 1957ء کو رخصت ہو کر خلیل

ملاقات کا ذکر کیا۔ یہ خوش خبری بھی سنا کی کہ غلیل جلد ہی گاؤں آئے گا۔ ماں کو تسلی دی۔ غلیل کی شادی کے بارے میں بتایا۔ اس پیشکش کو بھی دہرایا کہ غلیل نے اپنے بچہ کیوں تعلیم کی ذمہ داری قبول کی ہے۔

اس پیشکش کا پہلا فائدہ غلیل کے بھائی مولانا عزیز الرحمن نے اٹھایا۔ وہ اپنے بیٹے طارق عزیز کو لے کر غلیل کے پاس آئے اور اپنے بیٹے کو طے گڑھ میں پڑھانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ وقت کتاب بدل گیا تھا۔ جو لوگ غلیل کو علی گڑھ بھیج کر مخالفت کر رہے تھے وہی اب اپنے بچوں کو علی گڑھ بھیج رہے تھے اور اس کی سفارش ڈھونڈ رہے تھے۔ غلیل نے یہ درخواست خوشی سے قبول کی۔ اسے کالج میں داخلہ بھی دلویا اور اپنے گھر میں رہنے کے لیے جگہ بھی دی۔

غلیل کی اپنے بھائیوں سے تعلق کی تجدید ہو گئی تھی مگر اس کی بوزمی والدہ ابھی تک اسے دیکھنے کو ترس رہی تھیں۔ ان کی مانتا ٹھنڈی ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ غلیل اپنے معاملات میں الجھا ہوا تھا۔

☆☆☆

غلیل کی شاعری کا جو سرچشمہ میں شروع ہوا تھا اور کاغذی پیر بن تک پہنچا تھا۔ نیا عہد نامہ میں یہ تہائی کسی قدر کم ہونی دکھائی دی لیکن معاشرتی اقدار کی نوٹ بھوٹ کی گونج صاف سنا کی دینے لگی۔

اس مجموعے کے آتے آتے وہ ترقی پسندی سے تائب ہو چکا تھا۔ اس طرح پہلی تبدیلی تو یہی تھی جو اس کے موضوعات اور ڈکشن میں نظر آنے لگی۔

اس مجموعہ کی ابتدائی چار نظمیں موضوعاتی سطح پر ”کاغذی پیر بن“ ہی کو دہرائی تھیں وہی گاؤں چھوڑنے کی یاد اور وہی انفرادی و تہائی۔ اس کے باوجود فی سطح پر خوشگوار تبدیلی کا احساس ہوتا تھا۔ اس نے اس مجموعے میں خود کو جذباتیت سے الگ کر لیا تھا۔ اس نے اس کے لیے ”ایبزر“ کا سہارا لیا۔

نئے نئے کتے جتنو میری بیگلی پکڑوں کے
بچے دیے کی لورہ کر آدمی آدمی راتوں کو
اپنی گہری نیند سے جیسے چونک اٹھتی ہے بول اٹھتی ہے

آشاؤں کے سند رکھوے پر لالی سی آجاتی ہے
غلیل کی نظمیں ”بیمردوں“ آچل کی چھاؤں میں

”سایہ دیوار“ اور اپنے بچے کے نام ایک نئے موضوع آ پیش کرتی تھیں اور صاف بتا رہی تھیں کہ شادی کے بعد وہ جن کیفیات سے گزرا تھا اس کو اس نے تخلیقی وجہ دے دے ہے۔

اگر پرانا موضوع اختیار بھی کیا تو اسے وسیع تناظر سے ہٹنا کر کے قابل توجہ کر دیا۔ مثلاً گھر سے جدائی اس قدیم موضوع تھا لیکن اب وہ اسے ”بن پاس“ کہہ کر زیادہ وسیع کر دیتا ہے۔

میرا یہ جرم کہ میں صاحب اور اک و شعور
میرا یہ عیب کہ اک شاعر و فنکار ہوں میں
مجھ کو یہ خد کہ میں سر نہ جھکاؤں گا کبھی
مجھ کو اصرار کہ جینے کا سزاوار ہوں میں
مجھ کو یہ فکر کہ میں حق و صداقت کا امین
مجھ کو یہ زعم خود آگاہ ہوں خوددار ہوں میں

.....
اس مجموعے میں اس کی ذاتی تہائی صنعتی عہد کی تہائی میں تبدیل ہو گئی جس میں تعلقات ضرورتوں کی بنیاد پر ہیں۔

آتے ہیں بہت سے آنے والے
کچھ اجنبی کچھ رفیق و ہم
لیکن کئی سال مجھ سے گزرے
سننے کے لیے ترس گیا ہوں
دستک کے جواب بھی جانتی ہو
وہ نام جو میرا پیار کا ہے
(رفنگاں)

غلیل نے نیا عہد نامہ میں اپنی آواز کو پالیا اور وہ جدید نظم کے کئی کامیاب نمونے تخلیق کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ان نمونوں میں جذباتیت نہیں ٹھہراؤ اور فکری گہرائی تھی۔

☆☆☆

رسائل و جرائد سے غلیل کا تعلق بہت پرانا تھا۔ 54ء میں علی گڑھ کے بعض اساتذہ نے مل کر ایک ادبی جریدہ شائع کیا اس کا نام فکر و نظر رکھا گیا۔ غلیل اس کی مجلس ادارت میں شامل تھا۔

”فکر و نظر“ کے علاوہ بھی بہت سے دوسرے رسائل میں بھی معاونت کرتا رہا۔ ان میں بعض مکالمات رسائل بھی تھے۔ معاونت کے علاوہ کالم نویس بھی کی۔ یہ کالم آل احمد سرور کی دعوت پر انجمن کے رسالے ہماری زبان میں لکھے

گئے۔
 مذہبی سرگرمیوں کا سڑکنا ہوا وہ ریلوے کے عہدے تک پہنچ چکا تھا کہ 1970ء میں اس نے خاندان والوں کے بے حد اصرار پر گاؤں جانے کا ارادہ کر لیا۔
 اب اس کے حالات ایسے نہیں تھے کہ خالی ہاتھ چلا جاتا۔ اس نے گاؤں جانے کا ارادہ کرتے ہی تیاری شروع کر دی۔ اپنی والدہ، بھائی، بھادج اور بچوں کے کپڑے بنوائے۔ تولیے، چادریں، چائے کے ڈبے، چائے کا سینٹ غرض جتنا ممکن ہو سکنا تھا سامان لے کر گیا۔ اپنی مسجد کے امام کے لیے خوب بڑا سا کرتہ بنوایا۔ مدرستہ الاصلاح کی لائبریری کے لیے بہت سی کتابیں لے کر گئے۔
 وہ جب طویل بن ہاں کے بعد گاؤں لوٹا تو اس کے بھائی عزیز الرحمن سرائے میر کے انٹیشن پر گاؤں کے کچھ لوگوں کے ساتھ استقبال کے لیے موجود تھے۔
 گاؤں پہنچا تو وہاں کے استقبال کا تو کچھ ٹھکانا ہی نہیں تھا۔ رشتے داروں کا یہ حال تھا کہ واری صدقے ہو رہے تھے۔ یہ وہی رشتہ دار تھے جو طالب علمی کے زمانے میں اسے منہ لگا کر اوار نہیں کرتے تھے۔ جب وہ طالب علم تھا تو اس کے ایک رشتہ دار علی گڑھ آئے تو اس سے ملنا تک گوارا نہ کیا تھا۔ صرف اس لیے کہ اس وقت اس کی کوئی پوزیشن نہیں تھی اور نہ یہ امید تھی کہ وہ بھی اعلیٰ عہدے پر پہنچے گا۔ اب وہ علی گڑھ یونیورسٹی جیسے ادارے کا پڑھتا۔ پورے ملک میں اس کی شہرت تھی۔ اب وہ ادارہ گرد نہیں قابلِ عزت شوہر تھا۔ اس کی بیوی اس کے ساتھ تھی اب وہ تین بچوں کا قابلِ احترام باپ تھا۔ اب وہ لوگ بھی اسے اپنا رشتہ دار ثابت کر رہے تھے جو رشتہ دار نہیں تھے۔ اس نے اس منافقت پر بعد میں ایک نظم لکھی۔

جی میں آتی ہے
 ان محروں پر ہنسوں
 ان سے کہہ دوں کہ تم کو کھیلے ہو
 اپنی کرسی پہ بیٹھا ہوا کوئی احمق
 اونٹ کی طرح بلبلانے
 تو کہہ دو کہ کیا بک رہے ہو۔

وہ پورے اٹھارہ سال بعد گاؤں آیا تھا۔ خوشامیوں میں گھر اضرور لیکن اس مسند میں ماں کی جگہ محبت کا جزیہ بھی تھا۔ اک وہی تھی جس کی محبت میں خوشامیوں نہیں تھی۔ بیٹے کو دیکھ کر جو آنسو آنکھوں میں آ گئے تھے وہ بھی سچے تھے۔

کب کے ترے ہوئے ہونوں پر جو جلی آئی تھی وہ بھی جگہ تھی۔
 غلیل جب تک گاؤں میں رہے ماں کی محبت سے سرشار ہوتے رہے۔
 یہ غلیل کی خوش قسمتی تھی کہ ماں کی عمر میں برکت ہوئی اور عرصہ دراز کے بعد انہیں دیکھنا نصیب ہوا۔ ماں بھی شاید اسی انتظار میں زندہ تھیں۔ وہ گاؤں سے لوٹا تو چند مہینے بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ اس کے ایک سال بعد ہی اس کے بیٹے بھائی مولانا عزیز الرحمن بھی فوت ہو گئے۔ ان دونوں مواقع پر غلیل گاؤں پہنچا اور تعزیت کی۔ اس کے بعد وہ بھی گاؤں نہیں گیا۔

علی گڑھ واپس آنے کے بعد اس نے ماضی کی کھوج میں پیچھے پلٹ کر دیکھا تو پائل کے کمروں، خالی سڑکوں اور کرائے کے مکانوں کے سوا اسے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ وہ اب بھی کرائے کے مکان میں رہ رہا تھا۔ یہ پچھلے اٹھائیس برس کی کہانی تھی جو کسی ایک مکان میں رہ کر نہیں سنی جا سکتی تھی۔ اس نے ابھی تک اپنا ذاتی گھر نہیں بنایا تھا۔ اسے غالب یاد آئے، اپنے استاد شاد عارفی یاد آئے، غمزدہ نہ غالب تھا نہ شاد عارفی۔ اسے بچوں کے لیے ایک گھر کی ضرورت تھی جو اس کا اپنا ہو۔ اس کے بعد اس کے بچوں کو وہاں سے اٹھ کر کہیں اور جانا نہ پڑے۔ 1973ء میں اس نے سرسید محفل گڑھ میں زمین خریدی اور ذاتی مکان کی تعمیر کا ارادہ کیا۔ اس کے سنگ بنیاد کے لیے اس نے اپنے استاد رشید احمد صدیقی سے فرمائش کی۔ رشید صاحب نے معذرت کر لی۔ انہوں نے اپنی بیماری کے سبب نہ صرف معذرت کی بلکہ ایک مشورہ بھی دیا۔

”جامعہ ملیہ اسلامیہ کی پہلی جولائی کے موقع پر جب ہندوستان بھر کے اکابرین کا ایک اجتماع ہوا تو اگر صاحب نے جامعہ کی کسی بہت بڑی عمارت کا سنگ بنیاد جامعہ کے سب سے چھوٹے لڑکے سے رکھوایا تھا۔ اس کے مضمرات کا آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ میری رائے ہے کہ آپ بھی ایسا ہی کریں اور اپنے سب سے چھوٹے بیٹے سے یہ رسم ادا کرائیں۔“

غلیل نے اس مشورے پر عمل کیا اور اپنے چھوٹے بیٹے مدنان (مردس سال) سے سنگ بنیاد رکھوایا۔ مکان کی تعمیر کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اسے اپنے ادبی کاموں سے وقت نکال کر تعمیر کا کام دیکھنا پڑا

رہا تھا۔ جوں جوں مکان کی تعمیر آگے بڑھتی جا رہی تھی اس کی مسرور فیات بھی بڑھتی جا رہی تھیں۔
 مکان بن کر تیار ہو گیا لیکن وہ بیمار پڑ گیا۔ ڈاکٹروں نے برقان تجویز کیا۔ علاج ہونے لگا۔ ابھی یہ علاج ہو ہی رہا تھا کہ اس کی پیٹھ میں درد ہوا۔ یہ تکلیف ایسی تھی کہ قابلِ توشیح تھی۔ اسے یونیورسٹی میڈیکل کالج کے اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔

میں بائیس دن اسپتال میں رہنے کے بعد گھر آ گیا لیکن پھر طبیعت بگڑ گئی۔ دوبارہ اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ اسپتال میں گزارنے کے بعد دوستوں نے یہ سٹے کیا کہ اسے دہلی لے جایا جائے۔ شہیار کے ساتھ دہلی آیا اور محترم احمد فہیم کے توسط سے آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف مینٹل سائنسز میں چیک اپ کرایا۔ ڈاکٹروں نے رازدارانہ طور پر بتایا کہ بیماری بگڑ کر ہے اور خون بنانے والے خلیوں نے کام کرنا بند کر دیا ہے۔ اب جب تک زندگی ہے تازہ خون کی منتقلی کے سہارے جینا ہوگا۔

معاملہ صرف بگڑ کر ہی نہیں تھا اور بھی کئی چیزیں گھبراہٹ دہا رہی تھیں۔ کئی بھی بڑھ گئی تھی۔ گردے میں بھی کچھ خرابی تھی۔

ان کئی بیماریوں کے باوجود وہ خوش باش تھا۔ اس کا قلم تقیوں اور غریبوں میں بھی اگل رہا تھا۔ ریلوے اور ٹیلی وژن کے پروگراموں میں بھی حصہ لے رہا تھا۔

اب اس کی شاعری اک ایسے آدمی کا احوال پیش کر رہی تھی جس نے موت کے قدموں کی چاپ سن لی ہو اس کی تنہائی اس دور میں قبر کی تنہائی بن گئی۔

اسے وہ اک شخص جو مرے مرنے کی پہلی خبر سن کے دوڑے اور آواز دے، بھائیو! آؤ اس کا جنازہ اٹھاؤ اور اس آواز پہ کوئی آواز اس تک نہ پہنچے اور پھر مجھ سے بے یس کیلئے کو کا نہ مے۔ اپنے دھرے اور اکیلی ہی اک قبر میں مجھ کو پہنچا کے محفوظ کر دے۔

.....
 اب اس کی شاعری میں ”نیند“ موت کی ہم سفری ہو جاتی ہے۔

موت ہی وہ اپنی پیاری نیند ہے
 جو ہمیشہ کے لیے اپنے مسافر کو ملاتی ہے
 اسے تھکے حفا کرتی ہے

جس کو ہم بھی آرام کہتے ہیں اور بھی امن و سکون میں اس کی کالی زلفوں کا امیر میں اس اپنی دہن کا خنجر ہوں

غلیل کی تکالیف میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی بیماری وجہیہ صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ اس نے اسی بیماری کے سبب 1976ء میں ایک سال کی رخصت لے لی اور کوئی ہوئی صحت کو بحال کرنے کے لیے سری نگر چلا گیا۔ یہاں اس کے ہم زلف کمال احمد صدیقی بلسلہ ملازمت تنہا تھے۔

وہ جب سری نگر پہنچا تو بہت کمزور تھا لیکن یہاں کی خوشگوار آب و ہوا نے اس کی صحت پر بہت اچھا اثر کیا اور وہ پیدل پیدل سیر کرنے کے لیے نکلنے لگا۔ صحت کی اس بحالی میں اس کے دوستوں کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ اس کے کئی دوست یہاں تھے جو اسے ریلوے اور ٹیلی وژن کے پروگرام دلاتے رہے تاکہ اسے اپنی علالت کا احساس نہ ہو۔

احباب کی محفلوں اور خوشگوار آب و ہوا نے اس کی صحت پر مجوزہ اثر ڈالا۔ اس کے چہرے پر گوشت نظر آنے لگا اور آنکھوں میں وہی چمک آگئی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ اب اس کی ناگوں میں اتنی طاقت آگئی کہ پہاڑوں پر چڑھنے لگا۔

اس کے بدن میں نیا خون بننا بند ہو گیا تھا۔ ہر چند وہ دن بعد خون کی منتقلی کی ضرورت پڑتی تھی مگر یہاں تازہ خون بننا شروع ہو گیا۔ جتنے عرصے وہ سری نگر میں رہے، نئے خون کی ضرورت نہیں آئی۔

وہ چھٹیاں گزارنے کے بعد علی گڑھ واپس آ گیا اور یونیورسٹی جو آج کر لی۔ شبے کے سب کام نازل طور پر کرنے لگا لیکن یونیورسٹی کے ارباب اختیار اسے اب تک تیار سمجھ رہے تھے۔ جو لوگ اس کے خلاف تھے وہ سازشوں میں مشغول تھے۔

شعبہ اردو میں پروفیسر شپ کی جگہ نکلی تھی۔ اسے قابلیت اور سیناریائی کی وجہ سے اس منصب کے لیے مضبوط امیدوار سمجھا جا رہا تھا لیکن وہ سازشوں کا شکار ہو گیا۔ اس کی سنگین بیماری کو بھانہ بنایا گیا کہ ایسا آدمی کیا پروفیسری کر سکے گا۔ حریدار بات یہ تھی کہ انڈیو کے وقت آل احمد سرور ایکسپریٹ تھے اور خورشید الاسلام صدر شعبہ۔ اس سے بھی حریدار اور تکلیف دہ حقیقت یہ تھی کہ ایک مرتبہ پروفیسر شپ



آپاجی

زین مہدی

وہ ذہن رسا کسی مالک تھی لیکن اندر کے قلم کار کو بیدار کرنے سے بچکتی تھی۔ ادب سے ناتا جوڑنا چاہتی تھی مگر اسے مہمیز کرنے والا کوئی نہ تھا۔ ایسے میں اس کی شناسائی ایک ایسے نوجوان سے ہو گئی جو اسے اوج پر پہچانے کا خواباں تھا لیکن وہ حد درجہ کا شرمیلا تھا۔ اسے اپنانے کی خواہش رکھتے ہوئے بھی اپنی خواہش کے اظہار میں اس نے کئی سال لگا دیے۔ لیکن جب وہ دونوں ایک ہوئے تو اردو ادب میں کئی اہم اضافے ہوئے۔

تعلیم کی دینی اردو ادب کو شہرہ آفاق بنانے والی ادیب کی کٹھن

مشرقی پنجاب کا ایک چھوٹا سا شہر فیروز پور۔ اس شہر کی بہت سی خصوصیات ہیں، انہی میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہاں فوجی چھاؤنی ہے۔ اس وقت اس چھاؤنی میں انگریز سپاہی بھی تھے اور دیسی بھی۔ وہ شہر اسی فوجی چھاؤنی کی مشرقی پنجاب کا ایک چھوٹا سا شہر فیروز پور۔ اس شہر کی بہت سی خصوصیات ہیں، انہی میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہاں فوجی چھاؤنی ہے۔ اس وقت اس چھاؤنی میں انگریز سپاہی بھی تھے اور دیسی بھی۔ وہ شہر اسی فوجی چھاؤنی کی

”خلیل صاحب، ہاتھ بٹائیے۔“ بیوی نے کہا۔ خلیل نے آنکھوں سے ہاتھ بٹایا۔ کچھ دیر خالی آنکھوں سے نکلتے رہے۔ یہ تو چند سیکنڈ بعد معلوم ہوا کہ مکمل ختم۔

پڑوس سے دمی الرحمن آگئے۔ انہوں نے نہیں دیکھی۔ موت کی تصدیق ہوگئی۔ اسی وقت ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ اس نے بھی تصدیق کر دی۔

اسی روز چند دوستوں کی ہمراہی میں اس نے اردو پارک سے قبرستان تک کا سفر طے کیا۔ اندھیرا ہو گیا تھا۔ لائین کی روٹی میں قبر تیار ہوئی۔ مٹی کی امانت مٹی کے سپرد ہوگئی۔

بہار کے دنوں کی یاد دھوپ میں جھلس جاتی کہ زرد پھول دور دور مکمل اٹھے زمیں پہ اب کوئی جگہ نہیں بچی کہاں یہ خواہشوں کے بیج بوؤں میں مجھے تو بس اس فیصلے کا اختیار ہے ہنسوں کہ اور روؤں میں

اس کے انتقال کے بعد مردہ پرستی کی روایت کو بھاتے ہوئے یونیورسٹی نے اسے پروفیسر بنا دیا لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ وہ تو اپنی حقیقتات سے زندہ تھا اور زندہ رہے گا۔

اس کی وفات کے بعد اس کا آخری مجموعہ ”زندگی اے زندگی“ شائع ہوا جس میں 66ء سے اس کی وفات 78ء تک کا کام شامل تھا۔

اس نے پوری زندگی خاندان والوں سے دور رکھا، ٹیلیفون میں گزاری۔ تعلیم کا خرچ خود برداشت کیا لیکن اپنے بچوں کو محبت دے گیا۔

مٹی کی چادر میں چھپیں گے قبر بنے گی مٹی کی سب مٹی میں مل جائیں گے ختم فسانے مٹی کے

ماخذات

خلیل الرحمن اعظمی احوال و آثار

پروفیسر امجد علی شاکر

شاد عارفی

منظفر حنفی

کی اسامی نقل تھی جس میں خورشید الاسلام امیدوار تھے۔ خلیل نے اعلیٰ عمری کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو دست بردار کر لیا تھا۔ ان کے مقابل نہیں آیا تھا۔ اب اسی خلیل کو سینئر ہونے کے باوجود اسے نظر انداز کر دیا گیا اور یہ خورشید الاسلام کے سامنے ہوا۔

جیسے بیمار قرار دے کر نظر انداز کر دیا گیا تھا وہ اپنے معمولات کو جاری رکھے ہوئے تھا۔ تین تین گھنٹے کی کلاسیں لے رہا تھا۔

ہم ہانسری پر موت کا گاتے رہے نغمہ ترا اے زندگی اے زندگی رتبہ رہے ہالا ترا 25 اپریل 1978ء کو شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی کے زیر اہتمام اقبال سیمینار منعقد ہوا۔ خلیل اس اجلاس میں شریک ہوا۔ ایک اجلاس کی صدارت بھی کی۔ ایک صدارتی خطبہ بھی ارشاد فرمایا۔

26 مئی کو طلبہ کا زبانی امتحان لیا اور اسی روز ایکسٹرا کلاس لی لیکن اس رات پیٹ میں سخت درد اٹھا۔ دروزیادہ ہوا تو میڈیکل کالج میں داخل کرا دیا گیا۔ وہاں اسے تازہ خون دیا گیا اور 29 مئی کی شام کو گھر آ گیا۔

اس کے بھائی پرواز اصلاحی اپنے تحقیقی کام کے سلسلے میں علی گڑھ آئے۔ خلیل کے بچوں نے پہلی بار اپنے تایا کو دیکھا۔ مگر میں جشن کا سا ساں ہو گیا۔ وہ اپنے بھائی کو شعبہ اردو ساتھ لے گیا۔ لاجپوری میں بھی ساتھ گیا اور مخطوطات کی نقول حاصل کرنے کی اجازت دے دی۔

پرواز نے یکم جون کو واپس جانے کا ارادہ کیا تو باویداء نم رخصت کیا۔

”میں تو مستقل مریض ہوں۔ چلنے پھرنے میں دشواری ہوتی ہے۔ آپ بچوں سے ملنے آجایا کیجیے۔ اب ہمارا خاندان ہم سے ہی عبارت ہے اسے قائم رہنا چاہیے۔ بچوں کو معلوم تو ہو کہ ان کا بھی کوئی خاندان ہے۔“ پرواز میں سال بعد اس سے ملنے اس کے گھر آئے تھے۔

اسی دن اس کا بھائی رخصت ہوا تھا اسی دن اس نے بھی رخصتی کی ٹھان لی۔ کوئی بارہ بجے کے بعد اسے سردی محسوس ہوئی۔ اپنی دوا مانگی۔ بیوی نے دوا دے دی۔ پھر اٹار کا جوس مانگا۔ جوس اور دوا پینے کے بعد کچھ حالت سنبھلی۔ سورہ یسین پڑھنے کو کہا۔

تھوڑی دیر بعد آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

بدراثر مان نے فوراً جب سے ایک روپے کا سکہ نکال کر
 اس کی طرف بڑھا دیا۔ یہ ایک بہت بڑی رقم تھی۔ وہ خوش
 خوش واپس چلی گئی۔

ت کا کام ہے کرنا اور وہ کرنا رہا۔ اسے ابجے سے لری چکی تھی۔ حروف شناسی سکھا چکی تھی۔ اس لیے یہ مقامی اسکول میں داخل کیا گیا تو اسے ذرا بھی نہیں ہوئی۔ یوں بھی اسے بہت ساری نئی سہلیاں جو شاید بچوں کا اثر تھا کہ وہ بڑھائی میں بہت زیادہ

اس بار ماں کا تاجدار حرم شالہ ہوا تھا۔ وہ بھی ماں کے ساتھ نقل مکانی کرنے پر مجبور تھی۔ ایک ناٹھم تھا۔ نئے لوگ تھے مگر میں اس نے نئے اسکول میں خود کو ایڈجسٹ کر لیا۔ نئی سٹی لایا۔ وہ دوسری تھائی۔ پڑھائی میں تو تیز تھی اس لیے اسکول میں بھی پڑھائی نہیں ہوئی۔ وہ نہ صرف پڑھائی میں تیز تھی بلکہ

اب ایک نیا مسئلہ کھڑا ہوا کہ میٹرک کے بعد وہ کسے کیا؟ والدہ کا خیال تھا کہ اسے آگے بڑھنا چاہیے لیکن وہاں لڑکیوں کا کوئی کالج نہ تھا۔ ایک ہی کالج تھا جس میں لڑکے پڑھتے تھے۔ اسی کالج میں پرویز بھی تھا۔ اس نے جب سنا کہ بہن کو بھی اسی کالج میں داخلہ دلایا جائے گا تو اس نے سختی سے احتجاج کیا۔ وہ قلمو تعلیم کا مخالف نہیں تھیں تھیں وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ جس کالج میں وہ ہے اس میں بہن بھی جائے۔ قریبی شہروں میں لاہور تھا لیکن اسے لاہور جیسے تیار نہیں تھی۔ بیٹی کو کونسلوں سے دور بھی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ ماں نے شہر کی لبرل خواتین کو جمع کیا اور پھر ان کے سامنے لڑکیوں کے مسائل کو رکھا۔ وہ سب بھی اس سے متفق ہو گئیں کہ اس مسئلہ کا حل نکالا جائے۔ لڑکیوں کا ایک کالج ہونا چاہیے۔ سب نے ساتھ دینے کا وعدہ کیا اور پھر ان سب کی امانت و حوصلہ افزائی سے دھرم شالہ بازار سے کچھ اجواہر ایک کوٹھی کرائے پر لی گئی اور اس

میں ایف اے تک کی کلاسیں شروع کرادی گئیں۔ اس کالج میں اس کا گروپ ہی پہلا تھاجہز پر تعلیم تھا۔ اس گروپ میں دلائی لاما، سکھ، ہندو، کاسی اور طبریہ کا مجھے بڑے گھرانوں کی لڑکیاں تھیں۔ گیان سنگھ بہت بڑے بڑے بزنس مین تھے۔ ان کی بیس چلتی تھیں۔ گویا کہ تمام کی تمام لڑکیاں بااثر گھرانے کی تھیں۔ تعلیم کے ساتھ غیر تعلیمی سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔ شہر و شاعری ہی نہیں بیڈمشن اور دیگر کمپلیوں میں بھی وہ سب آگے آگے رہیں۔ جبکہ ملک بھر کا سیاسی اتھ یوٹی تیزی سے بدل رہا تھا۔ قیام پاکستان کا اعلان ہو چکا تھا اور اس بات پر ہندو سکھ آگ بگولا ہو رہے تھے۔ جگہ جگہ لوٹ مار، قتل، خون ریزی شروع ہو گئی تھی۔ کبھی اس شہر تو کبھی اس شہر سے مسلمان بستیوں کو لوٹنے آگ لگانے کی خبریں آنے لگی تھیں۔ اس وجہ سے ڈاکٹر بیکر نے اسکول اسٹیشن کے لیے دورے محدود کر دیئے تھے۔ وہ گورداس پور سے باہر نہیں جادی تھیں۔

گورداس پور میں ان کا گھر ترمو روڈ پر تھا جو تھن کی طرف جاتی تھی۔ اس گھر سے بڑے چھ بچے ایک ایک روٹھی پھر دوڑی گا دروازہ آتا تھا۔ یہ بچے گناہ دوڑی اندر مین میں کھلتا تھا جس کے چاروں طرف اور اور بھی کمرے تھے۔ کافی بڑا گھر تھا۔ مین کے ایک طرف باورچی خانہ وغیرہ تھا اور دوسری طرف کمرے تھے۔ ان میں سے ایک کمرہ بھائی پر دیز کے تصرف میں تھا اور دوسرے کمرے میں وہ اپنی اسی کے ساتھ سویا کرتی۔ باہر کا بڑا سا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا لیکن جب تعصب کی آندھی چلی اور حالات کشیدہ سے کشیدہ تر ہونا شروع ہو گئے تو دروازہ بند رہنے لگا۔ گورداس پور میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ وہاں کے لوگ پوری طرح مطمئن تھے کہ یہ علاقہ پاکستان کے حصے میں آئے گا اس لیے دیگر علاقوں کی طرح یہاں کے لوگوں نے ہجرت نہیں کی تھی مگر سیکہ اقلیت میں ہوتے ہوئے بھی شرارت سے باز نہیں آ رہے تھے۔ وہ مقامی لوگوں کو تو کچھ نہیں کہتے لیکن اگر کوئی دوسرے علاقے کا مسلمان نظر آ جاتا تو وہ اسے نقصان پہنچانے میں جکتے نہیں تھے۔ اس دن بھی ایک ایسا ہی منظر نظر آیا۔ وہ سب گھر میں بیٹھے بائیں کر رہے تھے کہ باہر سے شور کی آواز آئی۔ پرویز دوڑتے ہوئے دروازے پر پہنچا۔ دروازہ کھولتے ہی اس کی نظر ایک جم غفیر پر پڑی۔ سب گئے تھیں اور ایک بچہ کو گھیر رہے تھے۔ وہ دونوں اپنے حلیے سے ہی مسلمان نظر آ رہے تھے اسی لیے بلوائی ان کا پیچھا کر رہے تھے۔ ایسے وقت میں کوئی گھنڈ اپنی جان کو خطرے میں نہیں ڈالتا لیکن پرویز سے ممبر نہ ہوسکا اور وہ دوڑتا ہوا باہر نکلا اور ان دونوں کو کھینچتا ہوا اندر لے آیا پھر اتنی ہی بھرتی سے اس نے دروازہ لگا دیا۔ بلوائی باہر سے شور مچاتے رہے۔ ”جو بولے سو نہال ست سری اکال“ کا نعرہ لگاتے رہے۔ پوچھنے پر عورت نے اپنا نام سنبا اور بچے کا لالہ بتایا۔ اس نے کہا کہ وہ پیالہ کے تحصیلدار کی بیوی ہے اور جان بچا کر یہاں تک پہنچی ہے۔ اس کے گھر والے سب کے سب مارے جاتے ہیں۔ ان دونوں کو مکان میں ہی ٹھہرایا گیا۔ یوں بھی سب کو یقین تھا کہ یہ علاقہ تو پاکستان میں آئے گا ہی۔ اس لیے بھی دوسرے علاقے کے لوگ پناہ کی تلاش میں گورداس پور آتے جا رہے تھے۔ وہ گھر ایک طرح سے کھپ کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ اس لیے کہ جتنے بھی لوگ گورداس پور آتے وہ اسی گھر کا رخ کرتے۔ ابھی تک یہاں فسادات کی ابتدا نہیں ہوئی تھی۔ سکھ اور ہندو فخرے بازی تو کر لیتے تھے لیکن کوئی بڑی واردات نہیں ہوئی تھی۔ وہ گھر سے باہر نہیں نکلتی تھی کیونکہ وہ بھی ڈر گئی تھی۔ حالات کے اس نئے رخ سے وہ خوفزدہ تھی۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے جب اس کا بیٹھ کا پرچہ تھا۔ سینئر لیڈر ڈکال میں تھا۔ پرچہ شروع ہی ہوا تھا کہ کچھ شر پسندوں نے کالج کے مینیجر کے حصے میں آگ لگا دی۔ دھواں اٹھنے ہی لڑکیاں خوفزدہ ہو گئیں۔ سختی نے لڑکیوں سے پرچے لیے اور سب کو ایک بس میں بٹھا کر ایف سی کالج پہنچایا اور وہیں سب نے پرچے دیئے۔ امتحان گاہ سے وہ واپس آئی تو حد سے زیادہ ڈری ہوئی تھی۔ گورداس پور پہنچ کر بھی اس کا خوف کم نہیں ہوا۔ ابھی وہ اس خوف کے گھیرے سے نکلی بھی نہیں تھی کہ تقسیم کا اعلان ہو گیا۔ کشمیر کو راہ داری دینے کے لیے مسلم اکثریتی علاقہ گورداس پور کو بھارت کی جمہوری میں ڈال دیا گیا۔ ہندوؤں اور سکھوں نے پر پزے نکالنا شروع کر دیئے۔ مسلمان بستیوں پر حملے بھی شروع ہو گئے۔ لوگ جان بچا کر لاہور کی جانب بھاگنے لگے لیکن ڈاکٹر صاحب کا ابھی پاکستان جانے کا ارادہ نہیں تھا۔ پرویز جو پاکستان بننے سے بہت زیادہ خوش تھا وہ بھی ابھی پاکستان جانے پر غور نہیں کر رہا تھا کہ ایک دن گھر کا چشتی نوکر چراغ سرا سہ سا گھر آیا اور ڈاکٹر صاحب سے بولا۔ ”بی بی جی میں ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”کیا بولو؟“ انہوں نے پوچھا۔

”دو جو فوجی ہر یک ہے نا۔۔۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر جبکہ رہا تھا۔“

اس گھر سے قریب فوجی ہر یک تھے جن میں پہلے انگریز افسران رہا کرتے تھے۔ اعلان تقسیم کے فوراً بعد اس میں ہندوستانی فوجی آگئے تھے۔ وہاں بچتے والا بھگ اور پریڈ کی آوازیں بھی گھر تک آتی تھیں۔ چراغ میں سے آ رہا تھا اور اب وہ خاموش کھڑا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”تم کچھ کہہ رہے تھے؟“

”وہ جی آج میں نے اپنے کانوں سے ہندو فوجی افسران کو باتیں کرتے ہوئے سنا ہے۔ وہ لوگ جمہوری بی بی کو انوار کرنا چاہتے ہیں۔ گندی گندی باتیں کر رہے تھے۔“

انتہا تھا کہ ڈاکٹر بیکر نے حکم صادر کر دیا کہ ابھی اور اسی وقت ہم لاہور کے لیے نکل چلیں گے۔ آنا ٹاٹا فیصلہ ہوا اور جلد بازی میں جتنا کچھ لایا جاسکتا تھا وہ لے لیا گیا۔ ڈاکٹر بیکر نے اپنے اثر و رسوخ سے ایک ٹک حاصل کر لیا۔ اس ٹک میں اس گھر میں تعلیم پناہ گزینوں کو بھی بخلا لیا۔ ایک رضائی میں بانو کو لپیٹ کر اراہر کے پیچھے کھڑا کر دیا گیا۔ ماں کا حکم تھا کچھ بھی ہو جائے وہ بے بھی نہیں تاکہ کسی کو یہ پتا نہ چلے کہ اس رضائی میں کوئی زندہ وجود بھی ہے۔ ٹک پر ترپال ڈھاک دیا گیا اور پرویز پیچھے کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک انٹرکٹ تھی جس سے وہ چڑیا کا شکار کرتا تھا۔ اس گھر کی صرف ٹال باہر کی کدور سے دیکھنے والے یہی سمجھیں کہ دراصل کی ٹال ہے۔

ٹک لاہور کی جانب چلا۔ کئی جگہ بلوائیوں نے انہیں روکا لیکن رانقل دیکھ کر بلوائی خود پیچھے ہٹ جاتے وہ سمجھتے تھے کہ اندر فوجی ہیں۔ اس طرح وہ لوگ بلوائیوں سے بچتے بھاگتے باحفاظت لاہور پہنچ گئے۔ اب ان کا ٹھکانا یونیورسٹی کیمپس تھا۔ لاہور آتے گئے تھے محراب رہنے کے لیے محبت کی ضرورت تھی۔ بغیر محبت کے تو کوئی بھی رہ نہیں سکتا۔ شہر کی حالت دیگر گوں تھی۔ کوئی کسی کا پرسان حال نہ تھا۔ لے بے تانے تانے پر تانے آ رہے تھے۔ جیسے جہاں جگہ تھی وہیں ٹھہر جاتا۔ یونیورسٹی کیمپس میں آ کر وہ لوگ بھی ٹھہر گئے۔

کچھ برآمدے میں ٹھہرنا آسان نہیں۔ چراغ کی آمدنی سے روٹی اور اچار ساتھ آ گیا تھا۔ وہیں میز چلوں پر انہوں نے اچار سے روٹی کھائی۔ ڈاکٹر خاتون نے سوچنا شروع کیا کہ کہاں جایا جائے۔ ان کو یاد آ گیا کہ یہاں ان کی ایک ناخدا زوجین بھی رہتی ہیں۔ فیروزہ ان کا نام ہے۔ اب

محبت ملی تو نوکری کی گھر ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے حکم تعلیم کو اپنے آنے کی خبر دینا ضروری سمجھا اور اطلاعی درخواست جمع کرا دی۔ جواب آنے میں دیر نہ لگی۔ انہیں لیڈی میٹھکین کالج میں پرنسپل کا عہدہ دے دیا گیا۔ نوکری جیسی بھی ہو ایک آسرا ہو گیا۔ انہوں نے کالج کا دورہ کیا تو پتا چلا کہ یہ نیچر ٹریک کالج ہے۔ ڈوڈے کو کتا بھی سمجھتا نظر آتا ہے۔ انہوں نے خوش دلی سے چارج سنبھال لیا۔

ابھی انہوں نے عہدہ سنبھالا ہی تھا کہ ایک اور اضافی کام ان کے ذمے لگا دیا گیا کہ لاوارث بچوں کا کیمپ اچالے میں لگایا جائے اور ان بچوں کی نگاہداشت کی جائے۔ مشرقی پنجاب سے ہر آنے والے قافلے میں دو چار ایسے بچے ضرور ہوتے تھے جن کے والدین قید ہو چکے تھے۔ ایسے بچوں کے لیے کیمپ قائم کیا گیا تھا۔ ان بچوں کو ہاں رکھ کر ان کے والدین کو تلاش کیا جاتا۔ اگر مل گئے تو ٹھیک ورنہ انہیں کسی خواہش مند خاندان کو سونپ دیا جاتا۔

کالج سے ملحق پرنسپل لاج تھا۔ اس کے دو حصے تھے۔ ایک وہ حصہ جو پرنسپل کی رہائش گاہ تھا اور دوسرے حصے میں ہیڈ مسٹریں رہتی۔ کالج کی انگریز پرنسپل مس راتھرتھی تھی جو حالات خراب ہوتے ہی انگلینڈ چلی گئی۔ ہیڈ مسٹریں بھی غائب ہو گئی اس طرح دونوں حصے انہی کے تصرف میں تھے۔ پرویز نے ہیڈ مسٹریں والا حصہ اپنے تصرف میں لے لیا لیکن اس کا صرف ایک کمرہ استعمال کرتا تھا ورنہ کھانا پینا سب کچھ ساتھ ہی تھا۔ اس کا سوشل ورک بھی جو بن پر تھا۔ وہ ہند میں بیٹھے مسلمانوں کو نکالنے کے لیے مشرقی پنجاب کے اندر تک چلا جاتا تھا۔ کبھی امرتسر تو کبھی لدھیانہ۔ وہ جان بھٹیل پر رکھ کر اندر دیر تک چلا جاتا تھا۔ اسے صرف ایک ہی رٹ تھی کہ ہمارے بھائی ہند ہندو سکھوں کے زرخے میں ہیں انہیں کسی بھی طرح نکالنا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کالج کی سرگرمیاں گھیرے رہتیں۔ برادرہ ان کا دفتر بنا ہوا تھا۔ وہیں میٹنگز ہوتیں۔ دن دن بھر لوگ انہیں گھیرے رہتے۔

حالات آہستہ آہستہ معمول پر آتے جا رہے تھے۔ اس نئے شہر میں دوبارہ سے زندگی شروع کرنی تھی اس لیے ہانوں نے سوچنا شروع کر دیا کہ یہ پہاڑ جیسے دن کیسے گزارے جائیں؟ پرویز نے تو اپنا مشغلہ صوفیہ لیا تھا۔ مصوری کو پس پشت ڈال کر اس نے مہاجرین کی خدمت کو اپنا نصب العین بنایا تھا۔ اب وہ بھی ختم ہو گیا تھا اس لیے وہ بھی ابھرا صرف خالص کر

رہا تھا۔

ہاں اس کی طرح وقت ضائع کرنی کی عداوت نہ تھی۔ اس کے لیے وقت گزارنا مشکل تھا۔ حالانکہ اس نے وقت گزاری کا بندوبست کر رکھا تھا۔ کالج ٹائم ختم ہوتے ہی وہ رہمائی دروازہ کھول کر کالج کے احاطے میں چلی جاتی۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں بیڈیشن کی ریکٹ ہوتی۔ کالج کی کئی پروفیسر جو دو چار سال ہی بڑی ہوں گی ان کے ساتھ بیڈیشن کھیتی۔ وقت اچھا گزر رہا تھا پھر بھی وہ سوچتی کہ مجھے کچھ اور بھی کرنا چاہیے۔ مگر کیا کرنا چاہیے یہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کافی دماغ سوزی کے بعد بھی جب سمجھ نہیں آیا تو اس نے یہ مسئلہ ماں کے سامنے رکھا۔ ماں کا مشورہ تھا کہ وہ پھر سے تعلیم کی کڑی جوڑ لے۔ پارٹ دن مکمل تھا اب بی اے مکمل کر لے۔ وہ اسی پر غور کر رہی تھی۔ اس دن اس نے مکمل کے دوران مس ملک سے بھی اسی ٹاپک پر بات کی تھی۔ انہوں نے بھی یہی مشورہ دیا کہ پڑھائی شروع کر دینا ہی مکمل مندی ہے۔ مغرب کی اذان ہوئی تو وہ مکمل بند کر کے گھر آ گئی۔ جیسے ہی اس نے دروازہ پار کر کے اپنے حصے میں قدم رکھا۔ اس کی نظر سیدھے برآمدے کی طرف اٹھی۔ پروردگار کی طرح آج وہاں بھیڑ نہیں تھی۔ صرف ایک عورت ڈاکرہ صاحبہ کے ساتھ بیٹھی تھی۔ وہ لاہور کے اے ڈی سی کی بیوی زبیدہ تھی۔ جو کسی کام سے ہی آئی تھی۔ ہانو جیسے ہی ٹیوب دہلی سے ہاتھ منہ دھو کر برآمدے میں پہنچی ماں نے کہا۔ ”یہ میری بیٹی زبیدہ ہے۔“ آواز زبیدہ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا بلکہ سر تا پا جائزہ لیا اور پھر بوجھا۔ ”ناٹا نشانہ کرتی کیا ہے؟“

ڈاکرہ صاحبہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہا۔ ”بی اے کر چکی ہے۔ کینسر ڈکالج سے۔ بے چاری کی فرسٹ ڈویژن ماری تھی۔ افراتفری میں اس نے امتحان دیا تھا اس لیے پوزیشن حاصل نہ کر سکی۔“

”اچھا۔“ آواز زبیدہ نے ہانوکے پیٹھ پر جھکی دے کر کہا۔ ”اب کیا ارادہ ہے؟“

”اب انتظار میں ہوں کہ کوئی لڑکا پسند آئے تو اس کے ہاتھ پیلے کر دوں۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟“ آواز زبیدہ نے الجھے الجھے میں کہا۔ ”اتنی ہی عمر میں شادی کر دیں گی۔ ابھی اسے پڑھنے دیں۔ ایم اے تو کر لے۔ کتنی عمر ہے؟“

”انیس۔“ ماں نے جواب دیا۔

”یہ کیا بات ہوئی؟“ زبیدہ آبا بولیں۔ ”ایسا علم نہ

کریں۔۔۔ اتنی ہی عمر میں شادی۔ آپ اتنی پڑھی لکھی ہیں اور یہ نہٹ جاہلوں جیسی باتیں۔ اسے ایم اے کرنے دیں۔“

”کیوں کینسر ڈکالج تو صرف بی اے تک ہے۔“

”کینسر ڈکالج کیوں۔۔۔ گورنمنٹ کالج میں سمجھیں۔ وہاں ایم اے کی تیاری ہو رہی ہے۔ میں نے بھی داخلہ لے لیا ہے۔ پلرس بنواری دیکھ رہے ہیں۔ اچھی پڑھائی ہوگی۔“ آواز زبیدہ نے اطمینان بھرے لہجے میں ایسے کہا جیسے ڈاکرہ صاحبہ فوراً اجازت دے دیں گی۔

ماں نے ایک نظر بیٹی پر ڈالی پھر الجھے لہجے میں کہا۔ ”جب یہ وہاں تھی تو اس کے کد پانی کے استاصرداری لعل کہا کرتے تھے کہ اسے بیٹھ ٹیکس میں ایم اے کرنا چاہیے۔“

”اور اس سٹائی کتنی تھیں کہ مجھے ایکٹامیکس میں ایم اے کرنا چاہیے۔“ ہانو نے تردید دلائی۔

”ٹیکس سسر چٹھہ اس بات کو جانیں دیں۔ یہ پاکستان کے قیام سے پہلے کی باتیں ہیں۔ اب ہم نے ہندوؤں اور انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کر لی ہے۔ پاکستان بن چکا ہے۔ آپ تو خود ایکٹامیکس ہیں۔ محبت وطن ہیں۔ ہماروں کی خدمت میں پیش پیش ہیں۔ آپ جانتی ہیں اردو کے بغیر پاکستان کی شناخت ممکن نہیں۔ اگر ہم نے اس وحدت کے خلاف سندھ میں سندھی۔ بلوچستان میں بلوچی۔ سرحد میں پشتو۔ پنجاب میں پنجابی کو قوت دی تو ہماری شناخت بھی اتنے حصوں میں بٹ جائے گی۔“

ڈاکرہ چٹھہ الجھ نکلیں انہیں جواب دیتے نہ بنا تو وہ بولیں۔ ”دراصل وہاں۔۔۔ کواچو کیشن ہے۔“

”تو کیا ہوا۔ میں ہوں نا۔ یہ مرنے کے بچوں کی طرح پردوں میں رہے گی۔ آپ فکری نہ کریں۔“

آواز زبیدہ نے اپنے طور پر گوش کر لی لیکن سسر ڈاکرہ چٹھہ ابھی فکری مند تھیں کہ ڈاکٹر کٹر عینیت اللہ تک یہ بات کافی تھی۔ وہ گورنمنٹ کالج میں پڑھاتے تھے۔ عربی کے اسکالر تھے اور اردو ایم اے کے پہلے بیچ میں عربی کی کلاس ان کی ڈے واری تھی۔ وہ بی بی کی کلاس لینے آئے ہوئے تھے لیچجر کے بعد سسر ڈاکرہ چٹھہ نے ایم اے اردو کا ذکر کیا تو وہ بولیں۔ ”اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ قدیہ کو فزاد اعلیٰ کرا دیجئے۔ پاکستان کو پڑھی لکھی خواتین کی بہت ضرورت ہے۔ آپ خود سوچیں اگر آپ پڑھی لکھی نہ ہوتیں تو ان بچوں کو لے کر کہاں جاتیں؟“

ان کے سمجھانے کا غاثر خوا اثر ہوا اور انہوں نے پنسل

لرا۔ صاحبہ کون کیا اور ہانوکا داخلہ ہو گیا۔

یہ داخلہ نہیں کاتب تقدیر کچھ لکھ رہا تھا ایم اے اردو تو ایک بہانہ تھا۔ وہاں اشفاق صاحب سے ان کو ملنا تھا۔ جب اس وقت تک اشفاق صاحب کئی فاصل کر چکے تھے۔ ان کی تاب۔ ”ایک محبت سرفاسانے۔“ چپ چپ جی پھر بھی ان نے دل میں ایم اے اردو کرنے کا ارمان جاگ اٹھا اور وہ بھی اس دن اس میں آ گئے۔

اشفاق صاحب ہمندیشان تھے۔ وہ چھ بھائی تھے اور دو بہنیں تھیں۔ بڑی بہن فرخندہ۔ آبا فرحت۔ بھائی آفتاب۔ انکار۔ اقبال۔ اشفاق۔ اشتیاق۔ (عرف ایڈی بی) کہتے ہیں کہ ان نے دادا دوست محمد خان۔ خاصہ خوبصورت تھے۔ بڑے لطیف۔ تہ پند تھے۔ کبھی مٹلن آلود کپڑے تک نہیں پہنتے تھے۔ آپ نے خاص۔ انتہائی تھی۔ فارسی اور عربی شعرا کے کلام اس طرح ناسخ کر لکھا۔ سانسے کتاب کھلی ہوئی ہے۔ اتنا ہنسنے کے بعد بھی برادری کے قوانین سے رد گردانی نہیں کرتے تھے۔ برادری میں رواج تھا کہ شادی ہوگی تو برادری میں ہی ہوگی۔ ماں باپ نے جسے پسند کر لیا وہی حرف آخر۔ اسی وجہ سے انہوں نے اس لڑکی کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ اس نے شادی طے ہو گئی تھی۔ شادی کی رات انہوں نے لڑکی کو پہلی بار دیکھا۔ جیسے ہی انہوں نے ٹھوٹھٹ اٹھایا ان کی تہری پر بل پڑ گئے۔ لڑکی نے صرف کافی تھی بلکہ قد بھی بوٹا سا تھا۔ وہ اشتعال میں آ گئے تھے لیکن بزرگوں کے سامنے زبان بھی نہیں کھول سکتے تھے۔ مگر ان کی ناراضی کی خبر بزرگوں تک پہنچ ہی گئی۔

گھر والوں نے لڑکی پسند کی تھی اس لیے زبان سے تو کچھ نہ کہا لیکن دل میں گہر سی پڑ گئی تھی کیونکہ انہیں بیوی ہا اہل پسند نہ آئی تھی۔ زبان سے تو کچھ نہ کہا لیکن حجرت کی ضمان لی۔ برادری کا خوف یا کوئی اور بات کہ حجرت سے کس وہ بیوی سے قریب رہنے پر مجبور ہوئے پھر ایک دن خاموشی سے کمر چھوڑ دیا۔ دوست محمد خان نے حیدر آباد کو ن کارخ کیا تھا۔ اس لیے کہ اس دور میں حیدر آباد ظلم فتن کا مرکز بننا ہوا تھا۔ پورے برصغیر سے اہل علم اس ریاست کی طرف کھینچے جا رہے تھے۔ ریاست بھی اہل علم کو جمع کر رہی تھی۔ دوست محمد خان کو بھی یقین تھا کہ اس ریاست میں انہیں پڑھائی ملے گی۔ انہیں فارسی زبان پر مہور حاصل تھا۔ اس وجہ سے انہیں انہوں ہاتھ لیا گیا۔ شہزادوں کا اہلایق مقرر کر دیا گیا۔ یہ ایک منصب تھا۔ خواہ وہ بھی معقول تھی۔ وہاں وہ اکیلے تھے۔ پھر

بھی خوش تھے۔ گھر سے خط و کتابت ہوتی رہتی تھی لیکن انہوں نے بیوی سے کوئی رابطہ نہیں رکھا تھا۔ گھر سے آئے خطوط سے ہی پتا چلا کہ وہ ایک بچے کے باپ بن چکے ہیں۔ بچے کا نام محمد خان رکھا گیا ہے۔

بیوی سے کوئی رابطہ نہ رکھنے کے باوجود وہ گھر کے اخراجات پابندی سے بھیجتے تھے۔ بچے کی ولادت کا سن کر انہوں نے رقم میں اضافہ کر دیا تھا۔ ساتھ ہی تاکید کی تھی کہ بچے کی تعلیم کا خاص خیال رکھا جائے۔

محمد خان کو صرف تین سال کی عمر میں کتب میں بھلا دیا گیا۔ وہ پڑھتے رہے پڑھتے رہے۔ شکل و صورت میں وہ ماں پر گئے تھے۔ وہی سانولی رنگت۔ ہونا سادہ اس پر ایک اور آفت۔ چپک کا مٹل ہوا جس کے داغ چہرے پر جا بجا نظر آنے لگے۔ شاید اسی وجہ سے وہ کبھی بھی باپ کا بھرپور پیار نہ پا سکے۔ انہوں نے اپنی دنیا الگ بسالی تھی۔ اپنی بھرپور توجہ پڑھائی پر لگا دی تھی۔ میٹرک پاس کی پھر آگے کیا پڑھتا ہے یہ سمجھنا ہی تو ڈاکٹر بننے کے لیے دستری کالج میں داخلہ لے لیا اور پھر ڈاکٹر ڈاکٹر بن گئے۔

ڈاکٹر بننے کے بعد اطراف پر نظر ڈالی کہ کس علاقے میں پریکٹس کی جائے جہاں ترقی کے امکانات زیادہ ہوں۔ کافی غور کرنے کے بعد انہیں ملتان سے زیادہ مناسب لگا اور وہ ملتان منتقل ہو گئے۔

ملتان میں ان کی پریکٹس خوب چلی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ امیرا میں شمار ہونے لگے۔ زمینیں خریدیں بڑی سی حولی بنائی۔ امپل میں گھوڑوں کی اہلی خلیس جمع کر لیں اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اللہ نے اولاد کی طرف سے بھی خوش رکھا۔ چھ بیٹے اور دو بیٹیاں وہیں ہوئیں۔ سارے بچے ان کی طرح تعلیم سے خاص دلچسپی لیتے۔ اشفاق خان نے بھی میٹرک ملتان سے کی۔ آگے کی پڑھائی کے لیے وہ بی بی بہن کے پاس فیروز پور چلے گئے۔

فیروز پور کے رام سنگھ داس کالج میں پہنچنے کے بعد ان کے جوہر کھلنے لگے۔ ادب سے تو پہلے ہی دلچسپی تھی۔ یہاں آ کر ماحول بھی ادبی ملا تو حریف کھار اٹھا۔ خوش ہوش بھی بلا کے تھے۔ سب میں منفرد نظر آتے۔

پڑھائی جاری تھی کہ سیاسی افاقہ دلانے لگا۔ مسلمان ہونے کی وجہ سے وہ مسلم لیگ کو سپورٹ کر رہے تھے اور ماسٹر تاراسکی کے لوگ ان کی تاک میں رہنے لگے۔ کئی بار دھمکیاں بھی ملیں لیکن ڈر خوف تو کو یا چھوڑ کر نہیں گزرا تھا۔ ساری

ساری رات دوستوں کے ساتھ مل کر مسلم لیگ کے لیے کام کرتے۔ ریفریغزم ہوا تو ان کا حوصلہ اور بڑھ گیا۔ انہوں نے یہی سمجھا تھا کہ سکسوں کی ذہنی اختیارات تک ہی رہیں گی لیکن ماحول بتا رہا تھا کہ مسلم لیگ کی کامیابی غیر ممکنوں کے دل میں چھائیں بن کر چھب گئی ہے۔

پھر وہ دن بھی آگیا جب اعلان قیام پاکستان ہوا۔ اس اعلان سے تو ایسا لگا جیسے ہندو اور سکسوں کے دل میں چھپی نفرت کو ابال دے دیا ہو۔ ہر طرف تلخ و خوں کا بازار گرم ہو گیا۔ ایسے وقت میں بس ایک ہی راہ بھائی دی کہ وہ ہجرت پر خود کو آمادہ کر لیں۔

واپس کلکتہ آئے تو سب ہی تیار بیٹھے تھے۔ محمد خان نے سب کو لیا اور گھریلوں ہی کھلا چھوڑ کر لاہور کی جانب چل پڑے۔ اگر ایک دن اور دیر کرتے تو شاید کوئی بھی زندہ سلامت نہ آ پاتا۔

لے گئے محمد خان اپنے بچہ بیٹے اور دو بیٹیوں کے ساتھ لاہور پہنچے۔ 1966ء میں ایک ہفتے کی بہن رشیدہ رہتی تھیں۔ وہ سب ان کے ہاں جا کر اترے۔ کچھ دن رہنے کے بعد انہیں خبر ملی کہ مریض دیا کے پاس حرکت روڑ پر ایک مکان خالی ہے۔ یہ لوگ وہاں پہنچے۔ مکان کھلا دیا تھا۔ بجلی کا میٹر غائب۔ تل سوکھے پڑے تھے۔ کمرے لمبے کے ڈھیر بنے تھے۔ صفائی سترائی کے بعد یہ لوگ وہیں تک گئے۔ اشفاق سے بڑے اقبال بھائی نے کمانے کا ایک نیا طریقہ ڈھونڈا۔ وہ بکرا منڈی چلے جاتے اور ایک بکرا خرید کر اسے کندھے پر سوار کر کے شہر میں پھرتے گاتے۔ بک جاتا تو پیسے لاکر اماں جی کے ہاتھ پر رکھ دیتے۔ اسی سے گھر کی دال روٹی چلنے لگی۔ آفتاب بھائی سرکاری وکیل تھے لیکن ابھی لاہور کے کورٹ سے رابطہ نہیں ہوا تھا۔ اشفاق بھی روز نوکری والے دفتر جاتے اور انہیں ایک ہی جواب ملتا کہ امی کوئی نوکری نہیں ہے۔ روز روز کے کٹے سے جواب پر وہ ایک دن بول پڑے۔ ”بھائی کلرک میں روز آتا ہوں اور ایک ہی جواب ملتا ہے۔ آخر میرے لیے کوئی نوکری کیوں نہیں آتی۔ کلرک نے جواب دیا کہ آپ لی اے پاس ہیں اور جو نوکری آ رہی ہے وہ دوسری پاس کے لیے ہے۔ اشفاق نے کہا۔ ”اس میں مشکل کیا ہے۔ آپ میری دوسری کی سند رکھ لیں۔“

کلرک نے فوراً انہیں والٹن کیپ کی نوکری دے دی۔ وہاں مایک پر گشہدہ افرا کی انڈسٹری کرنا ہوتی۔ وہیں ان کی ملاقات ممتاز مفتی سے ہوئی جو جلد دوستی میں بدل

گئی۔ اشفاق کے افسانوں کا مجموعہ ”ایک محبت سوانح“ آپکا تھا اس لیے وہ تھوڑا بہت جھپکانے بھی جا رہے تھے۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ اسی چھوٹی نوکری میں صرف اوپر کے اخراجات پورے ہو رہے تھے اسی لیے انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب انہیں ایم اے کرنا چاہیے اور وہ داخلے کے لیے کالج پہنچ گئے۔

انہیں ایم اے کرنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ منشی فاضل کر چکے تھے لیکن قسمت بھی تو کوئی چیز ہے۔ انہیں کسی سے ملنا تھا۔ اسی لیے قسمت انہیں کھینچ کر ایم اے کی طرف لے جا رہی تھی۔

ادھر بانو کو بھی اسی کالج میں جگہ ملی۔ جس دن وہ کالج پہنچی تو پرنسپل نے انہیں اپنے روم میں بلا لیا۔ سوال جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ پرنسپل کرامت نے پوچھا۔ ”آپ نے بی اے کہاں سے کیا ہے؟“

”کنر ڈکال سے۔“ بانو نے جواب دیا۔

”فرسٹ ڈیوڑن آئی تھی؟“

”یقیناً فرسٹ آئی لیکن اس دن جب ہم پرچہ دے رہے تھے۔ جیل روڈ پر شری پند نے آگ لگا دی تھی۔ پرنسپل صاحبہ سب کوس میں بھاگ کر ایف سی کالج لے گئیں۔ انفرافری میں استحقاق دیا تھا۔“

”اور لی اے میں کون کون سے سبیکٹ تھے؟“

”میٹھ اور انا میٹس۔“

”میٹھ کون پڑھاتا تھا؟“

”پروفیسر سرداری لال۔“

”اچھا اچھا۔۔۔ تو ہمارے بھی پروفیسر تھے۔۔۔ اور اکنا میٹس؟“

”مستحقائی۔۔۔ وہ ساتھ سے آئی ہیں۔ ان کے بھائی نے اکنا کس میں بڑی عمر کے کی کتاب لکھی ہے۔“

”او بھائی اتنے قابل پروفیسروں سے پڑھنے کے بعد ایم اے اردو میں کیوں کرنا چاہتی ہو۔ میٹھ میں کرو یا پھر اکنا میٹس میں کرو۔“

”مجھے اردو میں ایم اے کا شوق ہے۔ میں رائٹر بننا چاہتی ہوں۔“

”کیا تمہیں معلوم ہے ایم اے اردو کا اجرا پطرس بخاری نے کیا اور نیکو چلے گئے۔ ہم سب کسی نہ کسی مسئلہ میں الجھے ہوئے ہیں۔ ابھی تک پروفیسروں کا بھی انتخاب نہیں ہو پایا ہے۔ خیر تم تمہیں وغیرہ جمع کرادو اور قدامت پھر دو لیکن احتیاط

۔۔۔ مار بھنا۔“ کہہ کر وہ کمرے ہو گئے۔

کویا باہر جانے کا اشارہ کر دیا۔ وہ پرنسپل کے کمرے سے باہر نکل کر کلرک کی کمری پر پہنچی۔ وہاں پہلے سے ایک نو جوان کھڑا تھا۔ خوب گورا چٹا کسا اٹھالیو خنبرو اے جیسا۔ وہ بانو، جیسے ہی ایک جانب ہو گیا۔ نظریں پچی رہیں۔ فیس اور فارم لے کر کلرک نے نو جوان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”یہ اشفاق احمد ہیں آپ سی کی کلاس میں ہوں گے۔ میں نے ابھی انہی فارم وصول کیا ہے؟“

بانو نے ایک نظر اس نو جوان پر ڈالی اور نظریں جھکا لیں اس لیے کہ وہ نو جوان آنکھوں کے راستے دل میں اترتا جا رہا تھا۔۔۔ رسید لے کر تیر تیر باہر کی سمت چل دی۔ یہ اس نو جوان سے بالوں کی مللی ملاقات تھی۔

بانو جب ویر مشالہ میں تھی اور اس کی وجہ سے اس کی امی نے پند بکرنے والیوں کے ساتھ مل کر کراچی کھولا تھا تو اس میں چہرہ ای کی نوکری موسیٰ کو ملی تھی۔ لیکن جب پاکستان کا قیام مل میں آگیا اور ویر مشالہ کے تمام مسلمان پاکستان آ گئے تو موسیٰ بھی یہاں آگیا اور وہ ڈھونڈتا ہوا آ کر وہ صاحبہ کے کالج پہنچ گیا۔ ڈاکر نے اسے فوراً چہرہ ای کی ڈیوٹی سونپ دی۔ بانو نے کالج جانے کا ہوا تو اسے کالج پہنچانے کی ڈیوٹی داری اسی کو سونپی گئی۔ وہ بانو کو لے کر کالج کی سمت چلا۔ آگے آگے بانو اور اس کے پیچھے پیچھے بدستھاٹھ موسیٰ۔

بانو کے لیے وہ پہلا دن بڑا عجیب تھا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا کہ یہ ویر مشالہ تو ہے نہیں۔ سب نئے لوگ ہیں۔ یہاں نہیں کیسے کیسے لوگ ہوں گے۔ وہ کلاس میں داخل ہوئی جہاں ایک مشتعل میز پر بھی ہوئی تھی۔ ایک طرف لڑکے تھے اور دوسری طرف لڑکیاں۔ اس نے پہلے سے موجود طلباء اور طالبات پر نظر ڈالی سامنے کی طرف مولوی طوطا قمر صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ کئی لڑکیاں موجود تھیں مگر ان کی چپٹہ دروازے کی طرف تھی اس لیے وہ دیکھ نہیں پائی کہ کون کون ہے۔ وہ کچھ آگے بڑھی۔ آواز بیدہ اور ڈیکہ موجود تھیں۔ آپا کو دیکھ کر حوصلہ ہوا آپا نے اسے اپنے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ جا کر اس پر بیٹھ گئی۔

ابھی وہ جا رہا تھا کہ اس میں رکھ رہی تھی کہ دروازے سے وہی نو جوان داخل ہوا اٹھالیو شکل و صورت والا اس نے ’لمہ لی‘ لٹوار اور نیکی لکھروں والی قمیص پہن رکھی تھی۔ بیروں میں ’بارا‘ کی چٹل تھی۔ وہ بڑے اعتماد سے اندر آیا تھا اور مولوی طوطا سے برابر میں جا کر بیٹھ گیا تھا۔ پھر اس نے ایک نظر تمام

طلباء طالبات پر ڈالی۔ اسے دیکھ کر بانو کا دل ایک بار بھر زور زور سے دھڑکنے لگا۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ لڑکوں کے درمیان آکر بیٹھی تھی۔ یہ لڑکا پہلی ہی بار میں اس کے حواسوں پر چھانے لگا تھا۔ اس نو جوان نے بیٹھنے کے بعد قدرے اوچی آواز میں کہنا شروع کر دیا۔ ”میرا نام اشفاق احمد ہے۔ میں فیروز پور کے قصبہ کلکتہ سے آیا ہوں۔ وہاں میرے والدہ انگریز ڈاکٹر تھے پھر دیر سے دیر سے حیوان تعلق کا علاقہ بھی کرنے لگے۔ ہم آٹھ بہن بھائی ہیں اور اس وقت سونچ دیا کے مقابل 11 رنگ روڈ پر رہ رہے ہیں۔“

اس کے اس طرح خود اعتمادی کے ساتھ اپنا تعارف کرانا بانو کو اچھا لگا لیکن زبان سے کچھ بولی نہیں۔ یوں بھی اس وقت تک اپنا تعارف کرنا وہ بھی اس اعتماد کے ساتھ ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ لوگ جھکتے تھے۔ مولوی طوطا نے اس تعارف کو اس کی شوخی سمجھا کر ڈیکہ جو بلند شہر پولی سے آئی تھی وہ اس پر ہزار جان سے فدا ہو گئی۔ متواتر وہ چور نظروں سے اسی کی طرف دیکھنے جاری تھی۔ ابھی کمرے میں پہلے پروفیسر داخل ہوئے۔ انہوں نے آتے ہی اپنا تعارف انگلیش میں کرایا کہ میرا نام غلام محمد الدین ہے۔ پھر بلیک بورڈ پر جا کر کیمیکل لیٹر میں اپنا نام لکھا اور مٹر کسب کے چروں کا جائزہ لیا پھر اردو پر آگئے۔ گو کہ وہ زیادہ سنجیدہ انگلیش میں دیتے تھے مگر جب اردو پر آتے تو ایسی نکالی زبان بولتے کہ کارخانہ قلم خذ خودی سہل متع بن جاتی۔ کچھ میں ڈرامی بھی دشواری نہیں ہوتی۔

ان کے بعد دبلے پتلے اثر صاحب کلاس میں آئے۔ انہوں نے بھی انگریزی میں اپنا تعارف کرایا۔ کہ میں مدراس سے آیا ہوں اور اس وقت کنٹرولر آف ایکز امینیشن ہوں۔ میرا کمرالیز بڑ روم کے بالکل سامنے ہے۔ آپ میں سے جب بھی کسی کو کوئی دشواری ہو میرے پاس آ سکتا ہے۔ میں اس کے لیے ہر ممکن کوشش کروں گا۔

اثر صاحب سے جا کر کون کون ملا۔ یہ کسی کو خبر نہ تھی مگر بانو نے اعزازہ لگا لیا کہ اشفاق اور وہ بہت قریب آ چکے ہیں۔ اثر صاحب مدراس میں ڈپٹی کمشنر تھے لیکن پاکستان کی محبت میں سب کچھ چھوڑ چھڈ کر چلے آئے تھے۔ ایک اہم عہدہ کولات مار کر آئے تھے اور بیڈن روڈ کے عتب میں کشمی بلڈنگ کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں اپنی اہلیہ ممتاز کے ساتھ رہ رہے تھے۔ وہ اتنے سیدھے سادے تھے کہ کبھی زبان پر نہ لایا کہ میں ڈپٹی کمشنر چکا ہوں۔ وہ کالج سے گھر پہنچنے کے بعد اضافی آمدنی کے لیے ”سول اینڈ میٹری گزٹ“ میں

کچھ نہ کہتے بس حلقہ میں نظروں سے دیکھتے اور ان کا ہوں دیکھنا ہی کافی ہوتا۔ ہر کوئی سمجھتا تھا۔ اس دن ان کا کچھ کچھ زیادہ ہی طویل ہو گیا تھا۔ باہر بیٹھا موسیٰ کچھ پریشان ہو گیا۔ وہ کلاس روم تک پہنچا اور اس نے بلکہ ساہو روکھ کا کراہا اور بھانٹا کڑا کڑا صاحب کی نظر پڑ گئی۔ ابھی وہ اس کی طرف دیکھ ہی رہے تھے کہ اشفاق احمد اپنی جگہ سے اٹھے اور منہ پر ہاتھ رکھ کر کھانٹے ہوئے دروازے کی سمت بڑھے۔ ان کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ کھانسی روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ باہر گئے اور فوراً ہی لوٹ آئے۔ جب کلاس کے خاتمہ کے بعد ہالو باہر آئی تو موسیٰ نے کہا۔ ”وہ آپ کے کلاس کا گورا والا لڑکا کہہ رہا تھا کہ اس طرح جھٹکے نہیں ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟“

ہالو نے جواب دینے کی بجائے ہنس کر بات ختم کر دی لیکن ایک دو دن بعد ایک اور مسئلہ سامنے آ گیا۔ ہوا یہ کہ ہالو کا بھائی پرویز بھی کسی پر عروں کا شکار کر لیا کرتا تھا لیکن جب سے حرم شامل چھوٹا تھا اسے شکار کا موقع نہیں ملتا تھا۔ اتوار کی وجہ سے کالج بند تھا۔ وہ اپنی جھمرے والی ڈیزری بندھو جسے وہ حرم مشال سے ساتھ لے کر آیا تھا اسے صاف کر کے کالج پہنچ گیا۔ کالج کی چھتوں پر کبوتر رہ رہے تھے۔ اس نے کئی ایک کبوتر کو نشانہ بنالیا۔ اتفاق کی بات ہے ڈاکٹر صاحب آن چکے۔ انہوں نے پرویز سے بندھو چھنی اور اسے کہیں سے بھاگ دیا۔ اگلے روز انہوں نے ہالو سے کہا۔ ”مس قدیر چھتہ پرویز چھتہ آپ کا بھائی ہے؟“

ہالو نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”جی ہر۔“
”اس نے کالج کا رول توڑا ہے۔ کیسے کے کبوتروں کو مارنا منع ہے۔ اس نے ایک دو تین، تین تین کبوتروں کو مار دیا۔“

اشفاق احمد کھڑے ہو گئے۔ ”سر قدیر چھتہ پیٹھڑی علاقے سے آئی ہیں۔ پیٹھڑی شکار کے شوقین ہوتے ہیں۔ حرم مشال میں رہتے ہوئے ان کے بھائی نے ایک سیرخ بھی شکار کیا تھا۔“

”تو میں کیا کروں؟“ ڈاکٹر صاحب نے کلاسا جواب دے دیا۔

”سر پہلی غلطی ہے اسے صحاف کر دیں۔“
”میری غلطی پہلی غلطی نہیں ہوتی۔ ہر غلطی آخری غلطی ہوتی ہے۔“ ڈاکٹر صاحب نے جھلا کر کہا۔

ڈاکٹر صاحب کا موڈ دیکھ کر اشفاق بھی تھلا گئے تھے۔ انہوں نے پھر کہا۔ ”سر ایک باری تو معافی دینی

چاہیے۔“

ڈاکٹر صاحب نے انہیں نظر انداز کر کے ہالو سے کہا۔ ”اسے کالج سے رسترنٹ کیا جاتا ہے۔ اسے کالج بھیجیے۔“

ڈاکٹر صاحب کو اشفاق نے کچھ نہیں کہا مگر خود اٹھ کر کلاس سے باہر چلے گئے۔ اس وقت ہالو کو اپنا کاکوٹی تو ہے جو اس کا خیال رکھتا ہے۔ ایسی کئی چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی تھیں لیکن جو خاموش زبان سے بہت کچھ کہتی رہی تھیں لیکن اشفاق احمد نے اپنے منہ سے ابھی تک کچھ نہیں کہا تھا۔ اور کہتے بھی تو کیسے اس لیے کہ وہ جھرتی پھانٹتے تھے۔ جھرتی پھانٹ اپنے رسم و رواج کے قیدی ہوتے ہیں۔ منیر نیاز ی ہر بات میں دیر کر دیتے ہیں۔ احمد فراز شاعری میں پناہ و حوض لیتے ہیں اور اشفاق احمد خاموش رہ کر صوفی بن جاتے ہیں۔ اپنے پھانٹی وصف کی وجہ سے ہی اشفاق احمد کو شادی کر لینے کے اعتبار میں بھی سات سال لگ گئے۔ وہ بھی اگر مستاز مشقی جیک نہ بننے تو اور بھی دیر ہو جاتی۔ ادھر ہالو کا بھی یہی حال تھا۔ اس کی ای نے مخلوق تعلیم کے لیے اجازت دیتے ہوئے کہا تھا۔ ”کاکو تو ایک بوہ کی بیٹی ہے۔ تیرے سر پر باپ کا سایہ نہیں ہے جو عزت کی حفاظت کرے گا۔ تیرے بھائی کا مسئلہ ہے کہ وہ انجھنگ نہ کر سکا۔ لی اے بھی کر لے تو خوب ہے۔ اس لیے اپنی محافظہ تو خود ہے۔“

اس ایک جیسے نے اس کے منہ پر بھی شیب چکا دیا تھا۔ وہ چاہ کر بھی کچھ بول نہیں سکی اور پانچواں سال بھی گزر گیا۔ اسی دوران ایک دن محترمہ قاطرہ جناح دورے پر آئیں۔ ڈاکٹر صاحب کے کام کوسرا اور کہا کہ اس وقت ملک کو ہیومن ریورس کی ضرورت ہے۔ آپ جیسی عورتوں کو آگے بڑھنا ہوگا۔ وطن کو فکری افسران کی ضرورت ہے اگر کہیں اور جانے کا کہا جائے تو انکار مت کیجئے گا۔“

ڈاکٹر صاحب نے ہاں کہہ دیا۔ اس کے کچھ دن بعد ہی ان کے نام پر لیز آ گیا کہ آپ کا تھوڑا شیخو پرہ کیا جا رہا ہے۔ اور وہ شیخو پرہ چلی گئی، ان پکڑ آف اسکول بن کر پرویز اور ہالو بھی ساتھ گئے مگر ایک مسئلہ تھا۔ ہالو کا ایم اے کا سال آخر تھا اور پرویز کی پڑھائی بھی جاری تھی مجبوراً ان دونوں کو واپس لاہور آنا پڑا۔ ان کے لیے نوب اور لاہور کو ساتھ کر دیا گیا۔ ساعدہ کا گھر ان کے لیے سازگار ثابت ہوا تھا کہ اب کوئی روکنے کوئے والا بھی نہیں تھا۔

ادھر فائل امتحان کا وقت بھی آ گیا۔ پنجاب یونیورسٹی

ہال میں امتحان ہوتا تھا۔ اب اشفاق احمد کی دونی والا ناک بھی تم ہو چکا تھا۔ انگوٹھی کا ڈراما بھی ٹیل ہو چکا تھا۔ اب کم کم سی دنوں میں ملاقات ہوتی۔ امتحان ہال میں دونوں تھے مگر الگ الگ اور چپ چپ۔ چوتھے پرپے والے روز اشفاق احمد اپنی جگہ سے اٹھے اور ہالو کی میز کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ اپنا قلم آگے بڑھا کر بولے۔ ”پلیز روشنائی دے دیں۔“

انہیں وہاں کھڑا دیکھا تو انگوٹھی لیر ہاٹا ہوا آیا اور ہلا۔ ”کیا بات ہے یہاں کیوں کھڑے ہو؟“

اشفاق احمد نے ہالو کی میز پر رکھی دوات اٹھا کر کہا۔ ”میری انک ختم ہو گئی ہے۔ ان محترمہ سے مانگ رہا ہوں۔“

انگوٹھی لیرنے سخت انداز میں کہا۔ ”آپ کو پتا نہیں ہے کہ امتحان ہال میں کسی دوسرے سے باتیں کرنا منع ہے۔“ پھر اشفاق احمد کو کہتے ہوئے وہ ہولا۔ ”آپ اشفاق احمد ہیں نا۔ وہی ایک محبت سوافسانے والے میں نے وہ مجموعہ پڑھا ہے۔ کیا خوبصورت افسانے ہیں۔“

گو یا وہاں اشفاق احمد کا یہ جرم چھپ گیا۔ معافی مل گئی۔ پرچہ دے کر سب باہر آئے۔ اس دن پہلی بار ہالو کی ملاقات اشفاق احمد کے کسی گھر والے سے ہوئی۔ وہ ان کا چھوٹا بھائی تھا۔ اشفاق احمد نے تصدیق کر لیا۔ ”یہ میرا چھوٹا بھائی اشفاق احمد ہے۔ نانا نانا فوج میں جھرتی ہوا ہے۔“ اور پھر بھائی کی طرف مڑ کر بولے۔ ”یہ قدیر ہیں۔ میری ہی کلاس میں پڑھتی ہیں۔“

یہ پہلی ملاقات ہی دونوں کو قریب لے آئی۔ وہ جب واپس کا کول چلا گیا تو وہاں سے بھی ہالو کو خط لکھتا جس کا وہ پابندی سے جواب دیتی۔
امتحان گزر چکے تھے۔ اب چھٹی ہی چھٹی تھی۔ ہالو اپنے لان میں لگے گھریلو بولے پر جھول رہی تھی کہ باہر کا بڑا سا کالا کیت کلا۔ پہلے سائیکل کا پھیا اندر آیا پھر دو گھرے ہاتھ نظر آئے جن پر سنہری ہال تھے۔ ہالو ادھر ہی دیکھنے لگی تھی کہ اندر آنے والا گیا۔ اس نے سائیکل کو ایک طرف کھڑی کی اور ہالو کی طرف بڑھا۔ اسے دیکھ کر ہالو بری طرح گھبرا گئی۔ اس کے ہاتھ پیر پھول گئے تھے۔ اسے مطلق امید نہ تھی کہ وہ کمریک آجائے گا۔ مگر وہ آ گیا تھا۔ اب ہالو اسے گھر سے نکال بھی نہیں سکتی تھی اس لیے اس نے صرف اتنا کہا۔ ”آپ؟“

”جی میں۔“ جواب میں اس نے اتنا ہی کہا۔

ہالو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کہاں بٹھائے۔ جھولے کے پاس ڈگڈگی نما کی موٹر سے رکے تھے مگر اس پر اسے بٹھانا عجیب سا لگا۔ وہ برآمدے کی طرف بڑھ گئی۔ ادھر کھڑکیاں رکھی تھیں جن پر اس کی ای فٹری امور کو نشانیا کرتی تھیں۔ اس نے اشفاق احمد کو مڑ کر دیکھا وہ اس کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ان کو یہاں کا پتا کس نے دیا ہوگا۔ ابھی اشفاق احمد خود ہی بولے۔ ”میں ریزی سے لٹے آیا ہوں۔ اس سے ایک کتاب کا نائل بٹھانا ہے۔“

اب وہ اور بھی الجھ گئی کہ اسے پرویز کا گھر لے نام کس نے بتایا۔ ریزی اسے صرف ای کہتی ہیں یا میں۔ انہیں کیسے معلوم ہوا یہ نام۔ وہ ابھی ابھی سی آگے ہی بدھتی رہی اور پھر کرسیوں کی طرف اشارہ کر کے اشفاق احمد سے بولی۔ ”آپ یہاں بیٹھیں میں ابھی آئی۔“

وہ انہیں بٹھا کر اندر کی طرف بھاگی۔ نوب پڑے کی آڑ میں کھڑی ہوئی باہر بھاگ رہی تھی۔ ہالو نے اس سے کہا۔ ”جلدی سے لاہور کو بیچ کر تنک پارے اور برنی منگوا لو۔۔۔۔۔۔ ہاں چائے بھی تیار کرو۔“

نوب نے اس کی بات کو نظر انداز کر کے پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟“

”یہ میرے ساتھ کالج میں پڑھتے ہیں۔ ابھی یہ ریزی سے لٹے آئے ہیں۔“

”اتنے سوہنے ہائے رہا اتنے سوہنے۔“ نوب نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔

”جلدی کرو۔ وہ زیادہ دیر بیٹھیں گے نہیں۔ لاہور کو بیچ کر نشتے کا سامان منگوا لو۔“

وہ باہر آ کر اشفاق کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اشفاق احمد نظریں جھکائے کسی دھن کی طرح بیٹھے تھے۔ اس سے سامنے بیٹھا محسوس کر کے بولے۔ ”آپ کو معلوم ہے میں حرکت روڈ پر رہتا ہوں۔“

”جی پتا ہے۔“ اس نے بھی اشفاق احمد کی طرح دھیمی آواز میں جواب دیا۔

”کیا آپ جانتی ہیں کہ جب ہم لوگ پاکستان آئے تو پہلے اپنی خال رشیدہ کے یہاں ٹھہرے تھے لیکن جلد ہی ہمیں حرکت روڈ کا پتا چلا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت ہم بے سروسامانی میں تھے۔ تو اور میں چھوٹے تھے۔ جو بھائی کراچی میں تھے۔ بابا جی میرے والدہ اپنی کل بی بی باریڈار کے اس پار چھوڑ آئے تھے۔ اس وقت اقبال بھائی اپنی اگری کو الگ

رکھ کر ایک ایسا کام کرنے لگے جس بارے میں ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ بکرا منڈی سے ایک بکرا خریدتے اور اسے کندھے پر اٹھا کر شہر کا چکر لگاتے۔ وہ بکرا بکنا تو وہ خوش ہو جاتے۔ بکرے سے ہونے والی آمدنی کو وہ اماں کے حوالے کر کے بھرے باہر نکل جاتے۔ اتنا پڑھ لکھ کر وہ ایسا کام کر رہے تھے۔

”جی۔“ ہانو نے بھر بھرا کہا۔

اشفاق احمد نے پھر سے سلسلہ کلام جوڑا۔ ”بھر میں نے سوچا کہ مجھے بھی کوئی کام کرنا چاہئے۔ نوکری تلاش کرنا بہت ضروری ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میں اس دفتر پہنچ گیا جہاں نوکری دی جا رہی تھی۔ ایسا ہیٹ آفیس میں درخواست جمع کرادی۔ دسویں کی سند جمع کر کے وائٹن کمپ میں نوکر ہو گیا۔“

”جی۔“ ہانو نے جواب دیا۔ اس وقت ہانو کا چہرہ دیکھ کر کوئی بھی اعزازہ لگا سکتا تھا کہ اسے اشفاق برترس آرہا ہے۔ اشفاق احمد اپنی دوسری کہتے گئے۔ ”وائٹن کمپ میں ہر طرف اجڑے بھڑے لوگ بھرے پڑے تھے، ایسے سینکڑو لوگ تھے جو انڈین سے بھڑے گئے تھے۔ یہ لوگ بڑی کم پرسی کی حالت میں تھے۔ میرا کام یہ تھا کہ وہاں آنے والوں کے نام اور دیگر کٹافٹ لکھوں۔ ان کی شکایات لکھوں۔ ایک نمبر حرکت روڈ سے پیدل وائٹن کمپ تک جاتا تھا۔ واپسی پر تھک کر چور ہوتا تھا۔ وائٹن میں ہی میری ملاقات مفتی سے ہوئی ممتاز مفتی سے اور پھر یہ دوستی گہری ہوئی چلی گئی۔“

اشفاق احمد جیسا داستان گو ہوا ہونیان کے سفر میں کھوئی گئی تھی۔ اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ اشفاق احمد اسے انٹرنیشنل کر رہے ہیں۔ اس کے پاس بیٹھنے کا جواز ڈھونڈ چکے ہیں۔ مگر ان کی نگاہیں بار بار دروازے کی سمت اٹھ رہی تھیں۔ جیسے وہ پرویز کی راہ دیکھ رہے ہیں۔

ہانو سوچ رہی تھی کہ یہ اکیلے بولے جا رہے ہیں۔ کہیں برمانہ مان جائیں کہ میں ان کی باتوں میں دلچسپی نہیں لے رہی۔ اس لیے اسے بھی بولنا چاہیے۔ لیکن گیمبرہٹ اس طرح اس پر طاری تھی کہ وہ سوچ بھی نہیں پاری تھی کہ اسے کیا بولنا چاہیے۔ جیسے ہی اشفاق احمد خاموش ہوئے اس نے کہا۔ ”میں آپ کو اپنا اہم دکھاؤں؟“

”جی ہاں ضرور دکھائیں۔“ اشفاق احمد جلدی سے بولے۔

ہانو اٹھ کر اندر گئی اور ایک اہم اٹھالائی۔ اہم دیکھ کر

اشفاق احمد نے دلچسپی کا اظہار کیا اور پوچھا۔ ”یہ آپ کی فلیکس اہم ہے؟“

”جی نہیں یہ تو میں نے خود بنایا ہے۔“ کہتے ہوئے ہانو نے اہم ان کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا۔

اشفاق احمد نے پہلا بیچ کھولا اور ان کے چہرے پر حیرت چھا گئی۔ وہ اہم ایم اے کی ایک طالبہ کی بھی اور اس میں تصویر اخبارات سے کاٹ کر لگی ہوئی تھی۔ دوسرا صفحہ کھولا اس پر بھی کسی اخبار سے کٹی ہوئی تصویر چسپی ہوئی تھی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ کہیں یہ مجھے بے وقوف تو نہیں بتا رہی ہے؟ بالآخر انہوں نے پوچھ لیا۔ ”یہ کیا ہے؟“

”یہ میرا شوق ہے۔ مجھے جتنے فلمی اداکار پسند ہیں میں ان کی تصویر کاٹ کر اس میں چسکا لیتی ہوں۔ ہے نا دلچسپ۔“ ہانو کا سوال اتنا محضمانہ تھا کہ اشفاق احمد نے کہا۔ ”ہاں دلچسپ ہے۔ لگتا ہے آپ کو کنڈن لال سہگل بہت پسند ہے؟“

”جی ہاں۔ آگے دیکھیں رینو کا دیوی کی بھی تصویر ہے۔“

اشفاق احمد نے اس کا دل رکھنے کے لیے کئی صفحے پلے لیکن مذاق نہیں اڑایا کہ یہ بھی کوئی شوق ہے۔ بس ورق پلٹتے رہے پھر بولے۔ ”آپ کے بھائی کا کیا زبردست شوق ہے۔ کتنی عمدہ تصویر بناتے ہیں۔ کیا آپ کا ایسا کوئی شوق نہیں ہے؟“ ہانو پر اب تک گیمبرہٹ طاری تھی وہ جلدی سے بولی۔ ”ہاں کتنی کتنی میں کہانیاں بھی لکھتی ہوں۔“

اشفاق احمد کے چہرے پر دلچسپی کا عکس لہرایا۔ وہ بولے۔ ”یہ تو زبردست شوق ہے۔ کیا آپ مجھے اپنی کوئی کہانی دکھائیں گی؟“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ میں ابھی لاتی ہوں۔“ کہہ کر وہ اندر گئی اور بنڈل کی صورت میں بہت سارے اوراق اٹھا لائی۔ اشفاق احمد نے اس کے ہاتھ سے وہ پلندہ لیا اور بڑی دلچسپی سے اسے دیکھنے لگے۔ ایک کے بعد ایک وہ کہانیوں کو دیکھتے چلے گئے۔

ہانو کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ کہانیاں دے کر بچھتا رہی ہے۔ اس لیے کہ اسے اب احساس ہو رہا تھا کہ اس نے غلط کیا ہے۔ جس کی کہانیاں ملک بھر میں مشہور ہیں۔ جس کا مجموعہ ”ایک محبت سوانح“ کی ہر طرف دھوم ہے اسے میں نے اپنے نانا پر لکھنے کے بارے میں دے دیے ہیں۔ وہ اسے پڑھ کر کیا سوچتا ہوگا۔ لیکن اشفاق احمد کے چہرے پر ایسی کوئی علامت

نظر نہیں آ رہی تھی جس سے اندازہ لگایا جاسکتا کہ اسے یہ افسانے پسند نہیں آ رہے ہیں۔ اتنے انتہاک سے وہ پڑھ رہے تھے جیسے کسی بڑے فلکار کی کہانیاں ہوں۔ پھر وہ سر اٹھا کر بولے۔ ”کاش آپ صفحہ نمبر نہیں ڈالتی ہیں۔ اس سے تو بیچ ادھر اُدھر ہو جانے کا خطرہ ہے۔“

”وہ بات یہ ہے کہ جلد بازی میں نمبر ڈالنا بھول گئی۔ ابھی تو یہ دفع ہے نا۔ بعد میں جب اسے صاف کروں گی تو نمبر بھی ڈال دوں گی۔“ ہانوں نے اپنی غلطی پر پردہ ڈالنا چاہا۔

”اتنی احتیاط کریں۔“ کہتے ہوئے اشفاق احمد کھڑے ہو گئے۔ ”لگتا ہے ریڑی کہیں دور نکل گئے ہیں۔ اب میں چٹا ہوں پھر کبھی آ جاؤں گا۔“

اشفاق احمد چلے گئے لیکن ہانوں کو ایسا محسوس ہوتا رہا جیسے وہ اب بھی اسی کرسی پر بیٹھے ہیں۔ اتنی دیر تک وہ بیٹھے رہے تھے لیکن ایک بار بھی انہوں نے اس کی طرف نظر اٹھا کر بغور نہیں دیکھا تھا۔ جیسے کالج میں نظرس جھکا کر باتیں کرتے تھے۔ اس وقت بھی ان کا وہی انداز تھا۔ اس وقت ہانوں نے سوچا کہ کہیں میں نے غلط تو نہیں سمجھا۔ وہ تو ایسے باتیں کر رہے تھے جیسے میری کوئی اہمیت ہی نہیں۔ اگر مجھ میں وہ دلچسپی لے رہے ہیں تو پھر مجھے نظر انداز کیوں کر رہے تھے۔ یقیناً میری غلطی ہے کہ میں ان کی آمد کو غلط سمجھ بیٹھی۔ کافی دیر تک وہ خود سے الجھتی رہی۔ پھر اس نے اپنے دل کو سمجھایا اور سونے کے لیے اپنے روم کی طرف چل دی۔ یہ وقت اس کے سونے کا نہیں تھا پھر بھی وہ خود سے فرار کی خاطر اپنے بیڈ پر ڈھلے گئی۔

ابھی دو چار دن ہی گزرے تھے کہ وہ پھر آ گئے۔ اس بار بھی ان کی آمد سے وہ گھبرا اٹھی۔ شاید اس لیے کہ اس کے دل میں چور تھا۔ وہ بھی سمجھ رہی تھی کہ وہ اس کے لیے آتے ہیں۔ اس بار اشفاق احمد نے آتے ہی کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تمہارے افسانے پڑھیں۔ یوں لگے کہ گھر میں پڑے رہنے سے بہتر ہے کہ وہ قارئین کے سامنے آئیں۔ قارئین ہی رضائی کرتے ہیں۔“

اس نے اپنے دو تین افسانے انہیں دے دیے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ افسانہ مانگنے کے بہانہ آئے ہیں۔ انہوں نے ایک نیا بہانہ ڈھونڈا۔ وہ نہ میرے افسانے ایسے کب ہیں کہ کوئی رسالہ انہیں چھاپے۔ لیکن ایک ڈیڑھ مہینے بعد اسے خبر ملی کہ اس کا ایک افسانہ ادب لطیف میں چھپ گیا ہے۔ وہ رسالہ لے کر خود آئے تھے۔ آتے ہی انہوں نے کہا کہ ہمارا

آپ کا افسانہ چھپ گیا۔ اس نے بے مبری سے رسالہ کھولا۔ درمیان کی شوق کے عنوان سے اس کا افسانہ ادب لطیف میں شامل تھا۔ افسانے کے اوپر قلم سے لکھا تھا۔ ”کاش ایسا افسانہ میں خود بھی لکھ سکتا۔“

افسانہ چھپنے پر اس کی خوشی دیدنی تھی۔ اس کی ایک درخشاں بات پوری ہوئی تھی۔ افسانے پر قدرتی جھٹکے بجائے ہانوں قدرتی لکھا تھا۔ اس کی توجہ انہوں نے یہ دی کہ جھٹکے غیر شاعرانہ نام ہے جب کہ ہانوں قدرتی دردمم ہیں۔

اس ایک افسانے سے اس کی ادبی زندگی شروع ہو گئی۔ اشفاق احمد آتے۔ اسے دن لائن دیتے جس پر وہ کہانی تیار کر لیتی۔ اب اس میں خود اعتمادی سی آگئی تھی۔ اسے اشفاق احمد نے باضابطہ قلم کا بنا دیا تھا۔ اس کے اندر کی معنویت کو جاننے کے لیے انہوں نے اسے ”داستان گو“ کا ایڈیٹر بنادیا۔ اس بہانے اسے دوسرے فلکاروں کی تحریریں پڑھنے کا زیادہ موقع ملنے لگا تھا۔ دوسروں کی تحریریں پڑھنے سے اسے لکھنے کے نئے نئے زاویے مل رہے تھے۔

1950 سے 1955 کا دور اس کے لیے بڑا طوفانی تھا۔ اس کی پوشنگ ملتان ہو چکی تھی۔ وہ وہیں رہ رہی تھیں۔ وہ ماں سے ملنے کے بہانے کبھی ملتان چلی جاتی۔ وہاں پہنچتی تو اشفاق احمد خط کے ذریعہ اس کی خبریت پوچھتے۔ نئے نئے ادبی مشورے دیتے پھر جب وہ لاہور لوٹ آتی تو اشفاق صاحب خود چلے آتے۔ بے ربط سی ملاقاتیں ہوتیں۔ ایسا لگتا کہ دونوں طرف آگ برابر کی لگی ہوئی ہے لیکن زبان سے کوئی بھی اقرار نہیں کر رہا تھا۔ ادھر اشفاق احمد نوکری کے لیے بھی پریشان تھے اور نوکری سے بھی پریشان تھے۔ اب تک ریڈیو سے ہی وابستہ تھے۔ نوکری ٹرانسفر لازمی ہے۔ اس لیے بھی انہیں جہلم پہنچ دیا جاتا اور کبھی مری۔ لیکن اس وقت میں بھی وہ اسے خط لکھنے سے پیچھے نہیں ہٹتے۔ ان کی نوکری اس ریڈیو اسٹیشن میں تھی جوڑک پر قائم کیا گیا تھا۔ تاکہ ان کی آواز بغیر کسی الجھن کے انڈیا تک پہنچتی رہے۔ ان کا مقبول ترین پروگرام ”ہم آگئے“ مقبوضہ کشمیر اور مشرقی پنجاب میں بھی پسند کیا جاتا تھا۔ اس پروگرام کی خاص بات یہ تھی کہ انڈیا جو ریڈیو کاش آکاش والی سے کرتا وہ فوراً اس کا جواب دیتے۔ جیسے ہی بھارتی پروگرام ختم ہوتا اسی دہانے پر یہ اپنا پروگرام شروع کر دیتے۔ ان تمام ریڈیو کاش کا جواب دینا شروع کر دیتے۔ جیسے ہی وہ کہتے ”ہم آگئے“ تو ریڈیو سے گویا چپک جاتے۔ کئی مہینوں کے درمیان وہ جواب نظر کرتے

ہے۔ ایسا جوابی حملہ ہوتا کہ آکاش والی والے سوچتے رہ جاتے۔

یہ ریڈیو اسٹیشن ٹرک پر۔ شور شرابے کے درمیان کھڑا ہوتا اس لیے باہر کا شور اندر تک نہ گونجتا تھا۔ اس پریشانی کا علاج ہانوں نے کیا تھا کہ تمام صدا کار بڑی بڑی رضائی اوڑھ لے کر باہر کی آواز صدا کار کی کے وقت پریشان نہ کرے اور نہ یاد الوں کو اس اسٹیشن کا کل وقوع سمجھ میں نہ آئے۔ اشفاق احمد بڑی دلچسپی سے اس پروگرام کا اسکرپٹ لکھتے تھے۔ یہ پروگرام ”تلقین شاہ“ کی ابتداء تھی جو 39 سال ریڈیو پر چلتا رہا۔ اس پروگرام سے ان کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ بابا جی محمد نان کا انتقال ہوا اور گھر مہمانوں سے بھر گیا۔ سب دلاسہ بیٹے سب کی نظر سے چھپ کر تلقین شاہ کی اسکرپٹ لکھنے میں مصروف رہے۔

ریڈیو سے نقل نام و ابھگی کے بعد بھی انہیں چین نہیں ل رہا تھا اس لیے انہوں نے نقل نام نوکری سے استعفیٰ دے کر دیال سنگھ کالج میں ٹیکسچر کی نوکری تلاش کر لی۔ اس دوران بھی وہ ریڑی سے ملنے کے بہانے ہانوں کے گھر آتے رہے۔ مگر زبان سے ابھی تک وہ لفظ ادب انہیں لکھا تھا جسے سننے کے لیے ہانوں نے تاب نہ کی۔ وہ اکثر سوچتی کہ اس خوبصورت گوشتے آدمی کو کیا خبر کہ وہ لڑکی جو سانسہ کلاں سے پھیل چل کر ٹھنک آئی ہے اور پھر وہاں سے بس کے ذریعہ گورنمنٹ کالج کے مقابلے اسٹاپ پراتی ہے اس کے دماغ میں بھی خناس بھرا ہے۔ جو کسی گویا بھی تک اپنا راز دار واری بنائیں پاتی ہے۔ اسے بھی بے مبری سے صرف ایک لفظ سننے کی آرزو ہے جو اس کو نکلے آدمی کو ادا کرتا ہے۔

اسی دوران ایک اور بات ہو گئی۔ اشفاق احمد کے نام روم سے ایک خط آ گیا۔ وہ خط روم یونیورسٹی سے ملتی ادارہ ISMEO کی جانب سے آیا تھا۔ ان لوگوں کو اردو کے ایک پیکر کی ضرورت تھی۔ کافی پہلے اشفاق احمد نے ان کے ہاں درخواست دی تھی یہ اسی کا جواب تھا۔ وہ خط لے کر پرنسپل کے پاس پہنچے۔ انہوں نے خط دیکھ کر کہا۔ ”یہ ہے کیا؟“

اشفاق احمد نے کہا۔ ”یہ نوکری کا پروانہ ہے۔“

”مگر یہ تو اعلیٰ درجہ کی زبان میں ہے؟“

”جی ہاں وہاں کی رائج زبان میں خط دیا گیا ہے۔“

”خوب! ابھی طرح سوچ لو لگی لگی نوکری چھوڑ کر جا رہے ہو کہیں ایسا نہ ہو کہ ٹھوکر کھا جاؤ؟“

”نہیں ادارہ معتبر ہے۔“

کئی اور لوگوں نے بھی سمجھایا کہ بغیر سوچے سمجھے جا رہے ہو ایسا نہ ہو کہ بعد میں پچھتاوا ہو۔ انہوں نے کسی کی نشی اور روم چلے گئے۔ وہاں جا کر بھی وہ ہانوں کو نہیں بھولے تھے۔ ہر ایک دور و روز بعد وہاں سے ہانوں کو خط لکھتے۔ ان خطوط میں صرف ادبی ہدایت نامہ ہوتا۔ داستان گو سے متعلق مشورے ہوتے۔ ہانوں خط پڑھتی جواب لکھتی لیکن وہ بھی ایسا کچھ نہیں لکھ پاتی تھی جو لکھنا چاہتی تھی۔ یہی حال اشفاق احمد کا تھا۔ وہ بھی ایسا کچھ نہیں لکھ سکتے تھے جسے قول و قرار کہا جاسکتا۔ ان کی زندگی میں 1950 سے 1956 تک بڑے طوفانی ایام گزرے تھے۔ 1952 میں انہوں نے ملک سے فرار کا اہتمام کیا تھا اور 1955 تک ISMEO میں پڑھانے کا اہتمام کیا۔

اشفاق احمد کی طرح یہ ایام ہانوں کی زندگی میں بھی طوفانی رہے۔ لاہور کالج فار ویمینز میں جاب کی آخر ہوئی لیکن ڈاکرہ چھٹہ بنے جی کو سمجھایا۔ ”مورت جب مالی طور پر بیمار ہو جاتی ہے تو شادی کے قابل نہیں رہتی۔“

ماں کے سمجھانے پر اس نے بھی نوکری سے خود کو دور رکھا۔ جب لاہور میں وقت گزرتا مشکل ہو جاتا تو وہ ماں کے پاس ملتان چلی جاتی اور جب وہاں بھی بدعت کھینچنے لگتی تو وہ وہاں سے لاہور آ جاتی۔ ملتان آتی تو اسے گزرے دن یاد آ جاتے کہ پہلے وہ جب بھی ماں سے ملنے ملتان آتی تھی تو دو چار دن کا وقفہ دے کر اشفاق احمد بھی پروڈ سے ملنے کے بہانے ملتان آ جاتے۔ ان کی باتوں سے خطوط سے ہانوں کو ایک نئی امید بندھ جاتی۔ وہ خوابوں میں کھو جاتی۔ ایسا لگتا کہ جیسے وہ ٹھہرے پانیوں میں پھر پھینک کر ظالم پیدا کرتے ہیں اور پھر اپنے گھر والوں، قبائلی رسم و رواج کے خوف سے سر پٹ بھاگ لیتے ہیں۔ دراصل ان کی سرشت میں شامل تھا کہ وہ کبھی کسی کی دل آزاری نہیں چاہتے تھے۔ ان کی یہی کوشش ہوتی کہ دوست دشمن سب سے ان کی بڑی رہے۔

وہ ان دنوں لاہور میں تھی کہ روم سے اشفاق احمد کا خط آ گیا جو انہوں نے اس کی ای کی لکھا تھا۔

”آپ کا خط ملا۔ جتنی بار اسے پڑھا اتنا حیرہ آیا۔ گو کہ یہ خط کاکی والے خط کی پشت پر تھا لیکن میں نے سب سے پہلے اسی کو پڑھا۔ کینٹین کے کواٹر پر بیٹھے بیٹھے اسے کئی بار پڑھا۔ کینٹین میں کتنے ہی گاہک آتے اور چلے گئے لیکن میں پڑھتا رہا۔“

جاتی دفعہ میں نے میرے کوڈل ٹپ دی تھی یعنی پورے میں لیرے۔ پاکستانی کرکسی میں دو آنے (2017) میں دو لیرا پاکستانی کرکسی میں ایک روپیہ چار آنے پہنچ گیا) دینے تھے۔ میرا اتنا خوش ہوا کہ بار بار جھک کر مگراتے کرتا، کہتا رہتا تھا۔ یہاں عام طور سے دس لیرے ٹپ دینے کا رواج ہے۔ یہاں کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ بارش بھی بھی برس سکتی ہے۔ ابھی مطلع صاف اور ابھی بو عید چمکنے لگیں۔ اس لیے ہر کوئی اپنے ساتھ ایک پھتری یا برساتی کوٹ ضرور رکھتا ہے۔ سبزیاں بہت سستی ہیں۔ یہاں سب سے مہنگی چیز مکان ہے جو اسے دو لمے سے سو روپے ماہانہ پر ملتے ہیں، مکانوں سے مہنگے ڈاک کے ٹکٹ ہیں۔ مجھ سے افسانہ مانگنے والے یہاں بھی پچھانیں چھوڑتے اس لیے مجھے ڈاک کے ٹکٹ کا انتظام رکھنا پڑتا ہے۔ باتی روم ہر مضمون میں سستا اور اچھا ہے۔ لوگ بہت اچھے اور امن پسند ہیں۔ کیونکہ غریب اور احساس کمتری کا شکار ہیں۔ یہاں کوئی کسی سے الجھتا نہیں۔ اگر بات بکڑ بھی جائے تو سرٹش کرنے سے زیادہ بات نہیں بڑھتی۔ کسی کو ایک ملنا بھلا مارنا ٹکٹ کے برابر ہے۔ یہاں کی سب سے بڑی گالی۔ ”چل دفع ہو جا“ ہے۔ اگر کسی کو کھ دیا تو وہ مارنے مرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔

یہاں کے لوگ پاکستان کو امیر ملک سمجھتے ہیں کیونکہ سر آغا خان پاکستان کے ہیں اور ریتا بیروٹھ پاکستان کی بہو ہے۔

نہیں رہا ہے اس لیے کہ میری وہ کتابیں جو مجھے آنکھیں پر
چادر ڈھکنی ہیں جو میری کل پوچی کھا چکی ہیں ان کو پیکر
کیا جائے سمجھ نہیں آتا۔“

ای! آپ کا کسی سے کچھ نہ بولا کریں۔ وہ ایسا ہے
لکھتی ہے کہ یقین نہیں آتا کہ یہ سب اس کے دماغ سے
ہے۔ فقط اسنو

”بھائی کیا مجبوری ہے؟ تم یہ فیصلہ کیوں کر رہے ہو۔“
 ”مجبوری میری نہیں میرے بھائی کی ہے۔“ انہوں
 نے ملے دل سے کہا۔ ”لیکن ایک بات کا خیال رکھنا
 گا۔ مرکز روڈ کے حالات صحیح نہیں ہیں اس لیے ابھی اس خبر
 راز میں ہی رکھنا ہے۔ کیونکہ اماں جی کی حالت ابھی نہیں

مگئے۔ ان کا وقت زیادہ تر خانہ کے ہاں ہی گزرتا۔ پھر بانو مکی 455.N سمن آباد میں منتقل ہو گئیں۔ یہیں سے داستان گو نکالا جانے لگا۔ یہیں ان کے گھر میں پہلی علقاری کوئی۔ ان کے گھر پہلے بیٹے امین کی پیدائش ہوئی۔ وہ تاریخ تھی 18 اکتوبر 1957ء۔ جیسے ہی ذکیرہ چھٹھ کو احساس ہوا کہ بانو کے ماں بننے کا وقت قریب ہے انہوں نے اسے بہن کے ہاں بھیج دیا۔ ساتھ میں نو سو روپے کے لیے بنائے گئے چھوٹے چھوٹے کپڑوں کی پوٹی بھی کر دی۔ بانو اچھا جی کے ساتھ 450 N میں جا پہنچی۔ کسی نے ڈیڑی جی کو خبر دے دی تھی۔ وہ ہاتھ سے آئے اور بانو کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ خالد نے حسین کی بی بی کو فورا بلا لیا۔ وہ بانو کو لے کر اصرار والے کمرے میں چلی گئی۔ جس وقت امین کی پہلی جج کوئی جج کی عہد کی اذان ہو رہی تھی۔ حسین بی بی نے بچے کو نہلا کر ڈیڑی جی کی کوڑی ٹال دیا۔ انہوں نے۔ بسین شریف جو وہ مسلسل پڑھ رہے تھے۔ اسے تپائی پر رکھی اور بچے کو گود میں لے کر کانوں میں اذان دی اور پھر بچے کو اشفاق احمد کی گود میں دے دیا گیا۔ وہیں اس کا نام امین تجوید ہوا۔ پھر پورے ایک سال بعد سولہ ستمبر 1958ء کو انیس پیدا ہوا۔ تیسرے بیٹے اشقر کی پیدائش 15 جن 1962ء کو ہوئی۔

دو۔ وہ بچوں کے علاج کے ماہر ہیں۔ ایک ہار کی دوا سے یہ اچھا ہو جائے گا۔

اس دن تو گری اور بھی سخت تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ دھوپ کی گرمی برہمگی بن کر جسم جمید دے گی۔ لیکن بچے کی حالت دیکھ کر دونوں باہر نکل آئے۔ ہالو نے بچے کو اچھل میں چھپا رکھا تھا تاکہ اس پر سورج کی گرمی نہ پڑے۔ دونوں تیز تیز قدموں سے چلے پڑے۔ پانچ کا ٹیکہ میکوز روڑ پر تھا۔ وہاں تک پہنچ جانا ممکن نہ تھا۔ تاہم اسٹینڈ تک پہنچنے پہنچنے ہی ان دونوں کی حالت خیر ہو گئی تھی۔ اسٹینڈ پر پہنچ کر پتا چلا کہ اصر کوئی تاٹا جاتا نہیں ہے۔ انہیں سالم تاٹا لینا پڑے گا جس کا کرایہ بارہ آنے ہوں گے۔ سمجھو گی بھی اس لیے انہیں بارہ آنے کی قربانی دینی پڑی۔

کلینک پر پہنچے۔ ڈاکٹر موجود تھا۔ اس نے بچے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ انھوں نے بچے کو اٹھا کر دیکھے۔ پھر ہالو سے بولے۔ ”تم لوگ کیسا بھڑت ہے۔ اس کو اب آخری وقت میں لے کر آیا۔ اس کا بدمعاشی فریڈٹ کر دے گا۔“

ہالو اتنا سننے ہی روئے لگی۔ وہ دوپٹے میں منہ چھپا کر رو رہی تھی کہ ڈاکٹر نے دو تین شیشیوں میں سے دوا اٹھ کر ایک چھوٹی شیشی میں سفید رنگ کا مٹول تیار کیا اور پھر اس میں اپنی دراز سے کوئی پڑیا نکال کر شامل کیا اور اس مٹول کو ہلاتے دیکھ کر کہتے ہوئے بچے کے قریب آئے۔ اشفاق احمد نے بچے کو گود میں لے رکھا تھا۔ ڈاکٹر نے بچے کے سونے کے جڑے میں اٹکی ڈال کر کسی غلام جلاوی طرح اس کا منہ کھولا اور اس نیچے سے منہ میں وہ مٹول ڈال دیا۔ بچے پر طاقت طاری تھی۔ اس نے بشکل دوا اصر کی۔ اشفاق احمد بچے کو کندھے سے لگائے کمرے سے اترے اور ہالو اس کی پیٹھ پر ہولے ہولے چھکی دے دی تھی۔

مٹول بچے کے پیٹ میں گیا ہی تھا کہ اس نے منہ پر کر تے کر ڈال کر اشفاق احمد کے کندھے کو پیچھا کرتا ہوا فرش پر پھیل گیا۔ فرش کو کندھا ہوتے دیکھ ڈاکٹر چلایا۔ ”لو کی تم کیسا بھڑت ہے بچہ لوگ کو سنبھال بھی نہیں سکتا۔“

ہالو فوراً زمین پر بیٹھ گئی اور آدمے دوپٹے سے فرش کو صاف کرنے لگی۔ فرش جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا۔ اصر سے بھری باہر آ رہی تھی۔ ایسے فرش کو صاف کرنا بھی جوئے شیر لاتا ہے۔ مگر وہ فرش کھڑکتی رہی۔

ڈاکٹر نے کن انھیں سے فرش کو دیکھا پھر بولا۔ ”تم لڑکی لوگ کیسا بے پروا ہے۔ اپنے دوپٹے کو بھی کندھا کر

دیا۔ اب جاؤ دو پٹا کو دھو کر آؤ۔ اس میں جراثیم ہے۔ اسے بچے کے قریب بھی نہ لانا۔ درحالت اور بگڑ جائے گا۔“

اشفاق احمد نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ ”نکا کدھر ہے؟“ ڈاکٹر نے بیٹے سے کہا۔ ”باہر جاؤ۔ اصر بہت پاؤں ہے۔ اگلے ہاتھ پر گھوڑا لوگ کے لیے دے دیتا ہے۔ اس میں پانی ہی پانی ہے۔“

ہالو فوراً باہر نکل گئی۔ اور جب واپس آئی تو اس کا آدمہ دوپٹا پیچھا ہوا تھا۔

ڈاکٹر سے اجازت لے کر وہ دونوں باہر نکلے۔ بس اسٹاپ بہت دور تھا اور دھوپ کی تیش جسم کو جمید رہی تھی۔ اشفاق احمد نے ڈاکٹر کی ٹیکہ سے نکلے ہوئے گئے۔ ایک گھوڑا اٹھایا تھا جس کو وہ بچے کے چہرے پر سایہ کرنے کے لیے آگے کیے ہوئے تھے۔

وہ دونوں چلتے ہوئے تاٹا اسٹینڈ تک پہنچے۔ کئی تانے درخت کی چھاؤں میں کھڑے تھے۔ ایک تانے پر بیٹھے ہوئے تانے والے سے کہا۔ ”گورنمنٹ کالج تک چلو۔“

ہالو نے نفس پر اٹھا کر اشفاق احمد کی طرف دیکھا جیسے پوچھنا چاہتی ہو کہ یہاں کیا ہے؟

اشفاق احمد نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور بچے کی طرف دیکھا۔ انٹق کے چہرے سے طاقت مٹا گئی۔ لیکن انھیں مل گئی تھی۔ وہ بڑی دلچسپی سے گھوڑے کو کھد رہا تھا۔ گھوڑا اپنا ہوا کالج کی طرف دوڑ رہا تھا۔

کالج کے گیٹ پر پہنچ کر تاٹا رک گیا۔ وہ دونوں تانے سے اترے اور اشفاق احمد نے تانے والے کے ہاتھ پر آٹھ آنے کا سکہ دیا۔ پھر وہ ہالو کو ساتھ لے کر کالج کی سڑکیوں کی طرف بڑھنے لگے۔

کالج بند تھا اس لیے پوری عمارت سنسان پڑی تھی۔ وہ دونوں آگے بڑھتے ہوئے کالج کے چبوترے تک پہنچ گئے، سامنے ہی وہ کلاس روم تھا جس میں انہوں نے کئی سال گزارے تھے، بلند دروازے کو دیکھ کر دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ سڑکیوں پر بیٹھ گئے۔ درختوں کی وجہ سے وہاں کی فضا خنڈی تھی۔ گرم ہوا کا جھوکا بھی فرحت بخش لگ رہا تھا۔ انٹق کو بھی یہ فرحت بھرا مٹول پسند آیا تھا کیونکہ وہ بڑی دلچسپی سے بڑے بڑے درختوں کو ہلٹے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ہالو نے بچے کو گود سے اتار کر بٹھا دیا تھا۔ وہ خود ہی کھڑا ہوا اور بچے کے فرش پر چلنے لگا تھا۔ ”اچھا قدم کے بعد ہی وہ دمک کر بیٹھ گیا۔ پھر اسے کھلے لگا اور واپس ہالو

کے پاس آگیا۔ اشفاق احمد اسے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ ہالو اور ان کے چہرے بھی مکمل اٹھے تھے۔ وہ ہالو کی طرف دیکھ کر بولے۔ ”ابھی دھوپ میں خاصی تیش ہے اسی لیے میں اصر آگیا۔ جب دھوپ دھل جائے گی تو ہم کمرے کے لیے چلیں گے۔“

ابھی ان کا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ چوکیدار آگیا۔ اس کے ہاتھ میں چابیوں کا کچھا تھا۔ ان دونوں کو بیڑیوں پر بیٹھا دیکھ اس کی پشیمانی پر فکتنیں نمودار ہوئیں۔ اس نے استفسار کیا۔ ”کون ہوتم لوگ؟“

”یہاں گرمی کی وجہ سے آگئے تھے۔ دھوپ دھلنے ہی چلے جائیں گے۔“

”نہیں نہیں یہاں بیٹھنا منع ہے۔“ چوکیدار ناپا تھا اس کا لہجہ بھی درشت تھا۔

”بس نے منع کیا ہے؟“ اشفاق احمد نے پوچھا۔ ”پہلے کا حکم ہے۔ انجینی کو گیٹ کے اندر آنا منع ہے۔“

”چوکیدار کا بھرا ہتھیالہ کچک اٹھتا تھا۔ اشفاق احمد جواب دینا چاہتے تھے کہ ہالو نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں چپ رہنے کو کہا اور بچے کو گود میں اٹھا کر باہر کی جانب بڑھنے لگی۔ اشفاق احمد بھی خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے باہر آگئے۔

شام تک انٹق کی طبیعت سنبھل گئی۔ وہ دونوں زندگی کی دیگر انجینوں کو سلحشا میں منگ گئے۔ وقت گزرتا رہا کہ ٹھٹھا بیٹا انیس بتا رہا ہو گیا۔ ہالو اسے لے کر سن آباد کے ایک ڈاکٹر کے پاس پہنچی۔ کسی جاننے والی نے ڈاکٹر کی بڑی تعریف کی تھی۔ ہالو کو یہ بھی پتا نہ تھا کہ ڈاکٹر کی فیس کتنی ہے۔ اس نے چند نوٹ مٹھی میں لیے اور بیٹے کو گود میں اٹھا کر چل پڑی۔ جب وہ ڈاکٹر کے کلینک پر پہنچی تو ڈاکٹر صاحب اپنی کرسی پر اترے بیٹھے تھے۔ خود کو پوری کولینائیڈ ڈاکٹروں کی طرح پری اوکوپائی نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بہت بندہ شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے سامنے والی کرسی پر ہالو بیٹھ گئی۔ انیس کی ناک بندھی سناس ناک سے سیٹی کی طرح نکل رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کچھ پوچھنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ ہالو نے بات کرنے کی غرض سے کہا۔ ”میں اشفاق احمد کی بیوی ہوں۔“

اس بات کا اثر ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر بالکل نہیں ہوا۔ انہوں نے کوئی نوٹس نہیں لیا تو ہالو بولی۔ ”مرتا مٹتی اور

شہاب صاحب کا نام تو آپ نے سنا ہوگا۔ قدرت اللہ شہاب وہ میرے شوہر کے قریبی دوست ہیں۔“ اس بات پر بھی ڈاکٹر صاحب نے کوئی توجہ نہ دی تو وہ بولی۔ ”میں بھی کتنی ہوں، ریلوے پورے سٹائل کہاں۔“ ڈاکٹر نے پھر بھی توجہ نہ دی اور بچے کی طرف مخاطب ہو کر بولے۔ ”منہ کھولو۔“

ایسا لگ رہا تھا جیسے ماں کی بات کی سچائی وہ بچے کا منہ کھلوا کر دیکھنا چاہتے تھے۔ انیس نے منہ کھول دیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”اور کھولو۔“

بچے نے اور کھول دیا۔ انہوں نے کہا۔ ”اور کھولو۔“ پھر کہا۔ ”نام کیا ہے تمہارا؟“

پھر بچے نے تو کئی زبان میں کہا۔ ”لالہ۔“ ”بس اسی پر توقف نہ کیا۔ اس نے عربی دو چار لکھی گالیاں دیں جو خود ہالو نے بھی سنی تھیں۔ یہ کمال تھا۔ پوز اور اتھار کا۔ ماموں اور تایا نے تو کہنے جو کچھ سکھایا تھا۔ وہ بان سے اٹل پڑا تھا۔ ہوتا یہ ہے کہ بعض لوگ بچے کی تو کئی زبان سے گالیاں سن کر مٹھوٹ ہوتے ہیں اور تنھے بچوں کو سکھاتے ہیں۔ وہی کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا۔ ہالو شرم سے زمین میں گڑی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب الگ حیران۔ وہ سو کھتا تک بھول گئے تھے۔ اب انہیں یقین آگیا ہو گا کہ ادب عورتوں کے ایسے ہی بچے ہوتے ہیں۔ ہالو سخت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ شرمندگی سے گڑی جا رہی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ سر جھکائے دوا لے کر باہر نکل اور تیز قدموں سے گھر کی طرف بڑھنے لگی۔ سخت کا احساس اسے عجین لینے نہیں دے رہا تھا۔ ڈاکٹر کے ہاں سے آنے کے بعد بھی وہ سخت میں جھلا رہی تھی۔ اس نے پرویز دغیرہ کو خبردار کر دیا تھا کہ اب اگر انہوں نے کسی چھوٹے بچے کو ناشائستہ لفظ سکھائے تو وہ اس کا آخری دن ہوگا۔

وقت گزرتا رہا۔ گھر میں خوشحالی کا گزر رہا تھا۔ بندہ ہو چکا تھا۔ زندگی دھوا یوں میں گھرنی جا رہی تھی۔ مکان کا کرایہ تک ادا نہیں ہو پا رہا تھا۔ مکان مالک انہیں بار بار مکان خالی کرنے کو کہہ رہا تھا۔ لیکن وہ مکان خالی کرتے تو کہاں جاتے اس لیے اسی مکان میں پڑے ہوئے تھے۔ مکان مالک نے ایک چال چلی۔ اس نے پانی کا ٹیکس بھرتا بند کر دیا تھا۔ واٹر ٹیکس ادا نہ کرنے پر وہ لائن میں آگئے۔ اشفاق صاحب کے چاہنے والے انہیں روکنے لگے لیکن وہ کسی کی سننے پر تیار نہ تھے، اتنے میں اشفاق صاحب آگئے۔ انہوں نے معاملہ

بھانپ لیا اور تفتین شاہ کے اعزاز میں بولے۔ ”کاٹ دو۔ ہاں فوراً کاٹ دو ورنہ کسی دن ہم پلو بھر پانی میں ڈوب مریں گے۔“

تفتین شاہ کی آواز سنی تو دونوں لاش میں چمک گئے۔ وہ بولے۔ ”آپ تفتین شاہ ہو۔“ پھر ہاتھ بھڑا کر کمرے ہو گئے کباب یہ قیل کی حال میں نہیں کئے گا۔ پلے رقی نہ تھی مگر عزت خوب تھی۔ اسی میں وہ دونوں خوش تھے وقت تیزی سے گزر رہا تھا کہ اشیر میاں بھی دنیا میں آ گئے۔ اب بانو تین شہزادوں کی ماں تھی۔ اسی دوران ایک اور تبدیلی رونما ہوئی۔ سن آباد کے 455 N سے وہ لوگ 479 N سن آباد منتقل ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ گھر گھر میں بھی فرق ہوتا ہے۔ کوئی گھر کسی کو اتنا رس آتا ہے کہ زندگی بدل جاتی ہے۔ ان لوگوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اس گھر میں منتقل ہوتے ہی ان لوگوں کے دن بھر گئے۔ خوشحالی نے گھر دیکھ لیا۔ اشفاق احمد ”لیل و نہار“ کے ایڈیٹر تھے یہ ریڈیو پاکستان سے بھی وابستہ ہو گئی تھی۔ ریڈیو پاکستان کے لیے وہ تفتین شاہ لکھنے لگے تھے۔ تفتین شاہ کا خیال کیسے آیا یہ بھی ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ ہوا یہ کہ ان دنوں وہ USIS پر وائس آف امریکا کے لیے پروگرام لکھا کرتے تھے۔ وہیں ان کی ملاقات مارلاک سے ہوئی جو اس پروگرام کا نایاب تھا۔ وہ اردو اتنی اچھی جانتا نہیں تھا مگر وہاں موجود دوسرے لوگوں کے چہروں سے وہ اندازہ کر چکا تھا کہ یہ پروگرام اچھا لگتے ہیں۔ اس نے اشفاق احمد کو مشورہ دیا۔ ”اشفاق تم کوئی ایسا پروگرام کرو جو Love able ہو۔ دوسروں کو صحت کرے اور خود پر کوئی پابندی نہ لگائے۔ بس اشفاق احمد کے دماغ میں ایک آئیڈیا آ گیا جو تفتین شاہ کا روپ تھا۔ جب اسے ریڈیو پاکستان سے نشر کیا گیا تو دلچسپی کی حد پار کر گیا۔ لوگ اس کا انتظار کرنے لگتے کہ کب آنے لگا۔“

21 اپریل 1959 کو لیل و نہار میں نوکری ملی تھی اور 1960 میں وہ کیلڈ کے سیکریٹری بنا دیے گئے۔ یعنی خوش قسمتی کا ستارہ اوج پر تھا۔ اسی دوران ایک اور بات ہوئی۔ بہت عجیب بات۔ بانو نے کہیں نوکری کے لیے درخواست نہیں دی تھی کسی اور نے اس کا نام دے دیا ہوگا۔ ایک دن ڈاکہ اس کے نام ایک خط لے کر آ گیا۔ اس نے لٹاف دیکھا تو حیران ہوئی۔ اندر خط دیکھنے کے لیے لٹاف جاک کیا۔ اندر سے جو خط نکلا اسے دیکھ کر وہ زیادہ حیران ہو گئی۔ اس نے خط اشفاق احمد کو دکھایا۔ خط دیکھ کر وہ مسکرائے

اور بھر بولے۔ ”ایک ہم ہیں کہ نوکری ڈھونڈتے ہیں اور ایک تم ہو کہ گھر بیٹھے نوکری مل رہی ہے۔“

اس دور میں ٹینک اشفاق کی بہت کمی تھی اسی لیے آٹو آسانی سے لاہور کا رخ فاروقی سے آخر آ گئی تھی۔ اس نے اشفاق احمد سے پوچھا۔ ”آپ کا کیا خیال ہے؟ نوکری کر لوں؟“

وہ سر جھکائے کچھ سوچتے رہے پھر بولے۔ ”یہ بتاؤ وہاں سے خواہ کیا ملے گی؟“

بانو نے جواب دیا۔ ”بہی کوئی ڈھالی تین سو روپے۔“

”یہ بتاؤ یہاں سے آنے جانے کے لیے اکیلا تا کالیہ پڑے گا۔ اس پر کتنا خرچ آئے گا؟“

بہی کوئی ستر سو روپے؟“

بانو نے انہماک سے سر ہلا دیا۔

”یہاں گھر میں تو جیسے جیسے کپڑے پہن کر وقت گزار لیتی ہو لیکن کالج میں تو ایسے کپڑے پہنیں گے نہیں۔ اور اشیر خان ابھی چھوٹا ہے۔ اس کے لیے کسی ماما کا انتظام کرنا ہوگا۔ اس پر کیا خرچ آئے گا؟“

بہی کوئی پچاس ساٹھ روپے۔“

اشفاق احمد کی باتوں نے اس کے غبارے کی ہوا نکال دی۔ اس نے آخر ٹھکرا دی۔ وقت مزید کچھ اس کے گھر کا تھا کہ ایک اور آخر آ گئی۔ یہ آخر شہاب صاحب خود لے کر آئے تھے۔ باتوں کے درمیان بولے۔ ”یہ تمہارے قریب ہی شاکر علی میوزیم بن رہا ہے۔ اس کے لیے ہمیں ایک ڈائریکٹر کی ضرورت ہے۔ اگر تم راضی ہو جاؤ تو میں بڑی آسانی سے یہ نوکری دلوا سکتا ہوں۔ تمہیں گاڑی مع ڈرائیور بھی ملے گا، اچھی تنخواہ بھی ہوگی۔ دو لوگ گھر کے کام کے لیے بھی سرکاری خرچ پر مل جائیں گے۔“

اس بات نے بانو کے دل میں جھپٹی اس حسرت کو کہ اپنا آپ منواؤں پھر سے جاگ اٹھی۔ اس نے اشفاق احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ سن رہے ہیں یا شہاب بھائی کیا کہہ رہے ہیں؟“

اشفاق احمد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بالکل سن لیا لیکن اس کا فیصلہ تو خود تمہیں کرنا ہوگا۔ جہاں تک میرا مشورہ ہے تو سوچ کر دیکھنا ہمارے پاس بیسوں کی تنگی ترشی نہیں ہے۔ گھر میں ایک پرانی سی گاڑی بھی ہے۔ پرسنل گاڑی کی ضرورت ان کو ہوتی ہے جو سوشل اکیٹیوٹی میں رہتے ہوں۔ دو نوکر پہلے سے موجود ہیں۔“

بانو نے ایک بار پھر انکار کر دیا۔ نوکری نہ کرنے کا فیصلہ اس کا اپنا تھا مگر خوشی اشفاق احمد کے چہرے پر بھی۔ انکار کرتے

ہوئے۔ یہی وہ کچھ دھکی گئی تھی کہ اس کے فیصلے پر کسی نے تفریق لگائی تھی۔ وہ اہمیت کی حامل ہے یہ کسی نے سراہا نہیں تھا۔ اس کے بعد بھی ایک اور موقع پر اسے خفیف ہونا پڑا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ ادیبوں کا ایک وفد گلڈ کی جانب سے شری قاپتان بھجوا جا رہا تھا۔ بانو کی ادبی یہاں بھی کوئی مجموعہ دکھانے والی تھی۔ اسے اسے پوچھا بھی نہیں۔ جب کہ اسے سندھ بن لے ہاں۔ شہلا پھول، ہزاروں میں بکتے کے ناریل اور اسی طرح لیے لیے ہالوں والی لڑکیاں۔ سانولی سلونی سی لڑکیاں۔ انہیں دیکھنے کا اسے کتنا ارمان تھا لیکن اسے بالکل ہی نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ وہ خود کو بہت چھوٹا محسوس کرنے لگی تھی۔ اپنے خرابوں میں ڈوب کر وہ یہ بھی بھول گئی تھی کہ وہ نہیں گئی تو کیا ہوا۔ اشفاق احمد تو اس وفد میں شامل ہیں اور انہیں گئے ہوئے کئی روز ہو چکے ہیں۔

ابھی وہ اسی بارے میں سوچ رہی تھی کہ شہاب آ گئے۔ قدرت اللہ شہاب کو دیکھ کر وہ کچھ اٹھنسی گئی۔ شہاب صاحب بھی اس کے زخموں کو کریدنے آئے تھے۔ آتے ہی بولے۔ ”اشفاق کو کرشن چوڑا سے شفق ہو گیا ہے۔“

شفق ہو گیا ہے یہ سننے ہی وہ چونک گئی۔ کرشن چوڑا؟ وہ سمجھ نہ پاتی تھی کہ وہ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ شہاب صاحب نے مزید کہا۔ ”اب وہ شاید ہی کرشن چوڑا کو چھوڑ کر آئے۔“

کسی بیوی کو یہ کب اچھا لگتا ہے کہ اس کا شوہر کسی کے شفق میں ڈوب کر گھر آتا بھول جائے۔ بانو کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ کرشن چوڑا کیسی ہے؟“

”ارے کرشن چوڑا ایک بیڑ ہوتا ہے جس پر کاسی اور نارنجی پھول لگتے ہیں۔ پتھروں کی شکل میں۔“ شہاب صاحب بولے تو اس کا دل اسے مقام پر آیا۔ ”اور وہ اشفاق اور اعجاز مالوی کیوں کا پورا پورا انکار کھاتا ہے۔“

بانو ہوتی بنی ان کا منہ دیکھ رہی تھی۔ شہاب صاحب پھر بولے۔ ”دو پہر کے کھانے کے بعد وہ لوگ ڈاب پیچے ہیں۔ دو دو ڈاب پیس۔“

”یہ ڈاب کیا ہوتا ہے؟“

”کچھ ناریل کا پانی۔ اسے ہی ڈاب کہا جاتا ہے۔“

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ناریل کیسے پیا جاتا ہے۔ شہاب صاحب بولے۔ ”اور رات کو وہ لوگ دو نہ بھر بھر کر سو نہ لیں کھاتے ہیں اور کھل کھاتے ہیں۔ آپ تو گئی نہیں در نہ یہ سارا حذر آپ کے حصے میں بھی آتا۔“

اب وہ کیسے کہتی کہ وہ کیوں نہیں گئی۔ شہاب صاحب کو احساس ہو گیا کہ مذاق میں وہ بہت دور نکل آئے ہیں اس لیے چپ ہو گئے مگر اس کی بھربائی بھی انہوں نے ہی کی۔ 1968 میں اختتام کر دیا۔

ان دنوں وہ لوگ سن آباد سے ماڈل ٹاؤن منتقل ہو چکے تھے۔ شام کے وقت ماڈل ٹاؤن کی سڑکیں ویران ہو جاتی تھیں۔ افضال چھتر ریاض محمود اور عارف ان سے ملنے اسکورڈ پر لڑ کر آتے جاتے۔ ان دنوں جگت کی برادری بھی اسی کمپنی پر سی بھلا کر بالداروں کی طرح منہ میں پائپ دبا کر چلنا چاہتی تھی۔ انہیں شکایت تھی کہ وہ اساتذہ سالوں سے انٹرکین کر رہے ہیں لیکن ادا کاروں کو عزت و مقام کی نہیں دیتا۔ ایک دن وہ لوگ آئے تو جوش و خروش سے بھرے ہوئے تھے۔ آتے ہی بولے۔ ”آپ اکل شہاب صاحب کے پاس ہمارا وفد جائے گا۔ شہاب صاحب اشفاق صاحب کے گرد ہیں۔ آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔“

دوسری صبح کچھ لوگ شہاب صاحب سے ملے۔ قدرت اللہ شہاب بھائی نے ان کی باتیں بھوری اور اسلام آباد چلے گئے۔ وہ سب پر امید تھے کہ بانو کے نام ایک سرکاری کمپنی آگئی اس پر شہاب بھائی کے دخل تھا۔ انہیں کسی میٹنگ میں

غرق محبت

”کب تک مجھ کو بھولو گے!“

چاہتوں کا بھیدوں بھرا یہ سوال اسے حال سے بے حال کیسے ہوتے تھا۔ اس نے محبوب کی آہٹوں پر کان اور رازوں میں پلکیں بچھائے زندگی تمام کر دی مگر..... فاصلوں میں کی نہ آئی۔ ابھی تو زندگی کی تلاش جاری تھی کہ اچانک اس انداز میں رقص اجل شروع ہوا کہ وہ چاہتوں کے مدفن پر حسرتوں کے پھول چڑھانے پر مجبور ہو گیا۔

جون 2017ء کے شمارے میں سہنسی

کے آخری صفحات پر جاوے کی انداز لیے۔

محبوب قذکاظاھر جاوید مغلا کی چونکا

دینے والی عمر انگریز طویل داستان۔ آپ کی توجہ کی منتظر

شرکت کرنے کا کہا گیا تھا۔ اشفاق احمد کے ساتھ بانو اسلام آباد جا چکی۔ شہاب بھائی کے ساتھ اہل حبيب کے برآمدے میں مسعود کھدر پوش اور اشفاق علی خان بیٹھے ناشا کر رہے تھے۔ شہاب بھائی نے بانو سے کہا۔ ”کل فنکاروں سے ایک خصوصی مینگ ہے۔ فنکاروں کے مسائل پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی جائے گی۔ اس کے صدر فیض احمد فیض ہوں گے۔ اس مینگ میں ہمیں بھی شرکت کرنی ہے۔“

اگلے دن جب بانو مینگ ہال میں پہنچی تو حیران رہ گئی۔ اس لیے کہ وہاں بڑی بڑی ہتیاں بیٹھی تھیں۔ فیض صاحب تھے۔ جمیل الدین عالی تھے۔

اشفاق مینگ کمیٹی آرٹ اینڈ گیلری کی تشکیل دی گئی۔ مشرق پاکستان کے مہبران منتخب ہوئے۔ مغربی پاکستان کی طرف سے جمیل الدین عالی منتخب ہوئے۔ صدر فیض احمد فیض تھے۔ دکن کے نام منتخب ہونے لگے تو شہاب صاحب نے کہا۔ ”میں بانو قادیان کا نام تجویز کرتا ہوں۔“

بانو نے فیض صاحب سے پوچھا۔ ”ہم کریں گے کیا؟“

”مختلف جگہ جا کر وہاں کے فنکاروں کے مسائل سنیں گے اور ان مسائل کو حل کرنے کے لیے حکومت کو تجویز دیں گے۔“

شہاب صاحب نے کہا۔ ”ہمیں ڈھاکہ دیکھنے کا شوق ہے۔ تاہم وہاں جا کر سیر پانے کا تباہی سارا کام فیض صاحب کر لیں گے۔“

اس طرح شہاب صاحب نے اپنی بات سچ کر دکھائی۔ بانو ملک بھر میں گھومنے کا موقع فراہم کر دیا۔

وقت گزرتا رہا اپنے نشان چھوڑتا رہا۔ یہ 1967 کی بات ہے۔ قدرت اللہ شہاب نے ایک ہی جھٹکے میں اشفاق صاحب کو مرکزی اردو بورڈ میں ڈائریکٹر بنا دیا۔ وہ بیسویں گریڈ میں آگئے تھے۔ لوگوں نے بھی سمجھا کہ وہ سفارت پر آئے ہیں لیکن جب کام شروع ہوا تو پتا چلا کہ یہ عہدہ انہی کے لیے تھا۔ کام کرنے کا یہ عالم تھا کہ نہ وہ دن دیکھتے نہ رات۔ قلم ہے کہ چلا جاتا ہے۔ ایسا لگتا کہ کام کے علاوہ انہیں کچھ اتنی نہیں تھا۔ وہ نہ صرف خود کام کرتے دوسروں کو بھی کام میں جتا دیکھنا چاہتے۔ دفتر کا یہ عالم تھا کہ باہر سے کوئی آجاتا تو اسے حیرت کا شہید جھکا لگتا کیونکہ کمرے میں ایک خاموشی سی چھائی رہتی۔ سب کے سر جھکے ہوئے۔ سب کے سب کام میں مشغول، ایسا لگتا جیسے یہ لوگ صرف کام کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ وہ خود بھی کام میں مشغول رہتے۔ جہاں کوئی خالی بیٹھا نظر آتا۔ وہ اسے ضرور پوچھتے

کہ جو کام اس کے ذمے ہے وہ پورا ہوا یا نہیں؟ ایک بار ایسا ہ کہ ایک صاحب کے مہمان آگئے۔ وہ ان کی سامنے والی کمرہ پر بیٹھے مگر ان صاحب سے باتیں کرنے میں ڈر رہے تھے کیونکہ بار بار اشفاق صاحب کمرے میں آجاتے تھے۔ وہ صاحب اس ڈر سے کچھ بول نہیں پارہے تھے کہ کہیں اشفاق صاحب ٹوک نہ دیں۔ مہمان الگ پریشان۔ وہ صاحب بارگھڑی کی طرف دیکھ رہے تھے کہ کچھ کی بات ہو تو وہ مہمان کا جائے پلانے لے جائیں۔ ادھر کچھ کی بات ہو اور وہ صاحب اٹھنے والے تھے کہ اشفاق صاحب اپنے ہاتھوں میں بکٹ کو پلٹ لیے حاضر ہوئے اور مہمان کے سامنے رکھتے ہوئے بولے۔ ”معاف کیجئے گا یہاں آنے والا دفتر کا مہمان ہوتا ہے۔ آپ جب آئے تو دفتر کا وقت تھا اس لیے آپ کا چائے پلانہ سکے۔ لیجئے ایک بکٹ کھائیں چائے آ رہی ہے۔“

اس انداز میں کام کرنا کہ وقت برباد نہ ہو ایک فن ہے۔ اور وہ اس کام میں ماہر تھے۔ ادارے کا ایک ایک لمحہ بچاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دور میں جتنی کتابیں بورڈ نے پیش کیں اس کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہی کچھ اشفاق صاحب کے ذرا سے میں بھی نظر آتا ہے۔ بیٹے پاؤں ہویا بیٹے کا سودا تو تباہی تباہی ہو یا ایک محبت سوانسے نے تقریباً ہر ذرا سے ہر سطر پر جھج جھج کر کہتا ہے کہ اس پر محبت ہوئی ہے۔ وہ محبت کرتے تھے اور خوب کرتے تھے لیکن سیاسی رجحان نے یہ دن بھی دکھا دیے کہ ان کی محبت پر مٹی ڈال دیا گیا۔

1967 سے 2 جون 1981 تک وہ جس اردو بورڈ کو بڑی خوش اسلوبی سے چلا رہے تھے وہاں سے انہیں ہٹا دیا گیا اور وجہ شاید یقین شاہ کا پروگرام بنا تھا۔ سیاست کی بازی گری نے ایک ادیب پر کاری وار کیا تھا کہ وہ سہ گئے۔ لیکن اوپر سے جھیلے ہی کچھ دکھائی دے دیے مگر اندر ایک نوٹ پھوٹ سی گئی تھی۔ وہ اس زبانی کا جواب دے سکتے تھے۔ عوام ان کے ساتھ ہو جاتی تھیں انہوں نے اپنا کچھ نہ کیا۔ اپنا درد سینے سے لگائے رہے۔ وقت گزرتا رہا۔ اب وہ زیادہ وقت گھر میں گزارتے تھے۔ بہر وقت کہ میں ایک بیلہ سا لگا رہتا تھا۔ داستان برا۔ کارواں بھی نہیں رہتا تھا۔ جب جس کا دل چاہتا وہ کہہ لے اندر آ جاتا

اس دن اشفاق صاحب نے اپنی موت سے ملنے گئے ہوئے تھے بانو ہاتھ میں کتابیں لے کر گھر پر تھیں۔ ان کی موت کے بعد ان کی کتابیں ان کے منہ سے نکل گئیں۔ ان کی موت کے بعد ان کی کتابیں ان کے منہ سے نکل گئیں۔ ان کی موت کے بعد ان کی کتابیں ان کے منہ سے نکل گئیں۔

اب اشارہ کرتے ہوئے بیٹھے کہہ لیں۔ ان کی موت کے بعد ان کی کتابیں ان کے منہ سے نکل گئیں۔ ان کی موت کے بعد ان کی کتابیں ان کے منہ سے نکل گئیں۔ ان کی موت کے بعد ان کی کتابیں ان کے منہ سے نکل گئیں۔

بانو نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے ہاتھ سے جھانک کر کہا۔ ”امریکا کی ایک ریاست ہے Seattle وہاں یہ کالج ہے۔“ کہتے ہوئے اس نے ایک کہانی نکال کر بانو کے سامنے رکھی۔ میز پر رکھ دی۔ عنوان تھا the heed seeker کہانی ان کے کہانی رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں نے آپ کی ایک کہانی ”توجہ کی طالب“ پڑھی تھی۔ اس کا ترجمہ کیا۔ میرے پروفیسر نے بھی اسے اپروڈ کر دیا لیکن جب تک آپ کی منظوری نہیں ملے گی میں اسے سب مٹ نہیں کر سکتی۔“

بانو نے اس کہانی پر دستخط کر دیے۔ یہی دوستی کی ابتدا تھی۔ اب وہ شوخ لڑکی روزانہ آنے لگی۔ آتے ہی بانو کو جو کام کرتے دیکھتی اسے روک دیتی۔ بانو کی عادت نہیں تھی کہ وہ کسی کو کریدے کہ تم کون ہو کہاں رہتی ہو۔ یہ تو اسے بہت بعد میں معلوم ہوا۔ وہ بھی تب جب بانو سے اس کی ماں پر وین باہر ملی کی ملاقات ہوئی۔ تب اسے معلوم ہوا کہ وہ معروف صنعت کار سید باہر علی کی بیٹی ہے اور روز پٹیل (نٹو پتھر) ان کی کنبی میں تیار ہوتا ہے۔

حتا باہر علی اب اس گھر کی فرد جیسی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ ماں باپ چاہ رہے تھے کہ اس کی شادی انہیں نامی لڑکے سے کرادی جائے جو ایک بڑے گھر سے تعلق رکھتا ہے لیکن وہ راضی نہیں ہو رہی تھی۔ اس بات پر اس کے گھر میں ایک ہنگامہ برپا تھا کہ ایک دن پروین کا لون آیا کہ آپا جلد آئیے۔ حنا پٹول لے کر کمرے میں بند ہوئی ہے۔

بانو بھاگ بھاگ ان کے گھر پہنچی۔ ماں نے حنا کا کرا دکھا دیا جو بند تھا۔ بانو نے انہیں اشارے سے دور ہٹ جانے کا کہا اور پھر اس کمرے کے دروازے کو کھولا۔ اندر سے حنا نے جواب دیا۔ ”اب یہ دروازہ نہیں کھلے گا۔“

بانو نے کہا۔ ”یہ میں ہوں۔ دروازہ کھولو۔“

حنا نے اندر سے پوچھا کہ اور کون ہے۔ جواب میں بانو نے کہا کوئی نہیں۔ دروازہ کھول دو۔ لڑکی نے دروازہ کھول کر اھر اھر دیکھا اور بانو کا ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچ لیا اور دروازہ پھر

بعض معقین سنیا کی ایجاد کے ابتدائی سلسلے کو بنیام، چین، جاپان اور ہندوستان میں دکھائے جانے والے چھایا ناگوں سے وابستہ کرتے ہیں لیکن انہیں زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ ہاں مشہور جرمن ریاضی دان اتھاناسیس کرچ نے دم میں اپنی سیرین (Magic Lantern) کے ذریعے ہاتھ سے بنائی کچھ تصاویر پر دے کر دکھائی تھیں جنہیں سنیا کی ایجاد کے سلسلے کی ایک کڑی کہا جاسکتا ہے لیکن اس کے بعد لگ بھگ دو سو برس تک اس طرح کی کوشش یا تجربے کے آثار نہیں ملے۔ جس سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ سنیا کی ایجاد کے سلسلے میں مسلسل کوشش جاری رہی۔ لہذا یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ سنیا کی ایجاد کی کوششوں کا حقیقی سلسلہ انیسویں صدی کے ابتدائی دور سے شروع ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں 24 دسمبر 1824ء کو شہرہ آفاق تصنیف Thesaurus کے مصنف جیمز مارک روڈنٹ محرک تصاویر سے متعلق لندن کی رائل سوسائٹی میں پڑھا گیا مقالہ The Perstnace of vision with regard to Moving object اہمیت کا حامل ہے۔

اس کے کچھ عرصے بعد ایک سائنس دان جان ہرشل نے لکڑی کا ایک چھوٹا کھلونا بنایا جسے متحرک تصویروں کی ایجاد کے سلسلے کی ایک کڑی کہا جاسکتا ہے۔ ہرشل نے مونے کاغذ کے ایک گول ٹکڑے پر ایک طرف ایک پرندے اور دوسری طرف ایک بگڑے کی تصویر بنائی تھی اور دونوں سروں پر ایک دھاگا باندھ دیا تھا جب اس گول ٹکڑے کو تیزی سے گھمایا جاتا تھا تو دیکھنے والوں کو محسوس ہوتا تھا کہ پرندہ بگڑے میں قید ہے حالانکہ ایسا محسوس ہونے کی وجہ یہ تھی کہ تیزی سے گھومنے کی وجہ سے پرندے پر نظر پڑنے سے تیز تیزی آنکھوں کے سامنے بگڑہ آجاتا تھا۔ ہرشل کے علاوہ ہنری فن اور ڈاکٹر ہائیگلی فیریڈے نے بھی متحرک تصاویر سے متعلق تحقیق میں نمایاں حصہ لیا۔

مرسلہ: زاہد علی زاہد۔ کراچی

ماہنامہ سرگزشت

دار اسن طریق پر کر رہے تھے۔ شاید آج اس دنیا میں اپنا آخری فرض بھی عالمانہ شکل اور صوفیانہ دلیری سے سرانجام دینے لگے ہیں۔ "ڈاکٹر نے پھر توقف کیا اور یوں۔" "آج ہی کا قول ہے کہ دل میں جو پہلا خیال آتا ہے وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی جانب سے ہوتا ہے۔ میں نے اس سوچ کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کی اور ایک بار پھر اللہ سبحانہ تعالیٰ سے دعا کی ہے کہ وہ اشفاق صاحب کو آسانیاں عطا فرمائے۔"

"ہاں تو آپ سے فون پر بات کرنے کے بعد میں نے سوچا کہ بہتر یہی ہوگا کہ خود چل کر اشفاق صاحب کی حراج پر سی کر آؤں۔ پھر خیال آیا کہ تیکم کو بھی ساتھ لے چلوں کہ اگر ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو وہ ہاں تو آپ کا ساتھ دے گی۔ سائرہ اسپتال فون کر کے میں نے ایبویٹنس منگوالی اور خود رو دکا نیکہ لینے داستان سرائے سے نکلا۔ میری غیر موجودگی میں اشفاق صاحب نے میری جگہ سے کہا۔ "آج ڈاکٹر صاحب کو پتا نہیں کیوں اتنی جلدی پڑ گئی ہے۔ آرام سے ناشتا کر کے نہادھو کے اسپتال چلے۔"

میں نیکہ بھی لے آیا۔ انہوں نے بازو خود میری طرف بڑھایا۔ نیکہ گلنے کے بعد ان کے دونوں خدمت گزاروں نے انہیں ایک مضبوط کرسی پر بٹھایا اور ایبویٹنس کے محلے کے ساتھ ان کو اٹھا کر باہر پورچ میں لے آئے۔ ایبویٹنس کچھ تو ویسے ہی ای جی ٹی اور کچھ اس کی شیشیں بھی ای جی ٹی میں۔ اشفاق صاحب کا اس میں بیٹھنا دھواں تھا۔ ساتھ ہی ڈاکٹر کی گاڑی کھڑی تھی۔ گوہر نے ان سے کہا اس میں چلے چلتے ہیں۔ اگلی سیٹ پر بمشکل اشفاق صاحب گوراڑ کیا۔ اب اشفاق صاحب بالکل خاموش ہو گئے تھے۔ ریاض نے پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر انہیں سہارا دیا۔ پھر ہاں تو آپ نے ریاض کو چند ضروری ہدایات دیں اور اس کی جگہ خاں صاحب کو پیچھے سے تمام لیا۔ داستان سرائے سے ہم باؤل ٹاؤن کی رنگ روڈ پر نکلے تو اشفاق صاحب کا سر کھنکھاتا میں جانب کو ہویا۔

اسپتال تک کا سفر ہم نے ایسے طے کیا کہ میں نے ان کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے بازو پر ان کو لٹائے رکھا اور ہاں تو آپ نے بائیں ہاتھ اپنے ہاتھ میں تمام کراپے کال سے لگائے رکھا۔ جب ہم رنگ روڈ سے سائرہ اسپتال کی طرف مڑے تو اشفاق صاحب کا بائیں ہاتھ آپ کے گالوں سے کچھ نیچے کھسک گیا اور آپ کو گمان گزرا کہ آخری سفر ہو چکا ہے۔ ساڑھے آٹھ سے ٹھوڑا اوپر ہم لوگ سائرہ اسپتال

پہنچے۔ اشفاق صاحب کو بمشکل ویل چیئر پر بٹھایا اور اندر چلا دیا۔ ہاں تو آپ ساتھ ساتھ تھیں۔ ڈاکٹر نے ان سے درخواست کی کہ وہ ان کے آفس میں تشریف رکھیں۔ پھر ڈاکٹر نے اشفاق صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ بے جان خاموش اور ساکت تھے۔ میرے اٹھاس پر انہوں نے اپنا دایاں ہاتھ اوپر اٹھایا اور آپ کا اشارہ کیا۔ وہ ہاتھ ہلا کر اللہ حافظ کہتے ہوئے میری نیگم ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔

اس دوران ڈاکٹر فواد صاحب بھی تشریف لے آئے۔ انہوں نے ای سی جی کی اسکرین پر ایک سیدھی لکیری طرف اشارہ کیا جو سنڈیر سے ری جی کی طرف طلب کو پا رہے ہیں اور اس کی طلب تمام ہو چکی ہے۔ اشفاق صاحب کے چہرے پر سکون و اطمینان تھا جیسے محبوب کے پہلو میں بنا خوف و رقیباں عاشق دروازہ ہو۔ کوئی شک چہرے پر نہ تھی۔ اطمینان بخش موت اللہ کے ولی کو ہی نصیب ہو سکتی ہے۔ ایسے جیسے وہ اس اہل تجربے سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔

سات تمبر 2004 کو وہ دنیا کی ہماہمی سے منہ مو گئے۔ ہاں تو پریسا اثر ہوا کہ وہ سابقان چمن جانے پر سکتے کی تو کیفیت میں کمی لیکن اس نے بڑی بہت سے اس قیامت کا سہارا اور جسد خاکی کو قبرستان تک پہنچا دیا گیا۔ ایک عہد تمام ہو گیا۔ لیکن نہیں ابھی تو ایک اور قیامت سی قیامت کو سہا تھا۔ اس دن سے وہ روزہ روزہ ہو کر جیسے لگی۔ ہر رات قیامت بن کر اترتی۔ ہر یاد تازہ بنی لیکن مرنے والے کے ساتھ مرنا بھی جاتا۔ وہ بھی جیسے کاظم سبکی رہی۔ بہت سے دن زندگی کے کیسوں پر اپنی سیاهی پھیرتے ہوئے گزرتے رہے اور پھر وہ دن آ گیا جس کا اسے انتظار تھا۔ اتفاق اسپتال کے بستر پر 5 فروری 2017 کو مغرب کے وقت ہاں تو آپ نے آخری سانس خارج کر کے اپنی زندگی کے کھو کے پاس چلی گئی۔ اشیر خان نے اپنی ماں کے بارے میں آخری جملہ کہا۔ "شاید خدا نے میری ماں کی جیسی عورتیں بھیجاں موقوف کر دیا ہے۔"

ہاں تو آپ نے ڈرامے اور کہانیوں کا ایک سمندر چھوڑا ہے جس میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں۔ "آتش زیر پاہ آدھو بات۔ ایک دن۔ امرتیل۔ ہارگشت۔ چار چن۔ دست بستہ۔ دھواں روزہ۔ دھواں قدم۔ فٹ ہاتھ کی گھاس۔ حاصل گھاٹ۔ دیہ آن لائن۔ ہوا کے نام۔ کچھ اور نہیں۔" لیکن راجا گدھ کا اپنا ایک مقام ہے۔ پھر راہرواں اور مردا پرشیم کا بھی بدل اردو ادب میں اہل الحال نظر نہیں آتا۔

جون کی شخصیات

صائمہ اقبال

شمسی کلینڈر کے چھٹے مہینے سے جزی ان اہم شخصیات کا مختصر مختصر تذکرہ جنہوں نے کارہائے نمایاں انجام دے کر اپنی اہمیت کا احساس دلایا، جنہیں ہم بھول نہیں سکتے۔ ان کا ذکر برابر کرتے رہنا چاہیے تاکہ معلومات حاصل کرنے کے شائقین اپنی پیاس بجھا سکیں۔

ایک ایسی تحریر جسے سب سے زیادہ پسند کیا جا رہا ہے

ملک معراج خالد

پاکستانی قوم کے نظریات اور افکار میں کئی تضادات ہیں۔ ہم مغرب کو پسند کرنے کی نگاہ سے دیکھتے ہیں مگر ان کی ٹیکنالوجی بخوشی استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ سائنس کو اب تک ہم نے مکمل سے قبول نہیں کیا ہے مگر جب بیمار پڑتے ہیں، تو ایلوپیتھک طریقہ علاج پر انحصار کرتے ہیں۔ مؤجدین کو اہمیت نہیں دیتے، مگر ہوائی سفر کو ترجیح دیتے ہیں، موٹائل فون استعمال کرتے ہیں مگر خود اس نوع کی کوئی ایجاد کرنے میں دلچسپی نہیں لیتے۔ یہ تضاد بدولتی دنیا کے علاوہ دینی امور میں بھی نمایاں ہے۔ ایک سمت یہ ٹھکے کہ اقتدار فقط اشرافیہ کا نصیب بنتا ہے، دوسری سمت جب انتخابات ہوتے ہیں تو اسی جاکیر دار اور سرمایہ دار کو منتخب کیا جاتا ہے جس کے اختیارات کا رتے زبان زد خاص و عام ہوں۔ یہ ٹھکے کرتے ہیں کہ سیاست داں کرپٹ ہیں مگر جب کوئی بے داغ شخص سامنے آتا ہے تو اسے منتخب نہیں کرتے۔ الٹا اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ سبکی کچھ ہمیں ملک معراج خالد کے معاملے میں دکھائی دیتا ہے۔ وہ پاکستان کے مستبر سیاست داں تھے جو عمران وزیر اعظم بھی

گر میاں تو سی بی میں عروج پر آ گئی تھیں۔ سندھ میں گرمی کا خاصا زور دار۔ سورج کا بارہ چڑھا رہا۔ لوڈ شیڈنگ بھی ظلم و حاقی رہی۔ سیاسی محاذ بھی گرم رہا جبکہ گرمی کا اصل زور جون میں دکھائی دیتا ہے۔ قارئین یہ پہلے بتا دوں جون ریمگورین سال کا چھٹا مہینا ہے۔ شمالی نصف کرہ میں اس مہینے گرمی کا موسم ہوتا ہے۔ اس کا نام قدیم روم کی دیوی جونو (Juno) کے نام پر رکھا گیا ہے، جسے حفاظت کی دیوی تصور کیا جاتا تھا۔ 21 جون سال کا سب سے لمبا دن ہوتا ہے۔ پاک و ہند کی کئی ممتاز شخصیات کا تعلق ماہ جون سے ہے۔ رنجیت سنگھ، رتنا لپات علی، مہدی حسن اور راج کپور کی بری اسی ماہ منائی جاتی ہے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو، یوسف رضا گیلانی اور شاہ محمود قریشی جیسی معروف سیاسی شخصیات نے اسی ماہ آٹھ کھولی۔ کئی بڑے کھلاڑیوں کا تعلق بھی اسی ماہ سے ہے، جیسے جاوید میاں داد اور جان شیر خان۔ صبا حمید اور فہد مصطفیٰ جیسے فنکار بھی اس ماہ پیدا ہوئے۔ ہدایت کار سگیتا کا تعلق بھی اسی ماہ سے ہے۔ آئیں، اس ماہ کی چند مستبر امتیوں پر نظر ڈالتے ہیں۔

رہے۔ ان شخصیات میں سے تھے جو فقیری میں امیری تلاش کر سکتے ہیں جس سے پیسہ ملے اور بے سہارا افراد کو مدد مل جاتی ہے۔ وہ درویش صفت شخص تھے جو بڑے عہدوں پر پہنچ کر بھی غربا اور مستحقین کے کام آتے رہے۔

ملک معراج خالد 20 ستمبر 1916 کو لاہور کے قریب واقع ضلع قصور کے ایک گاؤں کوٹ رادھا کشن میں پیدا ہوئے۔ کچھ کتابوں میں کبھی کا نام ڈیرہ چاہل درج ہے۔ اسی نام پر کچھ حوالوں میں تاریخ پیدائش یکم فروری لکھی گئی ہے۔ ان کا تعلق ایک کاشت کار گھرانے سے تھا۔ وہ انتہائی معنوی اور ذہین نوجوان تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں سے حاصل کی۔ سینئرل ماڈل ہائی اسکول لوز مال لاہور سے 1934 میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔

انہوں نے عام کاشت کار گھرانوں کے نوجوانوں جیسی سطح اور کشن زندگی گزار دی۔ وہ مسیح تین بجے جاگ جاتے۔ بھینسوں کا دودھ دوتے۔ دودھ بیچ کر پڑھنے کے لیے جاتے تھے۔ کئی ماہ تک ایک ہی قمیض کو پونے پانچ روپے کے طور پر استعمال کیا۔ پینے کے لیے جو تے بھی نہیں تھے۔ والد کا جوتا پنک کر کاٹ جاتے اور وہاں آکر انہیں لٹا دیتے۔ دن کے وقت ان کے والد اور دو پھر میں ملک معراج خالد ننگے پاؤں پھرتے تھے۔ دودھ فروشی اور معمولی ملازمتیں کر کے انہوں نے تعلیم حاصل کی۔

زمانہ طالب علمی میں انہوں نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔ مہاجرین کی آباد کاری کے لیے بھی کام کیا۔ سماجی محاذ پر بھی مصروف رہے۔ اگست 1939 میں انجمن اخوان اسلام کی بنیاد رکھی جس کے زیر انتظام 1954 میں اخوان ہائی اسکول برکی کا قیام عمل میں آیا۔ کئی عشروں بعد یکم فروری 1994 کو اخوان سائنس کالج برکی کی بنیاد رکھی تو اس کا افتتاح اس وقت کے صدر پاکستان فاروق لغاری سے کرایا۔

اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور سے 1939ء میں آئریز کیا۔ وہ زمانہ خاصا دشوار تھا۔ کسپری اور غربت کے دن تھے۔ کالج کی فیس بھی ان کے پاس نہیں ہوتی تھی تاہم انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔ 1946ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ پھر وکالت کے میدان میں قدم رکھا۔ عدلیہ کی سیاست کا آغاز 60 کی دہائی میں مسلم لیگ سے کیا۔ وہ ایب کا دور تھا اور حکومت مخالف تحریک زورور پر تھی۔ انہوں نے ”مہمیر کا بحران“ کے عنوان سے ایک پمفلٹ



لکھا، جس میں ایوب خان کی حکومت پر تنقید کی گئی تھی۔ اس پمفلٹ نے انہیں مقامی سیاسی حلقوں میں مقبول بنا دیا۔ ملک تبدیلی کے عمل سے گزر رہا تھا۔ صدارتی انتخابات میں فاطمہ جناح کو شکست ہوئی، مگر یہ شکست کوئی ہضم نہیں کر سکا۔ کراچی

میں لسانی فسادات ہوئے تو اسے فاطمہ جناح کی حمایت کا نتیجہ قرار دیا گیا۔ لیفٹ کی پارٹیاں پوری قوت سے ایوب خاں کے خلاف سرگرم تھیں، مگر یہ چھوٹے چھوٹے پونٹ تھے۔ انہیں ایک ایسی پمچری درکار تھی جس کے سنے طلباء، حوروں اور کسان اکٹھے ہو سکیں۔ جب ذوالفقار علی بھٹو ایوب کا ایندھ سے اگک ہوئے تو اس کا امکان پیدا ہوا۔ بھٹو نے لاہور میں انفر وائٹین پیپلز سائلیزیریٹی نامی جس تنظیم کے پلیٹ فورم سے پہلی بار حزب مخالف کے رہنما کے طور پر خطاب کیا تھا، وہ ملک معراج خالد ہی نے قائم کی تھی۔

بھٹو کی آمد کے بعد جمہوری اور روشن خیال حلقوں میں ایک امید پیدا ہوئی۔ طلباء اور حوروں تنظیمیں ان کے ساتھ جا کھڑی ہوئیں۔ معراج خالد پارٹی میں شامل ہوئے۔ والے ابتدائی لوگوں میں سے تھے۔ وہ پیپلز پارٹی کے کلکٹر پر لاہور سے 1970 کے انتخابات میں رکن قومی اسمبلی منتخب ہوئے۔ اس وقت کے انہیں کے مطابق ایک رکن قومی اسمبلی کو چھ ماہ کے لیے کسی صوبے کا وزیر اعلیٰ منتخب کیا جاسکتا تھا۔ اس حق کے تحت وہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ رہے۔ ان کا گورنر غلام مصطفیٰ کھر سے اختیارات پر تناؤ رہا۔ جاگیر دار اور وڈیروں کی جیت ہوئی۔ مگر اپنے ہم نام معراج محمد خاں کے برعکس... معراج خالد پارٹی سے الگ نہیں ہوئے۔ انہوں نے پارٹی میں رہتے ہوئے جدوجہد کرنے کا فیصلہ کیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے انہیں وفاقی وزیر زراعت بنا دیا۔ انہوں نے اصولوں کی بنیاد پر ڈے دار یاں نبھائیں۔ 1977 کے انتخابات کے بعد قومی اسمبلی کے اسپیکر منتخب کیے گئے۔ یہ انتخابات متنازع ثابت ہوئے دعا عدلی کے خلاف تحریک شروع ہو گئی جو مارشل لا پر ختم ہوئی۔

اس واقعے کے خلاف مذہبی کے تمام طبقوں نے بھرپور

جدوجہد کی۔ بھٹو کی چٹائی نے ایندھن کا کام کیا۔ سیاسی تنظیموں ایم آر ڈی کی پمچری سے بحالی جمہور کی تحریک شروع کی گئی تھی پورے قوت سے بکھلا گیا۔ جنہیں ممبر نہیں۔ مقدمے بنے۔ کورڈوں کی سزا ہوئی۔ اس تحریک کے دوران معراج خالد پیش پیش رہے۔ وہ گرفتار ہوئے۔ جیل کاٹی۔ جب بے نظیر بنو 1986 میں ملک واپس آئیں اور نصرت بھٹو کو کنارے کیا جائے گا تو سینئر اور مخلص سیاست دانوں کے بجائے نئے لوگوں کو آزمانے کا فیصلہ کیا گیا۔ ایسے لوگ، جو انٹیلیجنٹ کے لیے قابل قبول ہوں۔ معراج خالد اس خانے میں فٹ نہیں بیٹھے تھے۔ وہ ان بانی ارکان میں سے تھے جنہیں آہستہ آہستہ پارٹی کے معاملات سے دور کر دیا۔ البتہ بے نظیر بھٹو نے ان کے تجربے سے ضرور استفادہ کیا۔ 1988 کے انتخابات کے بعد منتخب ہونے والی پیپلز پارٹی کی حکومت میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بنیں تو انہوں نے معراج خالد کو قومی اسمبلی کا اسپیکر بنایا۔

محترمہ کے لیے حالات دشمن تھے۔ انہیں انٹیلیجنٹ نے قبول تو کر لیا تھا مگر ان کی حکومت کے خلاف سازشیں جاری رہیں۔ جب صدر غلام اسحاق خان اور فوج کے سربراہ جنرل مرزا اسلم بیگ نے بے نظیر بھٹو کی حکومت کو رخصت کرنے کا فیصلہ کیا تو ملک معراج خالد کو بے نظیر بھٹو کے خلاف تحریک عدم اعتماد کو وزیر اعظم بننے کی دعوت دی گئی، جو اس مخلص سیاست دان نے قبول نہیں کی۔ البتہ بے نظیر بھٹو کی شخصی دشمنی چکی تھی۔ 58 ٹوٹی کو برتے ہوئے پی پی پی کی حکومت ختم کر دی گئی۔ اب مہیا صاحب اقتدار میں آئے، مگر ان کی بھی صدر سے نہیں بچ سکی۔ ان کی گورنمنٹ کو بھی رخصت کیا گیا۔ البتہ سپریم کورٹ نے حکومت کو بحال کر دیا۔ اس کے باوجود حالات اس بچ پر پہنچ گئے کہ صدر اور وزیر اعظم دونوں کو استعفیٰ دینا پڑا۔ نئے انتخابات ہوئے اور پی پی پی اقتدار میں آگئی۔ اس زمانے میں محترمہ اور معراج خالد میں اختلافات کھل کر سامنے آ گئے۔ پیپلز پارٹی کی سربراہ نے انہیں لاہور سے ان کی رواجی نشست پر انتخاب لڑنے کے لیے پارٹی کا ٹکٹ نہیں دیا۔

اس واقعے کے بعد ملک معراج خالد پیپلز پارٹی کی سیاست سے دور ہو گئے۔ انہوں نے اخوان المسلمون نامی تنظیم بنا کر لاہور کے دیہی علاقے میں اسکول کھول لیے اور ان کے انتظامات پر توجہ مرکوز کر لی۔ وہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے ریکٹور بھی مقرر ہو گئے۔ معراج خالد

ایک سادہ انسان تھے جنہیں اکثر لاہور کے مال روڈ پر گھومتے ہوئے اور باغ جناح میں سیر کرتے ہوئے دیکھا جاسکتا تھا۔ اب فاروق لغاری ملک کے نئے صدر تھے۔ ان کا تعلق پی پی پی سے تھا۔ تاریخ نے خود کو دہرایا۔ صدر اور وزیر اعظم میں پھر قافلہ پلے پلے ہوا گئے۔ آخر پی پی پی کی حکومت کو ان کے اپنے ہی صدر نے ختم کر دیے۔ اب اسی معراج خالد کو جس نے پی پی پی سیاست سے دور کر دیا تھا، مگر ان وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ انہوں نے تین ماہ کی مقررہ مدت میں انتخابات کروا کے اقتدار نواز شریف کے سر پر کر دیا۔ جب وہ مگر ان وزیر اعظم نے تو انہوں نے دی آئی پی کچر کے تخت لٹے والی مراعات کو ختم کرنے کی کوشش کی اور ایئر پورٹ پر عام مسافروں کے راستے کو استعمال کرنا شروع کیا۔ اس زمانے میں عائشہ خٹرا کہا کرتے تھے کہ اب وزیر اعظم ہاؤس میں بیٹھیں بندھیں گی۔

ان کی زندگی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ 60 کی دہائی میں وہ لاہور کے جس مکان میں مقیم ہوئے تھے، وہ کہا مکان تھا۔ 1964 میں ریگل کے پاس اندرون ہال روڈ لکھی مشن میں ایک قلیٹ لے لیا اور بعد کی زندگی وہاں گزار دی۔ ایک کمرہ تھا۔ وہی ڈرائنگ روم، وہی دفتر وہی کمرہ۔ ان کی بیگم صاحبہ اسکول سمجھتی تھیں۔ 1973 میں وہ گورنر بن گئے تھے۔ تب ایک تقریب میں ان کی بیگم سے پوچھا گیا۔ ”آپ کے مہیاں وزیر اعلیٰ پنجاب ہیں؟ کیا آپ اسکول کی ملازمت چھوڑ دیں گی۔“

انہوں نے جواب دیا۔ ”میری ملازمت مستقل نوعیت کی ہے، میں کیوں چھوڑوں گی؟ ان کی ملازمت تو عارضی ہے۔“ کھر میں مٹی کے دو گھر تھے، جن سے مہیا بیوی پانی پیچے۔ فرخ تھا ضرور، مگر اس میں مہماؤں کے لیے پانی رکھا جاتا۔ انہوں نے مہیا باضابطہ طور پر پیپلز پارٹی چھوڑنے کا اعلان نہیں کیا، لیکن اب وہ اس سے لائق ہو چکے تھے۔ 13 جون 2003 کو اس اصول پسند سیاست داں کا اسلام آباد میں انتقال ہوا۔

میاں طفیل

آپ جماعت اسلامی کے تقریبات سے اختلاف کر سکتے ہیں، ان کی پالیسیوں اور فیصلوں کو تنقید کا نشانہ بنا سکتے ہیں، مگر اسے پاکستانی سیاست سے خارج نہیں کر سکتے۔ اس جماعت کے اثرات فقط پاکستانی سیاست تک محدود نہیں۔ اس نے مذہبی افکار اور ریاستی پالیسے پر بھی دیرپا نقوش

چھوڑے۔ اس اثر پذیر کاسب اس کے امیر ٹھہرے۔ مولانا مودودی اس کے بانی امیر تھے، جنہوں نے نہ صرف اس ملک بلکہ پوری مسلم دنیا کی سیاست کو متاثر کیا اور کئی ممالک میں ایسی مذہبی سیاسی تحریکوں کا آغاز ہوا، جنہوں نے مولانا مودودی کی شخصیت اور ان کے افکار کو مشکل راہ بنایا۔ مولانا کے بعد اس اہم ترین جماعت کی قیادت میں مفضل نے سنبھالی جنہوں نے پاکستانی تاریخ کے اہم مواقع پر کلیدی کردار ادا کیا۔

میاں مفضل محمد نومبر 1913 میں مشرقی پنجاب کی ریاست کپورتھلہ کے ایک گاؤں صفدر پور آرائیاں میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک کاشت کار مذہبی گھرانے سے تھا۔ ان کے والد اسکول میں معلم تھے۔ یعنی انہوں نے فطری زندگی کو بھی قریب سے دیکھا اور علم سے بھی رشتہ جڑا رہا۔ میاں مفضل اپنے بہن بھائیوں میں بڑے ہیں۔ پرائمری تک تعلیم اپنے گاؤں کے اسکول سے حاصل کیا۔ اب سفر پر نکلے۔ وہ ایک معنی طالب علم تھے۔ معاشی مسائل، کاشت کاری اور تعلیم ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ ذل کا مرحلہ قصہ بڑا لے ملے گیا۔ میٹرک کا امتحان کپورتھلہ کے رند میرانی اسکول سے کیا۔ وہ پری انجینئرنگ کے طالب علم تھے۔ رند میرانہ کالج، کپورتھلہ سے امتیازی نمبروں سے انٹر کیا اور دینی کے حق دار ٹھہرے۔ انہوں نے لاہور کا رخ کیا۔ یہی شہر مستقبل میں انہیں اس راہ پر گامزن کرنے والا تھا، جس نے انہیں ملک گیر شہرت عطا کی۔ انہوں نے لاہور کے گورنمنٹ کالج سے بی ایس سی آنرز کیا۔ پھر وکالت کی سمت آگئے۔ پنجاب یونیورسٹی لا کالج، لاہور سے 1937 میں ایل ایل بی، دوسری پوزیشن کے ساتھ کیا۔ انہیں جیسا سا تذہ لے۔ سابق چیف جسٹس آف پاکستان محمد منیر ان کے اساتذہ میں سے شامل رہے۔ اب انہوں نے جالندھر میں شیخ محمد شریف کے ہمراہ وکالت شروع کی جو بعد ازاں سپریم کورٹ کے جج بنے۔ ایک سال تک ان کے ساتھ کام کرنے کے بعد وہ کپورتھلہ منتقل ہو گئے۔ وہاں اپنی آزاد وکالت کا آغاز کروایا۔ ایک تحقیق کے مطابق وہ ریاست کپورتھلہ کے پہلے مسلمان (ایل ایل بی) وکیل تھے۔ خاندان دینی رحمان کا حامل تھا۔ انہیں بھی مذہبی کتب کے مطالعے کا شوق تھا۔ مولانا مودودی کے رسالے ترجمان القرآن کے وہ مستقل قاری تھے۔ جب جماعت اسلامی کا تاسیس اجتماع ہوا، تو وہ شریک ہوئے۔ اب ایک نئے سفر کا آغاز ہوا۔ انہوں نے اپنی خدمات جماعت کے لیے وقف کر

دیں۔ 21 جنوری 1942 کو وکالت ترک کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس وقت لوگوں نے اس فیصلے پر بڑی تنقید کی اور اسے جذباتی فیصلہ قرار دیا، مگر وہ ڈٹے رہے۔ ان کی نظریں مستقبل پر تھیں اور آنے والے وقت نے ان کے فیصلے کو درست ثابت کیا۔ گزشتہ برس کے لیے وہ تجارت کی سمت آگئے لیکن یہ راہ نقصان دہ تھی۔ شدید معاشی مسائل درپیش تھے مگر دینی اور روحانی سکون تھا۔ ان کی محنت اور لگن جلد انہیں سینئر وکیل کی نظروں میں لے آئی۔ اس وقت کے امیر جماعت اسلامی لاہور ملک نصر اللہ خان کی تجویز پر انہیں قلم (سکریٹری) مقرر کر دیا گیا۔ 1944 میں ملنے والی کس ڈے داری کو انہوں نے بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا۔



ارکان جماعت کو فاضل کیا۔ دعوت و تنظیم کے لیے ہندوستان بھر میں دورے کیے۔ اس دوران ان کی ممتاز مسلمان سیاست دانوں کے ساتھ ساتھ ہندو اور مسیحی اسکالرز سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ قیام پاکستان ایک مجرہ تھا، مگر قائد اعظم کی وفات کے بعد بگاڑ کی ابتدائی علامات ظاہر ہونے لگیں۔ اقتدار کے لیے رسہ کشی شروع ہو گئی۔ جمہوری اور سیاسی تحریک کا آغاز ہوا۔ جماعت ان میں پیش پیش تھی۔ اسلامی نظام کے نفاذ کی تحریک کے دوران میاں مفضل کو اکتوبر 1948 میں گرفتار کیا گیا۔ پہلے وہ قصور جیل میں رہے۔ پھر انہیں ملتان منتقل کر دیا گیا۔ اپریل 1950 میں نظر بندی کی مدت میں توسیع ہو گئی۔ بالآخر لاہور ہائی کورٹ کے پنجاب بلیک سٹیفی ایکٹ کے ایک فیصلے کے تحت 28 مئی کو رہا کر دیا گیا۔ دوران قید انہیں مولانا مودودی کی محبت میر آئی، جس نے ان کی شخصیت پر دیر پا اثرات مرتب کیے۔ جیل میں انہوں نے سید مودودی سے سورہ یوسف سے سورہ اتاس تک قرآن مجید سیکھا پڑھا۔ اور احسن احسن اسلامی جیسے اسکالر بھی قید تھے، جن عمرانی میں احادیث کی کتب پڑھیں اور عربی زبان سیکھی۔ 1965 تک وہ جماعت کے قلم رہے۔ اس دوران ہر تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جنوری 1966 میں وہ نائب امیر جماعت ہو گئے۔ یہ ایک بھاری ذمے داری تھی جسے

انہوں نے توجہ اور لگن سے نبھایا۔ اس دوران وہ جماعت اسلامی مغربی پاکستان کے امیر مکی رہے۔ متعدد مرتبہ مولانا مودودی کی جگہ قائم مقام امیر کے فرائض انجام دیے۔ مارشل لا کے خلاف زندگی کے تمام طبقے احتجاج کی راہ پر گامزن ہو چکے تھے۔ جو اعلیٰ پوزیشن (سی او بی) کا قیام قتل میں آیا، تو میاں مفضل اس کے مرکزی رہنماؤں میں سے تھے۔ عوام میں سیاسی شعور اب گہرا کرنے اور ملک میں جمہوریت کے حق میں ایک مضبوط تحریک چلانے کے لیے انہوں نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے دور دراز علاقوں کے طوقانی دورے کیے۔ جماعت کا موقف ہے کہ اسی تحریک نے پہلی بار یوں خان کی ڈکٹیٹر شپ کو چیلنج کیا۔ گو یہ دعویٰ سو فیصد درست نہیں۔ اس سے قبل ہی ترقی پسند طلباء مختلف مواقع پر آمریت کے خلاف بھرپور احتجاج کر چکے تھے اور شہر بدری کی پزائیں بھگت چکے تھے۔ ان کے جلسوں پر فائرنگ بھی ہوئی تھی۔

خیر، میاں مفضل نے پاکستان ڈیموکریٹک موومنٹ (پی ڈی ایم) اور ڈیموکریٹک ایکشن کمیٹی (ڈیک) میں بھی جماعت کی بھرپور نمائندگی کی اور فعال کردار ادا کیا۔ دونوں تحریکوں نے 1969 میں ایوانی آمریت کے خاتمے میں اہم کردار ادا کیا۔ 1970 میں ملک میں پہلے عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کو پاکستان کی تاریخ کے شفاف ترین انتخابات کہا جاتا ہے، مشرقی پاکستان سے محبوب الرحمن اور مغربی پاکستان سے مجنوں کاسب ٹھہرے۔ ان انتخابات کے بہت رخ نتائج سامنے آئے۔ آمریت سے جمہوریت کے سفر میں دشمنوں کو سازش کا موقع مل گیا۔ مشرقی پاکستان میں علیحدگی کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس مشکل دور میں میاں مفضل نے مشرقی پاکستان کا تفصیلی دورہ کیا اور وہاں کے لوگوں کو اتحاد اور اسلامی بھائی چارے کا پیغام دیا۔ گو یہ کوششیں لامحالہ ثابت ہوئیں۔ حالات پوائنٹ آف نوریشن پر پہنچ چکے تھے۔

پاکستان کا ایک بازو ڈٹ چکا تھا۔ مشرقی پاکستان بگڑنے میں ڈھل گیا۔ مولانا مودودی اب متحرک نہیں رہے تھے۔ نومبر 1972 میں میاں مفضل کو ایک اہم ترین ذمے داری سونپ دی گئی۔ انہیں امیر مقرر کر دیا گیا۔

امیر جماعت بننے کے بعد انہوں نے تربیت گاہوں کے ذریعے جماعت کے بنیادی لٹریچر سے تجدید کی اہم شروع کی۔ کارکنان کی تربیت اور قیادت سے براہ راست رابطے کے لیے مرکز میں ماہانہ دس روزہ تربیت گاہ کا اہتمام کیا۔ اسی

طرح پورے ملک میں قرآنی حلقوں کا نیا سلسلہ شروع کیا، اور کم از کم تین ہزار مقامات پر یہ حلقے درس قائم ہوئے۔

بھٹو کا زمانہ سیاسی طور پر خاصا متحرک تھا۔ مارچ 1973 میں اپوزیشن جماعتوں پر مشتمل حصہ جمہوری اتحاد (یو ڈی ایف) کے قیام میں میاں مفضل نے بھرپور کردار ادا کیا۔ گواہین سازی کا کرپٹ اس اتحاد کو نہیں دیا جاسکتا۔ البتہ اس کا اثر واضح تھا۔ جنوری 1977 میں ہونے والے انتخابات میں گو پی پی کا مایاب ٹھہری مگر پاکستان قومی اتحاد (پی این اے) نے دھاندلی کے خلاف بھرپور تحریک شروع کر دی۔ اس تحریک کے جہادوں دے میں میاں مفضل شامل تھے۔ بھٹو سے مذاکرات کے لیے جو کمیٹی بنی تھی وہ نواب زادہ نصر اللہ خان، پروفیسر غفور احمد اور میاں مفضل پر مشتمل تھی۔ پروفیسر غفور نے اکثر انٹرویوز میں یہ کہا کہ معاہدہ طے پا گیا تھا۔ دخل ہونے باقی تھے کہ ملک میں مارشل لا لگ گیا۔ ضیاء الحق نے اقتدار سنبھال لیا۔ ضیاء الحق کی مجلس شوریٰ کا حصہ بننا وہ فیصلہ تھا جس کے لیے جماعت کو ہمیشہ شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا، پروفیسر غفور احمد کا موقف تھا کہ وہ اس کے خلاف تھے مگر اجتماعی فیصلہ تسلیم کیا گیا۔ بعد میں منور حسن صاحب نے یہ موقف اختیار کیا کہ اس وقت جماعت نہیں بلکہ پی این اے فیصلہ ساز ہاؤی تھی، جس نے یہ فیصلہ کیا تھا اور انتخابات کی تاریخوں کا اعلان کروانے کے بعد جماعت مجلس شوریٰ سے باہر آ گئی۔ اب جو بھی دلیل پیش کی جائے، ضیاء الحق کی کابینہ کا حصہ بننا ہمیشہ ایک نا پسندیدہ عمل رہا۔ وقت نے کڑھ لی۔ دسمبر 1979 میں روس نے افغانستان پر حملہ کر دیا۔ شاطر امریکانے اسے لادینیت اور اسلام کی جنگ بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس کے فطیل نہ صرف ضیاء الحق حکومت توانا ہوئی بلکہ مذہبی سیاسی جماعتوں کو بھی ابھرنے اور سانج میں سرایت کرنے کا موقف ملا۔ جماعت اسلامی نے افغانوں کے موقف کی تائید کی اور سودیت یونین کی خدمت کی۔ یہ جنگ سودیت یونین کے ٹوٹنے کا سبب بنی مگر پاکستان کے لیے بھی کتنے ہی مسائل لے کر آئی۔

وقت گزرتا رہا۔ جماعت میں نوجوان قیادت ابھرنے لگی۔ میاں مفضل اب بوڑھے ہو گئے تھے۔ اکتوبر 1987 تک وہ امیر جماعت اسلامی رہے۔ ان کے بعد قاضی حسین احمد نے یہ ذمے داری سنبھالی۔ امدادت سے فارغ ہونے کے بعد ادارہ معارف اسلامی، منصورہ کے چیئرمین اور عالمی مساجد کونسل کے رکن رہے۔ انہوں نے طویل عمر پائی۔ 24 جون

2009 کو 95 سال کی عمر میں لاہور کے شیخ زید اسپتال میں ان کا انتقال ہوا۔

وسیم اکرم

وسیم اکرم فقط ایک کرکٹ نہیں، ایک پورا عہد ہیں۔ ایک انوکھا کھلاڑی، صلاحیت کا پاور ہاؤس۔ ایسا باکمال بلر، جس کی کوئی مثال نہیں ملتی، جو اپنے ہم عصروں سے سائیز رفتار نہیں تھا مگر اپنی بے پناہ قابلیت کے وسیلے اس نے ایسے کارنامے انجام دیے کہ سننے والا آکھٹ بد مذاں رہ جائے۔

وہ پہلے ہار تھے جنہوں نے دن ڈے کرکٹ میں پانچ سو نوکوں کا سنگ میل عبور کیا۔ اس وقت یہ ایک نامکن خواب تھا جسے ان کی محنت نے تعبیر دی۔ انہوں نے یہ سنگ میل 2003 کے ورلڈ کپ میں عبور کیا تھا۔ کرکٹ کے معتبر پرچہ وژن نے جب 2002 میں پہلی بار تاریخ کے بہترین کھلاڑیوں پر مشتمل ٹیم ریلیز کی تو اس میں وسیم اکرم بھی شامل تھے جنہیں دن ڈے کا بہترین بلر قرار دیا گیا تھا۔ 2009 میں جب ہال آف فیم میں عہد حاضر کے پانچ کرکٹرز کو شامل کیا گیا تو وسیم اکرم کا نام بھی اس میں موجود تھا۔ انہوں نے ٹیسٹ ٹیمر میں 17 ہارین آف ویج کی بیچ کا ایوارڈ حاصل کیا۔ دن ڈے میں یہ کارنامہ 19 بار انجام دیا۔ انہوں نے اپنے کیریئر میں چار بار بیٹ ٹرک کی۔ دو بار ٹیسٹ کرکٹ میں، دو بار دن ڈے میں۔ وہ چار بیٹ ٹرک کرنے والے اولین ہار تھے۔ انہوں نے بطور بے ہاز آٹھویں نمبر پر بیٹنگ کرتے ہوئے ڈبل سنچری اسکور کی۔ یہ اس نمبر پر پہلی جانے والی سب سے بڑی اننگز تھیں۔

وسیم اکرم ایک شان دار کھلاڑی تھے۔ جہاں پہنچ کر دوسروں کے کیریئر رک جاتے تھے، وہاں سے وہ ایک نئی انگڑاں آغاز کرتے تھے۔ کسی زمانے میں جنوبی افریقہ کے اپیل ڈونلڈ، آسٹریلیا کے میک گرا کو ان کا ہم پلہ خیال کیا جاتا تھا مگر پھر ریکارڈز کی دوڑ میں وہ ان سے بہت پیچھے رہ گئے۔ خود ان کے ہم وطن وقار یونس بھی ان ہی کے مانند عظیم کھلاڑی تھے۔ ایک زمانے میں دونوں میں نوکوں کی دوڑ لگی رہتی تھی۔ گودھاری مہارت اور قابلیت میں کوئی شک نہیں اور ان کے ریکارڈز ذہنی طاقتور وید ہیں مگر وسیم اکرم کے کارناموں کی فہرست ان سے طویل ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہ رہا کہ وہ بائیں ہاتھ کے بلر تھے جو سیدھے ہاتھ کے بے ہازوں کے لیے قہر ثابت ہوتا ہے۔ پھر ان کی کپتانی بھی ان کے کام آئی۔

عمران خان کے بعد جن کھلاڑیوں نے یہ منصب سنبھالا، ان میں، ایم اکرم سب سے خوش قسمت رہے۔ بے شک انہیں بھی مخالف کا سامنا رہا۔ ان کے خلاف ایکڈلٹر بنے، الزامات لگائے گئے، مقدمہ بھی چلا مگر قسمت نے انہیں بچا لیا۔ پھر انہیں بطور کپتان بطور مجرب اختیار دیا گیا۔ ان اختیارات سے انہوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔ اپنی مرضی کی ٹیم بنائی۔ سیدہ انور میں خان، انعام الحق، مشتاق احمد اور فطین مشتاق ان کی ٹیم کا کلیدی حصہ تھے، جنہوں نے وسیم اکرم کو بے طور کپتان تقویٰ ہی فتوحات دلایں۔

ایک زمانے میں ان کی اور وقار یونس کی جوڑی مشہور تھی۔ انہیں ”ٹو ڈبلوز“ کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ ایک اپنی تیز رفتار، دوسری اپنی نیکی، کبھی پڑ کر اندر آتی، کبھی باہر جاتی گیندوں سے مخالفین کی دفاعی دیوار میں دراڑ ڈال دیتا۔ ریوس سوئنگ کو پاکستانی بلرز کی ایجاد کہا جاتا ہے۔ بہت سے لوگ اس کا سہرا سرفراز نواز کے سر پر باندھتے تھے۔ البتہ یہ عمران خان تھے جنہوں نے اسے باقاعدہ آرٹ کا درجہ دیا اور پھر دسم اور وقار یونس نے اسے اپنے اوج پر پہنچایا۔

ایک زمانے میں تو انگریز ریوس سوئنگ کو بال ٹیسٹنگ کی کارفرمائی قرار دیا کرتے تھے اور اسے کھیل سے دھوکا سمجھاتے تھے۔ اس ضمن میں نہ صرف تنقید کی جاتی تھی، بلکہ ایک دوسرے کے خلاف مقدمہ بھی کیے جاتے۔ عمران خان اور این یو پیٹھم کا مقدمہ سب کو یاد ہے۔

خبر بات ہو رہی تھی وسیم اکرم کی جو نہ صرف اپنے عہد بلکہ کرکٹ کی تاریخ کے عظیم ترین بلرز میں سے ایک ہیں۔ اس کلام میں کوئی ان کا ہم پلہ نہیں تھا۔ گو بطور کپتان وہ ورلڈ کپ میں بد قسمت رہے۔ 1996 ورلڈ کپ میں وہ ان فٹ ہونے کی وجہ سے ٹیم سے آؤٹ ہو گئے۔ عامر سمیل نے کپتانی سنبھالی اور پاکستان کو ورلڈ فائنل میں اڑایا۔ یہ ہار کیا۔ 1999 میں انہیں پاکستانی تاریخ کی بہترین ٹیم مل۔ یہ ٹیم فائنل تک بھی پہنچی مگر ایک بار پھر پاکستان ٹیم دباؤ برداشت نہیں کر سکی۔ فائنل میں پاکستان کو ٹرمنٹ ٹاک شکست



ہوئی۔ یہ ورلڈ کپ وسیم کی کپتانی کے لیے بد بخت ثابت ہوا۔ بڑھتی عمر اور مسائل رکاوٹ بننے لگے اور اشارے ملنے لگے کہ ان کا دور ختم ہو رہا ہے۔ گو اس ورلڈ کپ سے قبل انہوں نے انڈیا کو کانٹے دار سریز میں ہرایا تھا۔ وہ ایک یادگار سیریز تھی، جہاں وہ اپنی اونچ پر تھے۔ اسی طرح انہوں نے انگلینڈ کو انگلینڈ کی سرزمین پر یادگار شکست دی۔ اس سے کچھ پیچھے چائیں تو ہم انہیں 1992 ورلڈ کپ فائنل کے ہیرو کے طور پر دیکھتے ہیں، جہاں انہوں نے ٹین وکٹیں حاصل کیں اور زبردست بیٹنگ کی۔

وسیم اکرم کے جن ریکارڈز کا نام ہم نے متعدد بار تذکرہ کیا، مناسب ہے، ان پر تفصیلی نظر ڈالی جائے۔ انہوں نے 104 ٹیسٹ کھیلے، جس میں 23.62 کی شان اوسط سے 414 وکٹیں اپنے نام کیں۔ کسی زمانے میں یہ ایک ریکارڈ تھا۔ انہوں نے 25 بار پانچ وکٹیں لیں اور پانچ بار دس وکٹیں لینے کا کارنامہ انجام دیا۔ اس فارمیٹ میں ان کی بطور بے ہاز بھی کارکردگی متاثر کن رہی۔ انہوں نے 2898 رنز بنائے جن میں سات نصف سنچریاں اور تین سنچریاں شامل تھیں۔ اس میں زماوے کے خلاف 257 ناٹ آؤٹ کی ایک یادگار اننگز بھی تھی جس میں انہوں نے فطین مشتاق کے ساتھ ریکارڈ یا ٹینر شپ کی۔ اس اننگز میں انہوں نے گیارہ چھکے جڑے تھے۔ اب دن ڈے پر نظر ڈال لیتے ہیں۔ وہ 356 مقابلوں میں اترے۔ یہاں چھ سنچریوں کی مدد سے انہوں نے 3717 رنز دوڑائے مگر ٹیسٹ تو ان کی بولنگ سے غرض ہے۔ انہوں نے 502 وکٹیں لیں۔ پانچ وکٹیں لینے کا کارنامہ چھ بار انجام دیا۔ یہاں بھی ان کی اوسط 23.5 رہی، جو تیرا ان کی تھی۔

وسیم اکرم تین جون 1966 کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد چوہدری محمد اکرم کا تعلق امرتسر سے تھا جو تیسرے عہد میں آن بے۔ وہ فطین کے شائق تھے اور ایسا بھ بھ بھ بھ کی فلمیں بڑے شوق سے دیکھا کرتے تھے۔ اسلام آباد کالج سول لائسنز کے طالب علم رہے۔ عمران خان کے گرویدہ تھے۔ ان ہی کو دیکھ کر کرکٹ کھیلنے شروع کی۔

پاکستان میں سلیکشن کا طریقہ کار آسٹریلیا اور انگلینڈ سے یکسر مختلف ہے۔ کھلاڑی نیچے سے اوپر نہیں آتے۔ کسی سینئر کرکٹر، کوچ یا پورڈ آفیشل کی نظر کسی نوجوان پر پڑ جاتی ہے اور اس کی قسمت جاگ اٹھتی ہے۔ تو صیف احمد کی مثال سامنے ہے۔ ان کا پہلا ٹیسٹ ہی ان کا پہلا فرسٹ کلاس تھا۔ وسیم

اس کے بعد 1853ء میں آسٹریا کے ہیرن فریو خان، ان کا سیر میں اور چوٹی کو لاکر ایک آ۔ جاکر لیا۔ انہیں کے علاوہ مادن کے جارج ہارن نے بھی اس سلسلے میں اہم کام انجام دیا۔ جینیو اور شیئر کے مشاہدات و تجربات سے قائمہ اٹھا کر زینروپ (Zoetrope) نامی آلہ منظر عام پر آیا۔ زینروپ میں ایک چمچی پر بہت سی تصاویر چسپاں کر دی جاتی تھیں اور اس کے آگے ایک اور چمچی ہوتی تھی جب اس چمچی کو گھمایا جاتا تھا تو تصویر میں حرکت پیدا ہو جاتی تھی لیکن اس آلے میں ایک نقص تھا کہ تصویریں یکسر کے سہانے ہاتھ سے بنی ہونے کی وجہ سے یکساں نہیں بنتی تھیں جس سے حرکت میں تسلسل نہیں رہتا تھا اور کاؤٹ پیدا ہو جاتی تھی۔ اس آلے کے ذریعے جاوڑوں، مداروں اور موزوں وغیرہ کی تصویریں چلتی پھرتی صورت میں دکھائی جاتی تھیں۔ اس سلسلے میں ایلمیر ریٹائڈ کی Praxinoscope کا ذریعہ بھی دلچسپی سے غالی نہیں۔ اس میں اور پہلے کے بنائے گئے آؤٹوں میں کوئی خاص فرق نہیں تھا صرف اس میں دیکھنے والے سوراخوں کی جگہ شیشے کا دیے گئے تھے۔ ریٹائڈ 1892ء تک اس میں مسلسل اضافہ و اصلاح کرتے رہے اور آخر انہوں نے جیس میں ایک فیئر کھول لیا جہاں وہ 1900ء تک ان چلتی پھرتی تصویروں کی نمائش کرتے رہے تھی کہ فرانس میں قسروں کی باقاعدہ نمائش شروع ہوئی اور انہیں اپنے اس مکمل کو مجبوراً بند کرنا پڑا۔

1860ء میں ایک امریکن ہائیسے ہنری کول مین نے زینروپ کے تصویروں میں پیدا ہونے والی رکاوٹ کو دور کر دیا۔ ہوا یوں کہ ایک دن اس نے اپنے بچے کو ایک کس میں کھیل کھوئے ہوئے دیکھا اور اس نے دوسرے شیشے کا استعمال کر کے اس کے کئی پوز کھیلے اور انہیں ایئر پکوپ کے شیشے کے پیچھے کھونے والے ایک پڈل دیلے پوز کا دیاجس سے حرکت میں پیدا ہونے والی رکاوٹ دور ہوئی۔ اس سے تقریباً دس برس بعد فلاڈلفیا میں ہنری ریٹائڈ نامی نوگرافر نے پہلی بار کئی پوز کی تصاویر کو ایک فٹسٹری پر چسپاں کر کے متحرک تصاویر کی صورت میں عوام کے سامنے پیش کیا۔ اس کے بعد 1877ء میں کینیڈا کے گورڈن فرانسز پر ایڈورڈ مائی برج نامی نوگرافر نے دوڑے گھومنے کی مسلسل 25 تصویروں کی کھینچ کر متحرک تصاویر کی ترقی میں ایک قدم اور آگے بڑھایا چونکہ ان دنوں آٹو ٹیک کیمیرے نہیں تھے لہذا مائی برج نے 25 کیمروں کو ایک قمار میں لگا کر ان سب کے شٹر دھاگے سے اس طرح باندھے کہ جب دوڑا ہوا گھوڑا کیمیرے کے سامنے سے گزرتا تھا تو بے ہودہ دھکے دھاگے ٹوٹنے جاتے اور شٹر کھل کر بند ہوتا جاتا تھا ان تصاویر کو ایک ساتھ دیکھنے سے گھوڑا دوڑتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ 1880ء میں سان فرانسسکو میں ان تصاویر کو ایک شیشے کی فٹسٹری کے ذریعے متحرک حالت میں دکھایا گیا۔

انتباس: فلم ڈائریکٹری: واڈ: یا سین گوریر۔
مرسلہ: ہاربا زخان۔ پٹاوار

اکرم کے معاملے میں سینئر کھلاڑی جاوید میاں داد تھے جنہوں نے سب سے پہلے ان کی صلاحیتوں کو پہچانا۔ البتہ کچھ معصنین کے مطابق یہ کہانی حقیقت سے مطابقت نہیں رکھتی۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ قدانی اسٹیڈیم میں فرامکر ہوئے۔ وہاں سیکڑوں نو جوانوں نے قسمت آزمائی۔ پہلے دو دن دو سیم کو بولنگ کے لیے بلایا ہی نہیں گیا۔ تیسرے دن موقع ملا تو وہ فرامکر پر موجود سینئر کو کھڑا کر کے ان کا کامیاب رہا۔

غزنی لینڈ کے خلاف انہوں نے علیحدہ عباس کی قیادت میں اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ 1985 میں انہیں آسٹریلیا کے خلاف چانس ملا جہاں وہ پانچ کھیل لے اڑے۔ انہوں نے 1985 میں غزنی لینڈ کے خلاف سیریز سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ سیریز کے دوسرے ٹیسٹ میچ میں دس کھیل لے کر انہوں نے اپنے انتخاب کو درس ثابت کیا۔ ساتھ یہ اشارہ بھی دے دیا کہ ایک ورلڈ کلاس بالر میدان میں اتر چکا ہے۔ ویسے قابلیت اپنی جگہ ہے۔ ان کی قسمت بھی جس کی وجہ سے وہ ڈومیسٹک کرکٹ کے تجربے کے بنا کر انٹرنیشنل کرکٹ میں چلے آئے۔ اب وہ ٹیم کا حصہ بن گئے۔ ویسٹ انڈیز کا دورہ کرنے والی ٹیم کے وہ رکن تھے مگر وہاں وہ انڈیز ہو گئے۔ بعد میں وہ سرجی سے گزرے اور زبردست کم بیک کیا۔ بعد کی کہانی تاریخ کا حصہ ہے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے یہ طور کو سینئر اپنا کیریئر شروع کیا۔ وہ آخر کے دنوں میں اس کا اشارہ دے چکے تھے۔ انہوں نے ملکی اور بین الاقوامی میچوں کے لیے کوچنگ کی اور خود کو سونایا۔ وہ وی وی پرائیویٹ کے طور پر بھی نظر آئے۔ پھر انہوں نے کوچنگ کیریئر شروع کیا۔ اس میدان میں انہوں نے کامیابی کے جھنڈے گاڑے۔ انڈین لیگ کی پہلی ترین ٹیم کلکتہ ٹائیڈ رائیڈز کے وہ بولنگ کوچ رہے۔ بعد میں جب پاکستان میں کرکٹ لیگ شروع ہوئی تو ہم نے انہیں اسلام آباد کے کوچ کے طور پر دیکھا۔ لہٰذا ایل کا پہلا سیزن اسلام آباد ہی نے جیتا۔ کئی مہینوں کا خیال ہے کہ پاکستان کرکٹ بورڈ کو ان کی صلاحیتوں سے استفادہ کرنا چاہیے اور انہیں کرکٹ ٹیم کی کوچنگ سونپی جائے۔ دیکھیں، یہ تیل کب منڈھے چڑھتی ہے۔

ان کی کہانی میں کئی شیڈز ہیں۔ کبھی کبھی تو یہ فلیس معلوم ہوتی ہیں۔ اس کا ایک پہلو وہ بھی ہے، جب انہیں اپنے کیریئر کے عروج پر... یعنی 30 سال کی عمر میں شوگر کی تشخیص ہوئی۔ اس وقت خیال کیا جاتا تھا کہ یہ بیماری فقط بوڑھوں کے لیے

مخصوص ہے اور اس کے بعد کھلاڑی پر فٹبال کرکٹ جاری نہیں رکھ سکتا۔ یہ دسم اکرم کے لیے بڑا چپکا تھا مگر انہوں نے باپس ہونے کے بجائے اس بیماری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ وہ باقاعدگی سے اوپریٹر رہے اور آگے بڑھتے رہے۔ یعنی طور پر اس کی وجہ سے انہیں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا مگر خدا کی دی ہوئی صلاحیت کے وسیلے وہ ایک کے بعد ایک ریکارڈ قائم کرتے چلے گئے۔ انہوں نے شوگر سے متعلق کئی آگاہی پروگراموں میں شرکت کی اور فیصل کو تحریک دی کہ کسی مسئلہ یا بیماری کو اپنی راہ کی رکاوٹ نہ بنے دیں۔

ان کی ازدواجی زندگی سے ایک بڑا تر تو نہیں جڑے تھے مگر وہ خبروں کی زینت ضرور بنی کہ ان کی زوجہ ہاشمی ایک سبھی ہوئی، مہذب اور خوش شکل خاتون تھیں جو دسم کے ساتھ خوب چلتی تھیں۔ 1995 میں ان کی شادی ہوئی۔ اس شادی سے دسم اکرم کے ہاں دو بیٹے تیمور اور اکبر پیدا ہوئے۔ پندرہ برس انہوں نے ایک بھر پور زندگی گزاری، مگر پھر امراض کے حملے نے 2009 میں ان کی جان لے لی۔ یہ ایک ہماری صدمہ تھا، انہیں اس سے ابھرنے میں کچھ وقت لگا۔ بعد میں ان کا نام سابق مس یونیورس شمسیتا حسین کے ساتھ جوڑا گیا مگر 2013 میں یہ خبریں دم توڑ گئیں، جب وہ ایک آسٹریلیائی خاتون سے رخصت ازدواج میں بندھ گئے جنہوں نے شادی کے بعد اسلام قبول کر لیا اور ضمیرا دسم کہلائیں۔ ان دونوں کی ملاقات 2011 میں ہوئی تھی۔ لاہور میں شادی کی سادہ سی تقریب ہوئی، جس کے بعد دسم نے نئے سفر کا آغاز کیا۔ 2014 میں خدا نے دسم اکرم کو ایک بیٹی عاتکہ سے نوازا۔ چند برس قبل دسم اکرم کے ساتھ عجیب واقعہ ہوا۔ شارع فیصل پر ہونے والی سح کلائی کے بعد ایک شخص نے ان پر غار داغ دیا۔ اس واقعے نے بین الاقوامی توجہ حاصل کی۔ بہت شور مچا۔ ایف آئی آر آئی۔ بہت لے دے ہوئی۔ معاملہ تو جیسے جیسے تھپتھپ گیا مگر اپنے پیچھے یادیں چھوڑ گیا۔

سنٹوش

پاکستان انٹرنیشنل کے ذوال نے ہم پر جو اثرات مرتب کیے انہیں الفاظ میں قید نہیں کیا جاسکتا۔ یہ فقط تفریح کی سب سے بڑی صنعت کا ذوال نہیں تھا بلکہ اس نے ہمارے زرخیز ماضی پر بھی کاری ضرب لگائی اور ہمارے ذہنوں سے پڑھے

لکھے قلم ساز، مہذب اداکار، ادبی ذوق کے حامل اسکریپٹ رائٹر اور باذوق فلم بنیوں کی یاد بخور دی۔ 80 اور 90 کی دہائی میں جب گنڈا سا پھر ہماری فلم انڈسٹری کو دیکھ کر طرح چاٹ رہا تھا، تب کون کہہ سکتا تھا کہ انٹری کی سمت جانی اس صنعت میں کبھی عدم، وحید مراد، محمد علی اور مسدح جیسے اداکار بھی تھے۔ کبھی یہاں سنٹوش جیسا وجیہ، تعلیم یافتہ اور باکروار فنکار بھی گزرا تھا جس کا ایک عالم معترف تھا۔ انہیں پاکستان فلم انڈسٹری کا پہلا سپر اسٹار کہا جاتا ہے۔



انہوں نے نہ صرف پاکستان، بلکہ برصغیر کی شوہر انڈسٹری پر گہرے اثرات مرتب کیے اور ان کے انداز کو تیکڑوں اداکاروں نے کاپی کیا۔ ان کا اصل نام سید موسیٰ رضا تھا۔ وہ 25 دسمبر 1925 کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ تعلیق

ایک تعلیم یافتہ اور باہزت گھرانے سے تھا۔ علمی و ادبی ماحول میں پروان چڑھے، جس نے مطالعے کی جوت بگائی۔ قابل طالب علم تھے۔ انہوں نے حیدرآباد دکن کی مٹانیہ یونیورسٹی سے آئی ایس سی کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ اہل خانہ کی خواہش تھی کہ وہ سول سروس میں نام پیدا کریں مگر وہ ایک ہائی تھے۔ انہوں نے فلم انڈسٹری میں قدم رکھنے کا فیصلہ کیا۔ قیام پاکستان سے قبل اس سمت آگئے۔ 1947 میں وہ فلم ”لہنہ“ میں نظر آئے۔ یہ فلم زیادہ کامیابی حاصل نہیں کر سکی۔ مگر تقسیم کے بعد انڈسٹری کی رفتار تھوڑی دھیمی پڑ گئی۔ ان کی جہاں دیدہ نگاہوں نے دیکھ لیا کہ لاہور انڈسٹری میں ترقی کے زیادہ امکانات ہیں (اس زمانے میں لاہور کو سبھی انڈسٹری بروفیت حاصل تھی) وہ اھر آگئے اور 1950 میں ایک پنجابی فلم ”بلی“ میں جلوہ گر ہوئے۔ ”بلی“ کا کامیاب ٹھہری، مگر ”آنسو“ کا تذکرہ زیادہ ضروری ہے۔ وہ پاکستان کی پہلی سلور جوبلی فلم تھی جس نے انڈسٹری کا چہرہ ہی بدل دیا۔ دنیا پاکستانی فلمی صنعت کا مردِ اوّل قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ کہا جائے گا کہ سنٹوش کی صورت پاکستانی انڈسٹری کو اصل چہرہ مل گیا ہے۔ ہندوستانی فلم سازوں کو اندازہ ہوگا کہ انہیں کتنے بڑے نقصان سے گزرنا پڑا ہے۔

50 کے عشرے میں صبیحہ خانم اور سنٹوش کا ملے کی فلموں میں اکٹھے کام کیا جنہوں نے ریکارڈ برسر کیا۔ ان فلموں میں غلام، رات کی بات، قاتل، انتقام، جیدہ، سر فرار، عشق لیلیٰ، دھند، سردار، سات لاکھ، حسرت، کھوار، دربار نمایاں ہیں۔ انور کمال پاشا کے ساتھ ان کی صلاحیتیں مکمل کر سامنے آئیں۔ آنسو، قاتل اور سر فرار دونوں کی فحاشی صلاحیتوں کے ملاپ کا نتیجہ تھیں۔

”دھند“ اور ”سات لاکھ“ کی شوٹنگ کے دوران صبیحہ خانم اور سنٹوش کا ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے اور بالآخر دونوں شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ اس محبت کا کرب ناک پہلو یہ ہے کہ سنٹوش کا پہلے ہی شادی شدہ تھے۔ ان کی بیگم جلیلہ ایک سبھی ہوئی مگر پہلے خاتون تھیں۔ سنٹوش خود بھی سمجھا رہے تھے۔ انہوں نے پہلی بیگم سے لاشعری اختیار نہیں کی۔ ان کی بیگم نے بھی کشادہ دلی سے صبیحہ کو قبول کر لیا۔ آخری دم تک ان کی دونوں شادیاں قائم رہیں۔ وہ شاید ان گنے بنے افراد میں سے ایک تھے، جو دو کشیتیں کا سوار ہونے کے باوجود وسائل تک بخفاقت سفر کیا۔

یہ تذکرہ بھی اہم ہے کہ پاکستان کا پہلا نگار ایوارڈ بھی قلم ”دھند“ کے لیے سنٹوش کے حصے میں آیا۔ اس معیہ اداکار نے سن 1950 سے 1982 تک 84 فلموں میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے۔ ان کی اور صبیحہ کی جوڑی نے انڈسٹری کو کئی ہلاک بسر فلیس دیں۔ آخر کے برسوں میں انہوں نے ریکٹر رول خوب بھائے۔ وہ 11 جون 1982 کو جہان فانی سے کوچ کر کے اور اپنے پیچھے اپنی میراث چھوڑ گئے۔ یہ انڈسٹری کے لیے ایک کرب ناک لمحہ تھا۔ بعد میں آنے والوں کے لیے خود کو ان کے اثرات سے بچانے کا حکم جگ بگ مانگن تھا۔ ”مصلحتی قریبی کی بات درست ہی ہے، جنہوں نے کہا تھا۔ ”یوں لگتا ہے کہ لفظ ”ہمیر“ بنا ہی سنٹوش کے لیے تھا۔“ انہوں نے نہ صرف انڈسٹری کی آب یاری کی، بلکہ اسے وقار بخشا اور وسیع و عریض ہندوستانی انڈسٹری کے سامنے ایک چیلنج بن کر ابھرے۔

ان کے بھائی عشرت عباس المعروف ورہن بھی پاکستانی فلمی صنعت کے معروف اداکار تھے۔ ایک بھائی ایس سلیمان نے پاکستانی فلمی صنعت کو بلور دیا پکارا باگدار فلیس دیں۔



شکیل ادريس

ہم آپ ٹی وی کی اسکرین پر ایسے رونگٹے کھڑے کر دینے والے مناظر دیکھتے ہیں جنہیں دیکھ کر ہی بول اٹھنے لگتا ہے لیکن کیا کبھی کسی نے یہ بھی سوچا ہے کہ اتنی مشکل فلم بندی ہوتی کیسے ہے۔ ٹیلی ویژن کے ایک معروف کیمرا مین پر کیا گزری اسی واقعے کو پیش کیا گیا ہے۔

”آج کا موسم حسین ہے۔“ شرنا بالغور نے اپنے شوہر ڈرائل سے کہا۔ اس وقت رات کے ساڑھے چار بجے تھے اور وہ اپنے نئی ڈرک میں سوار تھے اور کروڑ گز پھیل پارک جنوبی افرا جا رہے تھے۔ ڈرائل کی عمر 40 برس جب کہ شرنا کی عمر 39 برس تھی اور وہ مثالی جڑا سمجھے جاتے تھے۔ شرنا اپنے شوہر کی طرح سے مضبوط جسم کی مالک تھی اور افرا کے جنگلات میں فوٹو گرافی کرتے ہوئے اسے قطعی خوف نہیں آتا تھا۔ وہ انجیل فورس اسکاڈ میں بھی رہ چکی تھی اور سینٹر لینڈ کے گمنے کے ایک کھیت میں پروان چڑھی تھی۔ اس کے دو بھائی اور ایک بہن تھی۔ وہ کچھ کرنے کے جذبے کے تحت کام کر رہی تھی کہ زندگی میں کچھ کر کے رہے گی۔ اس کا شوہر اور وہ خود اپنے فوٹو گرافر تھے اور جنگلات کے موضوع پر کئی کتابیں شائع کر چکے تھے۔ ان دنوں وہ ہامیوں کی زندگی پر شائع ہونے والی ایک کتاب پر کام کر رہے تھے۔

کروگر میں ہامی بڑی تعداد میں تھے۔ شرنا اس سے پہلے تقریباً آٹھ ہزار مرلج میل کے علاقے میں گزشتہ آٹھ ماہ سے کام کر رہی تھی۔ اب ایک روز جو شرنا انہوں نے ستارہ ریسنٹ کمپ میں ایک کمرہ کرانے پر لیا تھا۔ انہیں تحکون نامی ہامی کی تلاش تھی۔ جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ علاقے کا سب سے بڑا ہامی ہے۔

وادی سندھ کی تہذیب

زمانہ مسیح سے قبل دنیا میں تین بڑی تہذیبیں تھیں۔ ایک ہڑپہ، مہن جو دھو اور دوسری دو تہذیبیں مصر میں دریائے نیل کے کنارے فرعونوں کی تہذیب اور مشرق وسطیٰ میں میسوپوٹیمیا کی تہذیب تھیں۔ ان تینوں ہم عصر تہذیبوں کا زمانہ 3000 قبل مسیح سے 1500 ق۔ م بتایا جاتا ہے۔ اس دور کو کاسی کا دور بھی کہتے ہیں کیونکہ اس زمانے میں زیور، سنکے اور برتن بنانے کے لیے کانسی کا استعمال عام تھا۔ سندھ کی تہذیب کو ہڑپہ تہذیب کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے کیونکہ ہڑپہ وہ پہلا شہر تھا جس کے آثار قدیمہ انیسویں صدی کے وسط میں ملنے شروع ہوئے اور 1920ء میں پورا ہڑپہ شہر دریافت ہوا۔ یہاں سے ملنے والی مہروں، برتنوں اور زیورات سے باہرین آثار قدیمہ نے اندازہ لگایا ہے کہ 2200 قبل مسیح سے لے کر 1900 قبل مسیح تک ہڑپہ کی تہذیب اپنے عروج پر تھی پھر چاک ہی اس تہذیب پر زوال آ گیا اور یہ تہذیب ماضی کی تہذیبوں میں کم ہو گئی۔ آثار قدیمہ کے ماہرین ہڑپہ کے گرد و نواح سے ملنے والے انسانی ڈھانچوں سے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ وہ کون سے عوامل تھے جو اس تہذیب کی تباہی کا سبب بنے۔ مختلف شواہد سے سائنسدان اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ شروع شروع میں اس تہذیب کے لوگ انتہائی امن پسند، ملنسار اور بااخلاق تھے۔ ہر شہری کو بنیادی سہولتیں میسر تھیں اور معاشرہ طبقاتی اور منہ بیک تھا مگر آہستہ آہستہ سوسائٹی میں بگاڑ آ گیا۔ معاشی طبقات وجود میں آ گئے۔ عسکروں اور اشرافیہ کی طرف سے غریب اور لاچار طبقے کے لیے نا انصافیاں بڑھ گئیں۔ نتیجتاً معاشرے میں ایک ایسا طبقہ وجود میں آ گیا جس نے بزرگوں طاقت و ممالک پر قبضہ کرنا چاہا۔ اس منکشف سے معاشرے میں تشدد، لاقانونیت اور انارکی پھیلیں۔ دینی سہی کسر موسمیاتی تبدیلیوں اور دہائی امراض نے پوری کردی اور اس طرح دنیا کی یہ عظیم تہذیب مکمل طور پر مٹ گئی۔

مرسلہ: احمد وحید۔ فیصل آباد

ساتھ چمک رہا تھا۔ اس نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ اس کا رویہ اور تقریباً دس فٹ کے قافلے پر پڑا تھا۔ وہ اس کے لڑکنے کے دوران ہولسٹرے کل گیا تھا۔ اسے اپنا رویہ اور اٹھاتا تھا۔ اس نے اپنی بیوی سے ملے کر کھانا کھا کر جب وہ فائربک کی آواز سے تواس کی مدد کو پہنچے۔ گویا ایک طرح کا شعل تھا۔ وہ رویہ اور کی طرف کھٹکے لگا۔ یہ اس وقت بڑا دقت طلب کام تھا، اس لیے کہ اس کا ایک کولہ تقریباً یکا ہوا چمکا تھا۔ اس کا دماغ کرب و اذیت میں تھا اور وہ صحیح طور پر کچھ سوچ نہیں پا رہا تھا۔

رویہ اور کے قریب پہنچ کر اسے اٹھانے میں پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ بہر حال رویہ اور جوں ہی اس کی گرفت میں آیا اس نے نال کو آسان کی طرف کیا اور لگا تار تین فائر کیے۔ رویہ اور کو اس نے اپنے ہولسٹر میں لگایا۔ دھوپ برے کی طرح اس کے جسم کو چھید رہی تھی۔ وہ سرکنا ہوا کانٹے دار جھاڑیوں کے قریب ہو گیا۔ پھر بے ہوشی کی ایک لہر آئی اور اس نے ڈرائل کو دیا دھنیا سے بے گناہ کر دیا۔ شرٹانے جب فائربک کی آواز سنی تو اسے پتا چل گیا کہ ڈرائل اسے بلارہا ہے۔ وہ مصیبت میں گرفتار ہے۔ اس نے ٹرک کو اس طرف کھینچا اور نزدیک جا کر جھاڑیوں کا جائزہ لیا۔ جھاڑیاں اتنی گھنی تھیں کہ چھدف کے آگے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے کرب سے سوچا کہ ڈرائل موت و زندقہ کی تکلف میں گرفتار ہے۔ اگر اسے وقت پر امداد نہ ملی تو وہ مر جائے گا۔

”ڈرائل! وہ بچی۔“ تم کہاں ہو؟“

اس کی آواز سدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔ دوسری طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ وہ ٹرک کی چھت پر چڑھ گئی تاکہ صاف طور پر دیکھ سکے۔ اس کی یہ کوشش بھی کامیاب نہ ہوئی۔

ڈرائل کو تھوڑی دیر کے بعد ہوش آیا تو اس نے اپنے قرب و جوار میں کسی کو نہ پایا۔ اس نے سوچا کہ فائربک کا دوسرا شعل دینا چاہیے۔ رویہ اور لالہ اس نے دو فائر کیے، لیکن تیسرا نہ کر سکا۔ اس کا ہاتھ جھول گیا۔ نتیجے کے طور پر رویہ اور ہاتھ سے گر پڑا۔ وہ ایک بار پھر بے ہوش ہو چکا تھا۔

شرٹانے اس سے تین سو فٹ کے قافلے پر تھی۔ ایک گولی شانیس سے اس کے سر پر سے گزر گئی۔ وہ چھلاک مار کر ٹرک کی چھت سے اتر گئی اور آواز کی ست کا دھچان کر کے

برہاں آگے ہوئے تھے۔ ڈرائل کی گرفت میں اس کا پاؤں صحیح طور پر نہیں آ رہا تھا۔ ٹھکانے نے اپنی سوت سے اسے قہام لیا اور دائیں بائیں حرکت دینے لگا۔ ڈرائل کی روح فنا ہو گئی۔ اس وقت اس پر قیامت گزری تھی جب ٹھکانے اس کی ایک ٹانگ پر کھڑا ہو گیا۔ وہ چیخنے چلانے لگا۔ پھر اس نے زور لگا کر ایک جھڑپائی۔ اس کا پورا وجود کانپ رہا تھا۔ اسے ایسا لگا رہا تھا جیسے وہ ہزاروں ٹھکانوں میں گھس رہا ہو چکا ہے۔

یکبار کی ٹھکانے نے اسے اپنی سوت میں لپیٹا اور آسمان کی طرف اچھال دیا۔ وہ تیس فٹ تک فضا میں گیا اور پھر دم سے کسی بے جان لڑکی کی طرح گھاس پر گر گیا۔ ٹھکانے پھر اس کی طرف آیا اور اس نے اپنے ایک دانت سے اس کے چہرے پر حملہ کیا۔ ڈرائل نے اس سے بچتا چاہا مگر ممکن نہ ہوا۔ وہ دانت اس کے چہرے سے رگڑ کھاتا ہوا سر میں جا لگا۔ اس کی چوٹ جان لیوا تھی۔ ڈرائل بے ہوش ہو گیا۔

اس کے سر سے نکلنے والے خون سے گھاس سرخ ہو گئی۔ ٹھکانے ایک بار اس کی طرف بڑھا، نزدیک آ کر وہ اس پر چمک گیا، لیکن کچھ نہ کر سکا اس لیے کہ اس کے دونوں دانت گھاس پر چمک گئے تھے۔ چنانچہ ٹھکانے اور ڈرائل میں ایک قاصد قائم ہو گیا۔ اس سہانہ مکمل سے ٹھکانے خود اکٹا گیا، لہذا اصرار اور کچھ جگل کی طرف چل پڑا۔ تھوڑی دیر بعد اس کا ہیولہ لگاہ سے اوچھل ہو گیا۔

☆.....☆

صبح کا وقت تھا، لیکن گرمی تھی۔ آسمان پر ایک بھی بادل نہ تھا۔ شرٹا طہینان سے ناول پڑھ رہی تھی۔ دس بج چکے تھے اور ڈرائل اب تک واپس نہیں آیا تھا۔ بہر حال اسے کوئی تیش نہیں تھی۔ مگر جب ایک گھنٹہ اور گزر گیا تو دسویں اور واہوں نے اسے گھیر لیا۔ اتنی دیر تک تو قصور میں نہیں بیٹھی جانتی تھیں۔ وہ ٹرک ڈرائیو کے کہیں جانا نہیں چاہتی تھی۔

☆.....☆

جب ڈرائل کی آنکھ کھلی تو اس کا حلق خشک ہو رہا اور دماغ جھپٹ جھپٹ کر رہا تھا۔ دایاں کولہا جس پر ہاتھی نے پاؤں رکھ دیا تھا وہی طرح سے اذیت دے رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس درد سے کیسے نجات حاصل کی جائے؟

دوپہر کا وقت تھا اور سورج پوری آب و تاب کے

ہوا آگے آیا تو ڈرائل کو قطعی حیرت نہیں ہوئی۔ وہ اس کی حرکات سے محفوظ ہو رہا تھا۔ پھر ہاتھی ایک جگہ ٹھہر کر اپنے پاؤں زمین پر مارنے لگا۔ زمین سے دھول اڑنے لگی۔ پھر اس نے اپنی سوت دھکی دینے والے انداز میں لہرائی۔

اس کی جگہ کرکٹی اور ہوتا تو ڈرائل جانا اور وہاں سے پلٹ کر آ جاتا، لیکن وہ اپنی ٹھکانے کی تصاویر کھینچنے میں مصروف تھا۔ پھر اس نے تپائی کو وہاں سے اٹھایا اور گھبراہٹ کرنے لگا۔ اسے ٹھکانے سے قطعی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ آگے کانٹے دار جھاڑیاں تھیں اور اس کے بعد ایک تنگ سا راستہ۔ وہ اس طرف چل پڑا۔ ٹھکانے مڑا اور اس طرف بڑھنے لگا۔ تقریباً چاس فٹ کے قافلے پر وہ رک گیا اور زور سے چٹکھا۔ ڈرائل کا دل تیز رفتاری سے دھڑکنے لگا۔ اسے محسوس ہو گیا کہ ٹھکانے اپنی برہمی کا اظہار کر رہا ہے۔ ٹھکانے ایک بار پھر آگے آیا۔ اس کے کان پھر پھڑپھڑا رہے تھے۔ وہ اپنے سر کو نیچے کیے ہوئے تھا۔ اور واضح طور پر معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس پر حملہ کرنے والا ہو۔ ڈرائل کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کی برہمی کا سبب کیا ہے۔ اس نے سراپہ ہو کر جھاڑیوں کے درمیان بنے راستے پر قدم رکھا۔ وہاں سے گزرتا ہی صراط پر سے گزرنے سے کم نہیں تھا۔ اس لیے کہ کانٹے دار جھاڑیاں بھی کمال اتار سکتی تھیں۔

اسے دیر ہو گئی اور ٹھکانے وہاں آن پہنچا۔ اس نے زور کی گھر ماری۔ ڈرائل سر تپا پا لڑ گیا۔ اس کا جسم جھپٹانے لگا۔ جب ٹھکانے نے دوسری بار گھر ماری تو ڈرائل کانٹے دار جھاڑیوں سے گھرا کر گر گیا۔ اس کی ران اور ایک بازو پر زبردست خراشیں آئیں اور خون بہنے لگا۔ وہ گھاس پر ادھو صا پڑا تھا اور تاریکی اس کی آنکھوں میں اتر رہی تھی۔

ٹھکانے اپنے پیروں سے زمین پر دھمک پیدا کرتا ہوا پھر قریب آ گیا۔ اس کے جسم سے ناگوار بو آ رہی تھی۔ موت کو اتنا قریب پا کر ڈرائل نے اپنی زندقہ بجانے کی کوشش کی اور گھاس پر کسی پیلن کی طرح سے لڑکنے لگا۔ ”دھپ۔ دھپ۔ دھپ۔“ موت اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ پھر ٹھکانے نے اس کے نزدیک پہنچ کر اسے لات ماری۔ ڈرائل کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کا سر چٹنا چور ہو گیا ہو۔ اس نے کرب سے سوچا کہ ہاتھی کے حملے سے کوئی زخمہ سلامت نہیں بچ سکتا۔ اس کی موت یقینی ہے۔

اس نے ہاتھی کا ایک پاؤں قہام لیا تاکہ وہ حملہ نہ کر سکے۔ وہ پاؤں کسی ستون کی طرح سے لمبا چھڑا تھا۔ اس

اس طرف دوڑی، جہاں اس کے اعزازے کے مطابق ڈرائل کو ہونا چاہیے تھا۔ تھوڑا قاصلہ طے کرنے کے بعد اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ میدان جنگ میں آگئی ہو۔ جہازیاں ٹوٹی ہوئی تھیں اور گیس ادھڑی ہوئی تھی۔ کیراٹوٹا پڑا تھا اور اس کے پرزے بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی نگاہ ڈرائل پر پڑی۔ وہ سنا سنا یا ایک جہازی کے قریب پڑا تھا۔ ایسا مظلوم ہوتا تھا جیسے روح اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ چکی ہو۔ وہ بے جان سا لگ رہا تھا۔ ممکن ہے بے ہوش ہو۔ ”دود..... دود“ ڈرائل نے جیسے سرکشی میں کہا۔

”ہاں۔ میں آگئی ہوں۔“ شرنانے اس کے قریب پہنچ کر تسلی دی۔ بھر پانی کی بول اس کے منہ سے لگا دی۔ ڈرائل نے ایک ہی سانس میں نصف بول خالی کر ڈالی۔ اس کی ایک ٹانگ عجیب سے زاویے پر جڑی ہوئی تھی۔ جب کہ دوسری ٹانگ سترم تھی۔ یہ صورت حال کافی بھیاں تک تھی۔ شرنانہ بڑبڑب میں گرفتار تھی کہ اپنے شوہر ڈرائل کے دوسو پاؤنڈ وزنی جسم کو طس طرح سے وہاں سے اٹھائے اور ڈرک میں ڈالے۔

پہلے اس نے کانٹوں کی جہازیاں ہٹا کر راستہ صاف کیا اس کے بعد ڈرک کو روک کر کے وہاں تک لائی۔ اس کے بعد وہ ڈرائل کی طرف لگی۔ وہ سیدھا جیت پڑا تھا۔ شرنانے نے کوشش کی کہ اسے اپنی پیٹھ پر اٹھالے، لیکن وہ وزنی آنے کی پوری کی طرح سے تھا۔ چونکہ بے ہوش تھا، اس لیے اس نے اپنی طرف سے کوئی کوشش نہیں کی۔ ڈرائل کے دونوں ہاتھ پیٹھ کے نیچے تھے۔ شرنانے انہیں کھینچ کھانچ کر اس کے جسم کے نیچے سے نکالا۔ پھر دلاسہ دینے والے اعزاز میں کہا۔ ”تم میرا ساتھ دو۔ ہم اس پریشانی سے نکل سکتے ہیں۔“

ڈرائل ہوش میں آچکا تھا۔ اس نے زور لگا کر خود کو اٹھایا۔ اس کے منہ سے کربناک آوازیں نکل رہی تھیں۔ مگر اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ شرنانے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا اور ڈرک کی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ کسی نہ کسی طرح سے اس نے اپنے شوہر کو ڈرک پر لا دیا۔ اس کوشش میں اس کی سانس دھڑکی کی طرح چلنے لگی۔ وہ تھوڑی دیر تک بیٹھی رہی۔

جب اس کے حواس بحال ہو گئے تو اس نے ڈرک چلانا شروع کر دیا۔ وہ نہایت احتیاط سے اسے چلا رہی تھی، اس لیے کہ اگر کوئی کانٹا تار میں پھنس جاتا تو تار

برست ہو جاتا اور ایک دشواری اور کمزری ہو جاتی۔ سڑک کو تلاش کرنے میں کافی پریشانی اٹھانا پڑی۔ بہر حال میں منٹ کے بعد وہ سڑک مل گئی جس پر ڈرائیج کرتے ہوئے وہاں آئے تھے۔

پارک کی انتظامیہ کا ہیڈ آفس وہاں سے 43 میل دور اسکو کوڑا کے مقام پر تھا۔ 75 میل کی رفتار سے ٹرک چلانے کے دوران اسے کئی بار ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی چٹائی جواب دے رہی ہو۔ کوئی بھی حیوان اس کی راہ میں آکر راستہ مسدود کر سکتا تھا۔ یہ بھی اندیشہ تھا کہ ڈرائل بے ہوش نہ ہو جائے۔ اس لیے وہ مڑ کر اس سے گفتگو کر رہی تھی اور اس سانچے کے بارے میں استفسار کر رہی تھی۔ تنکوان کی درندگی پر وہ حیران رہ گئی۔

وہ ڈرائل سے سوالات کر رہی تھی۔ ”اسکو کوڑا“ یہاں سے کتنی دور ہے؟ میں اس سڑک پر چل رہی ہوں۔ ہم وہاں تک پہنچ جائیں گے یا کوئی اور راستہ اختیار کرنا ہے؟ کہیں مظلوم ہے تاکہ میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں؟ یہاں کھیکواری کی خوببواتی کیوں آ رہی ہے؟ غالباً اسے کسی منصوبے کے تحت اگایا گیا ہے۔

اسکو کوڑا میں اسپتال کے ڈاکٹر نے ڈرائل کو ڈرک سے اتارنے کی اجازت نہیں دی اور دو ڈرائیج لگا دیں۔ جب ڈرائل قدرے ہوش میں آگیا اور کراہنے لگا تو ڈاکٹر نے بڑے اسپتال تک اسے منتقل کرنے کے لیے بلی کا پٹر منگوا دیا۔ بڑے اسپتال پہنچ کر ڈاکٹر اس کی ایک ٹانگ کے لیے معائنہ کیا۔ ان کی رپورٹ تھی کہ اس کی ایک ٹانگ کو لمبے کے پاس سے مخالف سمت میں مڑ گئی ہے، چھ ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ ٹھوڑی میں چوٹ لگی ہے اور کاسٹس سر ایک جگہ سے ٹوٹ گیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کے علاوہ کہیں کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی تھی۔

اس کا کئی مہینے تک علاج ہوتا رہا۔ وہ صحت یاب ہو گیا۔ اس کے حوصلوں اور قوت ارادی نے اسے سہارا دیا۔ وہ پھر سے افریقہ کے ان جنگلات میں اپنی بیوی کے ساتھ ہاتھیوں کی فوٹو گرافی کرنے لگا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا پروجیکٹ ہے کہ وہ ہاتھیوں پر تصویروں کتاب مرتب کرے۔ بالآخر وہ کامیاب رہا۔ وہ اب بالکل صحت یاب ہو چکا ہے۔ بس اس کی ایک ٹانگ پر ہاتھی کے پاؤں کا نشان ہے۔

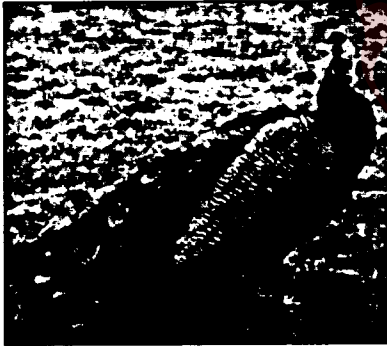
☆☆☆☆

نایاب پرندے

سعید احمد سلطان

موسمی تغیرات اور انسانوں کا ظلم، ہمارے آس پاس ازتے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کرتے، یہ خوب صورت، خوب صورت سے پرندے آہستہ آہستہ معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ پرندے انسانی زندگی کے لیے ضروری بھی ہیں اگر وقت رہتے ان کی افزائش نسل کی جانب توجہ نہ دی گئی تو یہ ماضی کا قصہ ہو جائیں گے۔

آہستہ آہستہ معدوم ہوتے پرندوں کا تذکرہ



پرندے! انوکھے رنگوں سے آراستہ پرندے! ہماری دھرتی کا حسن! حسین اور دلکش پرندے! جن کی چھپوں سے شمس دل آویز ہشامیں طربیز بن جاتی ہیں۔ جن کے گیتوں سے ماحول ٹٹکتا اٹھتا ہے، مسکرا اٹھتا ہے۔ جن کے پروں کی رنگینی سے موسم بہار کے رنگ جھلکنے پڑتے ہیں، ہرگز وہ شب مہکنے لگتے ہیں۔ حسن ترتیب و توازن کے یہ شاہکار ماحول میں جمال و نشیں کے منظر روشن کر دیتے ہیں۔ چڑیا، چکور، بلیک، ہند، فاختہ، طوطے، تیز، شیر، کبوتر، چیسے، کول، لالی، عقاب، کونج، مرغابی کس کس پرندے کا نام لیں اور کون سے پرندے کا تذکرہ کل پر اٹھائیں۔ ہرے بھرے بلند و بالا درختوں، ہر بنجر جھاڑیوں، دیواروں سے لپٹی بیلوں، قدیم عمارتوں، گئے جنگلوں، میں بنے اور بنائے گئے گھوسلوں میں رہتے یہ خوبصورت پرندے

ماہنامہ سرگزشت

یوں ہی انوکھے جذب و کیف کے ساتھ گئے درختوں کے چوں پہ تھاپ دے رہی ہوتی ہیں، تو مور کے پھیلے ہوئے پروں پہ اتری ہوئی ہے بے شمار آنکھیں اپنے ارد گرد کے سارے دلکش منظر کو اپنے اندر اُتار رہی ہوتی ہیں، اپنا سراپا ستورہ رہی ہوئی ہیں، اور سچان تیری قدرت کے زحمرے زبانون پہ بہنے لگتے ہیں۔

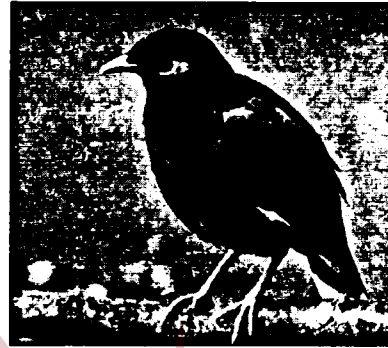
پرندے ہمارے ارد گرد پھیلے، بکھرے، ماحول کی خوبصورتی میں بے حساب اضافہ کرتے ہیں، سو ہمیں اپنے رب کا ہر دم ہلکا ادا کرتے رہنا چاہیے کہ جس نے ہمیں خوبصورت موسموں، منظر اور پرندوں سے نواز دیا، اور ہمارے چاروں جانب اُن کے پروں کے خوبصورت رنگ بکسیر دیئے۔

میتا

عمر عزیز کے کسی مرحلے میں بولتے ہوئے طوطے کی باتیں اور باتیں کرتی میتا کی کہانی تو آپ نے سنی ہوگی! پرانے زمانوں میں جب تاجر اور مسافر کسی قافلے کی سخت اختیار کر کے دور دیوں کی مسافرت اپنا تو قہر والوں سے ان کی فرمائشیں پوچھتے کر سنے دیں سے، جب واپس آئیں تو ان کے لیے کیا سوغات لائیں؟ جب ہر کوئی اپنی چاہت تلا تا، اپنی پسند سنا تا۔ ایسے میں کوئی لڑکی، کوئی بچی بڑے لاڈ سے، بہت چاؤ سے فرمائش کرتی، ”باہا! میرے لیے بولنے والی میتا لا، وہ مجھے نلک ملک کے قصے سنائے گی، شہر شہر کے افسانے تلائے گی، گاؤں گاؤں کی داستانیں سکھائے گی۔ اور جب آپ گھر نہیں ہوں گے تو اپنی بیٹی باتوں سے میرا دل بہلائے گی۔“

ایک دور تھا جب ہم سہا کی سر طوطیل راتوں میں دادی اماں کی آغوش میں بیٹہ کرانوی کہانیاں سننے کی فرمائش کرتے تھے، اور وہ اپنے گرد گولاف لپیٹ کر، ہم سب کو سمیٹ کر یوں گویا ہوتیں!

”ایک تھا بادشاہ، ہمارا تمہارا خدا بادشاہ! اس بادشاہ کی سات بیٹیاں تھیں، جو شہزادیاں کہلاتیں۔ سب شہزادیاں حسن و جمال سے لالہ، مجلس و دو اتائی میں بے مثال، مگر وہ جو سب سے چھوٹی شہزادی تھی، وہ بڑی لاڈلی، بڑی چبوتی تھی، اس کو بالکل تم سب کی طرح کہانیاں سننے کا شوق تھا، وہ ہر رات ملکہ ماں کی گود میں چڑھ کر کئی کہانی سننے کی فرمائش کرتی۔ ملکہ ماں ہر رات شہزادی کو کئی کہانی سناتیں، شہزادی کا دل بہلاتیں،



اور وہ کہانی سننے سننے ان کی گود میں سو جاتی۔

پھر ملکہ ماں کے پاس کہاں کا ذخیرہ ختم ہو گیا، شہزادی کی فرمائش نئی کہانی کی ہوتی، سو چ پچار کے بعد ملکہ ماں نے بادشاہ سلامت کو مسئلہ بتایا، بادشاہ سلامت نے دربار بلایا اور عقلمند وزیر نے مشورہ دیا کہ کوئی تاجر ملک چھین جائے وہاں سے بولتی ہوئی میتا لائے جو ہر رات شہزادی صاحبہ کو کئی کہانی سنائے گی، ان کا دل بہلائے گی۔“

دادی اماں ہر رات ہمیں انہی بولنے والی میتاؤں اور باتیں کرتے طوطوں کی کہانیاں سنایا کرتیں۔ اور جب ہم بڑے ہو گئے، کتابیں پڑھنے لگے، جب آگہی ملی کہ افکار ہویں صدی میں اردو میں ایک داستان لکھی گئی تھی طوطا میتا کی کہانی۔ طوطا جو باتیں کرتا تھا، میتا جو کہانیاں سناتی تھی۔

حیرت کی بات ہے اکثر دوسرے پرندوں کی طرح میتا کو شاعری میں جگہ نہیں ملی، اگر ملی بھی ہے تو بہت کم کم۔ ہاں البتہ نثر میں میتا کو بہت مان دیا گیا اور اس کے فسانے لکھے گئے۔

میتا کیسا پرندہ ہے؟ داستانوں میں کیوں اس کے تذکرے ملتے ہیں؟ انسانوں سے اس پرندے کی مصاحبت اور قافیت کب سے ہمارا کیوں کر ہے؟ یہ سب سوال کونج پسند ذہنوں کو تحقیق پر آمادہ کرتے ہیں۔

سیاہی مائل بھورے پر، تاریک رنگ کی چونچ، کالی سیاہ گول آنکھوں کے نیچے گردن کی طرف مگھوتا، خوبصورت شکل بنانا زور رنگ کا لہریا، چلی رنگت لیے پنپے، ایسی دم رکھنے والے نایاب پرندے کا نام میتا ہے۔ جو خاص طور جنوب ایشیائی ممالک میں پایا جاتا ہے، اور پاتا ہونے کی وجہ سے دنیا بھر میں پھیل گیا ہے۔

بھارت، پاکستان، میانمار، سری لنکا، نیپال، بھوٹان، بنگلہ دیش، ترکمانستان، افغانستان، قازقستان، ملائیشیا، تھائی لینڈ وغیرہ کے علاوہ دیگر سارے ایشیائی ممالک مضبوط چنے والے اس پرندے کا مسکن ہیں۔

چار ماہ حراج کے اس پرندے کا عام طور پر وزن 109 سے 130 گرام تک ہوتا ہے۔ مادہ میتا کا وزن ز کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے۔ اس کی لمبائی عموماً 23 سینٹی میٹر تک ہوتی ہے۔ موسم بہار میں مادہ میتا مہارت سے بنائے ہوئے یا کسی دوسرے پرندے سے چھینے ہوئے گھونسلے میں چار سے چھ چتکبرے اٹھ دیتی ہے، جن کی رنگت بڑی مائل ہوتی ہے، گھونسلہ اگر چہ مادہ میتا بناتی ہے لیکن اپنے انڈوں کو زرا در ماہل کر سیتے ہیں۔ اور انڈوں سے بچوں کے نکل آنے پر دونوں مل کر انہیں خوراک کھلاتے ہیں۔

میتا کی خوراک ہر طرح کے پھل، سبزیاں اور بیج ہیں۔ کیڑے مکوڑے اور پروں والے حشرے بھی ان کی غذا بن جاتے ہیں۔ خاص طور پر زری اجناس اور فصلات کو نقصان پہنچانے والے کیڑے ان کی مرغوب غذا ہیں۔ یوں گویا میتا ایک انسان دوست پرندہ ہے۔ خزاں کے دنوں میں جب سردی بڑھ جاتی ہے اور کیڑے مکوڑے دکھائی دینا ختم ہو جاتے ہیں تو میتا سرسوں اور کچے راستوں کے کناروں پر خوراک تلاش کرتے پائی گئی ہے۔ کیڑے مکوڑے کھانے کی وجہ سے میتا گود نیا بھر میں پسند کیا جاتا ہے کیونکہ یہ فصلوں کو نقصان پہنچانے والے حشرات اور کیڑوں کا خاتمہ کر کے بالواسطہ طور پر فصلوں کی پیداوار میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔

اگرچہ عام طور پر میتا کارنگ سیاہی مائل بھورا ہوتا ہے لیکن جغرافیائی مشغول اور موسمی حالات کے تحت ان کی رنگت اور وزن میں فرق پڑ جاتا ہے۔ اس کی کئی اقسام ہیں۔ لیکن پسندیدہ ترین قسم بولنے والی میتا کی ہے، جو ہر ایک کی نقل اتارنے میں مہارت رکھتی ہے۔

حالات موافق رہیں تو میتا چھپس برس کی عمر بھی حاصل کر لیتی ہے۔

میتا گود نیا بھر میں شہرت اس باعث ملی ہوئی ہے کہ یہ آوازوں کی نقل کرنا جانتی ہے۔ ہر طرح کے لفظوں، جملوں اور آوازوں کو قوجہ سے سن کر ان کی ہوبہ نقل کرنے میں اس پرندے کو کمال مہارت حاصل ہے۔ ماہرین کے مطابق دنیا بھر میں کوئی ایسا پرندہ نہیں ہے، جو آوازوں کی نقل اور جملوں

کی ادائیگی میں میتا کا مقابلہ کر سکے۔

میتا کے حراج میں کئی اور تیزی بے پناہ ہوتی ہے۔ یہ پرندے نہ صرف آپس میں لڑتے جھگڑتے، شور مچاتے رہتے ہیں بلکہ اگر ان کے گھونسلے کے قریب کوئی دوسرا پرندہ بھی آجائے تو اس کے ساتھ چھپس لڑا اتار اور جھگڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ میتا کے پروں کے نیچے طرف سفید رنگ کے دھبے ہوتے ہیں جو اس وقت دکھائی دیتے ہیں، جب یہ اڑ رہے ہوں۔

زرا مادہ میتا زندگی بھر ساتھ بھاننے والے پرندے شہر ہوتے ہیں، لیکن اگر جوڑے میں سے کوئی ایک نجی ناگہانی حالات کا شکار ہو کر دار عدم کو کوچ کر جائے تو دوسرا پرندہ فوراً متبادل تلاش کر لیتا ہے، تاکہ کوئی پرندہ اکیلا نہ رہے۔ عموماً یہ درختوں کی محفوظ شاخوں پر گھونسلے بناتے ہیں۔ لیکن پرانے درختوں کی کھوہ میں بھی بھیرا کر لیتا ان کے لیے کوئی مشکل نہیں۔

میتا ہر وقت شور مچاتی رہتی ہے۔ جنگل میں اس کی آواز سب سے نمایاں ہوتی ہے۔ میتا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ گھروں میں آسانی پائی اور سدھائی جاسکتی ہے، اپنے ارد گرد پائی جانے اور سنانی دینے والی تقریباً تمام آوازوں کو اپنے نغے سے ذہن میں محفوظ کر کے ہوبہ ادا کئی کرنے اور نقل اتارنے میں کمال مہارت رکھتی ہے۔

زرا در مادہ میتا میں پہچان بہت مشکل ہے، صرف جنگلی حیات کے ماہرین ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ ز میتا ہے اور وہ مادہ میتا۔

ساری دنیا میں لوگ پرندوں سے، قدرتی ماحول سے، جنگلی حیات سے پیار کرتے اور یہ اقرار کرتے ہیں کہ ان کی بقا اور سلامتی کے لیے ہر طرح کے اقدامات کرتے رہیں گے۔ ماحول کو صاف ستھرا رکھیں گے، آلودگی کا خاتمہ کریں گے اور ان کی نسلوں کو معدوم ہونے سے بچائیں گے۔ اور ان مقاصد کے حصول کے لیے وہ واقعی ایسا ہی کرتے ہیں۔ سنجیدگی سے، سنجیدہ فیصلے کر کے ان پر عملدرآمد کی بھرپور سعی کرتے ہیں۔ وطن عزیز میں تھوڑا سا لٹ بکھر ہے۔

ہم کھیتوں میں زیادہ پیداوار کے حصول کے لیے بے حساب کیمیائی دھاریں ڈالتے ہیں اور فصلوں پر بے دریغ زری ادویات چھڑکتے ہیں، جو زہر کھلاتے ہیں، یہ زہر میتا جیسے معصوم اور سفید پرندے کو بھی اپنا شکار بنا چکے ہیں۔ کہانی سننا کتنا بھلا لگتا تھا۔ مٹی کے سنہرے، دلکش

اور دلداروں و اسن میں چلے آتے تھے مگر اب ہاں..... بے شمار پردوں کی بس کہانیاں ہی رہ گئی ہیں۔

آج کل آپ چھدرے جنگلوں، چمکتے بانوں، آباد پارکوں، میں گھومنے جائیں۔ لہرائی عریوں، سنگتائی نہروں، جموتی جھیلوں، خاموش دریاؤں کے کنارے کنارے چلتے، مکی آنکھوں سے سیر کرتے جائیں، آپ کو بوتلے ہوئے طوطے، شور مچاتی بلبلیں، چھپاتی ہوئی چڑیاں، ڈار سے چھڑی کوئیں، بھول کے درختوں پر پھنسی کاغذائیں، سر نکھیرتے سادوں کو یاد کرتی کٹھن، بھان تیری قدرت کا نعرہ دے متانہ بلند کرتے تیر تو ضرور دکھائی دیں گے، مگر آپ کو ارد گرد کے درختوں، جھاڑیوں پر کھینکنا کا گھونٹلا دکھائی نہیں دے گا۔ آپ جھاڑیوں کی شاخیں ہٹا کر، جستو بھری ٹاکھوں سے شوق کے در پیچے کھولتے ہوئے طویل سفر کرتے چلے جائیں، کھیں کسی ٹیڑھی میڑھی چمڈی پر، ویران پر گھڑ پر اس نایاب پردے کا پر نہیں ملے گا۔ جواڑا ان بھرتے ہوئے، بھی کسی بدن سے جدا ہو جاتا ہے۔

پردے نایاب ہونے لگیں تو چڑیا گھروں کی زینت بننے لگتے ہیں۔ سینا منظر عام سے غائب ہونے لگی تو کہیں کہیں اس کے چند نمونے چڑیا گھروں کے ایک آدھ بچھرے میں دکھائی دیتے ہیں، جہاں سینا سر بیروڑائے، گردن جھکائے سوچوں میں گم دکھائی دیتی ہے، شاید ان سنبھرے دلوں کو یاد کرتی ہو جب اینٹ، لوہے، بگری اور سنگریٹ سے نئی عمارتوں کے جنگلوں کی جگہ بلند و بالا ہرودہ، سرسبز و شاداب درختوں کے جنگل ملتے اور دکھائی دیتے تھے۔ جب منظر اور ماحول میں صرف پردوں کی آوازوں کا راج ہوتا تھا۔ جب ارد گرد آلودگی کا جن قابض نہیں ہوا تھا۔ جب فکار یوں کی بندھنوں کی گولیاں شور نہیں مچاتی تھیں، خوف نہیں پھیلاتی تھیں۔

طویل عرصہ گزر گیا، وقت نے کئی قدم بھر لیے، صدی بیسویں سے اکیسویں کے شمار میں آگئی، مگر جستو سے آراستہ آنکھیں دینا کے منظر سے محروم رہیں، سوچنے کی بات ہے کیا یہ دلکش پردہ بھی معدومیت کا شکار ہو چکا ہے؟

ٹھیر

آزادی بھی کیا نعمت ہے؟ جہاں جی چاہا بیٹھ گئے، جہاں دل چاہا چلے گئے، جب خواہش ہوئی سینے میں سانس سنبھلی، پر پھیلائے اڑان بھری اور بلند یوں کو چھو آئے۔

مگر نجانے کیوں ہمیں ان اڑان بھرنے والوں کی قید اچھی لگتی ہے، ہم سنہری تیلیوں میں انہیں قید کر کے پھر ان کی چکاروں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اپنی خواہشوں کی تکمیل کے لیے دوسروں کی آزادی ختم کر دیتے ہیں۔

پردے انسان کے ازلی دوست ہیں، انسان نے انہی پردوں سے فکار کرنا، اڑان بھرنے، مگر بنانا سکھا۔ کپڑا بنانا ہمیں بچے نے سکھایا۔ جنگ بڑی کی پرواز نے بلی کا بڑی کی طرف ہٹل کیا۔ کھٹ بڑھتی نے درختوں میں سوراخ کرنا سکھایا۔ فٹس کے زرت بھاد سور نے بتائے، پانی میں غوطہ لگانا ہم نے ننگ فٹس سے سکھا۔

ہماری کائنات میں سات رنگوں کی سحرانی ہے۔ ہر رنگ اپنی جگہ منظر اور حوالا ہے۔ اور جب یہ رنگ ایک خاص ترتیب اور پیلے سے ہم آہنگ ہو کر کھیں اپنی جھلک دکھلاتے ہیں تو بصارتوں کو اسیر کر لیتے ہیں۔ پردے اُن رنگوں کا دلکش، دلچسپ اور دلدار ارماء و کس ہیں۔

پردے ہمارے گھر آئین میں اُگے پیروں پر بھیرا کر کے صبح شام کے اوقات میں اپنی چکاروں سے سامتوں کو انوکھے سرتال سے، آشنا کراتے ہیں۔ اور نظروں کو نئے منظر دکھاتے ہیں۔ سورج کی چمکی کرن کے ساتھ سفر آغاز کرنے والے پردے بھی جاہت بھرے موسموں کی نوید سناتے ہیں، تو کبھی مہمانوں کی آمد کی خبر دے کر منظر عید دکھاتے ہیں۔



رب تعالیٰ کی اس خوبصورت مخلوق کے گیت ہمارے میت، بن کر دلوں میں خوشیاں بھرتے ہیں، مگر ایک ہم ہیں کہ ان کی حیات کے دشمن بنے رہتے ہیں۔ اور جیسے ہی موقع ملے انہیں نقصان پہنچاتے ہیں۔ لذت کام و دہن کی بدولت ہم نے پردوں کی کئی اقسام کو آخری انجام تک پہنچا دیا ہے اور وہ وقت دور نہیں جب ہم کہانوں کی کتابوں میں ان پردوں کی بس

تصویریں ہی دیکھا کریں گے۔

پانچ موسموں کی سر زمین، پاکستان کے گوشے گوشے میں پردوں کی موجودگی، ماحول اور منظر کو متوازن رکھنے ہوئے دلکش بناتی ہے۔ ہمارے جنگلوں، میدانون، صحراؤں، پہاڑوں اور دریائی کناروں پر جہاں ایک جانب مقامی پردوں کا بھیرا ہے، وہاں بھرتی پردے بھی بے حساب سانسیتے ملے کر کے ہمارے ماحول کا حسن بڑھانے چلے آتے ہیں۔ کوئٹہ، ہرقالی، پشاور، کے ساتھ ساتھ تھرا کوئٹہ کے مہینوں میں بھرتی بھرت کر کے منظر و موسم کی دلکشی بڑھانے چلے آتے ہیں۔ یہ بھرتے تیزی کی شکل کا کمر اس سے چھوٹا پردہ ہے، جب گندم کی فصل کٹنے کے قریب ہوتی ہے تو یہ وہاں آن لے ہیں، اسی لیے اس کو فطری پردہ کہا جاتا ہے۔ فصلی بھرتہ ایک محاورہ بھی ہے جس کا مطلب ہے، خود غرض انسان جو اپنی ضرورت کے وقت تو دکھائی دیتے ہیں لیکن جب آپ کو ان کی ضرورت ہوتی ہے تو غائب ہو جاتے ہیں۔

ٹھیر اکثر زمین پر اور جھاڑیوں میں رہتے ہیں۔ میدانی جنگلوں میں یہ بعض اوقات درختوں کی شاخوں پر بھی رہتے ہیں۔ سردیوں کے موسم میں یہ غائب ہو جاتے ہیں یا بھر گئی جھاڑیوں میں چھپ جاتے ہیں۔ دریا کے کنارے رہتا انہیں زیادہ مرغوب ہے کہ وہاں خوراک کثرت سے مل جاتی ہے۔ ان کی خوراک عام طور پر مختلف فصلوں کے دانے اور بیج ہیں، لیکن کیرے کوڑے بھی کھا جاتے ہیں۔ پالتو ٹھیر کو عام طور پر لکڑی، دلیہ، چاول وغیرہ دیئے جاتے ہیں۔

لکھنؤ کے ہائے ہماری تہذیبی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتے ہیں جن کے بے شمار شوق تھے۔ پڑت رتن نامہ سرشار کی لکھی ہوئی داستان، ”فسانہ آزاد“ میں ایک کردار خوشی اپنے آپ کو بڑا ٹھیر باز تصور کرتا اور ٹھیر کی چھوڑتا ہے۔

ٹھیر بازی ایک شوق ہے، اور ٹھیر پالنا شوق کی تکمیل کا حصہ۔ شوقین لوگ جو ان کلڑائی اور مقابلوں کے لیے پالتے ہیں، ٹھیر باز کہلاتے ہیں۔ وہ ان کو با دام، پتے، شیش اور دیگر طربیات کھلا کر طاقتور بناتے ہیں تاکہ یہ پالتو ٹھیر پالی میں اتر کر مخالف ٹھیر کے چمکے چمڑا دیں۔ ٹھیر باز ہمیشہ پشور و ہم مشرب لوگوں سے مشہوروں کے طلبکار رہتے ہیں، ان کی صحت اور طاقت کے لیے مختلف نسخے استعمال کرتے ہیں تاکہ جب ان کا ٹھیر پالی میں اتر کر مخالف ٹھیر کے سامنے جائے تو مردانہ وار مقابلہ کرے۔ پشت دکھا کر بھاگ نہ جائے۔ ٹھیر بازی کا فن ابھی تک جواں رہا کی صحت اپنی چھب دکھاتا رہتا

ہے۔ ہمارے ٹھیر کی پچان میلوں میلوں میں اب بھی ان کے مقابلے ہوتے ہیں۔

ٹھیر عموماً سختی کی صورت میں رہتے ہیں۔ ان کی پرواز زیادہ لمبی اور طویل نہیں ہوتی، اسی لیے فکاری ان کو بہت جلد پکڑ لیتے ہیں۔ گوشت لذیذ ہونے کی بنا پر ٹھیروں کی اکثر شامت آئی دیتی ہے۔ خوراک کی ضرورت اور شوق کی ذیل کے لیے، ٹھیروں کی فاد رنگ بھی کی جاتی ہے۔ مختصری جگہ پر ان کی خاصی تعداد رکھی جاسکتی ہے، پالتو فاد رنگ کی طرح یہ بھی ایک منافع بخش کاروبار ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان کی فاد رنگ کریں مگر جنگلی حیات کو خوبصورت اور دلکش بنانے والے جنگلی ٹھیروں کو صرف لذت کام و دہن کے لیے، بے دریغ فکار نہ کریں۔

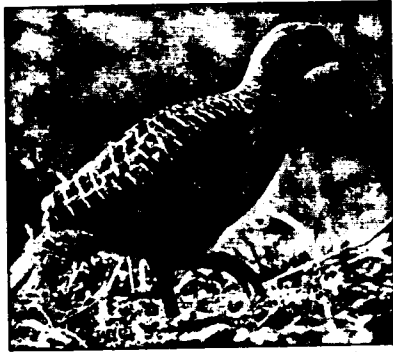
جوان جنگلی ٹھیر کا وزن گوشت کی صورت میں عام طور پر 35 سے 50 گرام تک ہوتا ہے بذمہ ٹھیر 90 گرام تک چلا جاتا ہے۔ جبکہ فادری ٹھیر کا وزن بعض اوقات آدھ پاؤنک ہوتا ہے۔

عام طور پر ایک ٹھیر کی لمبائی افکارہ سنٹی میٹر تک ہوتی ہے۔

رنگ ہلکا بھورا، نیلا ہوتا ہے۔ جنگل میں مٹی اور ریت سے ملتا جلتا رنگ اس کو فکاری پردوں اور لوسری وغیرہ سے بچاتا ہے، خشک جھاڑیوں میں دیک کر بیٹھا ہو تو اس کی موجودگی کا پتا ہی نہیں چلتا۔ ہر وقت چوکتا اور ہوشیار رہتا ہے۔ فزٹ فیکلی سے تعلق رکھتا ہے، اسی لیے اس کی خوبصورتی بے حساب ہوتی ہے۔ چونچ اور بچوں سے مٹی اڑا کر پروں میں ڈال لیتا ہے، اور بھر مٹی جھاڑنے کے لیے، پر بھلاتا ہے تو بہت بھاری بھر کم دکھائی دیتا ہے، پر سمیٹ لے تو چھوٹا سا ہو جاتا ہے۔

ہوٹوں، ریشہ شورانوں، ڈھابوں میں ٹھیر کو اسی، بھنا ہوا ٹھیر، تلا ہوا ٹھیر اور کئی دوسری ڈشز کی صورت میں عام ملتا ہے۔ یہاں اکثر فادری ٹھیر پکائے جاتے ہیں۔ پرانے وقتوں میں ٹھیر صرف امراء، رؤساء اور بادشاہوں کے دسترخوانوں کی زینت بنتا تھا، لیکن ٹھیر فاد رنگ نے اس کو کھل اھول بنا دیا ہے، اب شاہراہوں کے کناروں پر بنے ڈھابوں، ریشہ شورانوں اور بڑے ہوٹلوں میں اس کی لذت ڈشز کم قیمت پر دستیاب ہو جاتی ہیں۔

ٹھیر کا گوشت ذائقہ دار ہونے کی وجہ سے بھٹ پانہ کا



ان رنگوں کے باعث وہ زمین پر بیٹھی ہوئی دور سے پہچانی نہیں جاسکتی۔

جنگلی پرندوں کو قدرت نے اپنے تحفظ کے لیے خاص صلاحیتیں عطا کر رکھی ہیں۔ زیادہ تر ارد گرد اپنے ماحول میں کسی قسم کا خطرہ محسوس کریں تو خاص آواز نکالتے ہیں، جن کو سن کر اپنے فوری دیک کر زمین پر بیٹھ جاتے ہیں اور بے حس و حرکت پڑے رہتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے پیچھے رنگوں کے باعث آسمان پر منڈلاتی، فکار ڈھونڈتی چلیں، کولوں، اور دوسرے فکاری پرندوں کی تیز نگاہوں سے اوجھل ہو کر بچ جاتے ہیں اور یوں ان کی زندگی ماحول کو آلودہ نہیں کرتی۔

ہم کھروں اور علاقوں سے بچانے جاتے ہیں۔ تیز کر آبائی گھرا بیٹھا ہے، یہ فیزنٹ کیلی سے تعلق رکھتا ہے۔ موسم گرما میں اپریل سے جون تک کے مہینوں میں مادہ تیز میں سے پانچ اٹھ سوتی ہے، جنگلی حیات کے ماہرین کے مشاہدات میں نو اٹھ سوتی دیکھے گئے ہیں جن کو زار اور مادہ دونوں مل کر بیٹے اور ان کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ان اٹھوں سے چوبیس دنوں میں بچے نکل آتے ہیں، اور بہت جلد دوڑنا بھاگنا شروع کر دیتے ہیں۔ گئے جنگلوں میں رہنے والے تیزوں کے بچے کتنے دنوں میں اٹھوں سے باہر آ جاتے ہیں، اس بارے میں مستند معلومات دستیاب نہیں۔

تیز عام طور پر جڑوں کی صورت میں یا زیادہ سے زیادہ دس کی تعداد کے جھنڈ کی شکل میں رہتے ہیں جو ایک ہی خاندان ہوتا ہے، یہ عموماً زمین پر کئی جھاڑیوں کے چھچھوٹا بناتے ہیں، جو پالہ نما ہوتا ہے۔ پرواز پرندوں کی پہچان ہے، تیز بہت کم اڑان بھرتا ہے، خطرے کی صورت میں خورازاٹا ہے، مگر زیادہ دیکھ اور دور تک پرواز نہیں کر سکتا۔

ہمیں بھی وقت کی آواز کا اور اک کرتے ہوئے پرندوں کی اس خوبصورت قسم شیر کے تحفظ اور بچاؤ کی بنانے کے لیے اقدامات کرنے ہیں، تاکہ دھرتی کا حسن بڑھانے والے پرندے ہمارے ماحول اور سفر سے کوچ نہ کر جائیں۔

تیز

مجموعہ بھان تیزی قدرت کی من موٹی صدا، ہوا کے دوش پر سوار ہو کر، سٹون کا سینہ چرتی، خاموشی کا طمس توڑتی، کوہ دیباہاں میں اترتی ہے تو اس کی کوچ چاروں طرف پھیل جاتی ہے اور سب سننے والوں کی زبانیں سوہنے رب کی ثناء میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ برگ گل ہو کر برگ ستار، اس دلاویز صدا سے یوں مسحور ہوتی ہے کہ اپنے جمال کے سارے رنگ بھٹکانے لگتی ہے، اور ماحول رعنائی سے معمور ہو کر روحوں کی تسکین کا سامان کرنے لگتا ہے۔

یہ ماحول صدا ایک ایسے پرندے کی ہے جس کے پردوں کے بے شمار رنگ جب دل آویز انداز میں دیکھنے والوں کی آنکھوں کو اپنا گریہ دہائیے ہیں۔ لہذا ہوا سیاہ سینہ سرخی مائل چوچ، گول بدن، چھوٹی دم، زردی مائل پنجے، بے شمار رنگوں سے آراستہ خوبصورت فحل ونگار والے پر گردن کے گرد ایک دلکش ہالہ جیسے آبدار موتیوں کی مالا پہنی ہوئی ہو۔ یہ تیز ہے۔ دنیا بھر میں پایا جانے والا یہ پرندہ کہیں مقامی ہے تو کہیں جبرئی، کہیں اپنائیت کے ساتھ رہتا ہے تو کہیں بس سخت موسم گزارنے کے لیے قوی طور پر آتا ہے۔ مگر جہاں رہتا ہے، اپنی خوبصورتی اور دلکشی کے سبب سے ماحول کو آباد اور شاد رکھتا ہے، اس کے ترانے میج گوئیں یا شام کو، اپنے اندر ایک جب طرب انگیز کیفیت رکھتے ہیں۔

تیز کہیں شیر کی طرح بھورا ہے، کہیں کسی خطے میں تیز رنگوں کی آمیزش لیے فیزنٹ کی طرح ہے۔ جغرافیائی اور موسمیاتی تغیرات کی بنا پر جبکہ اس کی جسامت، قامت، وزن اور رنگوں میں کہیں زیادہ کہیں ہلکا فرق پایا جاتا ہے، مگر سب ایک ہی کہلاتی ہے۔

کالا تیز بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ اس کے کالے سیاہ پروں پر بھوری اور سفید دھاریاں ہوتی ہیں، اور سر پر سفید گیریں اور گردن کے ارد گرد سرخی مائل بھورا طوق ہوتا ہے۔ مادہ کارنگ ہلکا سرخ ہوتا ہے۔ نر کی طرح اس کا جسم بھی ناکسری ہوتا ہے۔ اس پر سفید دھاریاں اور وہ ہوتے ہیں۔

حصہ تھی۔ دور دور سے شیر باز ان مقابلوں میں شرکت کرنے اور دیکھنے کے لیے آتے تھے۔ مقابلے میں شریں باغیو جاتیں اور جیتنے پر خوشیاں منائی جاتیں اور ہارنے پر دکھ اظہار کیا جاتا۔ اب ثقافتی رنگوں سے آراستہ میلوں کا کال ہے تیز رفتار زندگی میں مسائل کا وبال ہے، تو میلوں ٹیلیوں میں شرکت کا شوق بھی نایاب ہوتا جا رہا ہے، زندگی میں خوشیوں کا عکس بھی سراب ہوتا جا رہا ہے۔ اور دوسری جانب۔

ہاں دوسری جانب ان محصور جبرئی پرندوں کا مستقبل بے پناہ اور بے رونق شکار کر کے تباہ کیا جا رہا ہے۔ ہم انسان جب مخلوق ہیں، نہ اپنی سلامتی کا خیال رکھتے ہیں اور نہ ہی قدرت کے دوسرے شاہکاروں کی بقا کے لیے سوچتے ہیں۔

دنیا بھر میں ماحولیاتی تبدیلیوں کی بنا پر، انسانوں کے ساتھ ساتھ پرندے بھی ہجرت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ حقیقی اور اپنا ماحول ناسازگار ہو جائے تو ہجرت ناگزیر ہو جاتی ہے۔ پرندے بھی اس کرب سے گزرتے ہیں وہ ناموافق موسموں کا سامنا کرتے، سختیاں جھیلنے، ہزاروں میل طے کر کے، ہماری جمیلوں، دریاؤں، جنگلوں اور میدانوں میں آن اترتے ہیں کہ جیسے ہی موسم اجازت دیں گے وہ اپنی کا سفر اختیار کر لیا جائے گا۔ مگر یہاں فکاری پرندے بچا کر ان کو گرفتار کر لیتے ہیں، آزادی ختم، اڑنا نہیں محدود ہو جاتی ہیں۔ شیر بھی اسی ظلم کا شکار ہیں۔ پہلے مارچ اپریل اور پھر اگست ستمبر کے موسموں میں ان پرندوں کو پکڑ کر لقمہ اجل بنادیا جاتا ہے۔ شپ ریکارڈر میں شیر کی آواز ریکارڈ کر کے، جال بچا کر ان محصور پرندوں کو دھوکے اور چالاکی سے گرفتار کر لیا جاتا ہے اور بالآخر یہ پرندے ذبح ہونے کے بعد لذت کام و دہن کا سامان کرتے ہیں۔

پرندے ماحول کو معتدل رکھنے میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں، ان کے گیتوں، پروازوں اور رنگوں کی بدولت انسانی ذوق کی تسکین کا سامان بھی ہوتا ہے، اور زندگی بے شمار مشکلات کے ہادو جو خوبصورت لگتی ہے۔ مگر ہم اس خوبصورتی کو ختم کرنے پر لگے ہوئے ہیں، اور دیگر بے شمار پرندوں کے ساتھ ساتھ شیر بھی تیزی سے مٹ رہا ہے۔ ہمیں آگہی و شعور کی منزل سے ہٹنا ہوتے ہوئے، اپنے فرض کو پہچاننا، انہ اور اللہ کی اس خوبصورت مخلوق کو محدود ہونے سے بچانا، نہ کہ ان میں ہماری بقا کا راز بھی ہے اور یہی وقت کی آواز بھی۔

جاتا ہے، کھانے والے گوشت کے ساتھ ساتھ اس کی ہڈیاں بھی چبا جاتے ہیں۔ گرامر مندوری روٹی اور مصلے دار نیکی چٹنی کے ساتھ شیر دوست، شیر کڑا ہی سب کی پسندیدہ ڈش بھی جاتی ہے۔

جنگلی شیر کو بھرے میں رکھا جاتے تو یہ جھٹلائی مار مار کر اپنا سر زخمی کر لیتا ہے، ہم جس دوسرے پرندوں کے ساتھ بھرے میں ہو تو ایک ہلی بھی سکون کی سانس نہیں لیتے، ہر وقت چو نہیں چلاتے اور لڑتے رہتے ہیں۔

مقابلوں کے لیے شیروں کو تیار کرنے والے شوقین، ان کے بھروں کے گرد گھر سے دیکھ کا خلاف چڑھا دیتے ہیں، تاکہ شیر کو اندر محسوس ہو اور وہ بھرے کی ٹیلیوں سے بار بار کر سر نہ کرائے اور زخمی نہ ہو جائے۔ شیروں کی لڑائی اور مقابلوں میں شرکت کے لیے بڑا اہتمام کیا جاتا ہے۔ لڑانے کے لیے شیر پالنے والے زبیر کو ہر وقت ہاتھ پر رکھتے، اسے سہلاتے اور تربیت کرتے رہتے ہیں۔

جس روز مقابلہ ہو اس رات شیر کو بھوکا رکھا جاتا ہے اور سونے نہیں دیا جاتا۔ یہ عمل شیر کے حراج میں کئی اور شہدی بھر دیتا ہے، چنانچہ اگلے روز مقابلے سے پہلے ذرا سی خوراک سے شیر کی تواضع کر کے اسے مخالف کا سامنا کرنے کے لیے پالی میں چھوڑ دیا جاتا ہے، بھوک اور ہفتے کے باعث وہ میدان میں آتے ہی بلڈ شیر کی پاکر مقابل کے سامنے سینہ تان کر ڈٹ جاتا اور بھر پور مقابلہ کرتا ہے۔ ایک دوسرے پر حملے بچوں اور چوچے سے کیے جاتے ہیں۔

مقابلہ دولہ نا تو اس نے خوب کیا، کے مصداق شیر ہمت اور جتنے سے بڑھ کر مقابلہ کرتے اور لڑتے ہیں، مگر یہ تو طے ہے کہ جیت تو ایک کے حصے میں آئی ہے، سر فراز تو ایک ہی کو ٹھہرا ہے، جیت کا تاج تو ایک کے سر ہی بٹھا ہے، سوطا تو اور ہماری پڑنے والا شیر سخت مقابلہ کر کے بالآخر دوسرے کو چنے موڑ کر بھاگ جانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ جیتنے والا انعام کا حقدار بن جاتا ہے۔ اگلے مقابلے میں شرکت کے لیے طاقت والی غذاؤں سے شیر کی خاطر مدارات شروع ہو جاتی ہے۔ موسم کی تبدیلی یا کسی دوسری وجہ کے باعث شیر اگر بیمار پڑ جائے تو ماہر اور بزرگ شیر پالنے والوں سے مشورے کیے اور لیے جاتے ہیں، نئے چوچے جاتے ہیں، اور دوائیاں تجویز کرائی جاتی ہیں۔ بچوں سے بڑھ کر ان کی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔

ایک وقت میں شیروں کی لڑائی میلوں ٹیلیوں کا لازمی

نہ تیر کے سر پر دگلش اور دلفریب رنگوں کی پھواراک خاص ترتیب کے ساتھ نمایاں ہوتی ہے، سر کے انہی رنگوں اور نقش و نگار کی بنا پر تیزوں کو چار مضمی اقسام میں بانٹا جاتا ہے۔ عام طور پر تیز کا قد گیارہ سے بارہ انچ (ستائیس سے تیس سینٹی میٹر) ہوتا ہے۔

نقش و نگار کی عطا نہ تیر کے مقدر میں ہے، مادہ تیز سادہ رنگوں کے ساتھ دکھائی دیتی ہے۔ تیز کا وزن البتہ مادہ تیز سے کم ہی رہتا ہے۔ زور اور جوان تیز کا وزن دوستیں گرام سے تین سو گرام تک چلا جاتا ہے جبکہ بڑی چربیلی مادہ کا وزن تین سو نوے گرام تک پہنچ جاتا ہے۔

تیزوں کی خوراک عام طور پر مختلف بیج بننے ہیں، بیج دستیاب نہ ہوں یا موسمی حالات کی بنا پر نایاب ہو جائیں تو تیز کیڑے کوڑوں کو بھی اپنی غذا بنا لیتے ہیں، جن کو وہ پودوں کے پتوں سے چٹنے ہیں۔ داند نکالتے ہوئے، کیڑے کوڑے کھاتے ہوئے، پیٹ بھرتے ہوئے، تیز پالتو مرغیوں کی طرح مسلسل بوتے رہتے ہیں اور کسی کلم خاصوتی نہیں رہتے۔ عام پہاڑی تیز مغربی ہالیڈ کی گودے ویتام کے شمال کی آغوش تک ملتے ہیں، اس کے علاوہ انڈیا، بھوٹان، نیپال، جبٹ، میانمار اور پاکستان میں ملتے ہیں۔

قدرتی طور پر اس کی افزائش کے لیے، ٹراپیکل یا سب ٹراپیکل مرطوب خطوں کے جنگلات، میدان اور پہاڑی علاقے مخصوص ہیں۔ مگر یہ صحراؤں اور میدانی جنگلوں میں بھی پایا جاتا ہے۔

تیز، شہر کی طرح مکر اس سے بڑا پرنده ہے، ہمارے ہاں تیز کو پالنے کے علاوہ شکار بھی کیا جاتا ہے۔ ہمارے جنگلوں میں تیزوں کی کئی اقسام ملتی ہیں، بھورا تیز شکار کے شوق کی بجائے چڑھتا ہے، جبکہ کالا یا مٹھی تیز مقابلوں کے لیے تیار کیا جاتا ہے، یہ مقابلے بڑے دلچسپ ہوتے ہیں۔ تیز پالنے کے شوقین خوبصورت بھجروں میں آئیں رکھتے ہیں۔

سرگردان اور جسم پر زہرات کی حمل کے نمونے اوڑھے نرکالے تیز کو قیمتی بھجروں میں رکھا جاتا ہے، جس کا گرد پوش انہیں باہر کی چیزیں دیکھنے سے محروم رکھتا ہے۔ کالے یا مٹھی تیزوں کے بھجروں کو غلاف سے ڈھک کر رکھنے کے پس منظر میں قیمتی طور پر منطقی سوچ موجود رہتی ہے۔ تیزوں کے شوقین کے مطابق مقابلے کے لیے سب مل کر ایک تاریخ متعین کرتے ہیں، جہاں تیزوں کو بلوانے کا مقابلہ مستعد کرنا ہو، وہاں کچی مٹی کے چپترے بنائے جاتے

ہیں، ان پر مچ سویرے چمڑکا ڈکایا جاتا ہے، کچی مٹی سے سونڈھی سونڈھی خوشبو ابھرتی ہے تو وہ انسانوں کے ساتھ پرندوں کو بھی محسوس کر دیتی ہے، بھران تیزوں کے بھجروں سے ایک ساتھ خلاف ہٹا دیئے جاتے ہیں، ہانکا لگایا جاتا ہے اور تیز بولنا شروع کر دیتے ہیں، ہر طرف بھان تیری کی قدرت کی دل نوا گونج ابھرتی، جھپٹتی اور کشتی رہتی ہے، مصطفین بھرپور توجہ اور ہوشیاری کے ساتھ اپنا فرائض نبھاتے ہیں، جو تیز سب سے آخر میں بولنا بند کرتا ہے، قاف ٹھہرتا ہے، اول آنے والے کے ساتھ ساتھ دوسری اور تیسری پوزیشنوں کا بھی اعلان کیا جاتا ہے، قاف مالکان کو خرافا اور انعامات تقسیم کیے جاتے ہیں۔

تیز بہاول پور ڈویژن کے تینوں اضلاع کے مصنوعی اور قدرتی جنگلوں میں بھی ملتا ہے اور صحرائے چولستان میں بھی پایا جاتا ہے۔ جنگلوں میں کالے تیز اور بھورے تیز دونوں ملتے ہیں، البتہ صحرائیں پایا جانے والا تیز بھورا ہوتا ہے۔ لوک ورثہ اسلام آباد کی چھاپی ہوئی تحقیقی کاوش ”چولستان“ میں جناب احمد خزانہ لکھتے ہیں۔

یہ پرنده پانی نہ ملے تو شہر کی مٹی سے اپنی پیاس بجھا کر زندہ رہ سکتا ہے۔ اس کی عمر پانچ اور سات سال کے درمیان ہوتی ہے۔ مادہ سال میں دو دفعہ انڈے دیتی ہے۔ یہ زیادہ تر آباد علاقوں کے قریب پایا جاتا ہے۔ باز، چرے سے اس کا شکار کیا جاتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق چولستان کے کناروں پر پائے جانے والے اس پرنده کی تعداد تقریباً چار ہزار ہوگی۔ زیادہ تر بھگوان کے ذریعے پکڑتے ہیں اور لڑاتے بھی ہیں۔ مٹھی یا کالا تیز زیادہ خوبصورت، طاقتور اور قیمتی ہوتا ہے۔ اسے شکاری سدھاکر بلور لاوے کے استعمال کرتے ہیں، ہستی میں آکر خاص موسم میں بولا ہے۔ درندہ اکثر شکاری اسے بھجروں میں بند کر دیتے ہیں اور اوپر چولی ڈال کر دیتا ہے۔ گویا اپنے حریفوں کو شہنشاہ دیتا ہے اور وہ دور دور سے اڑ کر اس پر جھپٹتے ہیں۔ دونوں تیزوں کو کوڑی کے ذریعے پھنسا کر پکڑتے ہیں۔ شکاری چوٹے کنوں کے ذریعے جھاڑیوں سے نکال کر یا جھاڑیاں ڈنڈوں سے پیٹ کر شکار کرتے ہیں۔

”تمہیں پرندوں کی نہیں نہ ختم ہو جائیں۔ کیونکہ درختوں اب گھونٹا نہیں ملے۔“
گھونٹا اس لیے نہیں ہیں کہ ماحول میں آلودگی کا راج

ہمیں ہمارا آج ہے، اور ہم اپنے آج کو آنے والے کل کے لئے غلط کرنے اور رکھنے پر مجبور ہی نہیں ہیں، ایسا ہوتا رہا تو تاریخ کو لکھے گا، اس میں نوٹے ہوں گے۔ آہوں اور آوازوں کے سناتے ہوں گے۔

بات ہم کر رہے تھے تیزی، ایک نظر نواز خوبصورت کی لکھنا ہوا سیانہ پھلا کر، پٹھے ہاکر، اک باکمال انسان اور ان کے ساتھ سرخی مائل زرد چوچے سے جب یہ پرنده آواز نکالتا ہے تو اس کی آواز کی لہریں بہت دور دور تک رسائی حاصل کر لیتی ہیں۔ ماحول سے سناے ختم ہو جاتے ہیں، آوازیں کوچ کر جاتی ہیں، بہاریں ٹکٹانے لگتی ہیں، فضا میں طراے لگتی ہیں۔

ضروری تو یہ ہے ہمارے ہر طرف دگلش پرندوں کی آوازیں کے سندیے ہوں، گیتوں کی رعنائیاں اور گھرائیاں ہوں، مگر اب ایسا نہیں ہوتا، ہاں اب ہمارے چاروں طرف لائے اور خاموشیوں کا راج ہے، جو دکھ بھرے فسانے سناتی ہے، بچی بہت رلاتی ہے۔

سنئے! جب خاموشی نوحہ کرنے لگتی ہے تو کھلتا ہے ہم نے چکاروں اور مہیکاروں کے کتنے جہان نا مٹھی کے ہاتھوں کو ڈاڑھے۔ کتنے قیمتی خزانے لٹا دیے۔

آج ہمارے ماحول سے خوشبو، خواب اور خوشیوں کے رنگ روخت گئے ہیں، دھند، دھوئیں اور دھول کی چادر نے ہمارے حسن کو گھٹا دیا ہے۔ آنکھیں ہیں کہ بے بصارت ہو گئی ہیں، دماغ ہیں کہ بے بصیرت ہو گئے ہیں۔ شہوہ کریں تو کس کر لیں!!! کہ یہ ساری کمائی اپنے ہی ہاتھوں کی ہے۔ ہم نے برکد، پھیل اور آم کے درخت کاٹ کر جائے خانے بنا دیے، ہم نے شیشم، شہتوت اجاڑے کہ گھر جاکیں، ہم نے انہوں کے منہ بند کر دیئے کہ مکان آباد کر سکیں، ہم نے جمیلیں آباد کر دیں کہ انسانی آبادیوں کو پھیل سکیں۔

مگر اسوں توجہ اس جانب سفر کرنے سے محروم ہی رہی، ناپال نے وہاں خیمے ڈالنے سے اجتناب ہی کیا، جہاں آگاہی نیر آئی کہ زندگی تو کائنات کے سارے بزرگ اور سنہرے رنگوں کے ہمارے سرو تازہ اور شاداب رہتی ہے، درخت کٹ جائیں، جنگل جل جائیں، جمیلیں خشک ہو جائیں، جتنے گانا گانا چھوڑ دیں، نرم ہوا میں مسکراتا چھوڑ دیں تو پرندوں کا حق تم ہو جاتا ہے، ان کی دھرم حوالی صدائیں ختم ہو جاتی

بہت ناراض ہیں مجھ سے پرنده

مرے گھر میں شجر کوئی نہیں ہے
انسانی تاریخ بتلاتی ہے، پرنده صداؤں سے محروم ہو جائیں تو انسانی زندگی کے سارے پیارے رنگ معدوم ہو جاتے ہیں، ہمارا سفر بھی تیزی سے معدومیت کی طرف جاری ہے۔

اور ہمارے شوق شکار کے ہاتھوں معدوم ہوتے تیز بھی یہی نوحہ پڑھ رہے ہیں، کیا ہم ان کی روتی ہوئی صداؤں سے توجہ دیتے ہوئے، اپنی آوازیں پہ غور کرنے کی سعی فرمائیں گے!

بلبل

نالہ ہے بلبل شوریہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تمام ابھی
سبز سنہری رتوں، زرد ہوتے موسموں میں، برف اوڑھتے دنوں میں آگ میں لپٹی دو پہروں میں، بادلوں سے بھرے مہینوں، خوشبوؤں سے بھری سکوں میں، سر پہ نسا تاج سجائے، پنک پھیلائے، گھٹاں گھٹاں گھونسا، ڈالی ڈالی بیٹھا، آگن آگن آڑنا، اس پرنده کا قدیم شیوہ، ہڈائی عادت ہے اور عادتیں کب بدلتی ہیں۔ جوڑوں کی صورت میں درختوں درختوں جیسے لہو لہو اڑتے، ایک دوسرے کا تعاقب کرتے یہ ننھے ننھے پرنده ہمارے ارد گرد پھیلے، بکھرے دگلش و دلدرا ماحول کا آئینہ ہیں، تو ہماری شعری اقلیم کا سنگھار بھی۔ سیای مائل بھورا سا تاج، سُرخ مائل بھورے پر، سفید سینہ، زرد پنچہ، کالی چوچی، اور دم کے پاس پگلی طرف ہیر بھولی کے رنگ ایسا، ہڈائی آئینہ برابر گول دائرہ ان کی پہچان ہے۔ یہ بلبل ہے۔ شاعرانہ زبان میں اس کو ہزار داستان بھی کہتے ہیں۔ عندلیب بھی اسی سوئے، ہم نے سوئے پرنده کا نام ہے۔

آئے عندلیب مل کر کریں آہ و زاریاں
ٹوہائے گل پکار میں ہائے دل کہوں
بلبل ایک عقیدہ ہے، اک استعارہ ہے۔ اک کہانی ہے، اک ستارہ ہے، کہانی سنائی جاتی ہے تو عجب دلفریب و دلنواز سحر آنکھوں کے درمیان آتے ہیں۔

کبھی زندگی کا سن و جمال ہے، کبھی قدرت کی فیاضی کا کمال ہے۔ ہمارے ارد گرد کا ماحول دگلش، ہڈسکن، ہریالی سے آنا خوشنارنگوں سے سجھا، دل بھانے والی خوشبوؤں میں بسا ہوا ہو تو چار جانب اُگے درختوں، پہوؤں اور

جھاڑیوں پر پرندے اپنے آشیانے ضرور بناتے ہیں۔ ماحول میں شور و غل کا چرچا، گرد و غبار اور دھواں کا غلبہ نہ ہو تو کھولنے پر حال سجاتے ہیں، جہاں کبھی بڑے پرندوں کی چبکاریں ماحول کو موسیقی سے مست رکھتی ہیں، تو کبھی ان کے بچوں کی آوازوں سے زندگی کا احساس تازہ و گلشت رہتا ہے۔ ان پرندوں میں بلبل بھی نمایاں مقام رکھتا ہے۔



بلبل میں چھاپا پیغام سب کے لئے ہے۔ آپ بھی پڑھیے۔

پاس ناموس مجھے عشق کا ہے اے بلبل
وہ نہ یاں کون سا انداز نقاش ہے کہ نہیں
عشق سراپا لوگوں نے بلبل کو بہت زیادہ شاعری
موضوع بنایا ہے۔ اس لیے کہ محبت کرنے والا، گیت سنا
والا اور ماحول و منظر کی رونقیں بوجھانے والا پرندہ ہے۔

بلبل کو ہر جگہ ہر مقام پر پسند کیا جاتا ہے، اس
عادتیں کمال ہیں۔ ٹھوڑی ٹھوڑی دیر بعد ایک جگہ سے دوسرا
جگہ ڈکڑ چلے جاتا، مختصری آڑان بھرتا، اس کا مشغلہ ہے۔
روایتی پرندے کو کہیں سچا عاشق تصور کرتے ہیں، کہیں اس
ہرجائی کا خطاب دیتے ہیں جو ہومزے کی طرح ڈال ڈال ڈال
اور پھولوں کا رس چوستا رہتا ہے۔

بلبل مختلف اوقات میں اکثر گیت گاتا رہتا ہے۔
کے گیت اپنی موسیقیت اور نفسی کی بدولت دل سے لے
والے ہوتے ہیں، اور وہ اہل غم جن کی باتوں میں تاثر
ہو بلبل شیراز کہلاتے ہیں، گلستان و بوستان کے خال
شاعر شیریں مثال حضرت شیخ سعدی بلبل شیراز کے لقب
سے دنیا بھر کے اہل غم میں معروف ہیں۔ اردو غزل کے با
آدم ولی دکنی کہتے ہیں،

بلبل شیراز کون کرتا ہوں یاد

حسن کوں تیرے گلستاں بوجھ کر

ہا کمال مقررہ ضرورتی نایہ کو بلبل ہند کا خطاب ملا تھا۔
مصر حاضر میں ہا کمال شاعر، کالم نگار، ناول نویس
اور سیاستدان مقررہ بشری رحمان صاحب بلبل پاکستان کہلاؤ
ہیں۔

بلبل کا گیت قدرت کی خوبصورت آوازوں میں شمار
ہوتا ہے، دل دہ لینے والا، ساقوں پر جادو کر دینے والا،

ہر ب میں اس کو کوئی بڑی کہا جاتا ہے۔

انسانیکو برتائیکا کے مطابق دنیا بھر میں اس کی ایک سو
پانچس کے قریب اقسام پائی جاتی ہیں۔ چین، جاپان،
لائبیریا، ملائیشیا، سری لنکا کے برساتی جنگلوں میں پایا جانے
والا یہ پرندہ یورپ اور سب صحارا افریقہ میں بھی ملتا ہے لیکن
اگر ہم اس کا کوئی وجود نہیں۔

بلبل کا قد چندہ سینٹی میٹر تک اور جوان بلبل کا وزن
دو ماہ میں گرام تک ہوتا ہے۔ یہ گھولوں اور گھسی سبز جھاڑیوں
میں رہتا ہے۔ موسمی تغیرات کے تحت اس کی افزائش اور
موت مری ہوتی ہے۔

مادہ بلبل غن سے پانچ تک گلابی اور جامنی رنگ کے
ڈالے دیتی ہے اور وہی ان کو سستی ہے، ان ڈالوں سے گیارہ
سے چودہ دن میں بیٹے نکلتے ہیں جو بارہ سے سولہ دن میں
لے کے بعد پرواز کرنے لگتے ہیں۔ سرخ دم والی بلبل
استان سے جاوا تک کے جنگلوں میں پائی جاتی ہے۔

بلبلوں کی خوراک مکمل، پھل، پتہ اور سب سے وغیرہ ہیں اور
اگر یہ دستیاب نہ ہوں تو کڑے کوڑے بھی کھا لیتے ہیں،
پھوس، بلیوں، لومڑیوں اور سانپوں کی یہ خوراک بنتے
ہیں۔ عموماً انسانوں سے دور گئے جنگلوں میں رہتا پسند کرتے
ہیں اپنے مختصر قامت کی بنا پر جلدی شمار ہوجاتے ہیں۔ بھرتی
رہتے ہیں، مناسب جگہ ڈھونڈنے کے لیے طویل سفر بھی کر
لیتے ہیں، جب تک مناسب جگہ نہ ملے آڑتے رہتے
ہیں۔ جنگلوں، پارکوں اور میدانوں میں ملنے اور کھولنے بنا کر
بیتے ہیں۔ اس بیارے پرندے کے ساتھ رومان بجا ہوا ہے،
کرگیت گانے والا ہے۔ اکثر نر بلبل گاتے ہیں، یہ کام مادہ کو
بھاننے کے لیے ہوتا ہے۔

بلبل کا نام ایک ہزار سال سے زائد عرصہ سے لیا جا رہا
ہے۔ یونانی شاعر ہومر نے اپنے ایک (طویل رزمیہ)
دائیں میں اس کا ذکر کیا ہے۔ فیکسیسٹر، وڈز، دھو،
ہارج، جان کیس، شیلے، نے بھی اپنی شاعری میں اس کو
موضوع بنایا ہے۔ پریوں کی کہانیوں میں بھی اس کے
ذکر ملے ہیں۔

شہروں کے قریب رہنے والے بلبلوں کی آواز خاصی
اے ہوتی ہے تاکہ پس منظر کے شور پر غلبہ حاصل کیا جاسکے۔ یہ
نام اور بات کوگاتے ہیں۔

گل و پھل کی ترکیب سے تو آپ واقف ہوں گے۔
اتانوں اور کہانیوں میں، غزلوں اور نظموں میں ان دونوں کا

ہمیشہ ایک ساتھ ذکر ہوتا ہے۔ تحقیقی کاوش کلاسیکی اردو
شاعری میں ڈاکٹر خیر احمد علوی فرماتے ہیں۔

مخلوں کے زمانے میں پاندیوں کے نام اکثر
پھولوں پر رکھے جاتے تھے اسی لیے فارسی اور اردو شاعری کو گل
و پھل کی شاعری کہا جاتا تھا کہ اس میں پھولوں اور پھلوں کا
ذکر اکثر آتا تھا۔ اکثر بلبلیں گھروں پر بھی رہتی تھیں۔ ایسا بھی
لوگ کرتے تھے کہ ان کے چہر میں ایک چھلا ڈال دیا جاتا
تھا۔ اور اس چھلے میں ریشم کی ڈوری باندھ دی جاتی تھی۔ اور
بلبل کو اپنے ساتھ رکھنے والا اسے اپنے ہاتھ پر بٹھائے رکھتا
تھا، اس زمانے کے بچہ کو اگر ذہن میں رکھا جائے تو پھول اور
بلبل زندگی میں داخل تھے۔ اور اسی لیے وہ ذہن اور وقتی
کاوشوں میں بھی شریک رہتے تھے۔

ڈاکٹر خیر احمد علوی ہماری معلومات میں مزید اضافہ
فرماتے ہوئے کہتے ہیں۔

ہماری اردو شاعری میں گل و پھل کو پھول کے رشتے
سے بھی لیتے ہیں اور عاشق و معشوق کے رشتے سے بھی۔ یہ
ایک تہذیبی اور نفسیاتی عمل ہے کہ ہم جس طرح خود دوسروں
سے اور خاص طور پر جنس لطف سے محبت کرتے ہیں اسی کا
تصور پرندوں اور پھول پتیوں کی زندگی میں بھی دیکھتے
ہیں۔ مثلاً اگر کسی مرد کی عاشق ہے، پھول پر پاندے سے عشق کرتا ہے،
مور گھٹاؤں کو کچھ کر بولنے اور پانچے لگتا ہے، اسی طرح بلبل
بھی پھول کے لیے بھرتا رہتی ہے، نئے لالچی سے اور فریاد
کرتی ہے۔ ہمارے شعرا نے اسی تصور کو اپنی شعری تصویروں
میں بدلا ہے جیسا کہ یہ شعر بلبل کی نالہ کشی کی طرف اشارہ کرتا
ہے،

بلبل کو دیا نالہ تو پروانے کو چلنا

غم ہم کو ویسا ہے جو مشکل نظر آیا

اردو فارسی میں صد ہا شعر ہیں جو لالہ دل اور عشق بلبل
سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا جو تعلق لالہ دل سے ہے یا عشق
بلبل سے ہے وہ بھی انسان کی اپنی نفسیات اور محبت و تعلق کے
جذبات کی ترجمانی اور احساسات کی عکاسی ہے۔

بلبل و ہندلیب، ہزار داستان کوئی سا نام لے لیں،
پرندہ ایک ہی ہے، ملک ملک میں اس کا نام مختلف بھی ہو سکتا
ہے، کہیں اس کی رنگت، بناوٹ، وزن، قامت میں فرق ہو
سکتا ہے، لیکن بلبل ہمیشہ گیت گانے والا ہوگا، دل بھالنے والا
ہوگا۔ اگر بچہ کی زبان کی ایک کہانی میں بلبل کے ساتھ ہمدردی
بھی منسلک ہے۔



چوں والی فاختہ بھی پائی جاتی ہے۔

کالی کالی، چھوٹی چھوٹی گول گول آنکھیں، سفید سینہ، کالے پنجے، کالی چونچ، ہلکے نیلے اور بھورے رنگ کے پر جن کا پھیلاؤ اڑان کے وقت سترہ اعشاریہ سات انچ تک چلا جاتا ہے، یہ فاختہ ہے جو اٹھاسی کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار تک سفر کرتی ہے۔

نر اور مادہ فاختہ کی لمبائی نو اعشاریہ ایک سے تیرہ اعشاریہ چار انچ تک پہنچ جاتی ہے۔ نر فاختہ کا وزن عموماً چھیانوے سے ایک سو ستر گرام تک ہوتا ہے۔ البتہ مادہ فاختہ کا وزن نرے مختلف اور نہ گام ہوتا ہے۔ ماہرین کے مطابق مادہ فاختہ 156-86 gram کی ہوتی ہے، جب کہ لمبائی یعنی قد اور پروں کے پھیلاؤ میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ مادہ اکثر دو اڈے دیتی ہے، چھوٹے سے گھونسلے کی تعمیر میں کچھ زیادہ وقت نہیں لگتا، اگر بڑی حرف دی کی بناوٹ رکھنے والی پتلی سی مگر مضبوط شاخ پر اوپر نکلے چند ٹکے گول پالے کی شکل میں رکھ دیے جاتے ہیں۔ گھونسلہ تیار ہو گیا، ان گھونسلوں میں فاختہ سال میں کم از کم تین اور زیادہ سے زیادہ مرچ مرتبہ دو دو اڈے دیتی ہے جن کو نر اور مادہ مل کر بیٹے ہیں، دو بھتوں میں ان اڈوں سے بچے نکل آتے ہیں جن کی حفاظت اور خوراک کی ذمہ داری نر اور مادہ دونوں مل کر نبھاتے ہیں۔

فاختہ اپنا گھونسلہ اگرچہ درختوں کی شاخوں پر بنانے کو ترجیح دیتی ہے، لیکن کبھی کبھی زمین پر بھی جمادیں کے نیچے بھی گھونسلے بنا لیتی ہے۔ اور وہیں اڈے دیتی اور سٹی ہے۔ لیکن یہاں اس کو شکاری جانوروں، لومڑیوں، گیدڑوں اور بلیوں وغیرہ سے ہر وقت جان کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔

درختوں کی شاخوں پر بنے گھونسلے تیز ہواؤں اور طوفانوں کی زد میں آجائیں تو سب سے پہلے فاختہ اڑنے لگتی ہے۔

ایمانے کثرت سے ملا کرتے تھے، یہاں تک کہ انار، اور مالے زور لیموں کے جھاڑ بھی ان معصوم پرندوں کے گھرانوں اور اڈوں بچوں سے شاد اور آباد رہتے تھے۔ کیوتر اور فاختہ ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ماہوں کی خوبصورتی بے مثال اور باکمال ہوتی ہے، فاختہ اپنے پر پھیلا کر اڑان بھرنی ہے تو ٹانگوں میں اس کی برق... لیلی اسیر ہو جاتی ہیں۔ مسلسل سیلون سفر کرنے سے بھی نہیں اسی... اور دم لے کر پھر اگے کی منزلوں کی طرف رواں دواں ہو جاتی ہے۔

دنیا بھر میں فاختہ کی تین سو سے زائد اقسام پائی جاتی ہیں، انگریزی، فاختہ، Dove، کھلمی اس کے مختلف زبانوں میں نام ہیں ایک نسل تو نور بھی کہلاتی ہے۔ فاختہ اگرچہ پالتو ہندو نہیں ہے مگر اس کو گھروں میں بچرے میں رکھا جاسکتا ہے، روٹی کے ٹکڑے، باجرہ اور کنگنی اس کی پسندیدہ کھانا ہیں۔ چڑیا گھروں میں اس کے جوڑے بڑے بڑے بچروں میں قید کر کے رکھے جاتے ہیں۔

فاختہ تین زیادہ تر زمین پر فصلوں اور کھیتوں اور سبزہ زاروں میں اپنی خوراک تلاش کرتی ہیں۔ بنیادی طور پر یہ دہوں، پھلوں اور پودوں کو اپنی خوراک بناتی ہیں، زمین پر گھومتے ہوئے یہ جگہ جگہ چونچ سے مٹی کر دیتے ہیں۔ تلاش کرتی اور ان کو اپنے پرے میں محفوظ کرتی رہتی ہیں، گھونسلے میں جا کر اس کو ہضم کرتی ہیں۔ فاختہ اپنے وزن کی مناسبت سے عمومی طور پر کم خوراک استعمال کرتی ہے۔ جس کی مقدار بارہ سے بیس فیصد تک روزانہ ہوتی ہے۔

فاختہ جنگلوں، درختوں، نہروں کے کنارے اگے بڑوں کے علاوہ پہاڑوں، میدانوں اور سبزہ زاروں کے ساتھ ساتھ صحراؤں میں بھی بسر کر سکتی ہے۔ وجہ شاید یہ ہو کہ وہ بارشوں کا کھڑا اور زکا ہوا زمین پانی بھی لیتی ہے اور انسانوں کی طرح ڈی ہائیڈریشن کا شکار نہیں ہوتی۔ ہاں البتہ ماہی پرندوں، بلیوں، لومڑیوں کے ہتھے ضرور چرچہ جاتی ہے جو اس کو اپنے پیٹ کا ایندھن بنانے میں ذرا بھی نہیں اٹھاتیں۔ دورانہ پرواز عقاب ان پر بہت جھپٹتے ہیں، اور بلوں میں اچک کر لے جاتے ہیں۔

ہمارے ہاں پائی جانے والی فاختہ کا رنگ خاکی اور ہورے کی آمیزش لیے ہوتا ہے، جو گرمیوں میں ہلکا اور سردیوں میں تیز ہو جاتا ہے۔ سفید فاختہ میں بھی ہماری اس طرح کی خاصیت بدھانے میں مصروف ہیں۔ نیوزی لینڈ میں

WWF کو چاہیے کہ اس مسئلے پر سنجیدگی سے توجہ دے تا پرندوں کی ایک اترسم معدوم ہونے سے محفوظ رہے، کہ وقت کا تقاضا ہے اور کبھی وقت کی آواز اٹھ کر تحفظ جنگلی حیات ہو کہ دوسرے معتدرا دارے، ان سب کے ساتھ ساتھ یہ بھی فریضہ ہے کہ ہم خالق کا اور اک کریں اور مضر سے معد ہوتی پرندوں اور جانوروں کی نسلوں کے تحفظ کو یقینی بنائیں کہیں ایسا نہ ہو کہ وقت کہے۔

دوڑو زمانہ چال قیمت کی چل گیا اور ہماری آئندہ نسلیں ان پرندوں کی بس کہانیاں سن رہی ہیں!!

فاختہ

بھریوں ہوا کہ جب چالیس دن گزر گئے تو اللہ کے روح علیہ السلام نے پانی کے طوفان سے گھری ہوئی زمین خشکی کا ٹھکانا تلاش کرنے کے لیے اس پرندے کو بھیجا اور چھ دن پرندہ واپس لوٹا تو اس کی چونچ میں زمین کی شاخ تھی اس بات کی علامت تھی کہ اب رب کی بنائی ہوئی دھرتی پر ہم واپس کا دور دورہ شروع ہو چکا ہے اور خشکی کے سوار سب سنا خشک زمین پر اتر کر اک نئے عہد کا آغاز کر سکتے ہیں۔

روایات کے مطابق طوفانی پانی میں ڈوبی زمین پر خشک کی خبر لانے والے پرندہ فاختہ تھی، جس کی چونچ میں زمین کی شاخ دلی ہوئی ہوئی ہوئی اسن اور سلامتی کی علامت ہے۔ اقوام عالم کی نمائندگی کرنے والے ادارے اقوام متحدہ کی پیمانہ زمین کی شاخ چونچ میں قحط سے فاختہ سے ظاہر ہوتی ہے۔

زندگی میں روحانی و ذہنی بھرنے والے مختلف رنگوں کی پیمانہ کے لیے ایک رنگ فاختہ بھی شمار ہوتا ہے۔ فاختہ اہم و ظہیر، دلکش، دلخواہ پرندہ ہے جس کی بہت بڑی پیمانہ بولتے ہوئے حق و حق ہو کا اثر آفریں و رد بھی ہے۔ صبح آسمان وقت ہو کہ دوپہر کے چھٹے لمحے، شام کی آرام کرتی گھڑیاں ہوں کہ رات کی بڑ سکون ساتیں، فاختہ کی آواز ہمیشہ کانوں میں رس گھونتی ہے، زندگی کے انوکھے عہدے گھونتی ہے۔

اگر آج سے چالیس پچاس برس پہلے کی یادوں کو ہمیشہ ہمارے گھروں میں بچے کروں کو ہوا سے مسمور رکھنے والے روشن جان جولانی کے سینوں میں فاختہ کی گھونسلوں سے آباد ہو جایا کرتے تھے۔ مگر آگن میں اگے کھلے تالی، بھر، آم، انجیر، ٹوٹ نم، ویرہ کے درختوں پر ان کے

کہانیوں ہے کہ ایک نوجوان طالب علم کادل ایک لڑکی پر آ جاتا ہے، اس لڑکی کے گھر میں ایک تقریب منعقد ہوتی ہے اور لڑکی نے لڑکے سے سُرخ گلاب لانے کی فرمائش کر دی۔ برف موسموں میں جب ہر طرف سفیدی کا راج ہو سُرخ گلاب کا ملنا ناممکن ہوتا ہے، یہ حقیقت نوجوان عاشق طالب علم کو اداس کر دیتی ہے، اور وہ آپس بھرنے، آنسو بہانے لگتا ہے، بلبل سے نوجوان کی اداسی و آواز زاری دیکھی نہیں جاتی، چنانچہ وہ اس کی مدد پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اور اس کے لیے وہ گلاب کے پودے کے پاس سُرخ پھول لینے کے لیے چلا جاتا ہے۔ گلاب کا پودا فرمائش کرتا ہے کہ اپنے محبت بھرنے کیت گاتے ہوئے میری رگوں میں اپنے بدن کا لہو داخل کر دو تو شاید سفیدی سُرخی میں بدل جائے اور میں سُرخ پھول دے سکوں۔ بلبل پودے کی خواہش پر سر تسلیم خم کر دیتا ہے، آسمان سے گرتی ہوئی برف کو جھیلنے، گیت گاتے، بلبل اپنا سینہ گلاب کے ایک تیز کاٹنے سے ملا دیتا ہے، گیت کی لے کے ساتھ بلبل کی رگوں سے خون نچرتا ہوا پودے کی رگوں میں داخل ہوتا رہتا ہے، پھول سفید سے ہلکا گلابی، سُرخ اور تیز سُرخ ہو جاتا ہے، اور بلبل آخری گیت گیت گیتی لے کر سناٹا اور عدم آباد کو سدھارتا ہے۔ اگلی صبح نوجوان کی نظریاں باغ میں پڑتی ہے تو سُرخ گلاب اس کی نگاہوں کے روبرو جھنگرا ہوا ہوتا ہے، وہ اسے تو ذکر محبوبہ کے پاس لے جاتا ہے، آگے کیا ہوا ہے ایک الگ کہانی ہے مگر اس کہانی سے ہمیں بلبل کی ہمدردی کے جذبہ سے آشنائی ضرور ہوتی ہے۔

پرندے ہوں کہ قدرتی منظر، جنگل اور دریا ہوں کہ آبشاریں، ندی نالے ہوں کہ سمندر، جگنو ہوں کہ ستارے، چاند ہو کہ سورج، ہمارے اہل قلم اور اہل فن نے ان سب کو استعاروں، تشبیہوں اور دیگر دیکھ دیکھ کے ذریعے جذبات و احساسات کی ترجمانی کا فریضہ نبھایا۔ بلبل بھی انہی وسائل میں شامل ہے اور جذبات و محبت کے اظہار کا بہترین ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ ہم اپنے اندر گرد کے ماحول میں جمائیں، سنجیدگی سے غور و فکر کریں اور پھر تجزیہ کریں تو چھ ایک صحت خالق ہمارا منہ ضرور چڑائیں گے، ان میں سے ایک ماحول کی آلودگی، درختوں کی کمی، جنگلات کے بے تحاشہ کٹنے اور عمارتوں کے جنگل اگنے کے ساتھ ساتھ ضرورت میں ہے پناہ اضافے کے سبب سے ماحول کو معتدل رکھنے والے پرندوں کا برقی رفتار تیزی سے مضر عام سے غائب ہونے کا صحت مگر سچا منظر نامہ بھی ہے۔ بلبل کی نسلیں بھی تیزی سے ختم ہو رہی ہیں،



فلم عمری

بابائے سندھی فلم

الور فرہاد

برصغیر کی پہلی فلم ”علی بابا“ کو قرار دیا جاتا ہے جسے پیرالال سہن نے 1903ء کو کلکتہ میں تیار کیا تھا پھر 1913ء میں دادا صاحب پھالکے نے ”راجا پریش چندر“ بنائی جسے برصغیر کی پہلی فیچر فلم کہا جاتا ہے لیکن بولتی فلموں کا دور 1931ء سے شروع ہوا، عالم آرلہ جسے اردشیر اہرانی نے امپریل فلم کمپنی کے بیئر پر بنایا تھا پھر 1932ء میں پہلی پنجابی فلم ”بیئر رانجھا“ بنی لیکن سندھی زبان کی جانب کسی کی توجہ نہ تھی ایسے میں ایک غیر سندھی نے پہلی سندھی فلم ”عمر ماروی“ بنا کر تاریخ رقم کر دی۔

ایک معروف ہدایت کاری دکھ بھری روداد

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ڈھاکہ میں صرف کمالی فلمیں بنی تھیں اور ان میں بیشتر فلمیں بہت اچھی، خوب صورت اور معیاری ہوتی تھیں۔ فلم دانوں کے بے حد اصرار حکومت نے فلم ڈیولپمنٹ کارپوریشن کا ایک ادارہ قائم کر دیا۔ اس کے زیر نگرانی ایک فلم اسٹوڈیو F.D.C. تعمیر کروایا گیا، جو کلسازی کے جدید ساز و سامان سے آراستہ تھا۔ اس دور میں ایک بنگالی کو خیال آیا کہ وہ یہاں ایک اردو فلم بنائے۔ اسے یہ خیال اس لیے آیا کہ ڈھاکہ کی

ہونے والی سرسراہٹ ماحول میں دلکش آہٹ بھر دیتی ہے۔ رفتار ایسی جیسے بندوق سے گولی نکلے اور نشانے پہ جا گئے سینکڑوں کلومیٹر کا فاصلہ ایک ہی اڑان میں کر سکتی ہے۔ فاختہ کا گوشت بہت لذیذ اور ذائقے دار ہوتا ہے۔ لے لے یہ پرندہ عموماً شکاریوں کے شوق کا نشانہ بناتا رہا ہے۔ لذت کام و دکان اور شوق شکار کے لیے شمالی امریکا، میکسیکو، نیوزی لینڈ کے علاوہ برصغیر میں اس کا بہت زیادہ شکار کیا جاتا ہے۔

فاختہ ایک نرم دل اور ہمدرد پرندہ ہے۔ بچپن آ یاد آ رہی ہوں کہ واقعات ہمیشہ ساتھ رہتے ہیں، مگر ذرا سا دیر میں ہی گم ہو جاتے ہیں۔ میں چالیس برس پہلے کے بچپن آ یادوں کو ہمیشہ تو احسان کا بدلہ احسان کا درس دیتا ہوا ایک واقعہ چراغ بن کر جھلکتا، مسکراتا ملتا ہے۔ جو کہانی آ صورت میں چھوٹی کلاسوں کی اردو کی کتابوں میں چڑھا۔ کہانی کچھ یوں تھی۔

ایک دفعہ ایک شکاری جنگل میں شکار کرنے آیا۔ آٹھ دن درخت کی شاخ پر فاختہ کو بیٹھے دیکھا تو بندوق سے نشانہ باندھنے لگا۔ فاختہ بے خبر تھی۔ ایک چیتو نے ماہر ادا کیا شکاری کے پاؤں پر کاٹ کھایا، نشانہ خطا ہو گیا، فاختہ اڑ گئی چند دن بعد چیتو بھی شہر کنارے پانی پینے گئی تو پانی میں گر کر فاختہ دیکھ رہی تھی اس نے فوراً ایک پتھر اڑا اور چیتو نے آگے لاکر پانی میں ڈال دیا، یوں چیتو کی جان بچ گئی۔ فاختہ نے چیتو کی جان تو بچالی، مگر وہ شکاری جو اس کو شکار کرنے آ تھا، بار بار جنگل میں، شہروں کے کناروں پر، کیتوں میں، بڑے زاروں میں گھومتا رہا، گھومتا رہا، ہر نظر آنے والی فاختہ کو اپنا بندوق کا نشانہ بناتا رہا اور یوں ہوا کہ فاختہ اس کی نسل نامہ معدوم ہونے لگی۔

اور آج صورت حال یہ ہے کہ ہماری ساتھی فاختہ کے ریس بھرے گیتوں سے اور آنکھیں دلکش اڑانوں سے محروم چکی ہیں، درخت اور پرندے لازم و ملزوم ہیں، پرندوں شکار کرنے کی لت اور عادت اس پر مستزاد ہے، ماحول آلودگی ایک اور خطرناک مسئلہ ہے جس نے نازک، نفیس اور خوبصورت فاختہ کو منظر اور ماحول سے گم کرنا شروع کر دیا ہے اس سے پہلے کہ معصوم، دلکش اور حسین پرندے کا ہتھکڑا اور قلاب گھر میں رہ جائیں، ہمیں سوچنا ہے کہ ان کی حفاظت کیسے کریں کہ ان کی حفاظت اپنی ہی بقا اور سلاست ہے۔

گھونسلے ہی نشانہ بننے ہیں کیونکہ فاختہ میں دوسرے پرندوں کی طرح اپنے گھونسلے خاتنی اقدامات کے کرے نہیں کر سکتی، اسی لیے ان کے گھونسلے سب سے پہلے اُجڑ جاتے ہیں، یا ان میں سے اُٹھ کر لڑھک کر زمین پر آن کرے ہیں اور ٹوٹ جاتے ہیں۔ یوں نیا خاندان بننے سے پہلے ہی ختم ہو جاتا ہے۔

فاختہ بہت حساس پرندہ ہے۔ گھروں میں بنے گھونسلوں میں موجود اٹھوں کو اگر کوئی ہاتھ لگا دے، یا اٹھا کر دوبارہ واپس رکھ دے تو فاختہ ان اٹھوں کی طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھے گی، یا تو ان کو زمین پر گر کر دوبارہ اُٹھنے سے روکے گی یا پھر گھونسلہ چھوڑ کر کہیں اور چلی جائے گی۔ یہی حال بچوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے، اگر آپ فاختہ کے بے پر بچوں کو ہاتھ لگا دیں، ایک بار اٹھا کر واپس رکھ دیں تو وہ ان بچوں کو گھونسلے سے کرا دے گی جہاں زمین پر ابھر کر کھوٹی ہلکیاں ان کو شکار کر لیتی ہیں اور اپنی بھوک مٹاتی ہیں۔ گویا فاختہ اس کو اپنی گھر کی زندگی میں ہر طرح کی بیرونی مداخلت سخت ناپسند ہے اور اگر کوئی ان کی دنیا میں داخل ہونے کی کوشش کرے تو یہ وہاں سے کوچ کر جاتی ہیں۔

فاختہ کا بھولپن بھی مثالی ہے، بلکہ یہ صفت اس پرندے کی خاص خوبی تصور کی جاتی ہے۔ فاختہ میں دنیا بھر میں پائی جاتی ہیں، البتہ جغرافیائی حالات اور موسمی تغیر کی بدولت ہر جگہ ان کی رنگت اور قامت میں فرق ضرور پیدا ہو جاتا ہے، جس کی بنا پر فاختہ کے علاقے کی پہچان کی جاسکتی ہے۔

ماہرین کی ایک تحقیق اور مشاہدے کے مطابق افزائش کے دنوں میں عام طور پر تین پرندوں (فاختہ) کو بے چین، پریشان اور مضطرب کیفیت میں ایک دوسرے کے پیچھے اڑتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے۔ ان میں سب سے آگے اُٹھنے دینے کے لیے تیار جوڑے کا نہ ہوگا، اس کے پیچھے دوسرا پرندہ بھی نہ ہوگا جس کو اپنی مادہ کی تلاش ہے اور اس کو اپنا گھونسلہ اس جوڑے سے بچاتا ہے، جبکہ تیسری مادہ ہوگی جس کا نرس کی رہنمائی کرنے کے علاوہ اس کے لیے گھونسلے کی جستجو میں ہے۔ یہ ایک سادہ مگر نامہ ہے۔ یہ تحقیق ظاہر کرتی ہے کہ اُٹھنے دینے کے لیے تیار فاختہ اس کا نہ پہلے گھونسلہ تعمیر کرنے کی بجائے مادہ کو رکھتا ہے اور جوڑا بنانے پر زیادہ توجہ دیتا ہے، اور جب اپنی مادہ ڈھونڈ لیتا ہے تب گھونسلے کی جستجو کرتا ہے۔

فاختہ اڑان بھرتی ہے تو اس کے پروں سے پیدا

ہنگامی فلمیں اچھی ہونے کے باوجود صرف مشرقی پاکستان کی حدود میں ہی چلتیں اور بزنس کرتی تھیں جب کہ اس دور میں لاہور اور کراچی میں بننے والی فلمیں پورے پاکستان میں دیکھی اور دکھائی جاتی تھیں اور ان کا کاروباری سرکٹ مشرقی پاکستان بھی تھا۔ اس ہنگامی نے سوچا اگر میں یہاں اردو فلم بنادیں گا تو اسے بھی پورے پاکستان میں ریلیز کر سکوں گا۔ یہ ہنگامی نے بی بی اسلام تھا جو گلگت سے ہجرت کر کے وحا کے آئے تھا اور گلگت کی فلم انڈسٹری کا ایک مجھا ہوا اور باصلاحیت کیراٹین تھا۔

اس نے اردو فلم بنانے کا ارادہ کیا تو سرور بارہ بنکوی سے اس کا اسکرپٹ لکھوایا اور ”تہا“ کے نام سے اس کی فلم سازی اور ہدایت کاری کا کام شروع کر دیا اور اس فلم کے کلیڈی کرداروں کے لیے کراچی سے شیخ حسن اور فہیم آراء کو کاسٹ کیا اور ہیرو کے لیے ایک نئے پٹاوری لڑکے ہارون کو بطور ہیرو متعارف کرایا۔

میں نے سرور بارہ بنکوی سے پوچھا۔ ”سرور صاحب! یہ شیخ حسن اور فہیم آراء کو آپ لوگوں نے کیوں کاسٹ کیا ہے؟“

واضح رہے کہ ان دونوں فلم یا فلم والوں کے بارے میں میری معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ میں ایک اچھڑتے ہوئے نوجوان شاعر و ادیب کی حیثیت سے سرور صاحب یا اس دور کے وحا کے ادیبوں اور شاعروں سے قربت رکھتا تھا۔

”ارے بھئی! ہم جو فلم بنا رہے ہیں اس کی کہانی کے کرداروں کی مناسبت سے آرٹسٹوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔“ ”تو کیا یہاں وحا کے ایسے اداکار یا اداکارہ نہیں تھے کہ کراچی سے لانا پڑا؟“

”یہاں بھی بہت اچھے آرٹسٹ ہیں مگر بی بی اسلام نے شیخ حسن اور فہیم آراء کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ فہیم آراء ایک اچھڑتی ہوئی باصلاحیت اداکارہ ہے جب کہ شیخ حسن ایک بہت پختہ اداکار ہیں۔ وہ ہماری کہانی کے کردار کو اپنی اداکاری سے چار چاند لگ دیں گے۔ اس کی شوٹنگ جب شروع ہوگی تو آکر دو ٹھکان کس پائے کے اداکار ہیں۔ ان کی اداکاری حقیقت سے بہت قریب ہوتی ہے۔“

اور پھر جب ایف ڈی سی اسٹوڈیو میں ”تہا“ کی شوٹنگ شروع ہوئی اور اس میں شیخ حسن بھی حصہ لے رہے

تھے تو ایک دن وہاں جا کر میں نے بھی شیخ حسن کو اداکارا کرتے دیکھا۔ کچھ بات تو یہ ہے کہ اپنے بچے کو نہیں پڑا سینما کے اسکرین پر مختلف مناظر آکر گزر جاتے ہیں یہاں یہ تماشا دیکھا کہ ایک ایک منظر کے متعدد ٹکڑے ایک ایک کر کے فلیپ بند کیے جا رہے ہیں۔ جلد ہی میں وہاں بور ہو کر واپس آ گیا۔

میں وہاں شیخ حسن کی اداکاری دیکھنے گیا تھا مگر وہاں جو اداکاری ان سے کرائی جا رہی تھی وہ اپنی سمجھ سے بالا تھی۔ ایک دو جملے کچھ کرتے ہوئے ان سے کہلائے جاتے تھے جس کے بعد بے بی اسلام ان سے کہتے۔ ”تہا صاحب۔ اس سے تھوڑا اور بہتر۔“ ”ٹھیک ہے۔“

شیخ صاحب کو تو اس بات پر برا نہیں لگا تھا مگر مجھے لگا۔ اچھا خاصا تو شٹ دیا تھا شیخ صاحب نے۔ میں۔ دل ہی دل میں کہا۔ ”اس سے اور بہتر کی فرمائش چہ؟“ ”دارو؟“

شیخ حسن کی ایک فلم ”برکھا“ میں نے دیکھی تھی مگر مجھے وہ فلم کہانی اور اس کے گانوں کی وجہ سے اچھی لگی تھی۔ میں نے کسی کی بھی اداکاری پر توجہ نہیں دی تھی۔ ”تہا“ کے سیٹ پر میں نے شیخ حسن اور فہیم آراء کو دیکھا تو بس یہ سوچا؟ اداکار و ہدایت کاری تو ہمارے ہی جیسے ہوتے ہیں مگر سینما کے اسکرین پر کتنے مختلف نظر آتے ہیں۔

یہ بھی شیخ حسن سے میری پہلی ملاقات ایسی ملاقات جس میں میں نے انہیں بس تھوڑے فاصلے سے دیکھا تھا اور ان سے کچھ کہنے سننے کی نوبت نہیں آئی تھی مگر جب وہ ”جنگ گیا آسان“ اور ”گاتا جائے بخارہ“ بنا رہے تھے ان دنوں میں کراچی میں تھا اور ایک فلم برٹشٹ کی حیثیت سے جانا پہچانا جاتا تھا تو ان سے کئی بار ملنے کا موقع ملا۔

مجھے یاد ہے پہلی بار دیکھی پریم مگر نے مجھے ان سے یہ کہتے ہوئے ملوایا تھا۔ ”شیخ صاحب! یہ میرا بڑا لائق فاکٹو شاگردانور فرہاد ہے۔“

انہوں نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا تھا۔ ”آپ کا نام میرے لیے انجانا نہیں۔ آپ بھی شاید بھائی الیا کر کے اخبار نگار سے وابستہ ہیں؟“

”جی ہاں۔“

”میں ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کی بڑی عزت کرتا ہوں۔ آپ سے مل کر بھی مجھے بہت خوشی ہوئی ہے اُمید

ہے کہ آج وہ بھی ملنے ملائے کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔“ دیکھی پریم مگر صاحب سے وقتاً فوقتاً شیخ حسن کے بارے میں باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ ”یار! اتنا بڑا آدمی ہے مگر.....“

”آپ سے بڑا تو نہیں۔ آپ تو اس سے بھی کچھ زیادہ قد کاٹھ کے ہیں۔“ میں نے ازراہ طنز کہا۔ دیکھی صاحب نے ہنس کر کہا۔ ”یار! قد کاٹھ سے بھی کوئی بڑا ہوتا ہے۔ اپنی فنی خوبیوں اور کارکردگی سے بڑا مانا جاتا ہے۔ شیخ حسن ایک بڑی فلمی شخصیت ہیں۔ ان کے خاتون نے انہیں ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ تم بھی کبھی ان کے بارے میں لکھو۔“

”ٹھیک ہے، لکھوں گا۔“ مگر میں نے ان پر کچھ نہیں لکھا۔ ان کی وفات کے بعد ایک واجبی سی سرسری... تحریر لکھی اور بس۔ پھر کچھ دنوں کے بعد مجھ سمیت سارے ہی لکھنے والوں نے انہیں فراموش کر دیا۔

بحیثیت قوم ہم لوگ اتنے ہی احسان فراموش ہیں۔ ترقی یافتہ قومیں اپنے ہیرو کو اپنے ادیبوں، شاعروں، فنکاروں، کھلاڑیوں اور سائنس دانوں کو ہمیشہ یاد رکھتی ہیں مگر ہم لوگ آٹھ اوجھل پہاڑ اوجھل کے صدق اپنے ہیرو کو جلد ہی بھول جاتے ہیں۔

گزشتہ دنوں ہمیں ایک گانا بن رہا تھا دنیا کسی کے پیار میں جنت سے کم نہیں

اس سدا بہار گیت کو سن کر دیکھی پریم مگر یاد آئے اور ان کے ساتھ ہی شیخ حسن کی یاد بھی آگئی۔ اس شخص نے اپنی فلم کے لیے کیسا اسرگیت لکھوایا تھا۔ شیخ حسن واقعی بہت بڑی فلمی شخصیت تھی۔ میں نے دیکھی صاحب سے وعدہ کیا تھا کہ شیخ حسن کی شخصیت اور فن پر کبھی تفصیلی تحریر لکھوں گا مگر دیکھی صاحب کی زندگی میں یہ وعدہ ایفا نہ ہو سکا۔ ان کے اس نالائق شاگرد نے ان کے قابل قدر استاد پر کچھ نہیں لکھا۔

شاید اس لیے نہیں لکھا کہ اخبارات میں پھر پورا انداز کی تحریر کے لیے جگہ بنانا ممکن نہ تھا اور میں شیخ حسن کی پوری زندگی کو ماننے لانا چاہتا تھا لیکن جب سرگزشت کے لیے لکھنا شروع کیا تو یہ موقع مل گیا اور میں نے یہ ارادہ کر لیا کہ اب مجھے وہ فرض ادا کر ہی دینا چاہیے۔ دیکھی پریم مگر کی روح کو سکون پہنچانے سے زیادہ اب یہ میری اپنی ضرورت تھی۔ میرا ضمیر نبھو بن کر جو بخش زنی کر رہا تھا اس سے نجات حاصل کرنے

زندگی نامہ

نام: شیخ حسن
پیدائش: 1912ء

مقام ولادت: دادور (پنجاب)

ابتدائی تعلیم: دادور سے کی تعلیمی اداروں میں حاصل کی۔ فلمی کیریئر: اپنی کسی ہی سے نہیں کے نگار خانے رنجیت مووی ٹون سے وابستہ ہو گئے اور فلم سازی کے مختلف شعبوں میں درکار کی حیثیت سے تربیت حاصل کرتے رہے۔ اس دوران مختلف فلموں میں اداکاری بھی کی اور ہدایت کاری بھی کی۔ بعد ازاں رنجیت مووی ٹون کے سب سے بڑے ہدایت کار ایس بی ایرانی نے انہیں اپنا مستقل اسٹنٹ بنا لیا۔ 1946ء میں پنپنی میں اپنی پہلی فلم ”شہناز“ بنائی۔

ہجرت: قیام پاکستان سے چند روز پیشتر ہی پاکستان (کراچی) آ گئے۔

پاکستان میں پہلی فلم: پاکستان میں پہلی اردو زبان میں ”برکھا“ بنائی۔

دیگر قابل ذکر فلمیں: مرادوی (پہلی ندمی فلم)، ہماری زبان (اردو زبان پر بنائی جانے والی فلم)، جاگ اٹھا انسان (بلوچی زبان)، تاراج (بلوچی زبان)، اردو زبان میں مہرکہ (اردو فلم)، بھل گیا آسان (اردو فلم)، انوری جام تھائی (سندھی)، شاد و فیروز (ندمی)، گاتا جائے بخارہ (اردو)، لاکھوں نساے (اردو)۔

آخری فلم: مہراں جاموٹی (سندھی)۔

آخری ایام: آخری ایام بیماری اور کپسری کی حالت میں گزریے چٹائی چلی گئی تھی۔

انتقال: طویل علالت... کے بعد 80 سال کی عمر میں 25 جولائی 1992ء۔

بطور ہدایت کار فلمیں

ادا کار و ہدایت کار شیخ حسن کی بطور ہدایت کار کل چودہ فلمیں تھیں۔ جن میں اردو فلمیں 8، سندھی فلمیں 5 اور پنجابی زبان کی ایک فلم شامل ہے۔ سندھی زبان میں بننے والی فلم ”مہراں جاموٹی“ بطور ہدایت کار ان کی آخری فلم تھی۔ پاکستان میں ان کی پہلی فلم ”برکھا“ تھی۔ جب کہ ہندوستان میں انہوں نے ”شہناز“ نامی فلم اردو زبان میں ڈائریکٹ کی تھی۔

کے لیے صفحات بھی مل گئے ہیں۔

شیخ حسن محض ایک اداکار اور ایک ہدایت کاری نہیں تھے۔ ایک تاریخ ساز شخصیت کے بانگ بھی تھے۔ ان کے کارنامے ایسے ہیں جنہیں پاکستانی فلمی منورج بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ انہوں نے کراچی میں بننے والی پہلی فلم ”ہماری زبان“ بنائی۔ ہماری زبان اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے تناظر میں بنائی گئی تھی۔ شیخ حسن کو اردو زبان سے جو محبت تھی اس کے اظہار کے لیے انہوں نے یہ فلم بنائی تھی۔ سوچئے اور غور کرنے کی بات ہے کہ ایک ہدایت کار جو کراچی میں فلم بنانا کہنے آپ کو روشناس کر رہا ہے اس نے کسی روایتی اور جاوید جیکٹ پر فلم بنانے کی بجائے ایک ڈاکوسری ٹائپ کی فلم بنائی جس میں قدرے کمرشل انداز کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ اس فلم کے نغمات آغا حشر کاشمیری، داغ دہلوی، عطا محمد، انیس رند کیفی اور رشید لاشاری نے لکھے تھے۔ ان میں عطا محمد کا تحریر کردہ نغمہ ”ہماری زبان اردو قوی زبان اردو“ جسے گلوکارہ نذیر بیگم کی آواز میں ریکارڈ کیا گیا تھا جب کہ اس فلم کے یہ دو نغمے اس دور میں مقبول ہوئے تھے۔

ربخ روشن کے آگے شیخ رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے
(شاعر داغ دہلوی موسیقی غلام نبی عبداللطیف)
تیری دنیا سے بہت دور چلی جاؤں گی
(شاعر رند کیفی موسیقی غلام نبی عبداللطیف)
اس فلم میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کی تصویر کو بھی نمایاں انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ ان کی زبانی ایک پیغام بھی دیا گیا تھا۔ اس فلم کے فلم ساز محمد خان تھے۔ جو برصغیر کے شہرہ آفاق ہدایت کار محبوب خان کے حقیقی بھائی تھے۔ یہ فلم کراچی کے ایٹرن اسٹوڈیو میں پانچ تھیل کو بنی تھی۔ واضح رہے کہ پہلے اس فلم کا نام ”سدا سہاگن“ رکھا گیا تھا۔

شیخ حسن کے کریڈٹ میں یہ بات بھی شامل ہے کہ انہوں نے پہلی سندھی فلم ”عمر ماروی“ بنائی۔ کیسا عظیم شخص تھا وہ کہ اس نے اردو زبان پر فلم بننا کہ نہ صرف اردو زبان سے محبت کا بھرپور اظہار کیا بلکہ علاقائی زبان سندھی کو بھی اپنی فلم کے ذریعے قومی زندگی دی۔

ہر زبان کی پہلی فلم کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ سندھی زبان کی پہلی فلم ”عمر ماروی“ سندھ کی ایک رومانوی داستان پر بنائی گئی تھی۔ فاضلانی فلمز کے بزنس تلے بننے والی

اس فلم کے فلم ساز سید حسن علی فاضلانی تھے جو سندھ کے ایک باذوق زمیندار تھے۔ ادب اور ثقافت سے انہیں بڑی دلچسپی تھی۔ اس فلم میں انہوں نے بطور اداکار فلم کا کلیڈی کردار ادا کیا تھا۔ ان کے مقابل مجت سلطانہ فلم کی ہیروئن تھیں۔ ہدایت کاری شیخ حسن نے بھی ایک اہم کردار ادا کیا تھا جب کہ چارلی بھی اس کی کاسٹ میں شامل تھے۔ اس رومانوی فلم کی موسیقی غلام نبی عبداللطیف کی موسیقار جوڑی نے ترتیب دی تھی۔ یہ فلم 12 مارچ 1956ء کو نمائش پذیر ہوئی اور کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ بطور ہدایت کاری شیخ حسن نے اس فلم سے اپنی ساکھ مستحکم کر لی تھی۔

شیخ حسن کی پاکستان میں پہلی فلم ”ہماری زبان“ کی مزید تفصیل یہ ہے کہ یہ فلم محبوب بچکر کے بزنس تلے بنائی گئی تھی۔ اس کے فلم ساز ایم آر خان تھے۔ اس کی کاسٹ میں شیخ حسن، دینا، رشیدہ اور لندن قابل ذکر آرٹسٹ شامل تھے۔ غلام نبی عبداللطیف کو بطور موسیقار ہدایت کاری شیخ حسن نے پہلی بار متعارف کرایا تھا۔ یہ فلم 1955ء میں ریلیز کی گئی تھی۔ اس کی نمائش صرف کراچی میں ہوئی تھی۔ ڈاکوسری نوعیت کی فلم ہونے کی وجہ سے باکس آفس پر کامیابی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کی اہمیت بس اس لحاظ سے تھی کہ قومی زبان اردو کے بارے میں تھی۔

اس سے پہلے کہ شیخ حسن کی پاکستان میں بنائی گئی دیگر فلموں کا ذکر کروں بہتر ہوگا کہ اس عظیم فنکار کی ابتدائی زندگی کے بارے میں بتاؤں۔ وہ کون تھے اور انہوں نے اپنی فلمی زندگی کب اور کیسے شروع کی؟ وہ ان لوگوں میں نہیں تھے جو اپنی پہلی فلم سے ہی کامیاب فلمی زندگی کا آغاز کر دیتے ہیں۔

شیخ حسن سمیٹی کے ایک محلے دادر میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک متوسط خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے دادر کے ایک اسکول سے اپنی ابتدائی تعلیم مکمل کی۔ قدرت کو آگے چل کر چونکہ ان سے ثقافت کے میدان میں بہت اہم کام لینا تھا۔ اس لیے ابتداء ہی سے انہیں مطالعے کا بڑا شوق تھا۔ کتابیں پڑھنا ان کا بہترین مشغلہ تھا۔ فکشن اور شاعری سے انہیں زیادہ دلچسپی تھی اس لیے افسانے ناول اور شعر و شاعری کی کتابیں ان کے ذریعہ مطالعہ رہیں۔

سمیٹی جو ان دنوں ممبئی نہیں کہلاتا تھا۔ اس کی اصل شناخت فلم نمبر کی حیثیت سے تھی۔ متعدد نگار خانے وہاں موجود تھے۔ جن میں بڑی تعداد میں ہندی اور دیگر زبانوں

کی فلمیں بنی تھیں۔

جس جگہ شیخ حسن کی رہائش تھی وہیں قریب ہی دو فلم اسٹوڈیوز بھی واقع تھے جن میں ایک کا نام رنجیت اسٹوڈیو اور دوسری کا نام شری ساڈا اسٹوڈیو تھا۔ شیخ حسن کے ایک بھائی بطور ہیرو فلموں میں کام کرتے تھے۔ ان کا فلمی نام رکاش تھا۔ شیخ حسن کے بھائی اسٹیج آرٹسٹ تھے۔ موصوف کی حیثیت بارہویں کھلاڑی جیسی تھی۔ اسٹیج کا کوئی اداکار جب کبھی کسی وجہ سے غیر حاضر ہوتا تو یہ صاحب اس کی جگہ باکر کام کر دیا کرتے تھے۔ وہ ایک مجھے ہوئے ڈراما آرٹسٹ تھے۔ انہیں آغا حشر کاشمیری کے بیشتر ڈرامے زبانی یاد تھے۔

یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ شیخ حسن ایک فنکار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی فلمی زندگی کا آغاز ایک عام ورکر کی حیثیت سے کیا۔ کچھ سیکھے اور کچھ حاصل کرنے کا جذبہ ان میں موجود تھا۔ چنانچہ وہ فلم کے ہر شعبے میں قسمت آزمائی کرنے لگے۔ کبھی وہ گھر سے کے ساتھ لگے ہوتے اور فوٹو گرافی کے اسرار و رموز حاصل کرتے۔ کبھی میک اپ کر کے شاٹ دیتے۔ کبھی وہ فلموں میں فائٹ کرنے والوں کا ساتھ دے رہے ہوتے۔ اس طرح وہ اسٹوڈیو میں فلم میکنگ کی عملی تربیت حاصل کرتے رہے۔ وہ ہدایت کاروں کے ساتھ بھی رہ کر ان کی معاونت کرتے رہے اور ہدایت کاری کی تعلیم بھی حاصل کرتے رہے کہ فلم کا کوئی شعبہ بھی ان کی دسترس سے دور نہ ہو۔ فلم بنانا کسی ایک شخص کا کام نہیں ہوتا، متعدد افراد اپنے فنی جوہر کا مظاہرہ کر کے فلم کی تکمیل میں اپنا حصہ ادا کرتے ہیں۔ نین اسٹیج شیخ حسن چاہتے تھے کہ وہ ہر شعبے سے متعلق واقف ہوں تاکہ اگر زندگی میں کبھی فلم بنانے کا موقع ملے تو فلم میکنگ کے بارے میں ہر زاویے سے اپنی گرفت مضبوط رکھ سکیں۔ ان کا ایک بھائی پرکاش فلموں کا مقبول ہیرو تھا۔ بھنوی اسٹیج کے جانے مانے آرٹسٹ تھے۔ شیخ حسن چاہتے تو ان دونوں کی مدد اور سفارش سے شارٹ کٹ کا راستہ اختیار کر کے اپنے مستقبل کے لیے کوئی آسان طریقہ کار اپنا سکتے تھے مگر اس حقیقت پسند نوجوان نے ایسا نہیں کیا بلکہ اپنی بنیادوں کو مضبوط کیا وہ کام کیا جو زندگی بھر ان کا سرمایہ ثابت ہو۔ سفارش کو وہ بیساحمی سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے تھے۔

نگار خانے میں ایک عام ورکر کی حیثیت سے شیخ حسن کی دلچسپی نگار اور جدوجہد کو دیکھتے ہوئے انہیں بطور اداکار

بطور اداکار

بطور اداکار شیخ حسن نے سمیٹی کے متعدد فلموں میں پرکار کیا جن میں شہنشاہ باہر، جھین لے آزادی، واسکوڈی گاما اور کولن خاص طور پر قابل ذکر ہیں جب کہ پاکستان میں اپنی تقریباً تمام فلموں کے علاوہ دوسرے ہدایت کاروں کی فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے۔ مادام نور جہاں کے ساتھ ہیرو کا کردار بھی کیا فلم کیسے ٹوٹے جا رہے۔

جنہیں فلمی دنیا سے متعارف کرایا

شیخ حسن کا یہ کارنامہ بھی کبھی فراموش نہیں کیا جائے گا کہ انہوں نے فلم کے ہر شعبے کے لیے نئے چہرے متعارف کرائے۔ جن میں سے بیشتر نے بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ سمیٹی میں اپنی بنائی جانے والی فلم ”شہنشاہ“ میں انہوں نے مشہور گلوکار امیر بائی کرناٹکی کو بطور میوزک ڈائریکٹر متعارف کرایا۔ اسی فلم میں صحافی دھپی پریم نمبر کی کو بطور فلمی کہانی نویس، مکالمہ نگار اور نغمہ نگار پیش کیا۔ پاکستان میں بنائی جانے والی فلم ہماری زبان میں گلوکارہ نذیر بیگم اور موسیقاروں کی جوڑی غلام نبی عبداللطیف کو فلم انڈسٹری سے روشناس کروایا۔ اپنی پہلی سندھی فلم ”عمر ماروی“ میں مجت سلطانہ کو بطور ہیروئن پیش کیا۔ سندھی فلم ”پرائی زین“ میں بھی اداکارہ سوزی ڈیئل اور اداکار سلطان کو متعارف کرایا۔ اردو فلم ”لاکھوں فسانے“ میں اردو ادب کے نامور افسانہ نگار ابرار الیم طیس کو بطور فلمی کہانی نویس متعارف کرایا۔ شاہ رو فیروز میں مدد ملی مرن کو بطور عکاس اور غلام علی کو بطور موسیقار انٹرویوز کرایا۔ اسی فلم شاہ رو فیروز میں مشتاق چٹیکڑی، مد پاور اور ملک انوکھا کو بھی پہلی بار پیش کیا۔ ”جنگ گیا آسان“ میں محمود خان سودی کو بطور ہیرو چانس دیا۔ اسی طرح گاتا جائے بجاہر میں آغا حشر کو متعارف کرایا۔ گاتا جائے بجاہر میں صحافی یونس ہمد کو بھی پہلی بار گیت نگاری کا موقع دیا۔ اسی طرح انہوں نے سندھی ادیبوں رشید لاشاری اور امر جیل کو بھی فلمی دنیا سے متعارف کرایا۔ انہوں نے زادشاہ صدیق اور فکیل لاسی کو بطور اسٹنٹ ڈائریکٹر اپنی فلموں کے ذریعے ہدایت کاری کی تربیت دی۔ ان کے یہ شاگرد بعد میں کامیاب ہدایت کار بنے۔

کاسٹ کیا جانے لگا۔ انہوں نے اس دوران جن فلموں میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے ان میں رنجیت فلم کمپنی کی فلم نرس، کارواں، شہنشاہ، باہر، پرہو کا گھر، گوان، جھین لے آزادی، واسکوڈی گاما اور سہرا قابل ذکر ہیں۔

شیخ حسن کی بطور اداکار فلم ”نرس“ کے ہدایت کار چر بھوج روٹی تھے۔ موسیقی میاں دت نے کمپوز کی تھی۔ شیخ حسن نے اس فلم میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ دیگر کاسٹ میں خورشید، انیل کمار، اردن پرہما اور اندرا شامل تھے۔ یہ فلم 1943ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

”کارواں“ شیخ حسن کی دوسری فلم تھی۔ یہ بھی رنجیت فلم کمپنی کی فلم تھی۔ اس کے ہدایت کار ایس بی ایرانی تھے۔ موسیقار بلو رانی تھے۔ اس فلم کی دیگر کاسٹ میں کلچر جی، کسیری، پریم، شیخ حسن اور اردن شامل تھے۔ یہ فلم 1944ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

اس دور میں آج کی طرح اداکار اور اداکارائیں اپنی مرضی سے ہر فلم ساز و ہدایت کار کی فلم میں کام نہیں کر سکتے تھے۔ اس زمانے میں ہر فلم کمپنی کے اپنے ہدایت کار اور فنکار ہوا کرتے تھے جو باقاعدہ ان فلم کمپنیوں کے ملازم ہوا کرتے تھے۔ انہیں ہر ماہ تنخواہ ملتی تھی۔ فلم بنے یا نہ بنے وہ اس کے حقدار ہوتے تھے۔ وہ اپنی مرضی سے اپنی کمپنی چھوڑ کر کسی اور کمپنی میں نہیں جاسکتے تھے۔ نہ ہی کوئی فنکار کسی دوسری کمپنی کی فلموں میں کام کر سکتا تھا۔ نہ ہی کوئی ہدایت کار کسی اور کمپنی کی فلم ڈائریکٹ کر سکتا تھا۔

شیخ حسن رنجیت فلم کمپنی کے ملازم تھے۔ اس دور میں رنجیت فلم کمپنی میں سب سے زیادہ فلمیں بنا کرتی تھیں۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ رنجیت فلم کمپنی فلموں کی فیکٹری تھی۔ اس فلم کمپنی میں سب سے زیادہ ہدایت کار اور فنکار ملازم تھے۔ رنجیت فلم کمپنی سے وابستہ ہونے کے بعد شیخ حسن نے یہاں کی فلموں میں اپنی اداکاری کے جوہر بھی دکھائے اور خدمت خلق کا کام بھی سرانجام دیا۔ جہاں بھی وہ محسوس کرتے کہ ان کی مدد اور تعاون کی کسی بہتر مندرجہ ضرورت ہے ترنت اس کی مدد کو پہنچ جاتے۔ کبھی لیبارٹری میں فلم دھوانے کے موقع پر، کبھی ریش پاپرنٹ نکالوانے کے مرحلے پر حاضر ہو جاتے اور بغیر کبے متذکرہ ہنرمند کا ہاتھ بٹاتے۔ وہ ہر طرح کے کام کرنے والی مشین کی طرح ہر وقت حاضر خدمت رہتے۔ ان کی یہ خوبی سب کو پسند آتی کہ وہ بغیر سلیک و سٹاکس کے اور لالچ سے بالاتر ہو کر سب کے کام

آتے تھے۔

ان کی اس خوبی نے رنجیت فلم کمپنی کے صفِ اول کے ہدایت کار ایس بی ایرانی کو اتنا متاثر کیا کہ انہوں نے شیخ حسن کو مستقل طور پر اپنا چیف اسسٹنٹ بنالیا۔ نیکی چاہے جس صورت میں ہو مگر رانیکا نہیں جانی۔ شیخ حسن کو ان کی اس نیکی کا قدرت کی طرف سے بہت بڑا انعام ملا تھا۔ رنجیت فلم کمپنی کے بہت بڑے ہدایت کار کے نائب کے طور پر کام کرنے کا یہ اعزاز کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ شیخ حسن کو ڈائریکشن کے اسرار و رموز سیکھنے کا اس سے زیادہ بہتر اور کیا بات ہو سکتی تھی۔ اس نوجوان نے ایک اچھے شاکر و کی حیثیت سے ایس بی ایرانی کی کئی فلموں میں انہیں اسسٹ کر کے ہدایت کاری کے صحن میں بہت قیمتی معلومات حاصل کیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ اداکاری بھی کرتے رہے۔ ایس بی ایرانی کی فلموں میں بھی اور رنجیت موسی نوں کی دیگر فلموں میں بھی۔

ایس بی ایرانی کی فلم ”کارواں“ کے بعد شیخ حسن کی بطور اداکار فلم ”شہنشاہ باہر“ ریلیز ہوئی۔ یہ بھی رنجیت موسی نوں کی فلم تھی۔ اس کے ہدایت کار وجاہت مرزا اور موسیقار حکیم چندر پرکاش تھے۔ یہ فلم بھی 1944ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔ اس کی کاسٹ میں شیخ حجاز، خورشید، مجید، سلوچا چوڑی، شیخ حسن، سوشل کمار اور لالہ یعقوب شامل تھے۔

شیخ حسن کی اداکاری کی حیثیت سے ایک منفرد فلم ”گوان“ تھی جو 1946ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس فلم میں شیخ صاحب کو ایک غیر معمولی کردار میں پیش کیا گیا تھا۔ جس میں ان کی اداکاری کو سب نے پسند کیا تھا جب کہ یہ فلم بھی عوامی معیار پر پوری اترتی تھی۔ امر پکچرز کے سینٹرل بننے والی اس کامیاب فلم کی موسیقی جنس راج بھل نے ترتیب دی تھی جب کہ اس کے ہدایت کار بابو راؤ بھل تھے۔ سوشلا رانی، ترلوک کپور، مادھوری اور ڈیوڈ نے بھی اس فلم میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے تھے۔

شاید یہ پڑھتے وقت آپ سوچ رہے ہوں گے کہ وہ شخص جس نے ایک ہدایت کار کی حیثیت سے اپنے آپ کو منوایا۔ اسے آخر اداکاری میں اتنے دنوں تک کیوں جان ماری کرتی پڑی؟ وہ اپنی ساری توجہ ہدایت کاری پر مرکوز رکھتا۔ آپ کی یہ سوچ غلط نہیں ہے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ برصغیر میں فلم، انش تمام نامور اور شہرت یافتہ ہدایت کاروں

نے اپنے فنی سفر کا آغاز اداکاری سے کیا تھا۔ مثال کے طور پر ایس ایم یوسف، ضیاء سرحدی، محبوب خان، سدھیر، ڈی شانتارام، مسعود پرویز، سہراب مودی، رفیق غزنوی، راج کپور، کار واد اور اپنے ہاں شان کے نام قابل ذکر ہیں۔

اس کی وجہ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ایک ہدایت کار کو جہاں فلم کے دیگر شعبوں کو کنٹرول کرنا پڑتا ہے وہاں آرتھٹسٹوں سے اپنی مرضی کے مطابق کام لینا سب سے اہم ہوتا ہے۔ اس لیے ایک کامیاب ہدایت کار کے لیے یہ بات از بس ضروری ہے کہ وہ ایک اچھا اداکار بھی ہو اور ضرورت پڑنے پر اداکار یا اداکارہ کو خود پر قادم کر کے بتائے کہ اس طرح کرو۔

1947ء میں رنجیت موسی نوں کی فلم ”جھین لے آزادی“ ریلیز ہوئی تھی۔ اس کے ہدایت کار بھی ایس بی ایرانی تھے۔ موسیقی جنس راج بھل نے ترتیب دی تھی۔ اس کی کاسٹ میں غلام محمد، دینا، امر ناتھ، شیخ حسن، الطاف، ایس حسین اور راجندر سنگھ شامل تھے۔

شیخ حسن نے کچھ اور فلموں میں بھی اداکاری کی تھی جن میں ”واسکوڈی گاما“ اور ”سہرا“ قابل ذکر ہیں۔

”سہرا“ 1948ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس کے ہدایت کار ڈی بی جوشی اور موسیقار ایس ہندرتھے۔ شیخ حسن فلموں میں اداکاری ضرور کر رہے تھے مگر ان کی منزل اداکاری نہیں ہدایت کاری تھی۔ ان کے دل میں یہ خواہش تھی کہ وہ کوئی فلم ڈائریکٹ کریں اور اپنے آپ کو ایک ماملاہیت ہدایت کار کے طور پر منوایں تاکہ ان کے جوہر سب کے سامنے کھل کر آسکیں۔

وہ جو کہتے ہیں کہ لگن بچی ہو تو منزل تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے۔ اللہ رب العالمین بھی اس کی مدد کرتا ہے جو اپنے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ اپنی ذاتی فلم بنانے کے سلسلے میں انہوں نے جدوجہد شروع کی تو انہیں ایک صاحب محبوب میاں بال لے مل گئے جو ان کی فلم کے لیے سرمایہ کاری پر رضامند ہو گئے۔

کسی بھی فلم کی تیاری کے لیے سب سے اہم چیز سرمایہ ہوتا ہے، قدم قدم پر پیسے کی ضرورت پڑتی ہے۔ روکڑا مہیا ہو جائے تو فلم شروع کر دی جاتی ہے۔ شیخ حسن نے بھی محبوب میاں بال کے مالی تعاون سے فلم کی تیاری شروع کر دی۔ فلم کا نام ”شہناز“ رکھا۔ اس فلم کی کہانی، مکالمے اور نغمات دھکی پریم نگر کی لکھوائے۔ دھکی پریم

عمر ماروی۔ تاریخ ساز فلم

یوں تو شیخ حسن نے اپنی فلمی زندگی میں کئی کارنامے انجام دیے مگر پہلی سندھی فلم ”عمر ماروی“ کی تخلیق ان کا وہ کارنامہ ہے جو فلمی تاریخ میں ہمیشہ سنہری حروف میں جگمگاتا نظر آئے گا۔ وہ سندھی نہیں تھے مگر سندھ کی سرزمین اور اس کی ثقافت سے بہت پیار کرتے تھے۔ ان کی انہی خوبیوں کی وجہ سے انہیں بابائے سندھی فلم کا خطاب بھی دیا گیا۔

عمر ماروی سندھی زبان کی مشہور لوک داستان تھی جس پر شیخ صاحب نے فلم بنا کر نہ صرف سندھی فلموں کی ابتدا کی بلکہ اس کی کامیابی سے سندھی فلموں کو استحکام عطا کیا۔ یہ فلم پاکستان کے علاوہ بھارت میں بھی دکھائی گئی اور پسند کی گئی۔ اس فلم میں عمر سومرو کا کردار قاضی خان اور ماروی کا کردار نگہت سلطانہ نے ادا کیے جب کہ شیخ حسن نے ماروی کے معشیت کا کردار ادا کیا۔ اس سندھی فلم کو 1963ء میں ماروی کے نام سے اردو زبان میں بھی بنایا گیا مگر اسے سندھی عمر ماروی جیسی نہ پڑا۔ حاصل نہ ہوئی۔ سندھی عمر ماروی ایک یا کار فلم کا درجہ رکھتی ہے۔

نا کام اداکار

شیخ حسن نے جن آرٹسٹوں کو متعارف کرایا ان میں سے چند ایسے بھی گزرے ہیں جو اپنی نااہلی یا کسی اور وجہ سے فلمی زیرِ برقرار نہ رکھ سکے۔ ان میں محمود نان مودی، آغا سجاد، سلطان اور سندھ باد کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نگری اس دور میں بھی میں ایک شو بزمی کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ شیخ حسن سے صاحب سلامت تھی۔ لہذا انہوں نے ان سے کہا۔ ”یار! تم کب تک دھکی بن کر دھکی بھری زندگی گزارتے رہو گے؟“

”شیخ صاحب جو تقدیر میں لکھا ہے۔“ شیخ حسن نے قطع کلائی کرتے ہوئے کہا۔ ”تم نے سنا نہیں علامہ اقبال نے کیا کہا ہے۔“

خودی کو کر بلند اتا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

”جی ہاں سنا ہے۔“

”تو اپنی تقدیر خود بدلو۔ آگے بڑھو۔ جدوجہد کرو۔ محض صحافت ہی کو کب تک اڑھتا بچھونا پائے رہو گے؟“

”تو پھر..... اور کیا کروں شیخ صاحب؟ آپ ہی بتائیے۔“

”میرا خیال ہے تم میں بڑی صلاحیتیں پوشیدہ ہیں۔ انہیں باہر لاؤ۔ میں نے سوچا ہے تم میری پہلی فلم کے لیے لکھو۔“

”کیا لکھوں؟“

”ارے ہاں! میں اس پر کوئی فیچر لکھنے کو نہیں کہہ رہا ہوں۔ تم میری فلم کی کہانی لکھو۔ اس کے مکالمے لکھو اس کے گیت لکھو، تم شاعری بھی تو کرتے ہونا؟“

”جی ہاں مگر.....!“

”تم بھی کہتا چاہتے ہو ناں کہ مجھے تو فلم رائٹنگ کا کوئی تجربہ نہیں۔“

”جی ہاں۔ یہی بات ہے۔“

”جسیں لکھتا تو آتا ہے ناں؟“

”جی ہاں۔“

”بس اتنا ہی کافی ہے۔ میں تمہیں گائیڈ کروں گا۔ جیسا کہوں گا ویسا ہی لکھنا۔“

اور ایسا ہی ہوا۔ دہی پریم مہری ایک بڑے لکھے اور قلم کے جمنی تھے۔ شیخ حسن کی رہنمائی میں انہوں نے لکھا اور ایسا لکھا کہ انہیں فلم رائٹر کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا۔

شیخ حسن نے دہی پریم مہری کی چٹہ ٹھوک کر کہا۔ ”کوئی بھی شخص ماں کے پیٹ سے سب کچھ سکھ کر دنیا میں نہیں آتا۔ یہاں اسے سیکنا پڑتا ہے۔ کچھ بننے کچھ حاصل کرنے کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔ جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ اگر بندے میں سیکنے کی لگن ہو، جوش اور جذبہ ہو۔ اپنی کوشش سے اپنی صلاحیتوں کا اظہار کر دیتا ہے۔ یہ ثابت کر دیتا ہے کہ میں یہ کر سکتا ہوں۔ جس طرح تم نے ثابت کر دیا کہ تم ایک اچھے سماعتی ہی نہیں ایک اچھے فلمی مصنف بھی ہو، ایک کامیاب فنکار بھی ہو۔“

”آپ نے غلط نہیں کہا ہے مگر اس میں یہ اضافہ کروں گا کہ اگر آپ کی نگرانی اور رہنمائی حاصل نہیں ہوتی تو میرے لیے یہ کامیابی حاصل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔“

”تمہاری بات میں، میں اپنی یہ بات بھی شامل

کروں گا کہ اگر تم میں سیکنے کا جذبہ اور لگن نہ ہوتا تو میری رہنمائی کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔“

”شہباز“ میں دہی پریم مہری کی کہانی اور مکالموں ہی کی پڑ برائی نہیں ہوئی۔ ان کے لکھے گیتوں کو بھی پسند کیا گیا۔ یہ گیت تو بہت مشہور ہوئے۔

”تقدیر نے ہمارے ہمیں پھر ملا دیا۔“

جیسے اس دور کی مشہور گلوکارہ امیر بانی کرناٹکی نے اپنی آواز میں ریکارڈ کروایا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خوب صورت آواز کی یہ ملکہ ہی تھی جس نے اس گیت کی دھن تیار کی تھی۔ اس گانے کے علاوہ دیگر تمام گیتوں کی کمپوزیشن کی تھی۔ آپ درست سمجھیں۔ امیر بانی کرناٹکی ہی نے بطور موسیقار ”شہباز“ کی موسیقی ترتیب دی تھی۔ اس لحاظ سے یہ ان کی پہلی فلم تھی اور اس کا کریڈٹ بھی شیخ حسن کو جاتا تھا کہ انہوں نے اپنی فلم کے ذریعے اس گلوکارہ کے سر پر موسیقار کا تاج رکھ دیا۔ یعنی شیخ حسن نے دہی پریم مہری کی طرح امیر بانی کرناٹکی کو بھی بطور موسیقار قلم ادا شری سے متعارف کرایا۔ وہ پہلی خاتون موسیقار تھیں۔ ان سے پہلے بھی کئی خواتین فلموں کی موسیقی ترتیب دیتی رہی تھیں۔ بہر حال یہ شیخ حسن کا کام تھا کہ انہوں نے ایک گلوکارہ کو موسیقار بنا دیا۔ اپنی اس فلم میں شیخ صاحب نے ایک نوجوان نہال کو بھی بطور اداکار پیش کیا تھا۔

واضح رہے کہ بہت سے ہدایت کار نئے لوگوں کو متعارف کرانے کا سارک نہیں لیتے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ایک تو ان کے نئے ہونے کی وجہ سے فلم کی اسٹار ویلیو مٹا رہی ہے۔ دوسرے ان پر بڑی محنت کرنی پڑتی ہے تب کہیں وہ مطلوبہ پرفارمنس دے پاتے ہیں مگر یہ اچھا رجحان نہیں، اگر نئے آرٹسٹ اور ہنرمند متعارف نہ کرائے جائیں تو آنے والے دنوں میں اچھے پرفارمر کیسے سامنے آسکتے ہیں؟ شیخ حسن اس سلسلے میں بڑے کشادہ قلب تھے۔ انہوں نے بطور ہدایت کار اپنی پہلی فلم سے لے کر بعد کی فلموں میں بھی نئے لوگوں کو متعارف کرانے میں کسی غل سے کام نہیں لیا۔

ان کی پہلی فلم ”شہباز“ جو 1946ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ وہاب پروڈکشنز کے بیئر تھے بنائی گئی تھی مگر پارہ جو اس دور کی مشہور اداکارہ تھیں۔ اس فلم کی ہیروئن تھیں۔ ان کے مقابل الطاف نامی اداکار نے ہیرو کا کردار ادا کیا تھا۔ شیخ حسن نے بھی ایک ایمر کردار ادا کیا تھا۔

ایک سال بعد یعنی 1947ء میں تقسیم ہند کے بعد

پاکستان بن گیا۔ ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی طرح جیسی سے بھی لوگ ہجرت کر کے پاکستان آنے لگے تھے۔ وقت اور حالات کے دھارے کو دیکھتے ہوئے شیخ حسن نے بھی متحدہ سینٹر فلمی شخصیات کی طرح پاکستان آنے کا فیصلہ کیا اور اپنی پہلی فلم ”شہباز“ کی نمائش کے بعد بمبئی سے کراچی آ گئے۔ ان کی آمد سے پہلے ان کی فلم شہباز کراچی آچکی تھی اور نارتھ سینما میں ریلیز ہو کر شیخ حسن کو اچھی طرح متعارف کرا چکی تھی۔ یوں بھی وہ بطور اداکار پاکستانیوں کے لیے کوئی نئے نہیں تھے۔ ان کی بمبئی میں بننے والی فلمیں پاکستان میں دیکھی اور دکھائی جاتی رہی تھیں۔

پاکستان آنے کے بعد شیخ حسن کو بطور ہیرو ایک فلم ”نوٹے تارے“ میں کاسٹ کیا گیا جس میں ان کی ہیروئن گلوکارہ واداد کارہ نور جہاں تھیں۔ یہ 1949ء کی بات ہے کہ جب یہ فلم بن کر تیار ہو گئی تو اس فلم کے سارے ٹیلو نگار خانے میں جل کر خاستہ ہو گئے اور شیخ حسن کی پاکستان میں پہلی فلم ”نوٹے تارے“ بھی ریلیز نہ ہو سکی۔ اس بات کا انہیں بہت دکھ تھا کہ ملکہ ترنم کے ساتھ انہیں ہیرو کے طور پر پرفارم کرنے کا موقع تو ملا مگر ان کی یہ فلم اسکرین کی زینت نہ بن سکی۔ یہ سوچ کر انہوں نے صبر کر لیا کہ شاید قدرت کو یہی منظور تھا۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ شیخ حسن پاکستانی فلم بینوں اور فلم والوں کے لیے انجمنی نہیں تھے، بطور اداکار اور بطور ہدایت کار ان سے آشنا تھے۔ اس لیے انہیں اس نئی جگہ اپنے دوسرے فلمی دور کا آغاز کرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ان ہی دنوں کراچی میں فلم سازی کی ابتداء ہوئی تھی۔ لہذا کراچی کے ایک فلم ساز خادم حسین نے اپنی رو مانوی فلم ”برکھا“ کے لیے انہیں ہدایت کا انتخاب کیا۔ پاکستان میں بطور ہدایت کار شیخ حسن کی یہ پہلی فلم تھی۔ اور گرین کے بیئر تھے بننے والی اس فلم کے موسیقار طفیل فاروقی تھے جب کہ اس کی کاسٹ میں مسعود، مسیحو خانم، نذر، نمی، آشا پوٹے، شیخ حسن، سندباد اور سلطان کھوسٹ شامل تھے۔ نئی نسل کو یہ بتانا ضروری ہے کہ کئی وی اور فلم کے دراشاںل فنکار عرفان کھوسٹ، سلطان کھوسٹ کے فرزند ارجمند ہیں جب کہ ایک خوب دو جوان گل یوسف نے سندباد کے فلمی نام سے اس فلم میں کام کیا تھا اور راجا ورن لہن کے رول میں بڑی عمدہ اداکاری کی تھی۔ اس فلم کے گیت شیراز، لکھی نے لکھے تھے۔ جب کہ اس کا ایک نذر

شیخ حسن کی بطور ہدایت کار فلموں کی تفصیلات

”شہباز“ (اردو) 1946ء، موسیقار: امیر بانی کرناٹکی، کاسٹ: بیگم پارہ، الطاف، نہال، شاما۔ ”برکھا“ (اردو) 1952ء، موسیقار: طفیل فاروقی، کاسٹ: مسیحو مسعود، آشا پوٹے، نذر شیخ حسن۔ ”ہماری زبان“ (اردو) 1955ء، موسیقار: غلام نبی عبداللطیف، کاسٹ: شیخ حسن، رینا، رشیدہ، لڈن۔ ”عمر ماروی“ (سندھی) 1956ء، موسیقار: غلام نبی عبداللطیف، کاسٹ: قاضیانی بکمت سلطانہ، چارلی شیخ حسن۔ ”پرائی زمین“ (سندھی) 1958ء، موسیقار: غلام نبی عبداللطیف، کاسٹ: سلطانہ، سوزی، چارلی۔ ”الطاف ناما“ (اردو) 1961ء، موسیقار: وجہ بٹا چاریہ، کاسٹ: ورہن، کلکاری سوزی، احمد رشیدی۔ ”ماروی“ (اردو) 1963ء، موسیقار: غلام نبی عبداللطیف، کاسٹ: قاضیانی بکمت سلطانہ، ناصرہ رخسانہ۔ ”جاگ اٹھا انسان“ (اردو) 1966ء، موسیقار: لال محمد اقبال، کاسٹ: وحید مراد، زینا، محمد علی، سیما، ابراہیم نفیس۔ ”شاہرو فرزد“ (سندھی) 1968ء، موسیقار: غلام علی، کاسٹ: ماہ پارہ، مشتاق چنگیزی، ملک انوکھا، سلیمان شاہ۔ ”نوری جام تہاچی“ (سندھی) 1970ء، موسیقار: غلام علی، کاسٹ: مشتاق چنگیزی، عشرت جہاں۔ ”جنگ گیا آسان“ (اردو) 1970ء، موسیقار: لال محمد اقبال، کاسٹ: محمود خان مودی، ترنم ترانہ، نرالا۔ ”گاتا جائے بخارہ“ (اردو) 1972ء، موسیقار: لال محمد اقبال، کاسٹ: آغا سجاد، زمرہ، فرخندہ، ریگھلا۔ ”فرک ڈرائیو“ (پنجابی) 1976ء، موسیقار: نیاز احمد باجی، کاسٹ: سلطان راہی، آسیہ۔ ”مہران جامونی“ (سندھی) 1988ء، موسیقار: غلام علی، کاسٹ: شیراز، رینا، زاہد نور، ملک انوکھا، محمود لاسی۔

”یہ چاند تارے جموئے سہارے“ علامہ لطیف انور کا لکھا ہوا تھا۔ واضح رہے کہ یہ ”قلم“ ”برکھا“ کراچی قلم انٹرنی کے ابتدائی دور کی قلم نسی جو عمل طور پر لاہور میں عمل کی گئی تھی۔ اس کی نمائش 1953ء میں ہوئی تھی اور اس لیے اس نے قماشائیوں کی توجہ حاصل کی تھی کہ یہ کراچی کے ایک قلم سازی کی پہلی قلم نسی۔ اس دور میں کراچی کی قلم انٹرنی چونکہ نئی تھی اس لیے اس میں تقریباً سارے ہی آرٹسٹ لاہور سے لیے گئے تھے اور اسے لاہور کے نگار خانے میں عمل کیا گیا تھا۔

شیخ حسن بمبئی قلم انٹرنی سے آئے تھے۔ جہاں نگار خانوں کی بہتات تھی اور بے شمار قلمیں بنا کر تھیں جس جب کہ کراچی کی قلمی صنعت نہ ہونے کے برابر تھی مگر شیخ صاحب یہاں کے ماحول اور حالات سے گھبرائے نہیں۔ بلکہ اسے بنانے سنوارنے اور اس کی ترقی و ترویج میں مثبت کردار ادا کرنے کے لیے کمر بستہ ہو گئے۔ وہ چاہتے تو لاہور جا کر زیادہ بہتر ماحول میں کام کر سکتے تھے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اپنی بہتری کی بجائے کراچی کی نوزائیدہ قلم انٹرنی کی بہتری اور بہبود کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔

کراچی میں ان کی دوسری قلم ”ہماری زبان“ بطور ہدایت کار 1955ء میں ریلیز ہوئی جس کے بارے میں بتا چکا ہوں کہ یہ ڈاکوسٹری ٹاپ کی قلم تھی اور اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے پیش نظر بنائی گئی تھی۔ اس قلم کے ذریعے شیخ صاحب نے موسیقاروں کی نئی جوڑی غلام نبی عبداللطیف کو متعارف کرایا تھا۔ ڈاکوسٹری قلم کے ذکر پر یاد آیا کہ شیخ حسن نے ”جہاد کشمیر“ کے نام سے بھی ایک دستاویزی قلم بنائی تھی۔

اردو زبان کی ترویج و تفسیر سے متعلق قلم ”ہماری زبان“ کی نمائش کے بعد کی بات ہے کہ شیخ صاحب کے بہنوئی نے سندھ کے اندرونی علاقوں کا ایک دورہ کیا۔ مقصد یہ تھا کہ وہ سندھ میں آج ڈراموں کے انتقاد کے لیے حالات کا جائزہ لیتا چاہتے تھے۔ سندھ کے دورے پر جاتے وقت انہوں نے شیخ حسن کو بھی اپنے ساتھ لے لیا کہ ایک سے دو بھلے۔ لہذا شیخ حسن کی میزبانی تک اپنے بہنوئی کے ساتھ سندھ کے قصبوں اور دیہاتوں کا دورہ کرتے رہے۔ انہوں نے اس دوران سندھی زبان و ادب اور شاعری سے واقفیت بھی حاصل کی اور سندھیوں کے آرٹ اور کچر کا

مطالعہ بھی کیا۔ سندھی کی لوک کہانیوں کو لوگوں کی زبانی سنا اور ان کہانیوں کے مابین مقامات کو چشم خود جا کر دیکھا اور پھر وہیں ایک سندھی قلم بنانے کی منصوبہ بندی بھی کر لی۔

اسی دوران شیخ صاحب کی ملاقات سید حسن علی فاضلانی سے ہوئی۔ فاضلانی صاحب سندھ کے ایک بہت بڑے زمیندار تھے اور صاحب ذوق بھی تھے۔ انہیں ڈراموں اور فلموں میں اداکاری کا شوق تھا۔

جب زمیندار صاحب کو معلوم ہوا کہ دارالحفاظہ سے (کراچی ان دنوں پاکستان کا دارالحفاظہ تھا) کچھ فنکار لوگ ادھر آئے ہیں تو انہوں نے ان سے ملاقات کی۔ انہیں اپنے اوطاق میں بلایا اور ان کی خوب آؤ بگت کی اور کہا۔ ”میں اگر چہ اس دور دراز علاقے میں رہتا ہوں اور زمینداری کرتا ہوں مگر دوسرے زمینداروں سے قدرے مختلف ہوں۔ پڑھا لکھا ہوں۔ ادب، آرٹ اور کچر کا دلدادہ ہوں۔ مجھے بھی ڈراموں اور فلموں میں کام کرنے کا شوق ہے۔“

”ماشاء اللہ! یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ آپ اس دور افتادہ جگہ رہنے کے بعد بھی اس قدر پلچڑ ہیں۔“

”ہاں نہیں یہ میری اچھائی ہے یا برائی۔“ فاضلانی صاحب بولے۔ ”آپ لوگوں کے بارے میں سنا تو ملاقات کے لیے بے چین ہو گیا اور یہاں آنے کی زحمت دی۔“

”جی نہیں، یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ آپ ایک باذوق آدمی ہیں۔ آپ سے مل کر ہمیں بڑی خوشی ہوئی کہ ہمارے گاؤں دیہات میں بھی ادب اور آرٹ کے دلدادہ لوگ بستے ہیں۔“

”عزت افزائی کا بے حد شکر ہے۔“

”آپ کو قلم ہو گا کہ ہمارے پاکستان میں اردو اور پنجابی میں قلمیں بنتی ہیں۔“

”جی ہاں معلوم ہے۔“

”آپ سندھ میں رہتے ہیں۔ سندھی ہیں۔ آپ چاہیں تو سندھی قلم بنا کر اپنے آرٹ اور کچر کو فروغ دے سکتے ہیں۔“

”کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے؟“

”کیوں نہیں ہو سکتا۔“

”مگر..... میں تو.....“

”ظاہر ہے آپ کو قلم اور قلم سازی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔“ شیخ صاحب نے کہا۔ ”اگر آپ کمر بستہ ہوں تو ہم آپ کی مدد کر سکتے ہیں۔ بس آپ کا بنیادی کام قلم

کے لیے سرمایہ کاری ہو گا۔“

”ہاں ہاں یہ کام تو میں بخوبی کر سکتا ہوں۔ میرے پاس پیسوں کی کوئی کمی نہیں۔ بتائیے سرمائے سے قلم بن جانے کی؟“

اس طرح سندھی زمیندار سید حسن علی فاضلانی قلم بنانے پر بخوش رضامند ہو گئے۔

وہ جو کہتے ہیں کہ سز و صلیہ ظفر ہوتا ہے تو شیخ حسن کے لیے اندرون سندھ کا یہ سفر حقیقتاً و صلیہ ظفر ہوا۔ انہیں ایک قلم پر دو پیسہ مل گیا اور انہوں نے جو سندھی قلم بنانے کی منصوبہ بندی کی تھی اس پر عمل درآمد شروع کر دیا۔ انہوں نے سندھی کی مشہور لوک داستان ”عمر ماروی“ پر قلم سازی کی تیاریاں شروع کر دیں۔

اس سندھی لوک داستان کو قلم کے اسکرپٹ کی شکل دینے کے لیے ایک صاحب کو ڈھونڈ نکالا جو مسز بہوت کے نام سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ (قاضی عبدالرحیم) اس نوجوان نے نہ صرف شیخ حسن کی رہنمائی پر اس لوک داستان کو قلم کے اسکرپٹ کا روپ دیا بلکہ اس کا اسکرین پلے بھی تحریر کیا۔ موسیقی غلام نبی عبداللطیف سے ترتیب دلوائی۔ گانے لاشاری نے لکھے۔ فاضلانی نے جو اس قلم کے پروڈیوسر تھے، شیخ صاحب نے انہیں ہیرو کے روپ میں پیش کر کے انہیں اداکاری کا شوق پورا کرنے کا موقع دیا۔ محبت سلطانہ نے ان کی ہیروئن کا کردار ادا کیا۔ چارلی اور شیخ حسن نے بھی اہم کردار ادا کیے۔

فاضلانی ظفر کے بیڑے بننے والی یہ قلم 1956ء میں ریلیز ہوئی اور پہلی سندھی قلم ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ لوک کہانی چاہے جس زبان کی ہو، جب اس پر قلم بنتی ہے تو بہت پسند کی جاتی ہے۔ عمر ماروی کو بھی زبردست عوامی پذیرائی حاصل ہوئی۔ سندھ میں ہی اس نے پسندیدگی کی سند حاصل نہیں کی۔ بھارت میں بھی سلور جوبلی منائی۔ واضح رہے کہ بمبئی اور اس کے گرد و نواح میں بہت سے سندھی آباد ہیں۔

یہاں پاکستان میں بھی عمر ماروی کو صد ارتی ایوارڈز سے نوازا گیا۔ اسے دو صد ارتی ایوارڈز ملے ایک اس کے شعبہ آرٹ پر اقبال صاحب کو دوسرا سبیل ہاشمی کو اس کی فوٹو گرافی پر۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اقبال شہزاد اور سبیل ہاشمی کو اسی قلم کے ذریعے شیخ حسن نے پہلی بار کام کرنے کا موقع دیا تھا۔

شیخ حسن کی نجی زندگی

شیخ حسن کی ہدایت میں بننے والی قلمیں دو باتیں مال کے وقت سے عام طور پر ریلیز ہوئیں۔ جس سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ جب وہ فعال تھے کام کر رہے تھے۔ اس وقت بھی ان کی معاشی حالت زیادہ مستحکم نہیں تھی۔ لہذا قلم انٹرنی سے کنارہ کشی کے بعد آزمائشی دور شروع ہونا لازمی تھا۔ چونکہ وہ ایک اچھے اور پائیدار انسان تھے اس لیے روایتی قلم والوں کی طرح انویسٹرز یا قلم سازی کی تلاش میں انہوں نے بھی کوئی نامناسب راستہ اختیار نہیں کیا اس لیے ان کی فلموں کی تعداد بہت کم ہے۔ انہوں نے اپنے 60 سالہ قلمی کیریئر میں خوش حالی کا دور بہت کم دیکھا۔ ان کی اولادوں نے ان کی زندگی میں یا ان کے بعد اسی لیے قلمی زندگی اختیار نہیں کی کہ وہ باپ کی طرح زندگی بسر کرنا نہیں چاہتے تھے۔

عمر ماروی کی زبردست کامیابی کے بعد شیخ صاحب نے ایک اور سندھی قلم بنائی۔ اس بار کسی لوک کہانی کو کھلانے کی بجائے ایک سوشل بیجکٹ پر قلم بنانے کی منصوبہ بندی کی۔ شیخ صاحب کا یہ اقدام قابل غور و فکر بھی ہے اور قابل تہلیل بھی۔ عام طور پر ہوتا ہے کہ اگر کوئی قلم کا مایاب ہوگئی تو پھر اسی قسم کی دوسری اور تیسری قلم بھی بنائی جاتی ہے۔ کامیاب قلم مگر خود بھی اسی نوعیت کی اگلی قلم بناتا ہے اور دوسرے قلم ساز و ہدایت کار بھی اسی جیسی قلم بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر شیخ حسن کی سوچ اور ذہن کی تعریف کرنا پڑتی ہے کہ انہوں نے اپنی کامیاب قلم عمر ماروی کے بعد کسی دوسری لوک داستان پر قلم بنانا مناسب نہ سمجھا۔

انہوں نے اندرون سندھ جو کئی ماہ گزارے تھے اور وہاں کے حالات و واقعات سے جو واقفیت حاصل کی تھی۔ اس کے تاثر میں ایک معاشرتی قلم بنانے کا پروگرام بنایا۔ یہ ہاریوں (کسانوں) کے مسائل پر بننے والی سوشل قلم تھی جو ”پرائی زین“ کے نام پر انہوں نے بنائی۔ اس کی کہانی انہوں نے دہلی پریم ٹری سے لکھوائی جسے مسز بہوت نے سندھی زبان میں شکل کروایا۔ وہی مسز بہوت تھیں۔ انہوں نے عمر ماروی کا اسکرپٹ اور اسکرین پلے لکھا تھا۔ قلم کار پوریشن کراچی کے بیڑے بننے والی اس قلم

اے جی مرزا، ہدایت کا شیخ حسن موسیقار غلام نبی عبداللطیف تھے جب کہ اس کی کاسٹ میں سوزی و ڈیل، سلطان، شیخ حسن اور جباری نے کلیدی کردار ادا کیے تھے۔ سلطان نای نوجوان کو شیخ صاحب نے بطور ہیرو متعارف کرایا تھا۔ یہ فلم 1958ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اسے بجیکٹ اور قصہ کے پیش نظر اسے پذیرائی کی کمی مگر عمر ماروی کی طرح باکس آفس پر کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ عمر ماروی کے بعد پرائی زمین جیسی سندھی فلمیں بنانے پر شیخ حسن کو بابائے سندھی فلم کے خطاب سے نوازا گیا۔

شیخ حسن ایک وسیع الشہر شخصیت کے مالک تھے اس لیے عام فلم میکرز سے قدرے مختلف تھے۔ محض کاروباری مفاد کے پیش نظر فلمیں نہیں بناتے تھے جب جہاں اور جس وقت جس نوعیت کی فلم کی ضرورت محسوس کرتے تھے اور پینل فلم بناتے تھے۔ انہوں نے کبھی کسی کی تقلید نہیں کی نہ ہی کبھی کوئی چرچہ فلم بنائی۔ اردو فلم سے انہوں نے فلم میننگ کا آغاز کیا تھا مگر سندھی فلمیں بھی بنائیں اور کامیابی حاصل کی مگر سندھی فلموں ہی کے نہیں ہو رہے اردو فلمیں بھی بناتے رہے۔

دو کامیاب سندھی فلموں عمر ماروی اور پرائی زمین کے بعد انہوں نے ایک اردو فلم ”لاکھوں فسانے“ قومی زبان میں بنائی اس کی کہانی نامور ادیب ابراہیم علیہ سے لکھوائی۔ نشاط پروڈکشنز کے بیئر تے بننے والی اس فلم کی کاسٹ میں درپن، سوزی، احمد رشدی اور بھلا کمار کی نے اہم کردار ادا کیے تھے۔ بھلا کمار کی بھارتی اداکارہ تھیں جنہیں اس فلم میں بطور ہیروئن پیش کیا گیا تھا۔ جب کہ گلوکار احمد رشدی نے درپن کے مقابل ایک منفی کردار ادا کیا تھا۔ ”لاکھوں فسانے“ کی موسیقی دیو بھٹا چار نے ترتیب دی تھی۔ اس فلم کے کی گیت مشہور ہوئے تھے۔ اس فلم میں بھارتی گلوکار سی ایچ آتما نے بھی اپنی آواز کا جادو جگایا تھا۔ یہ فلم 1961ء میں نمائش پذیر ہوئی مگر باکس آفس پر درمیانہ درجے کی ثابت ہوئی۔

سندھی فلمیں چونکہ سندھ کے محدود سرکٹ ہی میں پرنس کرتی تھیں جب کہ اردو فلمیں پورے پاکستان میں دیہی اور دکھائی جاتی تھیں۔ اس لیے فاضلانی صاحب کے اصرار پر شیخ حسن نے اسے اردو ورژن میں بھی پیش کیا۔ یہ فلم بھی فاضلانی فلمز کے بیئر پر بنائی گئی اور اس میں چند ایک تبدیلیوں کے بعد کاسٹ اور کریڈٹ میں سندھی فلم کے ہی

لوگ شامل رہے۔ عجب سلطانہ، فاضلانی اور ناصرہ نے کلیدی کردار نبھائے۔ موسیقی غلام نبی عبداللطیف ہی کی رہی۔ اگرچہ اسے پورے پاکستان میں نمائش کا موقع ملا مگر سندھی عمر ماروی کی طرح مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جس زبان کی لوک داستان ہوتی ہے۔ اسی زبان کے تماشا کی اس میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ عمر ماروی کا اردو ورژن 1963ء میں ریلیز ہوا تھا۔

شیخ حسن جوئی سوج اور نی جبت پر کار بند فنکار تھے۔ انہوں نے بلوچوں پر ایک فلم بنانے کی منصوبہ بندی کی مگر بلوچی زبان میں فلم بنانے پر بڑی دشواری تھی اس لیے اسے اردو زبان ہی میں بنایا۔ یہ فلم بلوچوں کے ایک ہیرو قادر بخش بلوچ عرف کا دو کمرانی کی زندگی پر مبنی۔ اس فلم کی تکمیل کے لیے شیخ صاحب کو کسی بلوچ پارٹی کی ضرورت ہوئی جو تھوڑی جتنو کے بعد انہیں مل گئی۔ یہ بہار علی بلوچ تھے۔ بہار علی بلوچ کا حبیب بچہز کے نام سے اپنا ایک قصہ کا ادارہ تھا۔ اس ادارے سے وہ کئی فلمیں ریلیز کر چکے تھے۔

شیخ حسن نے ان سے ملاقات کی۔ وہ شیخ حسن کو ایک کامیاب اداکار اور ہدایت کاری حیثیت سے جاننے اور پہچانتے تھے۔ بہار علی بلوچ نے انہیں اپنے دفتر آنے پر ان کا پر تپاک خیر مقدم کیا اور کہا۔

”زے عیب کہ آپ نے مجھے اور میرے دفتر کو یہ عزت افزائی بخشی۔ اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بلا جھج ارشاد فرمائیے۔“

”بھائی! بہار علی بلوچ صاحب بات یہ ہے کہ میں نے ایک بلوچی ہیرو قادر بخش بلوچ عرف کا دو کمرانی پر فلم بنانے کا ارادہ کیا ہے۔“

”اوہو! یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ آپ جیسا بڑا اور روشن خیال فلم میکر ہی ایسی منفرد فلم بنا سکتا ہے۔ بتائیے اس قصہ میں میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟ کس طرح آپ کے کام آسکتا ہوں؟“

”میں اسی مقصد سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں کہ“

قد رگو ہر شاہ داند پادانہ جو ہری بلوچی ہیرو پر فلم بنانے کی اہمیت کو کوئی بلوچ ہی سمجھ سکتا ہے۔“

بجا فرمایا آپ نے۔ مجھے یہ جان کر بے حد مسرت

ہوئی کہ آپ نے ایک بلوچ ہیرو کو اپنی قلم کے ذریعے حیات دوام بخشنے کا پروگرام بنایا ہے۔ میں ہر طرح سے آپ کے اس مٹن کو کامیاب کرنے پر آپ کا ساتھ دے سکتا ہوں۔“

”میری خواہش ہے کہ آپ اس فلم کو پروڈیوس کریں۔ اس کے لیے سرمایہ کاری کریں۔“

”یہ میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں شیخ صاحب!“

اس طرح بلوچ ہیرو پر فلم بنانے کے منصوبے پر عملدرآمد کا مرحلہ آیا۔ شیخ صاحب نے اس فلم کی کہانی کے لیے محمد حسن کا انتخاب کیا۔ انہیں قادر بخش بلوچ عرف کا دو کمرانی کے کارناموں کے تناظر میں کہانی لکھنے کو کہا۔ جب وہ کہانی لکھ چکے تو اس کے مکالمے اور گیت دیکھ کر پریم نگر سے لکھوائے۔ اور ”جاگ اٹھا انسان“ کے نام سے یہ فلم سینٹ کی زینت بنی اور بڑے زور و شور سے شوٹنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کہانی کی ضرورت کی مناسبت سے بہترین فنکاروں کا انتخاب کیا گیا۔ محمد علی کو کا دو کمرانی کے کردار میں پیش کیا گیا جس نے اس کردار کو اپنی لافانی کردار نگاری سے امر کر دیا۔ زیبا، وحید مراد، سیما، ابراہیم نصیس، جاوید شیخ، کامران، مقصود اور بدر منیر نے دیگر کردار ادا کیے اس کی موسیقی لال محمد اقبال سے کیونکر دوائی۔

اس فلم کی کہانی اداکار اور ہدایت کاری نے جہاں زبردست عوامی مقبولیت حاصل کی وہاں اس کے گیتوں نے بھی دھوم مچادی۔ ان گیتوں کے رنگ اور لکھ لکھائیے۔

☆ او گوری ذرا پھر سے بجا یا سریا۔ (آوازیں: نیسر شاہین، افرامیم اور ساتھی، بول دیکھ پریم نگر)

☆ جب سادون گھر گھر آئے کو لیا گائے۔ (آواز: مالا اور ساتھی، بول دیکھ پریم نگر)

☆ جمنوں میں جی بنی جگر باجھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں۔ (آواز: نور جہاں، بول: داغ دہلوی)

☆ دنیا کی کے پیار میں جنت سے کم نہیں۔ (آواز: مہدی حسن، بول: دیکھ پریم نگر)

☆ جی بجائے کوئی دنیا کے پار۔ (آواز: مالا، بول: دیکھ پریم نگر)

☆ دل میں بسایا پیار سے۔ ہم نے تم کو اپنا جان کے۔ (آوازیں: مالا، مسعود رانا، بول: دیکھ پریم نگر)

☆ چھپا کھونٹھ میں کھڑا گلاب سا۔ (آوازیں: عشرت جہاں، خورشید بیگم، کورس بول: دیکھ پریم نگر)

☆ میری مگر کی کا پانی چھلک چھلک کیوں جائے۔

(آوازیں: آرن پر دین و ساتھی، بول: دیکھ پریم نگر)

اس فلم کی موسیقی اور گانوں کی مقبولیت سے موسیقار لال محمد اقبال کی حیثیت فلم انڈسٹری میں بہت مضبوط ہوئی۔ مقصود حسین کو اس فلم کی تدریس پر بہترین تدریس کار کا نگار ایوارڈ ملا۔ جان محمد کو جو کیرئیر میں کے اسٹنٹ ہوا کرتے تھے۔ شیخ حسن نے اس فلم میں چیف کیرئیر مقرر کر دیا۔ یہ فلم جو حبیب بچہز کے بیئر تے بنائی گئی تھی۔ 1966ء میں ریلیز ہوئی اور اس نے بہار علی بلوچ کو مالا مال کر دیا۔ جہاں انہوں نے بلوچ ہیرو کو عوام الناس میں زبردست مقبول کرایا، وہاں شیخ حسن کی معاونت کرنے پر بھی خاصی مالی منفعت حاصل کی۔

”جاگ اٹھا انسان“ کی ہلاک بسوڑ کامیابی کے بعد شیخ حسن نے ایک سندھی فلم بنانے کی منصوبہ بندی کی اور اس کی سرمایہ کاری کے لیے بہار علی بلوچ کو ہی دعوت دی۔ بہار علی بلوچ جو بلوچی ہیرو کا دو کمرانی پر فلم پروڈیوس کر کے مالا مال ہو چکے تھے۔ سندھی فلم پر بھی سرمایہ کاری پر فوراً رضا مند ہو گئے۔ یہ سندھی فلم شاہرو فیروز کی لحاظ سے بہت اہم ثابت ہوئی۔ حبیب بچہز کے بیئر تے بننے والی یہ فلم سندھی فلموں کی آئینہ اور بہترین دکان کی پہلی فلم تھی۔ انہوں نے بعد میں فلم انڈسٹری میں بہت نام ایسا بہت ثبات حاصل کی۔ بطور فنکار بھی اور بطور ہنرمند بھی ان میں اس فلم کے ہیرو ہیروئن مشتاق چنگیزی اور ماہ پارہ سرفہر ت ہیں۔ مشتاق چنگیزی کو سندھی فلموں کا دلپ کمار کے لقب سے بھی نوازا گیا۔

شیخ حسن نے سنے چہروں کو پیش کرنے کی روایت کا اس فلم کے ذریعے مکمل کر مظاہر کیا۔ میوزک ڈائریکٹر غلام علی کو بھی اس فلم کے ذریعے متعارف کرایا تھا۔ اس فلم کی کاسٹ میں مشتاق چنگیزی، ماہ پارہ، ملک انوکھا، محمود لاسی، کلیل لاسی، نور بانو، مسدھ، یاسین، احمد علی، سید سلمان شاہ، نسیم، ایس مغل، منیر علی اور شیخ حسن نے کلیدی کردار ادا کیے تھے۔ شیخ حسن نے فلم کے ہیرو کے باپ کا کردار ادا کیا تھا۔ شاہرو فیروز کے عکاس مد علی مدن تھے۔ واضح رہے کہ یہ مشہور اداکارہ سوزی علی کے والد محترم ہیں۔ سوزی علی نے متعدد بھارتی فلموں میں اداکاری کی ہے۔

محمود لاسی اور کلیل لاسی نے بطور اسٹنٹ ڈائریکٹر کے بھی اس فلم میں کام کیا۔ اس فلم میں سنے چہروں کے طور پر پیش ہونے والوں میں زابد شاہ، مسدھ کے علاوہ فائز تہ

جوش ملیح آبادی

ولادت: 5 دسمبر 1894، ملخ آبادی (برٹش انڈیا)

وفات: 22 فروری 1982 (اسلام آباد، پاکستان)

عمر: 83 سال

قصہ: "جوش"

قومیت: پاکستانی

پیشہ: شاعر

ایوارڈ: پدم بھوشن ایوارڈ (1954ء)

تصانیف: جوش صاحب کی شاعری کا پہلا مجموعہ ”روح ادب“ 1903ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ نقش و نگار، شعلہ و شبنم، فکر و نشاط، حرف و حکایت، جنون و حکمت، سیف و سبیل و سلاسل، ابہام و انکار، عرش و فرش، آیات و لغات، آوازِ حق، جوش کے موشعروں، پیغمبر اسلام، طلوع فکر، حسین اور انقلاب، موجود و مگر، نواہر جوش، جوش کے سر مے، نجوم و جواہر، مغانیات جوش، سرورِ بخروش، مردس ادب حصہ اول و دوم، مخراب و مغراب، دیوان جوش، قطرہ قلم، موسم و سیاہ یادوں کی برات (خودنوشت سوانح

اور ہجر سے کارفناکوں اور ہنرمندوں سے کام لیتے ہیں۔ وہ اسے لیے تو آسان راستہ اختیار کر لیتے ہیں مگر قلم انڈسٹری کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتے۔ جب کہ شیخ حسن ان فلم سیکرز میں شامل تھے جنہوں نے ہمیشہ نئے چہرے پیش کر کے فلمی صنعت کو روشن، ذہین اور متین آرٹسٹ اور تکنیک کار دیئے۔ شیخ حسن کا یہ کارنامہ بھی ان کے دیگر کارناموں کی طرح پاکستانی فلمی تاریخ میں لکھا جائے گا۔

شیخ حسن سندھی نہیں تھے مگر انہیں سندھ اور اس کے کلچر و ثقافت سے بڑا پیار تھا۔ بنیادی طور پر وہ ایک اردو اسپیکنگ تھے۔ اردو ادب اور ثقافت سے گہرا لگاؤ تھا مگر اپنی پسند پر ہمیشہ وقت اور ضرورت کو ترجیح دیتے تھے۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ سرسزمین ہے آپ والہ! ہوں اس سے اپنی چاہت کا رشتہ استوار رکھیں۔ بہت سے ادیب و شاعر اور فلم والے ہندوستان سے ہجرت کرنے کے باوجود دہلی اور کنوئو کی ثقافت کے رنگ میں رنگے رہے۔ جو حقیقت ایک فلاح رحمان ہے۔ شیخ حسن اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے اس لیے اپنی مٹی اور اس کی شناخت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جہاں انہوں نے کامیاب اردو فلمیں بنائیں وہیں علاقائی زبانوں پر بھی قابل ذکر فلمیں بنا کر ایک بڑے اور روشن خیال فلم سیکر کی حیثیت سے اپنی شناخت بنائی۔

شاہرو فیروز کے بعد انہوں نے ایک اور سندھی قلم
"نوری حام تماچی" بتائی۔ یہ قلم اکب حمی اور حقیقی عشق

انصاری بھی شامل ہیں۔ جن میں شکیل لاسی، مصدق اور زاہد شاہ نے آنے والے دنوں میں بطور ہدایت کار بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ اداکارہ ماہ پارہ نے بھی شاپرو فیروز کے بعد کئی فلموں میں کامیاب اداکاری کر کے عوامی مقبولیت حاصل کی۔ بعد ازاں نامور ہدایت کار اقبال یوسف سے شادی کر کے گھر گھر ہستی کی ہور ہیں۔

شاہد و فیروز 2 اگست 1968ء میں ریلیز ہوئی اور اس نے سطور جوبلی کا اعزاز حاصل کیا۔ سندھ بھر کے تمام بڑے شہروں میں اس کی کامیاب نمائش ہوئی اور جہاں یہ فلم کامیابی سے ہمکنار ہوئی وہاں اس کے آئرشوں اور ہنر مندوں کو بھرپور عوامی پرائیویسی حاصل ہوئی۔

اس فلم کے بہرہ و مشاق چنگیزی نے جن کی یہ پہلی فلم تھی اس فلم سے شہرت حاصل کر کے سندھی فلموں کے دیپ کمار کہلائے جب کہ انہوں نے اپنے عروج کے دور میں کئی سندھی فلمیں ڈائریکٹ بھی کیں۔

رشید احمد لاشاری نے اس قلم کی کہانی لکھ کر سندھی قلموں کے مصنفوں میں اپنی حیثیت منوائی اور ایک کامیاب اور مستند کہانی نویس اور نغمہ نگار کی حیثیت سے ایک ممتاز مقام حاصل کیا۔

اس فلم کی موسیقی غلام علی نے ترتیب دی تھی۔ ان کی بھی یہ پہلی فلم تھی۔ اس کے کئی گیتوں نے مقبولیت حاصل کی تھی۔

جو ہدایت کا محض اپنی سہولت کے لیے مجھے ہوئے

میری (شامل ہیں۔

شیر حسین خان (جوش ملیح آبادی (برٹش انڈیا) میں پیدا ہوئے، آپ نے ST پینز کالج آگرہ سے تعلیم حاصل کی اور سینئر کمپنر کا امتحان 1914ء میں پاس کیا۔ آپ نے 1918ء میں عربی و فارسی کی اضافی تعلیم بھی حاصل کی اور اس کے بعد 6 مئی، 1924ء میں یونیورسٹی میں گزارے۔ 1924ء میں جوش اسلامیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ میں ملازم ہو گئے۔

شاعری ریاست حیدر آباد میں آپ کا قیام اس وقت اختتام پذیر ہوا جب آپ (نظام آف حیدر آباد) کے خلاف قلم کھینے سے نود کو باز نہ رکھ پائے۔ آپ کچھ مہرے دھلی سے اپنا ایک ادبی رسالہ ”تکلیف“ شائع کرتے رہے جس میں برطانوی راج سے آزادی کے حصول کے حوالے سے آرٹیکل لکھتے رہے جس کی وجہ سے رفتہ رفتہ عوامی سطحوں میں آپ کی مقبولیت بڑھنے لگی اور آپ ”شاعر انقلاب“ کہلانے لگے۔ رفتہ رفتہ جوش آزادی کی جدوجہد میں متحرک ہوتے ہوئے اس دور کے کچھ دیگر اہم سیاسی لیڈروں سے قریب تر ہوتے گئے۔ جن میں اہم ترین نام ”جواہر لال نہرو“ کا ہے جو انڈیا کے پہلے وزیر اعظم تھے اس کے بعد ہندوستانی سالے ”آج کل“ کی ادارت بھی فرمائی۔ 1956ء میں جوش ہجرت فرما کر پاکستان آئے اور کراچی میں رہائش پذیر ہوئے۔ کراچی میں جوش نے مولوی عبدالحق کے ساتھ مل کر ”انجمن ترقی اردو“ کے لیے کام کرنا شروع کیا۔ فیض احمد فیض اور خورشید بن Bailey دونوں آپ کے اور آپ کے صاحبزادے سجاد حیدر خورشید کے قریبی حریف اور دوست تھے۔

شاعر انقلاب جوش آبدی کو شاعری ورثے میں ملی ان کے والد شبیر احمد خان اور دادا دونوں صاحب دہان شاعر تھے۔

مپوزیشن پر اس فلم کے متعدد کیت قبول ہوئے تھے اور اس دور کے علاوہ آج بھی شوقی سے سنے جاتے ہیں۔ اس فلم میں یہ تجربہ بھی کیا گیا کہ کسی ایک شاعر سے سارے کیت لکھوانے کی بجائے مختلف شعراء سے نغمہ نگاری کروائی گئی۔ کیت ملاحظہ کیجئے۔

☆ چاند کی سچ پہ تاروں کا سجا کر سہرا۔ (آواز: رونا لیلیٰ وساتھی، بول: صہبا اختر)

☆ ہوا آج کل اڑاتی ہے اڑانے دو۔ گلے ہم کو لگاتی ہے لگانے دو۔ (آواز: رونالسی۔ بول: حمایت علی شاعر)

☆ ساقی ہے نام میرا۔ پیاسے رک جا۔ (آواز: رونا
لعلی۔ بول: صہبا اختر)

☆ چمن میں گلوں کو نہ ہنس ہنس کے دیکھو۔ (آواز: مہدی حسن۔ بول: دکھی پریم نگری)

☆ یہ دل اپنا نہ وہ اپنے۔ (آواز: رونا لیلیٰ۔ بول: صبا اختر)

کئی علاقائی زبانوں کے بعد شیخ حسن کی یہ اردو قلم بھی کامیابی سے ہسکتا ہوگی۔ اس کی کھل کا سٹ یہ ہے۔
ترنم، محمود خان مودودی، ترانہ، نرالا، حنف اور کمال ابراہانی۔

اس فلم کی پردہ پوشی کا کارہ تر تم اس فلم کی کامیابی پر بہت شاد اور آبلہ تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ شیخ حسن کی ڈائریکشن میں فلم بننے اور کامیاب نہ ہو؟ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ میں نے ان کا انتخاب ہی نہیں کیا تھا۔

”جھک گیا آسمان“ کی کامیاب نمائش کے بعد بہار

داستان پرچی فلمی۔ اس فلم میں شیخ صاحب نے بابا بیسہ شاہ کا کلام بھی شامل کیا تھا۔ معروف سندھی ادیب امرتیل سے اس فلم کے مکالمے تحریر کروائے گئے تھے۔ مشتاق پنجیزی اور معرفت جہاں نے اس فلم میں ٹائٹل رول ادا کیے تھے۔ اس فلم کے فلم ساز بھی بہار علی بلوچ تھے۔ ”فلم رو مانوی، اصلاحی اور معیاری فلم کی حیثیت سے پسند کی جاتی تھی۔“ ”نوری جام ناٹھی“ 1970ء میں فائنل پنڈر ہوئی تھی اور حبیب بکچر کی ”کایاب“ فلم ثابت ہوئی تھی۔

وہ بھی بڑا عجب دور تھا۔ قلم والے بھی پیار محبت بھاننے والے لوگ ہوتے تھے۔ بہار علی بلوچ بلوچ خزاں ہونے کے باوجود شیخ حسن سے ٹوٹ کر پیار کرتے تھے جو سچی نہیں تھے۔ ”جاگ اٹھا انسان“ کے بعد انہوں نے شیخ حسن کی دوسری فلموں کی بھی سرمایہ کاری کی جو سندھ قلمی نہیں۔ ان کا جیب کچر ہمیشہ شیخ حسن کی خدمت کے لیے پار ہوتا تھا۔

1970ء کی یہ بات ہے کہ اداکارہ ترنم نے ایک دو فلم ”جنگ گیا آسان“ بنانے کا پروگرام بنایا تو اس کی اہم کاری کے لیے شیخ حسن کی انتخاب کیا۔ یہ فلم بڑے شہرت کی نئی۔ اس کی پروڈیوسر اداکارہ ترنم تھیں۔ شیخ حسن نے اپنی روایت کے مطابق اس فلم میں بھی ایک نیا چہرہ عارف کرایا۔ یہ محمود احمد مودودی تھے شیخ صاحب نے ترنم کے مقابلہ بیرو کے طور پر پیش کیا تھا۔ موسیقی کے لیے وجہ بنا چارہ کا انتخاب کیا گیا تھا۔ جن کی خوب صورت

خود کہتے ہیں۔

شاعری کیوں نہ اس آئے مجھے
بہ امراض خاندانی ہے

گویا شروع ہی سے جوش کے رگ وریشے میں شاعری کے عناصر موجود تھے، یہی وجہ ہے کہ اس میدان میں وہ انتہائی
بلندیوں تک پہنچے۔

حوریں ہزاروں سے قربان ہو گئی ہیں
رہ گئیاں سب کر انسان ہو گئی ہیں

جوش نے شاعری کی ابتدا غزل سے کی لیکن غزل میں ان کی دھواں و حار شخصیت سانس نہ لے سکی اس کے لیے بہت جلد اسے ترک
کر کے آپ نے نظم کو اختیار کیا جس میں ان کی شخصیت کے پہلو، ان کے حراج کی تندہی و تیزی، ان کے لب و لہجے کی تمازت، ان
کے حریت پسند خیالات اور ان کی انقلاب پسند طبیعت سب سما گئی۔ آپ نے ایک طویل عرصہ اس صنف سخن کو اپنا پناہ رکھا اور بلاشبہ
اس میں کوئی شک نہیں کہ اس صنف میں ان کا مقام و مرتبہ بہت بلند ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس صدی میں دور دور تک کوئی ان کا
تقریباً مقابل نظر نہیں آتا۔

جوش کی نمایاں ترین خوبی قدرت زبان و بیان ہے، ان کا ذخیرہ الفاظ بہت وسیع ہے۔ جوش اردو کے ان چند شعراء میں سے

علی بلوچ نے بھی ایک اردو قلم بنانے کا پروگرام بنایا اور ظاہر
ہے کہ اس کی ہدایت کاری کے لیے شیخ حسن کو ہی لیا۔ جن
سے ان کا پیار محبت اور عقیدت کا رشتہ استوار تھا۔ یہ قلم بھی
”گاما جائے بخارہ“۔

شیخ حسن نے اس قلم میں آغا سجاد کو بطور ہیرو پیش کیا
تھاجب کہ دیگر کاسٹ میں زمر، فرخندہ اور ریحیلانے اہم
کردار ادا کیے تھے۔

لال محمد اقبال اس قلم کے موسیقار تھے۔ ان کی مسموع
کن دھنوں میں اس قلم کے کئی گیت مقبول ہوئے تھے۔
مہربانیا جو چمکی تو ہائے میں بھی۔ (گلوکارہ رونا
للی۔ شاعر: دلی پریم نگر)

پشپتا جو کھڑکا تو دل میرا دھڑکا۔ (گلوکار: احمد
رشدی۔ شاعر: صہبا اختر)

مٹاؤں پڑوس چاہے جو بھی کہے۔ (گلوکارہ رونا
للی۔ شاعر: کیف رضوانی)

یہ قلم 1972ء میں سینماؤں کی زینت بنی تھی اور
باکس آفس میں اس نے اوسط درجے کا بزنس کیا تھا۔
اس اردو قلم ”گاما جائے بخارہ“ کے بعد شیخ حسن کو
خیال آیا کہ میں نے پنجابی زبان میں تو کوئی قلم نہیں بنائی۔
پہلی تو ہماری علاقائی زبان ہے۔ بس پھر انہوں نے پنجابی
قلم بنانے کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔ جب ساری تیاری
ہو گئی تو اس کے لیے انہیں لاہور جانا پڑا کیونکہ کراچی میں وہ
کر وہ کوئی پنجابی قلم نہیں بنا سکتے تھے۔

ایک ہیں جنہوں نے شاعری میں سب سے زیادہ الفاظ استعمال کیے ہیں، ان کی زبان وانی مسلم ہے اور ان کی اس خوبی کو تمام
تقدیرین نے سراہا ہے۔ جوش الفاظ کے اثرات اور کیفیات سے بخوبی واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں لفظی تناسب کی صفت
پائی جاتی ہے اور موسیقیت کی ایک لہر شروع سے آخر تک ملتی ہے۔

بلاشبہ جوش الفاظ کے بڑے خازن ہیں اور ان کی اس دولت کے آگے بلاشبہ قارون کے خزانے بھی گرو ہیں۔

الامان والحدرد، میری کڑک، میرا جلال
خون، سفاکی، گرج، طوفان، بربادی، قتال
برجیاں، بھالے، لکنا، تیر، تلواریں کنار
بیر کلیں، پرچم، علم، گھوڑے، پیادے، شہسوار
بانگچی ہو شہریوں کے سر پہ یہ کہہ کر کرن
تم ہو جی، ناک، افغن، صف، فغن، بشیر زن

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جوش کے آگے الفاظ دست بستہ کھڑے رہتے ہیں جن کو وہ موقع محل کی مناسبت سے باندھتے چلا
جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ کا ایک ربط ہے یا وہ انمول خزانہ ان کے قبضہ قدرت میں ہے جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا۔
اقباس: نامہ خان، کراچی

کرتے ہیں۔ جو وقت اور حالات ۱۹۵۵ء اور ۱۹۵۶ء میں
کا نہیں رہتا اس سے ان کا پس منظر لینے ہیں۔ شیخ حسن
اپنے آخری ایام میں بیمار ہو کر بستری تک گئے تو انہیں
کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ وہ طویل عرصے تک بیماری اور
کسبیری کی حالت میں رہے مگر قلم انڈسٹری نے پلٹ کر
ان کی خبر نہ لی۔ انہیں اس بات کا بوا دکھ تھا کہ جس قلم
انڈسٹری کو انہوں نے اتنا کچھ دیا اس نے ان کے برے
وقت میں ان کا ساتھ نہیں دیا۔ حکومت نے ان کی کسبیری
کے دور میں اگرچہ ان کے لیے کچھ سرکاری وظیفہ مقرر
کر دیا تھا مگر اس سے نہ ان کی تنگدستی دور ہو سکتی تھی نہ ان
کا بھرپور علاج ہو سکتا تھا۔ بہت سے قلم والے جنہیں اس
فصل نے فرش سے اٹھا کر عرش پر پہنچا دیا تھا۔ انہوں نے
یہ جاننے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی کہ ان کا حسن کس حال
میں ہے۔ ترقی یافتہ قومیں اپنے ہیرو کو کبھی اس حال کو پہنچنے
نہیں دیتیں۔ انہیں اپنا قیمتی اثاثہ سمجھ کر ہمیشہ شاد اور آباد
رکھتے ہیں مگر افسوس صد افسوس کہ ہمارے ہاں ایسا کوئی
ردا نہیں۔ کوئی ریت نہیں۔ شیخ حسن جیسا تاہذ روزگار
فنکار اپنی کسبیری کے دن کراچی کے پس ماندہ علاقے
کورنگی کے ایک مکان میں گزارتا رہا اور وہیں ایک طویل
علاقت کے بعد اپنے بے مروت دوستوں اور ساتھیوں کی
بے رحمی کا دھک لے کر اس جہان فانی سے کوچ کر گیا۔ 25
جولائی 1992ء کو جب اس مہمان کے موتی کو پہنچا
خاک کیا جا رہا تھا تو وہاں اس کے کچھ عزیزوں اور نہ

اس قلم کا یہ گیت جسے ملکہ ترنم نور جہاں نے گایا تھا
بہت مشہور ہوا تھا۔

”سو نہ لگتا اس پیارا لگتا اس“

آسہ اس قلم کی ہیروئن تھیں جنہوں نے سلطان راہی
کے مقابل پنجابی فلموں کی ہیروئن کی نمائندگی کی تھی۔
پنجابی فلموں کا تجربہ نہ ہونے کے باوجود یہ قلم ناکام
ثابت نہیں ہوئی تھی جس کی ایک وجہ سلطان راہی تھے۔ ان
دنوں کسی بھی قلم میں سلطان راہی کی شمولیت کامیابی کی
ضمانت تھی اس کے بے شمار چاہنے والے صرف اس کا نام
دیکھ کر قلم دیکھتے تھے۔

تذکرہ پنجابی فلم ”نرک ڈرائیور“ کے بعد شیخ حسن
نے پھر ایک سندھی فلم ”مہراں جاموتی“ بنائی۔ اس سندھی
فلم کے قلم ساز شوکت زمان خان تھے۔ اس کی موسیقی غلام
علی نے ترتیب دی تھی۔ اس کی کاسٹ میں شیراز، رینا،
زاہد نور، محمود لاسی، بار بلوچ، ملک انوکھا اور نور محمد لاشاری
شامل تھے۔

مہراں جاموتی، بابائے سندھی قلم شیخ حسن کی
ڈائریکشن میں بننے والی آخری فلم تھی۔ یہ 1988ء میں
سندھ بھر میں نمائش پذیر ہوئی۔

یہ دنیا بڑی بے درد ہے اور فلم ہماری اور اس سے
وابستہ افراد تو بے مروتی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ یہ
چڑھتے سورج کے پجاری ہوتے ہیں جو انہیں کما کر دیتا
ہے اس کے کن گاتے ہیں، اس کے لیے تن من بچھاؤ

رب کا بڑا کریم ہے کہ آج میں اور آپ گزرے دنوں سے کہیں بہتر زندگی گزار رہے ہیں۔ میں اور میرے اکثر دوست وہی ہیں جو بھی کراچی کی بسوں میں لنگ کر کالج جایا کرتے تھے۔ ایک چائے یا کوا کولا پینے کے لیے ایک دوسرے کی جیبوں کی طرف دیکھتے تھے۔ جب ٹیلی فون کمرہ کیا، محلے میں بھی بمشکل ہوتا تھا۔ مگر آج الحمد للہ ہم میں سے تقریباً ہر ایک کے پاس الٹی کار ہے، ایسے ریسیوٹ اور ہوٹوں میں کھانے بھی کھاتے ہیں۔ ہر کسی کے پاس کم از کم

ایک موبائل فون تو ضرور ہے، کئی دوست تو دودو، تین تین فون لیے بھرتے ہیں۔ ہم میں سے اکثر دنیائوں گھومتے ہیں جیسے شہر کے ایک محلے سے دوسرے محلے میں آ جا رہے ہوں۔ لیکن نجانے کیا بات ہے کہ جب بھی آپس میں ملتے ہیں تو یاد انہی دنوں کو کرتے ہیں۔

اس وقت ریڈیو اور ٹیلی ویژن مواصلات کا اہم ذریعہ تھے اور یہ کراچی ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی خوش بختی تھی کہ اسے ابتدائی سے ذوالفقار علی بخاری جیسا ماہر براڈ کاسٹر اور مستقیم میسر آیا۔ بخاری صاحب اور ان کے رفقاء نے نشریات، ابلاغ اور صدا کاری کے ایسے اعلیٰ معنی قائم کیے کہ کسی معمولی صلاحیت والے کا ان اداروں میں گزرا ممکن تھا۔ یہی معیار خبروں کے شعبے کا تھا جہاں اردو خبریں پڑنے والوں میں اساطیری حیثیت رکھنے والے فکیل احمد، انور بہزاد، فہیم اعجاز اور وراحت مرزا جیسے بھاری بھر کم نام موجود تھے اور یہی حال فی وی کا تھا جہاں طارق عزیز، قربان جیلانی اور وراحت مرزا جیسے خبریں پڑنے والے موجود تھے۔

ایسے قدر آور اور جفاور ناموں کے ہوتے ہوئے ایک دبلے پتلے، سیدھے سادے نوجوان نے پہلے ریڈیو پھر ٹیلی ویژن پر اپنا جلوہ ایسے دکھایا کہ اگلے تیس سال تک وہ ہر گھر کے ڈرائنگ رومز بلکہ بیڈ رومز کا حصہ بنا رہا۔ یہ نوجوان تھا زبیر الدین، جو آج نشریات کے شعبے کا تیس سال مکمل کرنے کے باوجود بھی اٹھارہ بیس سالہ نوجوان ہی نظر آتا ہے اور آواز کا سونا آج بھی اتنا ہی کھرا ہے جیسا 70ء اور 80ء کے عشروں میں ٹیلی ویژن پر دکھائی اور سنائی دیتا تھا۔ وہ نوجوان بیسے فلموں میں کام کرنے کا شوق خجروں کے شعبے تک لے آیا، یہ سب کیسے ہوا، آج اسی کی زبانی سنیتے ہیں۔

بات چیت آج سے ایک سال قبل ہوئی تھی اور زبیر الدین صاحب چاہتے تھے کہ میں اسے اپنے انداز میں لکھوں لیکن سال بھر تک میں زبیر الدین صاحب کے الفاظ سے زیادہ بہتر الفاظ یا ٹیلیٹیکس سوچ کا چٹا نیچر یہ بات چیت حرف بہ حرف دی ہے یہی ہمارے درمیان ہوئی اور اس میں میری جانب سے کئی پسند نہ ٹانگنے کی کوئی گنجائش نہ نکلی سکی۔ زبیر صاحب کے پاس کراچی ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے متعلق یادوں کا انمول خزانہ ہے جو اس مختصر تحریر میں سینٹا ممکن نہیں۔ آئیے ان سے ریڈیو سے لی وی تک کے سفر کی داستان سنیں۔

مجھے اشعار یاد نہیں رہے، لیکن ایک شعر سنا چاہوں

گا۔

سکون دل کی خاطر اتنا تو اہتمام کروں
ذرا نظر ملے تو انہیں سلام کروں
مجھے تو ہوش نہیں آپ ہی مشورہ دیجیے
کہاں سے شروع کروں اور کہاں پہنچاں کروں

یہ بل دہلی کی بات نہیں 47 سال کا قصہ ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ اتنی میری عمر نہیں تھی خبریں میں نے پڑھی ہیں۔ ایک یا دو سال بعد پچاس برس مکمل ہو جائیں گے خبریں پڑھتے ہوئے۔

یہ اٹھارہ سال کی بالی عمر تھی، 68ء میں ریڈیو اور 69ء میں ٹی وی سے خبریں پڑھنا شروع کیں اور تیس سال لگا تار خبریں پڑھیں۔

2000ء میں ٹی وی چھوڑ دیا تھا، امریکا اور کینیڈا آتا جاتا رہا، وہاں کے مقامی ٹی وی پر بھی خبریں پڑھتا رہا۔ شروع کے پانچ چھ سال جب بھی جاتا تھا تو کراچی ٹی وی والے اصرار کرتے کہ ایک بلٹن تو پڑھو۔

نیز ریڈنگ کوئی آسان راستہ نہ تھا۔ فکیل احمد، انور بہزاد، فہیم اعجاز، وراحت مرزا اور انگریزی میں رضوان واسطی، انور حسین جو ڈاکٹر محمود حسین کے صاحبزادے تھے، اینٹا غلام علی جو انگریزی کی استاد بھی تھیں، خدیجہ نقوی اور ایڈورڈ کی ریڈیو جیسوں کی موجودگی، پھر ایک ریڈیو اور ایک ٹی وی ڈی اینٹیشن تھے۔

ہوا کچھ یوں کہ سترہ اٹھارہ سال کی عمر تو ایسی ہی ہوتی ہے، لا اہالی سی۔ پڑھنے دڑھنے کا شوق تو مجھے تھا نہیں۔ میزک کر لیا تھا اور کانچ میں پڑھ رہا تھا۔ ان دنوں فلموں کا بڑا شوق تھا بلکہ ہمارے ایک دوست تو پہلے دن کے پہلے شو کی بجگ کر لیا کرتے تھے۔ ہم بھی وحید مراد وغیرہ کو دیکھتے اور ان جیسا بننا چاہتے تھے۔ ہمیں بھی ہیرو بننے کا شوق ہوا تو کسی نے کہا کہ پار یہ کوئی ایسے ڈائریکٹ ٹیوی ہیرو بن جاتا ہے۔ پہلے کچھ تجربہ حاصل کرو، نام بناؤ۔ ڈرامے وغیرہ میں کام کرو پھر فلمی اداکار کی کا سوچو۔ ہم نے سوچا کہ ریڈیو سے شروع کرتے ہیں کیونکہ ٹی وی اس وقت نایاب آیا تھا۔

خبریں پڑھنے کا خیال تو ذہن میں بھی نہیں تھا۔ ڈرامے کا شوق البتہ تھا۔ ریڈیو میں ڈی اینٹیشن دیا اور الحمد للہ پہلے ہی ڈی اینٹیشن میں کامیاب ہو گیا کیونکہ بنیادی طور پر وہاں آواز کی ضرورت ہوتی ہے اور اللہ کا کرم ہے کہ آواز اس نے بہت اچھی دی ہوئی تھی۔ لوگ بھی یہی کہتے تھے۔ اس کے بعد کوئی

پہ مینے ریڈیو اینٹیشن کے پکڑ لگا تار ہا کہیں کوئی کسی ڈرامے میں آواز لگانے ہی کا موقع مل جائے جہاں وہ میری شکل دیکھیں تو کہیں، میاں اسکول براڈ کاسٹ یا بزم طلبہ میں چلے جاؤ۔ ہم اسکول براڈ کاسٹ میں جاتے رہے لیکن وہاں کوئی لفٹ ہی نہیں کراتا۔ یہ سلسلہ یوں ہی چلا رہا۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ ڈی اینٹیشن میں کامیاب ہو گئے تو اب ڈرامے کے ہیرو بھی بن جائیں گے۔ جبکہ ڈی اینٹیشن ڈرامے کے لیے دیا تھا۔ مجھے کیونکہ ڈراموں کا شوق تھا لیکن یہاں تو کوئی پوچھتا ہی نہیں تھا۔ جان پہچان کے لوگوں سے ملتا رہا۔ ایک صاحب تھے ہمارے جاننے والے وہ نیز سیکشن میں کنٹرولر کے قریبی تھے، انہوں نے کچھ لوگوں سے طویا۔ ہر کوئی کہتا ہاں میاں، کچھ کریں گے تمہارے واسطے۔

در اصل اٹھارہ سال کی عمر پر ایسی تھی کہ لوگ بچہ ہی سمجھتے تھے۔ جو علیہ تھا وہ بھی بچوں ہی جیسا تھا۔ اب وہ کہتے تھے کہ بچہ ہے، اگلے ہفتے آنا، اگلے مہینے آنا۔ یہ سارا سلسلہ یوں ہی چلا رہا۔ میں ایک مہینے بعد ان کے پاس گیا کہ یہاں تو کوئی گھاس ہی نہیں ڈالتا۔ انہوں نے کہا ہاں میاں، بس یہاں ایسا ہی کچھ سلسلہ ہے، تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ خبروں میں ڈی اینٹیشن دے دو۔ میں نے کہا آپ مذاق تو نہیں کر رہے۔ کہتے لگے نہیں، آواز تمہاری اچھی ہے۔ یہاں ڈی اینٹیشن ہونے والے ہیں اور انہیں ضرورت تھی ہے، ہم ڈی اینٹیشن دے دو۔ میں نے دل میں سوچا کہ خبریں پڑھنا تو دور کی بات ہے، میں تو خبریں سننا تک نہیں ہوں۔ وہ کہتے تھے کہ تم یوں کر وہ ریڈیو سنار کرو۔ لی بی سی سنو اور دوسرے اینٹیشن سنار کرو۔ ناموں کو ذہن میں رکھو اور مجھ سے روزانہ بلٹن لے جایا کرو۔ خبریں سنو اور اس کی پریکٹس کیا کرو۔ مجھے خبروں کی الفب کا بھی نہیں پتا تھا، پھر میں نے سوچا کہ سال بھر ہو گیا، ڈراموں میں تو کوئی چانس نہیں دے رہے، چلو یہاں قسمت آزمائی کرتے ہیں۔ اب میں نے شوق شروع کر دی۔ لی بی سی اور دنیا جہاں کے اینٹیشن سننا۔ اب ایک جتنی ہو گئی تھی۔

بہر حال خبریں پڑھنے کا ڈی اینٹیشن ہوا اور اتفاق کی بات کہ میں یہاں بھی کامیاب ہو گیا۔ کچھ لوگ کامیاب ہوئے تھے، جن میں، میں تھا، افتخار عارف تھے، ایک نئے فیصل الدین۔ ایک بنگلہ کے نیز کاسٹر تھے امین الحق۔ یہ نام مجھے اس وقت یاد آ رہے ہیں۔ ہاں عابدہ جاوید بھی تھیں۔ میں نے ان سے کہا کہ ابھی اب میں خبریں کب پڑھوں گا، کہنے لگے غمزدہ، وہ مجھے ایک صاحب کے پاس لے

گئے جو شاید نیز ایڈیٹر تھے۔ نام ان کا ”زڈ“ تھا۔ مجھے پورا نام یاد نہیں آ رہا۔ ان سے پوچھا کہ وہ جو ڈی اینٹیشن ہوئے تھے ان کا کیا بنا۔ کہنے لگے ہاں ایک دولڑ کے سلیکٹ ہوئے ہیں۔ انہوں نے پوچھا زبیر الدین کا کیا ہوا۔ کہنے لگے ہاں آواز اچھی ہے لے آؤ۔ کہنے لگے یہ کھڑے ہیں آپ کے پیچھے۔ انہوں نے اوپر سے نیچے تک مجھے دیکھا اور بولے، پار یہ تو بچہ ہے، یہ کیا پڑھے گا خبریں۔

کہنے لگے آپ نے ڈی اینٹیشن سن لیا، آواز دیکھ لی، بچے میں جتنو ہے، شوق ہے، یہ کر لے گا۔ وہ کچھ متذبذب نظر آئے۔ کہنے لگے ہم نے دس بارہ لڑکوں کو سنا ہے۔ اس سے کہو کہ دو تین ہفتے پریکٹس وغیرہ کرے۔

ان دنوں غالباً ریڈیو پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار ایک ٹریننگ سیشن شروع کیا گیا، خبروں کے اسرار و رموز سے آگاہ کرنے کے لیے۔ روزانہ دو تین گھنٹے کا سیشن ہوتا۔ لیڈر ہوتے۔ اسلم انڈر ایم ڈی تھے، وہ آتے، ڈاکٹر اٹلیل ایم آر ریجنل ڈائریکٹر فیس الدین بٹ آتے، برہان الدین ان صاحب بھی آتے۔

ان سب نے آٹھ دن دس لیکچر دیے۔ بس اللہ نے خبریں پڑھوائی تھیں۔ اس میں کامیاب ہوا تھا۔ اللہ کا نام لے کے ڈی اینٹیشن دیا۔

سب سے پہلے پانچ منٹ کی خبریں پڑھیں فوجی بھائیوں کے پروگرام میں، اور پھر گھنٹے بعد کراچی کی خبریں پڑھیں۔ ایک وقت میں دو بلٹن پڑھنے ہوتے تھے اور دس روپے ملتے تھے۔ خبریں پڑھیں اور ستائیس کیا۔ آپ یقین کیجئے کہ اس سے پہلے میں بھی آن ایئر کیا ہی نہیں تھا۔ میرا تو گھانٹک ہو گیا، دل طلق میں آ گیا، جیسے نیچے خبریں پڑھیں۔ برہان صاحب نیز ایڈیٹر تھے، انہوں نے مجھے بلوایا اور کہا کہ یہ کیا کیا تم نے بلٹن کا ستائیس مار دیا ہے، کس نے مجھے نہیں اپناٹ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ سر اتنی مشکوں سے تو ڈی اینٹیشن پاس کیا اور ٹریننگ بھی کی۔ کہنے لگے، ہاں میاں، تمہارے اندر ٹیلنٹ تو ہے۔ تمہاری آواز بھی اچھی ہے، بس اپنا انداز بناؤ۔ ان دنوں فکیل احمد، انور بہزاد وغیرہ کا پروگرام خاص انداز تھا۔ برہان صاحب کہنے لگے کہ یاد رکھو تمہارا اپنا انداز ہونا چاہیے، لوگ سنیں تو یہ نہ کہیں کہ یہ فکیل احمد یا انور بہزاد کی طرح خبریں پڑھنے والا زبیر الدین ہے بلکہ یہ کہیں کہ زبیر الدین پڑھ رہا ہے۔

یہ بات میرے ذہن میں بیٹھ گئی۔ ابھی کہہ رہا تھا۔

ستاؤ، اب تلفظ غلط، نام غلط انہوں نے باقاعدہ میری تربیت کی، کروٹنگ کی۔ چھ ماہ بعد وہی دی کے نوزائید میڑ ہو گئے۔ واد اٹھل اٹھ، بڑے مزے کے آدی تھے۔ کینیا شرفی افریقا وغیرہ کے لیے رات کو گجراتی خبریں ہوتیں، میں ایک لیٹن اردو کا رات کو پڑھتا، ایک صبح کے وقت۔ صبح کے لیٹن میں واد کی بھی ڈیوٹی ہوتی تھی۔ واد کو کپ شپ کا بڑا شوق تھا۔ وہ روز کشین میں بیٹھ جاتے، دو چائے منگواتے اور گرم پانی منگواتے، وہی پانی دو چائے میں ملا کر سب میں تقسیم کرتے اور کپ شپ کرتے رہتے۔

گھٹیل صاحب کو میں نے دیکھا کہ خبریں پڑھتے تو مائیک ان کی وافی جانب ہوتا۔ ہم سے تو کہا جاتا کہ منہ مائیک کے سامنے ہو اور مائیک ہی میں بولے۔ لیکن واد کی آواز بڑی زوردار تھی پتا نہ چاہتا کہ مائیک کی جانب کر دیا جاتا۔

گھٹیل احمد ڈراموں میں بھی کام کر چکے تھے۔ انہوں نے آغا حشر کے کئی ڈرامے کیے تھے۔ وہ خبریں مل مل کر پڑھتے تھے جیسے تلاوت کرتے ہیں۔ اللہ مغفرت کرے، بہت شاندار آدی تھے۔

اور دوسرے تھے وراثت مرزا۔ بڑے ہی تیس آدی تھے۔ سردی ہو یا گرمی، ہمیشہ شيروانی میں نظر آتے۔ حیدر آبادی تھے۔ میں نے بھی انہیں ہمیشہ شيروانی ہی میں دیکھا۔

پان کھاتے تھے، نہ سگریٹ پیتے تھے۔ ایک تجارتی خبریں ہوا کرتی تھیں۔ وراثت مرزا صاحب میں لیٹن پڑھتے اور میں تجارتی خبریں پڑھتا۔ میں اس زمانے میں سگریٹ پیا کرتا تھا۔ مرزا صاحب کہتے یار سگریٹ ملاؤ میں کہتا آپ تو سگریٹ نہیں پیتے، کہتے بس یار، تمہارے ساتھ بیٹے کوئی چاہتا ہے۔ وہ حیدر آباد کالونی میں رہتے تھے۔ میرے پاس موٹر سائیکل ہوتی تھی، میں جیکبھار روڈ پر رہتا تھا، انہیں نیل روڈ پر حیدر آباد کالونی چھوڑنا ہوا جاتا۔

ہاں یہ بھی بتا دوں کہ میرا خاندان دہلی کا تھا۔ میری پیدائش البتہ کراچی کی ہے لیکن میں نے ایسے بھی لوگ دیکھے ہیں کہ اردوان کی دلداری زبان نہیں لیکن تلفظ اور لہجہ لہجہ زبان سے بھی بہتر ہوتا تھا۔ ایک صاحب تھیں، سٹکی جی، بھابی تھیں لیکن بڑی شستہ اردو بولتی تھیں۔ اصل میں کراچی کا ماحول ایسا تھا کہ بھابی اور سرحد کے لوگ اس میں ڈھل جاتے تھے۔ اس کے لیے وہ بھر پور محنت کرتے تھے کیونکہ اس وقت معیار سخت ہوا کرتا تھا۔ نہ سفارش چلتی تھی اور نہ تعصب کی عینک۔

جس میں ٹیلنٹ ہوتا وہی آگے بڑھتا تھا۔ سخت معیار تھا، ایسا ڈیسا آدی تو وہاں کس بھی نہیں ہسکا تھا۔ یہی حال کی دی کا تھا۔ وہاں بھی معیار پر کوئی سمجھتا نہیں ہوتا۔ ریڈیو پر جب سال بھر ہو گیا تو میں نے برہان صاحب کو فون کیا کہ اب تو میں نوز کا سٹر ہو گیا ہوں، مجھے کی دی پر بھی موقع دیں۔ ہنسنے لگے، ان دنوں کی دی پر طارق عزیز، وراثت مرزا اور قربان جیلانی خبریں پڑھتے تھے۔ دو دو دن پڑھا کرتے، میری کوئی دی نہیں ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ برہان صاحب بلا جھجک ہوئے ابھی تو بالکل گنجائش نہیں ہے۔ کئی دن آؤ، آؤ لیٹن لے لوں گا۔

میں ان کے پیچھے لگا رہا۔ میری قسمت اچھی تھی۔ ہوا یہ کہ طارق عزیز لاہور شفٹ ہو گئے اور میرے لیے جگہ بن گئی۔ برہان صاحب نے فون کیا کہ میرے پاس آؤ تاکہ تمہیں آزما سکوں اس لیے کہ یہاں کمرے کو بھی فیس کرنا ہوتا ہے۔ میں نے کہا وہ بھی کر لیں گے۔ انہوں نے اہم نکتے سمجھائے کہ کمرے پر کیسے نظر رکھنی ہے، خبروں میں کہاں، پاز دینا ہے۔ پھر مجھے ایک صاحب کے پاس بھیج دیا۔ انہوں نے آڈیشن لیا اور پھر برہان صاحب اور اسلم اظہر صاحب نے سمجھایا کہ کی دی پر خبریں کیسے پڑھنی ہیں۔

اسلم اظہر صاحب براؤ کا سٹنگ کی دنیا کا بہت بڑا نام تھے۔ بہترین منتظم بہتوں کو علم ہو گا کہ وہ خبریں بھی پڑھا کرتے تھے۔ مجھے انہوں نے بھی بہت گرم کیا۔ مجھے یاد ہے اسلم اظہر صاحب نے ایک اہم بات سمجھائی تھی کہ جیسے موسیقی میں سر ہوتے ہیں، سارے گا، با، پا، اسی طرح خبروں میں الفاظ کی اور آواز کی ٹانگنگ ہوتی ہے۔ خیر اسلم اظہر صاحب نے بھی پاس کر دیا۔ یہ 69 کی بات ہے۔

ریڈیو پر تو آواز اور تلفظ کی ضرورت ہے مگر کی دی پر کل وصورت، لباس اور پرستاری بھی ضروری ہوتے ہیں۔

میرا کام یہ تھا کہ سارا دن اخبار پڑھتا، ساری خبریں سنتا، اس طرح جب میں خبریں پڑھتا تو مجھے علم ہوتا کہ کیا پڑھنا ہے۔ اس طرح مجھے بہت آسانی ہو گئی تھی۔

ایک خاتون ہوتی تھیں، نام نہیں بتاؤں گا۔ ایک دن کہنے لگیں، میرے گھر تو اخبار بھی نہیں آتا۔ بعض نام مشکل ہوتے ہیں۔ لیکن مجھے ایسی پریشانی نہیں ہوتی تھی کیونکہ خبریں سننے سے وہ نام لینا آسان ہو جاتا تھا۔ ورنہ برہان صاحب سے پوچھ لیتے تھے۔ وہ خود کہتے تھے کہ پوچھ لیا کرو، بجائے اس کے کہ غلط نام پڑھ دو۔

اوپر بتا ہی چکا ہوں کہ خبریں پڑھنے کے لیے ریاض

نہی ہے لیکن نہیں، میں ریاض وغیرہ تو نہیں کرتا تھا لیکن نوش کرتا تھا کہ شغلی یوش، کمناس اور اچار وغیرہ سے بچا ہوں۔ ہر دوسرے دن خبریں پڑھنے سے ریاض تو یوں ہی ہو جاتا اور یقین کیجئے، نوز کا سٹر کوئی سال دو سال میں نہیں بنتا۔ اس کے لیے دو چار سال لگتے ہیں کہ آپ کہہ سکتے ہیں کہ ہاں یہ انداز میں خبریں پڑھ رہا ہے۔

آج کل تو بچا سوں پچھل ہیں۔ اس زمانے میں ایک کی دی وی پچھل تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ میں نوبے ہر گھر کے زائنگ روم یا بیڈ روم میں موجود ہوتا تھا۔ تیس سال خبریں پڑھیں۔ لوگ ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ جب میں ماں کی کوڈ میں ہوتا تھا تب سے آپ کو دیکھ رہا ہوں۔ ایک مشر صاحب ملے تو کہتے تھے کہ بچوں سے کہتا ہوں زہیر خبریں پڑھتے تو غور سے سنا کرو، تمہاری اردو اچھی ہو جائے گی۔ یہ میں غور سے نہیں کہہ رہا، لیکن فخر کی بات تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ شروع میں ہم بھی بہت غلطیاں کرتے تھے۔

لیکن ہمارے سٹرن مذاق اڑانے کی بجائے بٹھا کر بکتے بتایا کرتے تھے۔ جیسے وراثت مرزا۔ وہ ہمیشہ شفقت سے پیش آتے۔ بچوں کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ واد کا بھی یہی حال تھا۔ انور بہزاد صاحب سے دیر تعلق نہیں تھا جیسا وراثت مرزا صاحب کے ساتھ تھا لیکن بہر حال انسان اپنے سینئرز سے بہت کچھ سیکھتا ہے۔ انور بہزاد کا اپنا ایک انداز تھا جو گھٹیل واد کی طرح منفرد تھا اسی طرح شمیم اعجاز بہت اچھی اور تیس خاتون تھیں۔ ان سب کے نقوش ریڈیو پر بڑے گہرے تھے۔ جب میں کی دی پر آیا تو کچھ حاسد بھی ملے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ کسی اور کا خبریں پڑھنے کا دن ہوتا اور اس سے کہا جاتا کہ آج آپ کی بجائے زہیر الدین پڑھیں گے تو ظاہر ہے انہیں یہ پسند نہ آتا تھا۔ وجہ تھی کہ سینئر کو کچھ پراعتہ تھا۔ ہم محنت بھی کرتے تھے۔ وہ بھوسا صاحب اور ضیاء الحق کا زمانہ تھا۔ بعض اوقات ان کے باہر کے دورے کی نوز فیڈ آتی۔ اتنا وقت نہیں ہوتا کہ خبریں کہاں بولنا ہے، کہاں رکنا ہے۔ ریسرل تو کوئی ہوتی ہی نہیں تھی۔ بہر حال انہیں مجھ پر کانٹیزس تھا۔ کہتے تھے اسے زہیر سے پڑھو، وہ سنہال لگے گا۔ ایک وقت تو اللہ کا شکر ہے کہ ایسا آگیا تھا کہ ان کی غلطی میں بھی نہ لگا تھا۔

میں وراثت مرزا سے بہت متاثر تھا یا پھر خالد حمید تھے۔ جن کی بہت اچھی آواز اور پرستاری تھی۔ ہم کراچی سے خبریں پڑھتے تھے۔ پھر جب نیٹ ورک شروع ہو گیا تو مجھے

جہاں گانوزنگ

میں کے ممتاز فوٹیل انعام یافتہ ادیب۔۔۔
جینئرو (Ganzho) صوبہ جیاگ میں ایک آفیسر کے ہاں پیدا ہوئے۔ والدہ اداکارہ تھیں۔ 1962ء میں بیجنگ یونیورسٹی سے فرانسیسی زبان کی ڈگری لی۔ وہ کیونٹ پارٹی کے بھی رکن تھے، تاہم 1969ء میں مستعفی ہو گئے۔ 1981ء سے 1987ء تک مختلف ادبی رسالوں میں مضامین لکھتے رہے۔ اس دوران انہوں نے ڈراما نگاری کی جانب بھی توجہ دی اور 1986ء میں "The Other Shore" کے عنوان سے ان کا ڈراما ایڈج پر دکھایا گیا۔ اس ڈرامے میں انہوں نے ثقافتی انقلاب کو ہدف تنقید بنایا تھا۔ لہذا حکومت نے ڈرامے پر پابندی لگا دی۔

چونکہ وہ پابندی کے ماحول میں لکھنے لکھانے سے قاصر تھے، لہذا 1987ء میں ہجرت کر کے بیس کوپنا وطن ثانی بنایا۔ وہ ایک اعلیٰ پائے کے ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ پائے کے مصور بھی ہیں اور ان کے فن پاروں کی نمائش دنیا بھر میں منعقد کی جا چکی ہیں۔ 12 اکتوبر 2000ء کو سویڈش اکیڈمی نے ان کے لیے ادب کے نوبل انعام کا اعلان کیا۔

مرسلہ: سہرس، شیخوپورہ

اسلام آباد، کوئٹہ، پشاور وغیرہ بھی بھیجا جانے لگا۔ میں نے چاروں اسٹیشنوں سے خبریں پڑھیں۔ سب سے ملاقات رشتی تھی۔

ریڈیو پر میں نے ڈرامے وغیرہ کیے تھے لیکن پھر یہ ہوا کہ جب خبریں پڑھنا شروع کیں تو سوچا کہ ایک کام تو بہتر کر لوں پھر دیکھا جائے گا اور میں خبروں کی دنیا میں اپنی پہچان بنانے لگا۔ انٹرنٹ ٹرانسمیشن بھی کیے، مگر کے اور سٹرن کے انٹرنٹ میں غزالہ یاسین وغیرہ کے ساتھ بہت عمدہ ٹرانسمیشن دی۔

شادی کے بعد غزالہ یاسین، راحت سعیدی کی پڑھیں آئیں۔ جب میں نورنگا گیا تو وہاں نگہت آفرین، جریم حارف وغیرہ سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک سعید احمد تھے، ہوا کرتے تھے، ملتے دس دن میں آج بھی ان سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ مگر آفرین تقریباً پچاس سال بعد ملنے آئی تھیں۔

خبریں پڑھتے ہوئے غلطی ہو جاتی ہے لیکن مجھے یاد نہیں کہ میرے ساتھ ایسا کچھ ہوا ہو۔

ایک بار ایسا ہوا کہ ہمارے دوست، اللہ ان کی مغفرت کرے، انگرام علی شکی تھے، وہ اور میں خبریں پڑھ رہے تھے۔ لاہور کے کسی مذہبی جماعت کے جلسے کی فلم چل رہی تھی جس میں ایک مولانا آئے، ان کی اتنی ہی داڑھی تھی، دوسرے مولانا آئے تو ان سے بڑی داڑھی تھی اور تیسرے آئے تو بہت ہی بڑی داڑھی تھی۔ جیسے ہی فلم کٹ ہوئی اور کیراٹنشی پر آیا تو وہ کہہ رہے تھے۔ ”اے! اس کی تو سب سے بڑی ہے۔“ لیکن لوگوں نے اسے نوٹ کیا۔ میں نے وقفے میں بتایا کہ ان کا جملہ آن ایئر چلا گیا ہے۔ کہنے لگے نہیں یار۔ ابھی آدھا گھنٹا بھی گزر کر رہا تھا کہ ٹی وی اسٹیشن کے باہر پچاس ساٹھ لوگ جمع ہو گئے کہ اس کا فریٹنگی کو باہر نکالو۔ اس نے شعار اسلامی کا مذاق اڑایا ہے۔ اس بے چارے کو دو تین ماہ کے لیے ہٹا دیا گیا تھا۔

اتفاق ہے کہ اب تک مجھ سے ایسی کوئی غلطی نہیں ہوئی کیونکہ اگر خبر غلط کہی ہے اور میں نے دیا ہی پڑھا ہے تو ظاہر ہے میرا قصور نہیں۔ صرف ایک بار ایسی غلطی ہوئی جس کے لیے طعنے لے تھے۔

ایم کیو ایم کی ہڑتال ہوتی تھی اور شہر بند ہوتا تھا لیکن ہمیں خبریں دی جاتیں کہ جردی ہڑتال ہوئی اور دکانیں کھلی رہیں۔ اب ایسے ہی ایک بار گوشت کی دکان کھلی دکھائی گئی جب کہ وہ منگل کا دن تھا۔ ان دنوں منگل کو گوشت کا ناغہ ہوتا تھا۔ ایم کیو ایم والے طعنے دیتے کہ یار تم جموٹی خبریں پڑھتے ہو۔ اب آپ ہی بتائیں بھلا اس میں میرا کیا قصور، مجھے جیسی خبر دی، پڑھ ڈالی۔

ہمیں سکھایا جاتا ہے کہ خبر آپ کو کروڑوں لوگوں تک پہنچانی ہے۔ جذبات کا مظاہرہ یا ڈرامے بازی نہیں کرنی۔ ہمیں تو مسکرانے تک کی اجازت نہیں تھی۔ ہاں، اب ذرا ویزن میں اضافہ ہوا تو دیکھا کہ بی بی سی، این این وغیرہ پر لوگ خبروں پر تبصرہ بھی کر لیتے ہیں۔ آپس میں ہی مذاق بھی کر لیتے ہیں۔

ان دنوں خبروں میں چیخ پکار نہیں ہوتی مگر پچھلے دنوں کراچی جانا ہوا تو بی بی سی پر بھی کیا۔ جیو اور اے آر وائی کے بھی ایک دو نیوز کا شرمو جو تھے۔ خبروں کو چیخ و پکار کی بات ہو رہی تھی۔ وہ ظاہر ہے اس کی حمایت کر رہے تھے۔ دراصل ریٹنگ وغیرہ کا چکر ہوتا ہے جبکہ ہمیں تو سکھایا گیا تھا کہ اس

طرح کا چیخا چلاتا تو بی بی سی اور سی این این پر بھی نہیں ہوتا ہے۔

میں نے کرنٹ افیئرز کے پروگرامز بھی کیے۔ آپ کو یاد ہوگا، سینیا ہاؤس میں پاکستان کا تصویری خبر نامہ ہوتا تھا، وہ بھی میں کیا کرتا تھا۔

میرے علاوہ طلعت حسین اور عبدالماجد بھی کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی اسلم اظہر، ضیاء محی الدین، عبدالماجد، اسلم ایم سلیم، محمود خان مودی بھی کیا کرتے تھے۔ وہ بڑا پاولو تھا۔ میں نے بیس سال یہ کام کیا۔ بہت ساری ڈاکٹری بھی کیں۔

جب میں پاکستان سے نکلا تو اس وقت پرائیوٹ چینل شروع ہوئے تھے۔ دو ہزار پانچ میں کینیڈا چلا گیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اب تو پیسے کمانے کا وقت آیا ہے۔ لیکن پیسہ تو سب کچھ نہیں۔ بچے ہیں، مکی ہے۔ اب پوتے پوتیاں ہیں۔ وہ جو کہتے ہیں نا، اصل سے سوڑ یادہ پیار ہوتا ہے۔ بس اب انہی کے ساتھ وقت گزارتا ہے۔ چار بیٹے ہیں۔ سب کی شادی ہو گئی ہے۔ سب ساتھ رہتے ہیں اور الحمد للہ ہر سرورزگار ہیں۔ میں اب ٹورنٹو میں خبریں پڑھتا ہوں۔

میں تین دفعہ بی بی سی ڈی ایوارڈز کے بہترین نیوز کاسٹر کے لیے نامزد ہوا اور دو بار مجھے ایوارڈ ملا۔ اس کے علاوہ نگار ایوارڈ کی تاریخ میں شاید پہلی اور آخری بار بہترین نیوز رپورٹر کا ایوارڈ دیا گیا جو مجھے ملا۔ اس کے علاوہ بھی بے شمار ایوارڈ ملے جن میں سندھ اسمبلی کا ایوارڈ، وحید مراد ایوارڈ، لہری ایوارڈ وغیرہ بھی ملے۔ لیکن صدارتی ایوارڈ نہیں ملا۔ حالانکہ اسلام آباد سے تعلق رکھنے والے دو نیوز رپورٹر کو صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی دیا گیا ہے۔ شاید کراچی، اسلام آباد سے بہت دور ہے اور اب باب اختیار کی نظر میں ان تک نہیں پہنچتیں۔

ذرا سوچیں کہ یہ ستم غریبی نہیں ہے کہ پاکستان کی تاریخ میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بیس سال تک مستقل خبریں پڑھنے والا اور آج بھی امریکا اور کینیڈا میں پاکستانی اور اردو بولنے والوں کے لیے خبریں پڑھنے والے جنہوں نے اس شعبے میں تقریباً گولڈن جوبلی ہو چکی ہے ہماری وزارت اطلاعات اور براڈ کاسٹنگ کے کرتا دھرتاؤں کی نظروں سے اوجھل ہوں۔

مبہر حال یہ پاکستان ہے اور یہ کوئی پہلا موقع نہیں ہے کہ حقدار کو اس کا حق نہ دیا گیا ہو۔ شاید کسی کے دل میں اثر جائے سری بات۔

دیو مالائی کہانوں کا خطبستان جواہری رسم و روایات اور ثقافت کی بنا پر انفرادیت کا حامل ہے، وہیں اس کی سحر انگیز وادیوں میں زمانہ نامعلوم کی تاریخ سے انسان کے ارتقائی سفر کے شواہد ملے ہیں جس نے زبانوں، مذہبی عقائد اور ثقافتوں کو تنوع بخشا اور وہیں اس سے فن کے ایسے نادر نمونوں نے جنم لیا جو صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی بے نشان ہو جانے والے فنکاروں کے فن کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

بلتستان کی تاریخ میں ایسے تین مذہبی ادوار ملتے ہیں جس نے فنکاروں سے فن کے ایسے نادر نمونے تخلیق کروائے جو آج بھی لوگوں کو درطرح حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ ان میں پہلا دور ”یون مت“ دوسرا ”بدھ مت“ اور تیسرا ”اشاعت اسلام“ سے وابستہ

ہے جس کی تاریخ گزشتہ سات صدیوں پہلے ملتی ہے۔ شجرہ ملتان کی وہ وادی ہے جہاں ان تینوں ادوار کے آثار پائے جاتے ہیں جن کی غالباً اکثریت مسلم فن تعمیر سے منسلک ہے۔ ان میں آستانے، امام بارگاہیں اور خانقاہیں شامل ہیں جن میں فن چوب کاری یا م عروج پر پہنچا ہوا نظر آتا ہے۔ بلتستان میں چوب کاری کے اس فن کو ایرانی مہلبین اسلام اور ان کے ہمراہ آنے والے کشمیری ہنرمندوں سے منسوب کیا جاتا ہے جن کا آغاز اپنے وقت کے اہم مبلغ امیر کبیر سید علی بھٹائی سے وابستہ ہے۔

لوگ روایتوں کے مطابق امیر کبیر سید علی بھٹائی چودھویں صدی عیسوی میں کشمیر سے اسکردو اور پھر یہاں سے شکر پینچے اور اشاعت اسلام کا سلسلہ شروع کیا۔ اس وقت شکر پر

معمولی فنکاروں پر بڑے فنکاروں کا ذکر خاص

تخلیق فن کے لیے دماغ سوزی کے ساتھ ساتھ، باتہ کا کمال بھی لازمی ہے۔ ہر فن پویش وادیوں میں جہاں کی راہیں بھی دشوار ہیں وہاں جا بجا فن پارے بکھرے ہوئے ہیں لیکن ان فن پاروں کی حفاظت کا کوئی معقول انتظام نہیں اگر وقت رفتہ ان کی حفاظت نہ کی جائے خواہ انتظام نہ کیا گیا تو انے والی نسلیں بعد میں ہمارے ہی ہوں گی۔

فن پارے
مختار آزاد



شمشال لوزنٹو

ندیم اقبال

شاعر نے غلط نہیں کہا ہے کہ چاند میری زمیں پھول میرا وطن۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ میرا وطن چاند سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ اس کی وادی، اس کے دریا، شہر و کوہسار سب کے سب بے نظیر و بے مثال ہیں۔ لیکن ان فضاؤں سے جو نکل کر کسی اور شاخ پر اُشیانہ سجانے کی خواہش کرتا ہے۔ اسے کیسی کیسی پریشانیاں گھیرتی ہیں اس کا ذکر جو یورپ و امریکا میں بسنا چاہتے ہیں وہ اس تحریر کو ضرور پڑھیں۔



ایک جہاز کا شاندار کی دلچسپ سفر کہانی کا چودھواں حصہ

سرجی کا بڑا بھلا۔ وہ ڈمگائے اور پیچھے آتے غول پر گر پڑے۔ یہ اتفاق تھا کہ وہ جس پر گرے اس کی سرجی بی بی نے اچھل بھاری اگر اس کے پیچھے دوسرے لوگ نہ ہوتے تو وہ بری طرح زخمی ہو جاتی۔ وہ غول اڑتین سیاح کا تھا۔

ہم سب مجھے آزادی پر جانے والی سیر میں پرچہ لے رہے تھے باقی سب تو ایک ایک کر کے سیر میں چڑھ رہے تھے۔ ایلن سرجی کو جوش آگیا تھا اور وہ جلد اور پیچھے کی کوشش میں ایک ایک کر کے دو دو سیر میں بھلا لگ رہے تھے اسی کوشش میں

ثقافتی رنگ لیے طرز تعمیر کو بالکل نہیں سمجھتا بلکہ اسے ایرانی کشمیری اسلوب کے استخراج سے مزید جلا بخشتی۔ اسکر دو سے کے ٹوک جانے والے دساتے پر واقع قصبہ شہر میں ایک قلعہ اور کم از کم سات مساجد، خانقاہیں، آستانے اور مزارات ایسے ہیں جن کا فن تعمیر امیر کبیر سید علی بھٹائی سے منسوب ہے اور اس پر کشمیری اور نئی انداز تعمیر نمایاں ہے۔ ان میں قلعہ چھوٹا کھر، امبوڑک مسجد، خانقاہ میر بجی، آستانہ گنجی، ممبر دھنی مسجد، قلعہ مسجد، مقبرہ میر غلام الدین نائب، خانقاہ میر غلام الدین نائب شامل ہیں۔

ان تعمیرات میں سے تین کو (قلعہ چھوٹا کھر، امبوڑک مسجد اور آستانہ میر بجی) کو گزشتہ چند برسوں کے دوران اقوام متحدہ کے ادارہ برائے سائنس، ثقافت اور تعلیم (یونیسکو) کی جانب سے ایشیا پیسیفک بیرتھ ایوارڈ حاصل ہو چکے ہیں جس کے سبب فن تعمیر کے اس دورے کو عالمی سائنس حاصل ہوئی۔

چوب کھاری کے فن کے تحت بنائے گئے نقش و نگار کے حوالے سے کی گئی راقم کی تحقیق کے مطابق بلتستان میں ایسے نمونوں کی تعداد پندرہ سو سے بھی زائد ہے جو یہاں کندہ نظر آتے ہیں۔ ان نمونوں کے باقاعدہ نام ہیں۔ نیز منظر نقش و نگاری کے اثرات بھی یہاں تک پہنچے جہاں علیحدہ نام دیے گئے ہیں۔ ان ناموں میں موج کور، موج حیدر، موج حسن، موج اصغر، موج دریا، بادا، آبشار، خشک، گز تیں، گند جاز، عکبوت، تیر، کندروی، سادہ کندروی، یون دروگ، اٹھم، چندن، سرشت رومی، جان شیریں سمیت متعدد شامل ہیں جن کے تذکرے کے لیے خاصی جگہ درکار ہوگی، جو فی الوقت یہاں دستیاب نہیں۔ یہاں منظر طرز تعمیر سے وابستہ چولی نمونوں کے ناموں کا تذکرہ بھی کرتے چلیں۔ ان میں دروازہ سر، شش سر، شش سر بہشت زاویہ، شش باہی، بندروی قابل ذکر ہیں۔ یہاں ایک قدیم نشان، سوہمیت کا ہے مشابہت رکھتا ہے جس کو جرمنی کے حکمران ایڈولف ہٹلر کے نشان کی حیثیت سے عالمی شہرت حاصل ہوئی اور ہندوؤں کا بھی یہ معتبر نشان ہے۔ بلتستان کے فن تعمیر میں اس نشان کی تاریخ صدیوں پرانی ہے جسے یوگ دروگ کہا جاتا ہے۔ بعض محققین کے مطابق بلتی تاریخ میں اس نشان کی بلتستان کے قومی نشان کی حیثیت حاصل رہی ہے جو اس اسلامی کی علامت تھا۔

سادہ لیکن بڑا کار کے ہاتھوں نے جوش تراشے۔ وہ آج تاریخ اور تہذیب و ثقافت کی علامت ہیں۔

راجا غوری حکم کی حکومت تھی جب کہ رعایا بدھ مت کے پیروکار تھے۔ ایک دن راجا پولوگرادغ میں پولو کھیل رہا تھا کہ امیر کبیر سید علی بھٹائی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ یہاں آن پہنچے۔ راجا کو یہ تو علم تھا کہ حضرت ایک ایسے دین کی تبلیغ میں مصروف ہیں جو اس خطے میں پہلے موجود نہیں تھا۔ جب امیر کبیر سید علی بھٹائی نے راجا کو بچپان کر اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تو اس نے چنگا پٹ کا مظاہرہ کیا اور کچھ تامل کے بعد یہ شرط رکھی کہ اگر وہ پولوگرادغ کے ایک حصے میں موجود بڑے سے پہاڑی پتھر کو یہاں سے غائب کر دیں تو وہ اسلام قبول کر لے گا۔ کیوں کہ اس پتھر کے باعث کھلاڑیوں کو کافی دشواریوں کا سامنا ہوتا ہے اور لاکھ کوششوں کے بعد بھی لوگ اس پتھر کو یہاں سے ہٹانے میں ناکام رہتے۔

امیر کبیر سید علی بھٹائی نے اس شرط کو قبول کیا اور اپنے ہاتھ میں موجود عصا کو پتھر پر مارا۔ پتھر زمین میں دھنسا چلا گیا اور آخر کار غائب ہو گیا۔

راجا نے یہ دیکھ کر اپنی زبان کا پاس رکھا اور اسلام قبول کر لیا۔ قبول اسلام کے بعد راجا کا نام غازی میر رکھا گیا۔ راجا کی دیکھا دیکھی یہاں کے باشندے تیزی سے شرف بہ اسلام ہونے لگے۔

فردغ اسلام کے سبب یہاں پہلی دینی ضرورت ایک مسجد کی تعمیر محسوس کی گئی۔ روایات کے مطابق امیر کبیر سید علی بھٹائی کے ہمراہ بڑی تعداد میں ایسے ہنرمند اور فنکار موجود تھے جن کا وصف چوب کھاری کے فن میں طاق ہوتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ امیر کبیر سید علی بھٹائی نے اشاعت اسلام کے ساتھ ہی یہاں دو مسجدوں کی بنیاد ڈالی۔ ان میں ایک امبوڑک مسجد اور دوسری چھ بروجی مسجد ہے۔ کتاب زاد البیان کے مطابق امیر کبیر سید علی بھٹائی کی بلتستان میں آمد کا سال 782 ہجری ہے۔ کہتے ہیں کہ بلتستان کی اولین مساجد ہیں۔

امیر کبیر سید علی بھٹائی کے یہاں سے واپس چلے جانے کے بعد بھی بلتستان میں فن چوب کھاری کا وہ سلسلہ چلتا رہا۔ امیر کبیر سید علی بھٹائی نے جس کا آغاز کیا تھا۔

فن چوب کھاری کو مذہبی تعمیرات کے حوالے سے دیکھیں تو اسلام سے قبل یہاں موجود بدھ مت کی مذہبی اہمیت کی حامل عمارتوں میں بھی چوب کھاری کا فن نظر آتا ہے جس کے نمونے آج بھی جیت میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ امیر کبیر سید علی بھٹائی نے جس فن تعمیر کو یہاں روانہ کیا اگرچہ اس میں ایرانی اور کشمیری رنگ نمایاں ہے تاہم دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے مقامی

بھارتیوں کی ایک بری عادت ہے کہ وہ امریکا آتے ہی خود کو سب سے اعلیٰ سمجھتے تھے ہیں اور اس کا برملا اظہار بھی کرتے ہیں لیکن صرف رنگ دار لوگوں کے سامنے۔ یورپیوں کے سامنے تو وہ نظریں بھی اٹھاتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں بھی انگریز سمجھا تھا اسی لیے سب ایک ساتھ غصے کا اظہار کر رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ سر جی کالی دیر سے اس لڑکی کو گھور رہے تھے پھر جیسے ہی انہیں موقع ملا اس پر گر گئے۔ حالانکہ انہیں معلوم نہ تھا کہ سر جی بھی کسی دیکھ کر نہیں کرتے بلکہ گر کر دیکھتے ہیں۔

میں نے بڑی مشکل سے انہیں مطمئن کیا کہ ایک تو یہ عمر میں اس لڑکی کے باپ جیسے ہیں پھر انہیں دکھائی بھی کم دیتا ہے۔ یہی سر جی بولے۔ ”اللہ قسم میں نے جی سمجھ کر کرتے ہوئے اس کا سہارا لیا تھا۔ تم کہنا ہے پر وہ لوگ پھر چلانے لگے کہ تم لوگ پاکستانی ہو اس لیے انگریز کو دیکھتے ہی اسے زک پہنچانے سے باز نہیں آتے۔ وہ سب غصے سے لال پیلے ہو رہے تھے کہ میں نے جلدی سے کہا۔ آپ لوگ انہیں بزرگ سمجھ کر معاف کر دیں۔“ میرے بزرگ کہنے پر وہ سب شک میں پڑ گئے تھے کیونکہ سر جی کسی بھی زاویہ سے اس لڑکی کے بزرگ نہ لگتے تھے۔

میری التجا پر ان میں سے ایک آدمی جو خاصا عمر وراز تھا، بولا۔ ”آپ کے کہنے پر اسے معاف کر دیتے ہیں لیکن یاد رہے کہ آئندہ یہ کسی انگریز سے بدتمیزی نہ کرے۔“ میں کر مجھے یقین ہو گیا کہ یہ نورسٹ ہی ہو سکتے ہیں۔ ورنہ یہاں رہنے والے انگریز کسی اس طرح سے بدتمیزی نہیں کرتے۔ دل میں اگر کچھ ہو تو اور بات ہے مگر آئے سامنے ایک دوسرے سے بہت اچھی طرح عیش آتے ہیں۔ حالانکہ سر جی کسی طور پر نہ باپ لگتے تھے اور نہ باپ جیسے۔ مقصود انہیں بھانا تھا اور میں نے انہیں باپ کے برابر عزت و مرے پر فیض گر دیا تھا۔ بعد میں وہ میری اس ”گستاخی“ پر ناک بھجوں چڑھاتے رہے۔

شہباز جو اب تک خاموش تھا اس نے حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے کہنے پر اسے معاف کر دیا ورنہ ہم گھر پہنچ کر اس کی دھتائی کرتے تاکہ یہ پھر کسی انگریز لڑکی پر نہ گرے۔“ یوں بھی ہم پاکستانی انڈینوں پر قہر بھی گراتے رہتے ہیں۔

بڑی مشکل سے انہیں مطمئن کیا اور کراؤن پر پہنچنے کے لیے اوپر چڑھنے لگے۔ کراؤن پر پہنچنے اور وہاں سے دریا بندن کا چمکنا پانی دیکھنے لگے۔ اس میں چٹکی فیری کشتیاں نظر آ رہی

تھیں۔ سامنے مطمئن کی خاموش عمارتیں کھڑی یہ سارا طرہ دیکھ رہی تھیں۔ اندر سے یہ حسد اٹھتا تھا کہ جیسا بننا بھی یا آسانی کھڑے ہو سکتے تھے۔ کراؤن میں کئی کھڑکیاں سے مشعل قریب سے نظر آ رہی تھی۔ سات شعاعیں میرے سامنے تھیں۔ خوش قسمتی سے مشعل پکڑے ہاتھ کی میز پر آج کھلی تھیں۔ اسی لیے ہاتھ تک پہنچ گئے تھے مگر مشعل کا جانے کی میز پر 1916ء میں بند کر دی گئی تھی، اس آگے نہیں گئے۔ میں بیالیس میز پر چڑھ کر مشعل پکڑا۔ ہاتھ تک پہنچا۔ وہاں سے لیڈی لبرٹی کا تاج مجھ سے نیچے تو میں اس کے سر کو اوپر سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے یہ خوشی آج بھی۔ کہ میں نے وہاں سے نیو پارک کو دیکھا جواب سب کے بند ہے کیونکہ ہاتھ تک جانی میز پر اب سیاحوں کے مکمل طور پر بند کر دی گئی ہیں۔

وہاں سے اترے تو ایس آئی لینڈ جانے والی فیری ۵ بیٹھنے۔ اس فیری پر بیٹھنے سے پہلے ہم میں بہت تندہ و تیز ہوئی تھی۔ شہباز کہہ رہا تھا کہ وہاں کوئی پرانا میوزیم دیکھ وقت کیوں ضائع کیا جائے؟ اسی دوران ٹائم اسکوآرڈ دیکھ لیا، ہم ازم کو روک تو ہوئی۔ سر جی نے اپنے آپ کو ہمارے فیصلے پر چھوڑ دیا تھا اور وہ اپنی ”روفتی“ آس پاس دیکھ رہے تھے۔

میں نے شہباز سے کہا۔ ”ذرا تصور کرو کہ سو سال پہلے تارکین وطن کس طرح آتے ہوں گے۔ ان کو کیسے رکھا جا ہوگا اور وہ اپنے ساتھ کیا کیا سامان لاتے ہوں گے۔ کیا یہ بک کر نہیں بچیں اور حیرت نہ ہوگی؟“

اس نے کہا۔ ”کیا لائے ہوں گے، وہی جو ہم لا۔“ میں۔ کون سی افوی چیزیں ان کے پاس تھیں جو تم دیکھنا چاہتے ہو۔“

سر جی نے بحث میں اپنے آپ کو اس طرح سے غرق کر دیا کہ میں نے اسے میرا ساتھ دیا اور کئی شہباز کی ہاں میں ہاں ملائی۔ میں نے شہباز سے کہا۔ ”تم کو جنہن میں جو کچھ دیکھ ہے، وہاں بھی چلیں گے اور ہمارے پاس وقت بھی ہے مگر جب یہاں آپ پہنچے تو ایس آئی لینڈ بھی دیکھ لیں ورنہ پھر وہاں کسی نہیں جائیں گے۔“ آخر ایک بحث کے بعد ہم ایئر آئی لینڈ والی فیری میں بیٹھے تھے اور وہ ہمیں اتنا دور نہیں لگ رہا تھا۔

بادل بھر آئے تھے۔ ہوا میں شدت درآئی تھی۔ اب باقاعدہ سردی سے میں کپکپا رہا تھا۔ سر جی اوٹی اوٹی کر کے کانچا

ا۔ دیکھے تھے۔ شہباز نے اپنی اوٹی نوٹی اور نیچے کر کے اپنا نشان شروع کر دیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کھڑا تھا ہی کو صاف لہر ہا ہوگا۔ شہباز نے اپنا غصہ سر جی پر نکالا اور کہنے لگا۔ ”وہی تو ہر وقت تم برف باری برف باری کرتے رہتے ہو۔ آج سردی سے مرے جا رہے ہو۔“

سر جی نے معصومانہ انداز میں کہا۔ ”تم کیوں مجھے دکھا رہے ہو۔ میں سردی کی وجہ سے تو نہیں کانپ رہا۔“

خندہ میاں ہوا سے مجھے لڑتی ہے۔“

اتنے میں فیری کنارے آگئی اور ہم ایک لائن میں لگ اس میں سوار ہوئے۔ مشعل کی وجہ سے ہم نیچے والے بند میں مقید ہو گئے۔ میں واٹس روم گیا اور جب وہاں نکلا تو ایس آئی لینڈ کے سامنے لنگر انداز ہونے کی تیاری کر رہی تھی۔ سامنے چار منزلہ ایک خوبصورت عمارت تھی جو اینٹوں پر بننے کے پھروں سے بنی انتہائی دلکش لگ رہی تھی۔ اس نے کنبہ اس کو اور جاذب نظر بنا رہے تھے۔ عمارت اور یہاں کے درمیان گھاس کے قالین بھی تھے جو اس سردی میں لہی اپنا سبز رنگ برقرار رکھے ہوئے تھے۔ چتے درخت تھے، سب کے سب بے برگ تھے۔ یہ عمارت کوئی عام جگہ نہ تھی۔ پانچ سال کے عرصے میں سوا کروڑ تارکین وطن یورپ سے

ایک اسی عمارت سے ہو کر داخل ہوئے تھے۔ ان میں دند، آرٹس، سائنس دان، پروفیسر اور مزدور سب شامل تھے۔ ان کے آنے کے بعد امریکا کی گریٹ ڈپریشن سے گزرا۔ یہاں یہاں بہت تھے اور پھر یہی لوگ پورے امریکا میں پھیل گئے۔ پھر یہاں انہوں نے اپنے جوہر دکھائے۔ زندگی کے ہر شعبے سے لوگ یہاں آئے تھے اور انہوں نے اپنے ہنر یہاں آزمائے تھے جس کی وجہ سے امریکا ترقی کر پھر گئے تھے اور پھر امریکا ایک سپر پاور بننے لگا۔ اگر میں اس ترقی کی تفصیل میں جاؤں تو ایک پوری کتاب درکار ہوگی لیکن اس کو پڑھ کر قاری نازیاہ خوش نہیں ہوں گے۔ اس لیے صرف اتنا کہوں گا کہ امریکا کی زمین سونا اگلنے لگی۔ لیبارٹریوں میں ریسرچ شروع ہوئی اور نئی ایجادات آنے لگیں۔ میڈیکل کے شعبے میں بے تحاشا ترقی ہوئی۔ فلم کے شعبے میں نمایاں کام ہوا۔ مصور، سینئر اور فنکار اپنی اپنی تخلیقات دنیا کے سامنے رکھ رہے ہو گئے۔ موٹر گاڑی اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ صاحب مال لوگوں نے کمال کر دکھایا۔

میں اس عمارت میں داخل ہوا تو اپنے آپ کو ایک بال میں کھڑا پایا جس کی پچھوں پر دلکش ونگار بنے

تھے۔ جو سامان تارکین وطن اپنے ہمراہ لائے تھے، وہاں انڈیا سجا کر رکھا گیا تھا۔ ان کے کس، ریڑھیاں، بستر اور پلڑے رکھے تھے۔ ان ریڑھیوں پر ہی وہ بھاری کبے اٹھا کر لائے تھے۔

میں یہ سامان دیکھ کر اپنے آپ کو سو سال پہلے کھڑا محسوس کر رہا تھا۔ سر جی غائب تھے۔ جب مڑ کر دیکھا تو وہ کاؤنٹر پر کئی لڑکیاں سے باتیں کر رہے تھے۔ شہباز سخت پوریت کی حالت میں اپنی جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالنے ان کے ساتھ کھڑا تھا۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ اپنے سر جی کہیں پھر کسی چکر میں نہ پھنس جائیں اور شہباز ان سے یہ کہہ رہا ہو کہ تم نے یہ کیسا پایا کھڑا کر دیا ہے۔ وہ میرے پاس تقریباً دوڑتے ہوئے آئے اور پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بولے۔ ”کام ہو گیا ہے۔ اب میرے ساتھ چلو۔“

میں نے حیرت سے کہا۔ ”کون سا کام؟“

”میں نے تمہارے بارے میں انہیں کہا ہے کہ یہ پاکستان سے آئے ہیں اور امریکا کے ایٹکریٹس پر کوئی ریسرچ کر رہے ہیں۔“

”ایسا آپ نے کیوں کہا؟“ میں نے پوچھا۔

”بہت رعب پڑتا ہے اور اب وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”یار اکہیں مرواندیتا۔“

”بس تم نے ذرا میری طرح“ وقار سے دہنچا ہے تاکہ انہیں لگے کہ کوئی بہت بڑا دانشور آیا ہے۔“

میں ان کی اس بات پر ہنسا تو وہ بولے۔ ”واٹس درختے نہیں ہیں۔ کہیں میری عزت کا جتانہ نہ نکال دیتا۔“ میں نے پوچھا۔ ”تو پھر کیا کرتے ہیں۔“ تو ان کا متانت بھرا جواب آیا۔ ”چہرے پر سنجیدگی اور تازہ ہوتا ہے اور نظر اپنی سیدھی رکھتے ہیں۔ اس پاس نہیں جھانکتے جیسے آپ تاڑتے رہتے ہیں۔“ میں نے اسی بردباری سے سر ہلایا جس کا انہوں نے مشورہ دیا تھا۔

میں ان کے ساتھ چل پڑا بلکہ وہ اب میرے پیچھے چل کر مجھے ہدایات دے رہے تھے کہ کس طرح سے میں نے بات کرنی ہے تاکہ ہمارا بھانڈا نہ پھوٹ جائے۔

میں کاؤنٹر کے قریب پہنچا بھی نہ تھا کہ اس کے پیچھے سے ایک آدمی اور دو لڑکیاں میرے استقبال کے لیے نکل آئے۔ مجھ سے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ پھر اپنی قسمت پر ناگاہک کہ پاکستان سے ایک محقق صرف تارکین وطن پر اتنا پ

لکھنے کے لیے امریکا آیا ہے۔

اتنے زوردار استقبال پر پہلے تو میں گھبرایا اور پھر اپنے آپ کو تاریخ دان کچھ کرنجیدگی کا ایک خول اپنے آپ پر چڑھا کر سختی سے کس لیا۔

ایک لڑکی جس نے کالی اسکرٹ کے نیچے کالے رنگ کا قمر ل پہنا تھا اور سفید شرٹ میں اپنے پلاٹ بلبوں اور جیکلیے واٹوں کے ساتھ ایک شہزادی لگ رہی تھی، مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”سراہم آپ کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟“

میں نے بھرپور محتاط اختیار کے ایک طویل سوال پوچھا۔ ”یورپ کے کن کن ممالک سے تارکین وطن یہاں پہنچے، ان کے آنے کی وجوہات کیا کیا تھیں اور یہاں وہ کن مراحل سے گزر کر امریکا میں داخل ہوئے؟ مجھے ان کا سال بہ سال کا مکمل ڈیٹا مل جائے تو میں آپ کا بہت مشکور ہوں گا۔“

سریجی کو میرے اس سوال کی توقع نہ تھی۔ ان کی توقعات سے بڑھ کر میں پوچھ بیٹھا تھا اور اب وہ حیرت سے منہ کھولے ہم دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ رضامندی سے سر ہلا کر خوشی راہی ہوئی۔ مجھے اپنے ساتھ آنے کو کہا۔ سریجی اور شہباز بھی ساتھ آنے لگے تو میں نے مڑ کر اسی محتاط سے حکم دیا۔ ”آپ لوگ ہر طور پر جا کر اپنے اپنے نوٹس لیں اور فارغ ہو کر اسی جگہ پہنچ جانا۔“ پھر میں لڑکی کے ساتھ چل پڑا۔ بھی میں نے شہباز کی ایک کیٹیف گئی تھی وہ اب سریجی سے یہی کہہ رہا تھا تم نے یہ کیسا سیالیا کھڑا کر دیا ہے۔ سریجی کی ایک مٹی سی آواز میری ساعت سے غرائی۔ ”یو ایس سی ہوا کہ ہماری ملی ہمیں ہی میاؤں!“

پہلے وہ مجھے پیچھے ایک بڑی لائبریری میں لے گئی۔ فرش سے چھت تک دیواروں کے ساتھ کئی الماریوں میں سینکڑوں کتابیں، رجسٹر اور سالے پڑے تھے۔ میں تو دیکھتے ہی گھبرا گیا کہ کہیں وہ مجھے کتابیں دے کر اس سے نوٹس لینے کا نہ کہہ دے پھر وہ بولی۔ ”ان کتابوں میں تارکین وطن کا سارا ریکارڈ موجود ہے۔ آپ کے تھیسس کے لیے بہت کچھ آپ کو ان میں مل جائے گا۔“

میں سخت پوچھا چکا تھا اور سریجی کی شان میں اندری اندر ”تھیدے“ پڑھ رہا تھا کہ مجھے کہاں لا چھنایا؟ اگر میں ایسے نوٹس لینا بھی چاہتا تو مجھے کئی ہفتے انہیں کھنگالنے میں لگ جاتے مگر اس نے یہ کہہ کر میری پریشانی کم کر دی کہ ”مجھے معلوم ہے کہ آپ کا وقت بہت قیمتی ہے۔ ہم ضروری ریکارڈ کی فوٹو کاپی کر کے آپ کو دے دیں گے۔“ پھر یہ بھی کہا۔ ”اگر آپ کو

کسی اور میٹرل کی ضرورت ہو تو آپ ہمیں ای میل کر دیں فون کر دیں۔ ہم پاکستان میں آپ کو پوسٹ کے ذریعے دیں گے۔“

میں نے مدبرانہ انداز میں اپنا سر ہلا دیا اور سریجی بارے میں اپنے الفاظ واپس لے لیے۔

پھر وہ مجھے لائبریری کے پیچھے ایک بڑے ہال میں آئی۔ ہمارے علاوہ کوئی تیسرا نہ تھا۔ جو رست آتے تھے شا باہری باہر دیکھ کر واپس چلے جاتے ہوں گے۔ اس ہال میں مختلف فلرز ایک ترتیب سے رکھے تھیں جن میں تارکین وطن کی حالت زار بتاتی تھی۔ مجھے بارے قسم اور پر امید چہرے تھے۔ ایک نئی زندگی شروع کرنے کی توجہ بھی اور ساتھ ساتھ دکھ بھی اٹھائے کھڑے تھے۔ بچے، بڑے، بوڑھے، مرد و عورتیں سب، خاندان کے خاندان ایک ساتھ آئے تھے۔

اس کے بعد وہ مجھے دوسری منزل پر سیز جوں سے آئی۔ یہ ایک بڑا ہال تھا جہاں قطاروں میں بہت ساری پیچیدہ پڑی تھیں۔ دیوار کے ساتھ کاؤنٹر تھے۔ تصویروں میں مجھے بتا رہی تھی کہ ان دنوں یہ پیچیدہ آنے والوں سے بھری ہوئی تھیں۔ سب اپنی باری کا انتظار کرتے تھے۔ اپنی باری آئے کے بعد وہ اپنا سامان پکڑے کاؤنٹر پر پہنچ جاتے۔ ان کے کاغذات تیار ہوتے۔ پھر کچھ تصاویر دکھاتے ہوئے بولی۔ ”اس کے بعد ان کا طبی معائنہ ہوتا تھا اور انہیں ویکسین دے جاتی۔ کچھ اور تصاویر دکھائیں جس میں بحری جہازوں سے تارکین وطن سینکڑوں کی تعداد میں بھرے نظر آ رہے تھے۔ عورتوں نے اسکارف سے سر ڈھانپے ہوئے تھے۔ مردوں نے اپنے سروں پر ہیٹ پہن رکھے تھے۔ کسی نے بچا اٹھایا ہوا تھا اور کسی نے اپنا سامان۔ وہ سب ایک لائن میں کھڑے تھے۔ مجھے حیرت آئی جب پھر وہ سریجی کی کہانیاں تصویروں کے پس منظر میں اس وقت بھی منظر میں آئیں کہ وہیں ایسا ہی تھا جیسے آج تھا۔ ایسی ہی بلندہ اور اونچی اونچی عمارتیں ان تصویروں میں نظر آتی تھیں جیسے ہم آج دیکھ رہے تھے۔

پھر مجھے وہ ایک اور ہال میں لے آئی۔ جہاں تارکین وطن کو کھانا دیا جاتا تھا۔

تصویروں دیکھیں جن میں اس بڑے ہال میں کئی ایک میزیں ترتیب سے رکھی تھیں، جن پر صاف و شفاف پلیٹیں تھیں۔ باوردی خانہ سے انہیں کھانا پیش کر رہے تھے۔ ہم دوسرے کمرے میں آئے جہاں شوکیسوں میں ان کا پاسپورٹ اور دوسری قانونی دستاویزات رکھی تھیں۔ ان کے

پہرے اور دوسرا سامان پڑا تھا۔ جو خوراک ان کو دی جاتی تھی، وہ بھی پلیٹوں میں تھی۔ مصنوعی چلوں کے نمونے تھے جو ان دنوں اصل میں دیے جاتے تھے۔ ڈبل لائیاں، آلیٹ، ایلے چاول تک رکھے تھے۔

تیسری منزل پر پولنگ سینٹر تھا۔ بڑے بڑے کمرے ہال میں بینک بینڈ اوپر کھڑے رکھے تھے جو اس وقت استعمال آتے تھے۔ یہ سوئے کی جگہ تھی۔ اس وقت کے واش رومیں جہازوں سے لگے چکر رہے تھے۔ گویا زندگی کی ضرورت کا سامان انہیں مہیا کیا جاتا تھا۔ اس لڑکی کے ساتھ مجھے ڈیڑھ گھنٹہ ہو گیا تھا۔ میرا یہاں آنا تاریک نہ گیا تھا۔ سریجی کا مذاق اس لیے باعث رحمت بن گیا تھا۔ تاریخ میں میری دل ذہن تو ہمیشہ سے رہی ہے اور آج تو مجھے کاغذ بھی ایسا ملا تھا جس سے خوشبو پھوٹی تھی۔ وہ مجھے جو عزت دے رہی تھی وہ بہت کم دیکھوں کو یہاں ملتی ہوگی۔ یہ سریجی کا کمال تھا۔ وہ مجھے اپنی تعلیم دے رہی تھی کہ جیسے میں اسٹنٹ کیسٹ ہوں اور میں می ٹوڑا سا اپنے آپ کو ایسا سمجھنے لگا تھا۔ میری عادت رہی ہے کہ اپنے ساتھ والے کسی بھی انسان سے مذاق کرتا ہوں مگر یہاں مجھے اپنے ”سرے“ کا لالچ بھی رکھنا پڑا تھا۔

ہم نیچے ہال میں آئے تو کاؤنٹر پر ایک بڑا دستہ فوٹو کاپی دہیرے اعزاز میں رکھا تھا۔ مجھے اس لڑکی نے وہ کاغذات دیے ہوئے اپنا کارڈ بھی دیا کہ کسی قسم کی معلومات کی جب میں ضرورت پڑے تو میں اس سے رابطہ ضرور کروں۔ مجھے اس احترام سے رخصت کیا گیا اور جاتے جاتے یہ گزارش ملی کہ اپنے تھیسس کی ایک کاپی ان کو بھی بھیجیں تاکہ وہ اپنی لائبریری کی زینت بنا سکیں۔ میں نے وہ کاغذات اپنے دوستوں کے پردے کیے جیسے وہ میرے اسٹنٹ ہوں۔ وہ کاغذات سریجی اور شہباز نے مل کر اٹھائے اور ہم باہر کھڑی لڑکی میں آ بیٹھے۔ بیٹھے ہی شہباز کا ہانا جو مجھ پر پھینکتے ہوئے ہال۔ ”اپنی رڈی کو اپنے پاس رکھو۔ ہم تو تم نے اپنا منشی بنایا ہے۔“ سریجی بھی شکایتی کاندھے اور منہ بسور کر بولے۔ ”مالا نکہ ہم سب ایک ہی جھلی کے چنے بنے ہیں مگر آپ نے تو باہر اخرج ساتویں آسمان پر رکھ لیا تھا۔“

”مجھے معلوم تھا کہ میرے دوست جانتے ہیں کہ میں سب کرکٹس ایسی مذاق میں کہی تھیں اور وہ اب میرے مذاق پر غور کر رہے تھے۔“

بعد میں ان کاغذات کا جب مطالعہ کیا تو بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئیں۔ مشرقی اور جنوبی یورپ میں وہ لوگ جو

بھوک اور افلاس کے مارے ہوئے تھے یا مذہبی یا پھر ریاتی دہشت گردی کا شکار تھے، وہ سب بیٹوں، گھوڑوں یا پیدل کسی سمندری بندرگاہ پہنچے۔ وہاں سے کسی اسٹیمر پر دو ہفتے میں بحر اوقیانوس عبور کر کے ایس آئی لینڈ پر اتارتے۔ جو امیر ہوتے وہ کسی پرائیویٹ کمپن میں سفر کرتے۔ زیادہ تر شپ کے نچلے حصے میں ہزاروں کی تعداد میں بھرے ہوتے تھے۔ شپ ہمیشہ پرانا اور بوسیدہ ہوتا۔ دو ہفتے کے سفر میں قہرؤ کلاس کے مسافر بد حال ہو جاتے۔ وہ جیسے ہی لینڈی لہریں کو دیکھتے تو کئی خوشی سے رونے لگتے۔ دوسرے اس حصے کو ہاتھ ہلا ہلا کر اس کا شکر یہ ادا کرتے۔ پھر حکم صحت کے افسران جہاز پر آ کر ان کا چیک اپ کرتے۔ سیکلے فرسٹ اور سینڈ کلاس مسافروں کی باری آتی۔ ان کو چند ٹھنڈوں میں فارغ کر دیا جاتا۔ قہرؤ کلاس کے مسافر کئی دن اپنے چیک اپ کا انتظار کرتے رہتے۔ ان کو خوش نصیب گھرانہ جاتا جن کا چیک اپ جلد ہو جاتا۔ اس کے بعد انہیں لائونج میں سامان سے بہت بھر کر ایس آئی لینڈ ایسا جاتا۔ انگریزین افسران میں نمبر یک دے دے اور نئی نئی لائونج بلڈنگ میں جانے کا کہتے۔ بہت سے انگشٹ نہیں بچتے تھے اور وہ پریشان ہر ایک سے پوچھتے کہ یہ آفیسر کیا کہہ رہا ہے۔ یہ لوگ پولینڈ، آئی، ریشیا اور مشرقی یورپ کے ہوتے تھے (آج ان کی اولاد اس اب بننے آنے والوں کو نفرت سے دیکھتی ہیں کہ انہیں انگشٹ نہیں آتی۔ جب ان کے باپ دادا آئے تھے تو وہ انگشٹ کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھتے تھے)۔ سرخ اینٹوں والی عمارت کے مین فلور پر اس کا سامان بے یار مددگار پڑا ہوتا اور وہ اوپر کی منزل پر رجسٹریشن کروانے کے لیے پورا دن یا دو دن تک بیٹھے رہتے۔ ایک جہاز میں تین ہزار تک مسافر بھرے ہوتے۔ عام طور پر اگر ایک شپ آتا تو وہ ایک دن میں فارغ ہو جاتے تھے۔ رجسٹریشن والے ہال کو گریٹ ہال کہا جاتا تھا۔ یہاں ایک دوسرا ڈاکٹر آنے والوں کو دوبارہ چیک کرتا۔ خاص کر آنکھوں کو چیک کیا جاتا۔ جس کی چٹائی بہت کمزور ہوتی یا انہیں کوئی خاص بیماری ہوتی تو اس کو وہاں یورپ بھیج دیا جاتا تھا۔ میڈیکل سب سے اہم تھا کہ مریض میل میں پاس ہو جاتے تو آگے رجسٹریشن کے لیے بھیجا جاتا اور وہاں اسی جہاز میں روتا چٹتا انہیں واپس کر دیتے۔ اس ہال میں تین چار ہزار لوگوں کا شور برپا ہوتا اور کان پڑی آواز بھی بمشکل سنا کی دیتی تھی۔

ہر ایک سے چند مخصوص سوالات پوچھے جاتے کہ کہاں سے آئے ہو، کس شہر جاتا ہے، کس جرم میں کبھی پکڑے گئے۔

ہو، کتنی رقم ساتھ ہے، شادی شدہ ہوادر ہو تو کتنے بچے ہیں اگر کوئی جواب غلط پایا جاتا تو اس کو واپس بھیج دیا جاتا۔ حیرت ہے کہ یہ سوالات اسی طرح اب بھی پوچھے جاتے ہیں اور غلط بیانی پر وہی سلوک ہوتا ہے جو پہلے ہوتا تھا۔

جن کو امریکا میں رہنے کی اجازت مل جاتی تو وہ خوشی خوشی ایک اور کمرے میں لائے جاتے۔ اجازت ملنے پر بھی تو مہینے لگ جاتے اور وہ اسی دوران ہولڈنگ سینٹر میں اوپر قید رہتے تھے۔ اجازت ملنے پر وہ پیچھے آتے۔ مددگار موجود ہوتے۔ منی ایکسچینج (Exchange Money) والے ان سے ان کی کرنسی کے بدلے امریکن ڈالر دیتے۔ وہیں ڈاکٹرنہ بھی تھا اور ٹرین کے کنک بھی دیں سے ملنے جنہیں کسی اور شہر کو جانا ہوتا۔ یہاں سے وہ اس ہال میں آتے جہاں ان کے وہ عزیز انتظام میں کھڑے ہوتے، جوان سے پہلے امریکا آچکے تھے۔ اس ہال کو کنک ہال کا نام دیا گیا تھا۔ جب یہ چھڑے آپس میں گلے ملنے تو خوشی سے نعرے لگاتے اور ظاہر ہے چوہا چانی بھی کرتے تھے، اسی لیے تو اس ہال کا نام کنک ہال پر گیا تھا اور پھر یہ سزا ختم نہ ہو تا اور وہ شادمان ہوتے کیونکہ وہ اب امریکا میں تھے۔ میں یہ لکھتے ہوئے اب بھی سوچ رہا ہوں کہ سو ڈیڑھ سو سال پہلے بھی امریکا آنا بہت سے لوگوں کا خواب تھا اور آج بھی ہے۔ کل رہتا ہے یا نہیں یہ اللہ ہی جانتا ہے۔

مجھے چہ بچے سے پہلے طارق کی فارمی پتہ پتہ تھا۔ میں سرہی اور شہباز کو بھی لے آیا تھا اور ان کے ساتھ مظنوں کی ایک سب دے پر کھڑا تھا۔ چہ پہلے ہی بجے تھے۔ مجھے طارق کے گھر تک ولی اسٹریٹ پہنچنا تھا وہیں کھڑے کھڑے ان دونوں سے کہا کہ کل دس بجے سینٹرل پارک ویسٹ اور 77th اسٹریٹ کے کارپریٹس گئے۔ ان کو نہیں بتایا تھا کہ میرا نیچرل ہسٹری میوزیم دیکھنے کا ارادہ ہے ورنہ وہ دونوں بھڑک جاتے اور ساتھ جانے سے انکار کر دیتے۔ سرہی نے ایک بار پوچھا بھی۔ ”کیا وہ رشتہ شوق دانی جگہ ہے؟“

میں نے جواب دیا تھا۔ ”وہاں سینٹرل پارک ہے، جہاں اس موسم میں بھی لڑکیاں نیکریں پہنے کھڑی ہیں۔“ سردی سے ٹھہرتے ہوئے انہوں نے مجھے شک بھری نظروں سے دیکھا اور کہا۔ ”انہیں سردی تو لگتی ہوگی؟“ میں نے جواب دیا۔ ”وہ دراصل اسکن کلر کا قمرل بہنتی ہیں اور پتا بھی نہیں چلا کہ کچھ پتا ہوا ہے۔“

یہ سن کر وہ کہنے لگے۔ ”پھر تو بہت زیادہ روٹی ہوگی اگر

برف باری ہوتی تو اور زیادہ مرہ آتا۔“

ٹرین پر سوار ہوتے ہوئے میں نے ان دونوں سے کہا۔ ”اپنے رات کے کپڑے اور ضروری سامان بھی لیجے آئیں، شاید رات ڈاکٹرنہ میں گزارنا پڑے۔“

یہ سن کر وہ دونوں ایک ساتھ بولے۔ ”وہ کیوں؟“

میں نے کہا۔ ”رات کو ٹائم اسکوائر کی رونقیں کیا نہیں دیکھنی؟ اور کل دیکھنا بھی ہے۔“

دونوں کی نظروں میں ایک چمک سی آئی تھی۔

میں ایس آئی لینڈ میں پیش کیے گئے نوٹس لیے جسے طارق کے گھر پہنچا تو وہ پریشان ہو گیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ ”کہاں رہ گئے تھے؟ کم از کم فون تو کر لیتے۔“ پھر میرے ہاتھوں میں کاغذوں کا بوجھ دیکھا تو پوچھا۔ ”یہ کیا ہے؟“

میں نے جب تفصیل بتائی تو بھڑک کر کہنے لگا۔ ”تمہارا تو دماغ خراب ہے۔ لوگ تفریح گاہوں میں کھوئے جاتے ہیں اور تم کہاں پھر رہے ہو؟“ پھر پوچھنے لگا۔ ”ایس آئی لینڈ کہاں پر ہے؟“ میں نے جب بتایا تو اس نے کہنے لگا۔ ”خدا کا قسم، میں نے آج تک اس کا نام ہی نہیں سنا۔ معلوم نہیں تم کون ان جگہوں کے بارے میں جانتا ہے؟“

جب میں نے پوچھا۔ ”تم لبرٹی آئی لینڈ کتنی بار گئے، تو جواب دیا۔“ بارہ سال پہلے جب بنایا آیا تھا، تب ایک با

میں نے پوچھا۔ ”کیا اور پڑھے تھے؟“

”میرا دماغ خراب تھا؟ بس دور سے دیکھا اور واپس آ گیا۔ بہت بورنگ تھی۔“ پھر ایک لمبی چپکے مار کر کہنے لگا۔ ”تم کو اطلاع کئی کے کسینو لے جاؤں گا۔ کچھ دیکھنے کی جگہاں دیکھو۔ معلوم نہیں کیا کیا دیکھ رہے ہو؟“

جب میں نے یہ بتایا کہ کل میں نیچرل ہسٹری میوزیم دیکھنے جاؤں گا۔ تو وہ اپنا سر ہٹ کر بیٹھ گیا اور تنہا بیٹھ جاتا تھا۔

کچن سے آیا جو ہاں کھڑی ہماری تین رہی تھیں۔

طارق کہنے لگا۔ ”میں قسم اٹھا کر کہتا ہوں کہ پچھلے سا سال سے جتنے بھی پاکستانی یہاں آئے، کسی نے بھی ایس آئی لینڈ کی عجائب گھر جانے کا اظہار نہیں کیا۔“

پھر بولا۔ ”تم پہلے پاگل ملے ہو جو ایسی بورنگ جگہ جارہے ہو۔“

جب میں نے یہ بتایا کہ شاید کل رات ہم ڈاکٹرنہ میں گزاریں تو وہ اور زیادہ بھڑکے لگا۔

میں نے کہا۔ ”ہم رات کو ٹائم اسکوائر دیکھنا چاہتے

...

وہ بھٹلا کر بولا۔ ”وہ میں تمہیں لے جاؤں گا۔ رات کو وہاں نظرہ ہوتا ہے، تم اکیلے مت جاؤ۔“ اس نے مجھے ڈرایا، بھائی اور دھمکایا۔ پھر جب یہ دیکھا کہ میں اس سے کس نہیں ہوتا تو آخر میں ہتھیار ڈال کر کہنے لگا۔ ”تمہارے اور ہمارے دوستوں کے لیے میں ٹائم اسکوائر کے ساتھ کوئی دکان کھول دیتا ہوں۔“ میں نے اس سے کہا کہ تم بھی اسے ساتھ چلو تو جواب میں مجھے سرخ آنکھوں سے صرف کھرتے رہ گیا۔

پھر اس نے انٹرنیٹ پر 8th اونڈو، سینٹ لیس اسٹریٹ تین بیڈ کا ایک کمرہ کرایا دیا۔ کہنے لگا۔ ”آخر تم میوزیم دیکھو کیوں دیکھتے ہو؟ اور بھی بہت سی جگہیں ہیں جہاں تم اور ہمارے دوست بھی جا کر خوش ہوں گے۔“

انہیں معلوم نہ تھا کہ میری دلچسپی تاریخ سے کتنی زیادہ ہے۔ میں عام طور پر ان جگہوں سے دور رہتا ہوں جہاں بہت زیادہ شور شراب ہو۔ ایک ہی بار ایسی جگہ کو دیکھنے جاتا ہوں مگر بارہ جانے سے ہمیشہ کتراتا ہوں۔ ایک بار صرف اس لیے جاتا ہوں کہ اگر کچھ لکھنا چاہوں تو مستند معلومات میرے پاس ہوں۔

ہسٹری کو کبھی میرا مضمون نہ تھا۔ میں نے میڈیکل کے ڈیٹ پڑھے تھے مگر ہر علاقے کی تاریخ سے مجھے بہت لگاؤ رہی ہے۔

میرے کینیڈا آنے سے چند ماہ پہلے کا واقعہ ہے۔ میرے شہر ڈیرہ اسٹریٹ خان کے ساتھ ٹاک شہر ہے۔ اس کے مدد ساتھ وزیرستان ہے۔ مجھے کہا گیا کہ ٹاک، جنڈولہ اور اٹا کے کیسٹ شاپ کے مالکان کو ایک ورک شاپ دینی ہے۔ فارمی کونسل نے میرا انتخاب کیا ہے۔ ورک شاپ کے مدد ان کا نمٹ ہوتا تھا اور جو پاس ہو جاتا اسے میڈیکل اسٹور ہاؤس مل جاتا تھا۔ میں روزانہ ٹاک جاتا اور سو سے زائد میڈیکل اسٹور کے مالکان کو پوچھتا کرتا تھا۔ سب استحقاق میں ہونے کے لیے میرے لیے تحائف لانا شروع ہو گئے۔ ولی کپڑے لے کر آ رہا تھا اور کوئی جریساں اور کوئی ڈرائی وٹ۔ میں نے انکار کر دیا۔ ایک دو تو بھول اور کلاٹھکوف می لے آئے۔ میں نے پہلی بار جنڈر گریڈ اس دن دیکھا جب صاحب نے کہا۔ ”سر یہ آپ رکھ لیں، کام آئے گا۔“ گریڈ دیکھ کر ہی میری روح فنا ہو گئی۔ قلم سے دلچسپی والے کے لیے گریڈ کو چھوٹا ایک عذاب سے کم نہیں۔

میں نے سب کچھ بھی لینے سے انکار کر دیا۔ آخر تک آکر ان کا نمائندہ بولا۔ ”یہ سب بطور تحائف کچھ دینا چاہتے ہیں۔ آپ خود بتائیں کہ آپ کو آخر کیا پسند ہے؟“

مجھے معلوم تھا کہ اس پاس آنا قدرتی میری کچھ دریافت ہوئی تھیں۔ میں نے ان کے لیڈر سے کہا کہ اگر ہو سکے تو ان مقامات پر مجھے لے جائیں۔ وہ پٹھان تھے سب کے سب بکا بکارہ گئے کہ کوئی یہ فرمائش ہے؟

دوسرے دن تین بڑی بڑی گاڑیاں آگئیں۔ بندوق بردار گارڈز بھی تھے۔ مجھے ایک گاڑی کے آگے بٹھایا گیا اور شہر سے دور ایک نیلے پرلے جاکر بولے۔ ”یہاں پر بارش کے بعد علاقے والوں کو اکثر پرانے برتن ملنے رہتے ہیں۔“ باقی سب نیچے کھڑے ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر مگر مگر ہے تھے اور میں نیلے پر چڑھائی کھود کر ٹیکریاں اٹھائی کر رہا تھا۔ وہ حیرت سے بھی اپنے کان سمجھتے، کبھی منہ پھر کر توڑا سا مسکرا دیتے اور پھر ایک دوسرے کو نشانہ بننے کے اشارے کرتے۔ دو گھنٹے میں اس ڈیمیری سے بھٹکنا شروع کر رہا ہوں۔

دوسرے دن میں کلاس میں آیا تو کوئی میرے پاس آکر مجھے نوادرات پیش کرنے لگا۔ یہ ان کے گھروں میں رکھی تھیں۔ بہت سے لوگ پتھروں کے چھوٹے بت لائے تھے۔ کچھ لوگ مٹی اور کاہر کے پرانے برتن گھروں سے اٹھا لائے تھے جن پر پرانے بادشاہوں کی تصویریں اور جانوروں کی شکلیں کندہ تھیں۔ کچھ لوگ پرانے سکے لائے جن پر شیر شاہ سوری کی تصویریں تھیں۔ غرض کہ میرے پاس جتنی نوادرات کا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ مجھ سے اپنی خوشی چھپائے نہیں چھپتی تھی۔ وہ سب اس بات پر خوش تھے کہ قیمتی تحفوں کے بدلے یہ ناکارہ اشیاء دے کر ان کی جان بچھوٹ گئی ہے۔ وہ سارا سامان انہوں نے میرے گھر پہنچا دیا۔

بیوی نے جب بت اور پرانے برتن دیکھے تو فساد ڈال دیا کہ میں کفر کی علامتیں گھر میں کیوں لے آیا ہوں۔ میں انہیں کینیڈا اس لیے نہ لاسکتا تھا کہ قیمتی نوادرات کو ملک سے باہر لے جانا جرم ہے۔ پھر میں نے سب چیزیں چھپا کر کہیں رکھ دیں۔ میں کینیڈا آیا تو بیوی نے میرا وہ قیمتی اثاثہ میرے بچے کو دے کر دریا سندھ میں بہا دیا تاکہ اگر کوئی بدروح یا غوسٹ ان سے جڑی ہو تو ہمیشہ کے لیے غرق ہو جائے۔ یعنی ایک ہی مسئلے میں بیگم نے قیمتی نوادرات سے محروم کر دیا۔

کل کے پروگرام سے پریشان بیٹھا مجھے مٹھن میں رات کے خطرات سے آگاہ کر رہا تھا۔ میں پورے دن کا تھا کہ ہوا تھا۔ صبح پھر جلدی اٹھتا تھا اور اسی لیے میں سونے کے لیے تہ خانے میں چلا گیا اور پھر اسی مٹھن شریک وجہ سے اوپر لی وی لاؤنگ میں صوفے پر آسویا۔

دوسرے دن میں میوزیم کے سامنے اپنی متفقہ جگہ پر کھڑا ان دونوں کا انتظار کر رہا تھا۔ میرے بیک پیک میں میرا رات کا لباس تھا۔ پانی کی بوتل بھی اور تنہا بھائی نے آلو کے پراٹھے بھی بنا کر بیک میں رکھ دیئے تھے۔ آج بھی موسم کل کی طرح تھا۔ زیادہ سردی نہ تھی جو بے آرام کرتی۔ سب سے پہلے سرخی خراماں خراماں آتے نظر آئے۔ آتے ہی سلام دعا کے بعد بولے۔ ”لگتا ہے شہباز کھک گیا ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”وہ کیوں؟“
”کل بھی وہ بڑا بڑا تھا کہ ندیم بھائی ہمیں عجیب گھر دکھانے لے جاتے ہیں۔ پرانی چیزوں سے ہم نے کیا لینا؟“ وہ شہباز کے قصیدے پڑھ رہے تھے کہ اس کی چیز کی قدر و قیمت کا اندازہ بھی نہیں ہے اور مجھے دیکھو، میں تو یہ سب دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہوں۔ وہ بھی باتیں کر رہے تھے اور شہباز پیچھے آکھڑا ہوا تھا۔ یہ سب سن کر بولا۔ ”سرخی! خدا کا خوف کرو۔ یہ سب تو آپ کہہ رہے تھے۔“

سرخی اسے اچانک پا کر بڑا گھمے اور بولے۔ ”میں تو تمہارا دل رکھنے کے لیے تمہاری ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔“ سرخی نے بات کا رخ بدلا اور کہنے لگے۔ ”وہ راجا اندر کا اکھاڑ کہاں ہے؟“

شہباز تھلا کر بولا۔ ”ہم کوئی گوجرانوالہ کی سیر کو آئے ہیں جہاں اکھاڑے ہوں گے؟“

اس پر سرخی کہنے لگے۔ ”میرا مطلب یہ تھا کہ وہ جگہ کہاں ہے جہاں تیسریں اس موسم میں، نعوذ باللہ اللہ لگی گھومتی ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”وہ دوپہر کے بعد آتی ہیں۔ اس سے پہلے انہیں آنے کی اجازت نہیں ہوتی۔“

سرخی چلا کر بولے۔ ”تو اس دوران کیا کریں گے؟ وہ چلا اس لیے رہے تھے کہ آتی جاتی بسوں کا شور تھا۔ ہمارے سامنے چار بڑے ستونوں کے بیچ ایک بڑا دروازہ میوزیم کا تھا۔ اس دروازے تک متعدد سڑکیاں جاتی تھیں۔ ہر ستون کے اوپر ایک پتھر کا مجسمہ تھا۔ دروازے کے عین سامنے ایک چبوترے پر کسی گھڑسوار کا مجسمہ تھا اور مین گیٹ کے دونوں

جانب ایک لمبی اور پرقا عمارت کھڑی تھی۔ میں اسی میوزیم پہنچا۔ دو کچھ کر حیران ہو رہا تھا۔ ہمارے پیچھے سینٹرل پارک تھا۔ پارک کے درخت بغیر چوں کے اجڑے اور اس کا کڑے تھے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ جس نے سینٹرل پارک نہیں دیکھا اس نے نیو یارک نہیں دیکھا۔ مگر میری اپنی نظریں میوزیم پر تھیں۔ ان دونوں کو ابھی تک اندازہ نہ ہو سکا تھا کہ وہ دنیا کے مشہور اور تاریخی عجائب گھر کے باہر کھڑے ہیں۔ مجھے اصرار دیکھتے ہوئے سرخی بولے۔ ”یہ کوئی بڑا ہول لگتا ہے؟“

شہباز نے اب ذرا غور سے دیکھا تو چیخ پڑا۔ ”یہ تو میوزیم ہے۔“

اب سرخی بھی میوزیم کا نام سن کر لرز گئے اور ان کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ سوالیہ نظروں سے پوچھنے لگے۔ ”ہمیں یہ دکھانے تو نہیں لے آئے؟“

میں مجرموں کی طرح خاموش کھڑا تھا اور وہ مجھے گھبراہٹ سے جھانک رہے تھے۔ میں ان سے مخاطب ہوا اور بولا۔ ”آپ دونوں کو معلوم ہے کہ ہم نیو یارک کیوں آئے ہیں؟“

شہباز بولا۔ ”مگر ہم صرف میوزیم دیکھنے نہیں آئے۔ اب اصل بات کرو۔“

سرخی کہنے لگے۔ ”ہمیں تو تم نے بتایا تھا کہ یہاں تیسریں ایسے لباس میں پھرتی ہیں کہ نہ میں پانی آجاتا ہے اور یہاں آپ نہیں جانا گھر لے آئے ہیں۔“

میں نے سرخی کے کندھے پر نرمی اور خوشامدی انداز سے ہاتھ رکھا اور بولا۔ ”پہلے میری بات مکمل سنو اور پھر مرضی ہوگی دوستوں کی میں دہی کروں گا۔“

وہ دونوں خاموشی سے میری بات سننے لگے۔ میں نے کہا۔ ”نیو یارک صرف مٹھن ہے اور وہ بات کچھ نہیں، ہم اس کو کھنگالتا ہے۔“

شہباز بولا۔ ”وہ بھی ایک دن میں اور سارا دن اسی کے اندر گزر جائے گا۔“

میں نے لہجے میں کچھ بھکاری پن ڈالا اور بولا۔ ”ہم ایک یا دو رات ڈاکن ٹاؤن میں کسی ہول میں ٹھہریں گے۔ اور اب میں نے اصل پتا پچھنا کا اور کہا۔“ میرے کزن نے آپ دونوں کے لیے ہول کی دو رات کی بکنگ بھی کروائی ہے۔ ہم ٹائم اسکوائر کے علاوہ سینٹرل پارک بھی دیکھیں گے۔ رات کو آپ کو ریڈ ایریا بھی دکھاؤں گا اور میڈیسن اسٹریٹ دیکھیں گی ہول کی دکانیں بھی آپ دیکھیں گے۔“

حالانکہ طارق نے ایک رات کی بکنگ کروائی تھی۔

نہ سوچا کہ اگر دوسری رات کے تو میں خود ادا ہو چکی کروں گا۔ منت کے ہول پر ان دونوں کے چہرے کا تاؤ کم ہوا مگر شہباز نے کہا۔ ”پہنٹ بھی تو بھرتا ہے۔ کھانا کہاں سے کھائیں گے؟“

میں نے کہا۔ ”اس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ یہاں مال کھانا بھی مل جاتا ہے اور سستا ہے۔“

سرخی بولے۔ ”سستا کیسے ملے گا؟ یہاں کیا کوئی پکوان پھیلے لگے ہوتے ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں حلال کھانوں کے ٹیلے بھی چوکوں میں لگے ہوتے ہیں اور آپ لوگوں کو لاہور یاد آجائے گا۔“

وہ مجھے بے یقینی سے دیکھنے لگے۔ مجھے طارق بتا چکا تھا کہ ڈاکن ٹاؤن میں پاکستانی ریزہ جیوں پر بہترین کھانا لگاتے ہیں۔ گرم نان، کٹے اور کباب بہت سستے ریٹ پر مل جاتے ہیں۔

شہباز اب مجھے بلیک میل کر رہا تھا بولا۔ ”کھانا بھی تمہارے ذمے ہوگا۔“ میں نے ہائی بھر لی۔

سرخی بولے۔ ”اور وہ تیسریں؟“

میں نے کہا۔ ”وہ سب کا اپنا اپنا تعصب۔“

اس طرح وہ رام ہوئے۔

سرخی بولے۔ ”جلدی کریں۔ رات ٹھوڑی اور سوانگ بہت ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”اس کا مطلب تو سمجھائیں۔“ تو بولے۔ ”آپ لوگوں نے سارا وقت انگریزی سیکھنے میں لگا دیا

ان لیے اردو کا ایک لفظ بھی آپ کی کچھ میں نہیں آتا۔ میرا مطلب یہ تھا کہ وقت کم ہے اور تمہیں بہت دیکھنی ہیں۔ جلدی کریں۔“

اب وہ میرے رحم و کرم پر تھے لیکن میں نے ان کو پھر ”نہن کے“ وہ رنگ دکھائے کہ اب بھی یہی کہتے ہیں کہ جو مزہ اس وقت کھوئے گا آتا تھا، پھر کبھی نہیں آیا۔

ہم چلتے ہوئے میوزیم کے مین گیٹ کے سامنے اٹھڑے ہوئے۔ ہم اس کی ساخت، رعب و دبدبہ دیکھ کر رعب ہو گئے۔ اتنی بڑی اور شاندار عمارت اور اس کی بناوٹ

ایک کرم حیرت زدہ کھڑے تھے۔ وکٹوریہ گوتھک ڈیزائن پر مبنی عمارت 1874ء میں تعمیر ہوئی جب ہم اپنی جنگ آزادی

رہا تھا، انہی دنوں بریٹن فورڈ یونیورسٹی بن کر تیار ہو چکی تھی۔ اب بھی اگر ہم اپنے پیارے ملک پاکستان میں دیکھیں تو اس وقت موجود سارے میوزیم انگریزوں نے بنائے تھے۔ بات بڑھ کر کہیں اور نہ نکل جائے، اسی لیے میں واپس نیو یارک آپ لوگوں کو لے آتا ہوں۔

اس شاندار عمارت کو دیکھ کر اب مجھے یقین ہو رہا تھا کہ واقعی یہ دنیا کا سب سے بڑا ہسٹری میوزیم ہے۔ ویسے تو شاہ گولڈ ہسٹری میوزیم میں کئی بار دیکھ چکا ہوں مگر جو بات نیو یارک کے میوزیم کی ہے، وہ کسی اور ہسٹری میوزیم کی نہیں ہو سکتی۔ مجھے پیرس کے ڈی لورے میوزیم نے اس سے زیادہ متاثر کیا مگر وہ آرٹ کے شہ پاروں سے بھر پڑا ہے۔

سولہ لاکھ مربع فٹ پر محیط نیو یارک کے ہسٹری میوزیم کی یہ وسیع و عریض عمارت اپنی بناوٹ میں اتنی شاندار و کھتی ہے کہ دل چاہتا ہے کہ اس کے سامنے بیٹھ کر اس کو دیکھتے رہیں۔ مین گیٹ پر کھڑے ہر سوار، ہر امریکی صدر، روز ویٹ کا ہے جو خود قدرت کی نیکیوں کا شوق رکھتا تھا۔ مجھے آج ایک فلم یاد آ رہی ہے جس کا نام ”نائنٹھ ان میوزیم“ ہے۔ ایک سٹیورٹ رلی گاڈ رات کو اس میوزیم کی چوکیداری پر آتا ہے اور رات کے آخری پہر اس میوزیم کے سب کردار زندہ ہو جاتے ہیں۔ سب جانور اور انسانی تہذیبوں کے کردار کھڑے دوڑاتے اس کے برآمدوں میں بھاگے پھرتے ہیں۔ ڈائنو سارز زندہ ہو جاتے ہیں اور دو دروز ویٹ بھی کھڑے سے اتر کر گاڑے کو کھنگتو ہو جاتا ہے۔ صبح نکلنے سے پہلے وہ سب دوبارہ شویکسوں میں جج جاتے ہیں اور سب کچھ پہلے جیسا ہو جاتا ہے۔

سرخی اور شہباز بھی میری طرح حیرت سے اس کی بیرونی بناوٹ کو دیکھ رہے تھے۔ پتھروں سے بنی اس عمارت کے اونچے اونچے برج اور ان میں سے باہر نکلی بالکونیاں اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی تھیں۔ محرابیں اور کشادہ سڑکیاں اور لمبی کھڑکیوں نے ہمیں مسحور کر دیا تھا۔ بہت سے لوگ سڑکیوں پر بیٹھے تھے کچھ سگھٹ بی رہے تھے۔ کچھ نے کتابیں کھولی ہوئی تھیں اور اس میں غرق تھے۔ کچھ ایسے ہی بیٹھے دھوپ سیننے کی کوشش کر رہے تھے۔ سب دنیا دہانیا سے بے خبر مطمئن اور خوش بیٹھے تھے۔ سرخی کہیں بھی خاموش نہ رہ سکتے تھے۔ سڑکیوں پر بیٹھے ان بے فکر لوگ کو دیکھ کر مجھ سے پوچھا۔ ”یہ لوگ عجائب گھر دیکھ آئے ہیں یا انہی اندر جا رہے ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”معلوم نہیں، پر لگتا ہے کہ دیکھ آئے ہیں ورنہ اتنے آرام سے نہ بیٹھتے ہوتے۔“

سرجی انہیں طنزیہ انداز سے دیکھ کر بولے۔ ”آسودہ تو ایسے بیٹھے ہیں جیسے مغفران کے کھیت دیکھا آئے ہوں۔“

شہباز ہمیں ہکا کر کے کہتے ہوئے اندر لے گیا۔ ”جگہ اچھی لگتی ہے، درختیں کرنی چاہیے۔“

ہم لابی میں داخل ہوئے تو اس میں ڈانٹو ساز کے زمین سے لے کر بلند چھت کو چھوٹے بختہ کھڑے تھے۔ ارد گرد کاؤنٹر پر مستعد عملہ کھڑا ایک سے خوشگوار سی پیش آ رہا تھا۔ ایک کاؤنٹر پر برادر اور میز زم کے نقشے بنائے جارہے تھے۔ میں نے پہلے وہ چکرے۔ سرجی شہباز سے پوچھ رہے تھے۔ ”یہ ڈانٹو ساز انڈے دیتے ہیں یا بچے؟“

شہباز نے ان کی انجینئرنگ کو گالیاں دیں اور کہا۔ ”تمہارے سائز سے بھی دو گنا بڑے انڈے دیتے تھے۔“

سرجی بولے۔ ”میں کہتا ہوں تمہارے اپنے سائز جتنے بڑے انڈے دیتے تھے۔ بات کو گھما کیوں رہے ہو؟“ یہ بہر سرجی کی سوچ میں ڈوب گئے اور جب باہر نکلے تو بولے۔

”ان کے ایک انڈے کا کتنا بڑا اعلیت بننا ہوگا؟“

شہباز بولا۔ ”ڈانٹو ساز کا انڈا حرام ہوتا ہے۔“

سرجی کہاں ماننے والے تھے۔ طنزیہ انداز میں کہنے لگے۔ ”حرام کیسے ہو گئے؟ اس وقت تو اسلامی نظام بھی نہیں آیا تھا۔“

میں نے دیکھا کہ اگر اسی طرح وقت ضائع ہوتا رہا تو ہم یہ میوزیم ایک دن میں ادا بھی نہیں دیکھ سکیں گے۔

میں نے انہیں وقت کی نزاکت کا احساس دلایا۔ اپنے بیک پیگ سے ڈائری اور چن نکالا اور چھتوں پر لگے متعل شیشوں سے آتی سورج کی روشنی کو ایک نظر دیکھ کر پھر نقشے کو دیکھا اور اندر داخل ہو گیا۔

اس میوزیم کے پینتالیس نمائش بڑے بڑے ہال ہیں۔ ان کے پاس تین کروڑ سے زیادہ چیزیں ہیں جن کی نمائش کی جاتی ہے۔ ایک وقت میں میں لاکھ چیزیں نمائش کے لیے رکھی جاسکتی ہیں۔ کچھ دنوں بعد ایک کی جگہ دوسری اقسام لے لی جاتی ہیں۔ اتنی بڑی عمارت میں اتنی جگہ نہیں ہے جس میں تمام اقسام ایک ساتھ رکھی جاسکیں اور میں لاکھ میں سے آپ دو ہزار چیزیں بھی ایک دن میں دیکھ لیں تو بہت بڑی بات ہے۔ دیکھ دیکھ کر انسان تھک جاتا ہے۔ کم از کم دو مکمل دن آپ کو چاہیں، اس میوزیم سے کچھ آگاہی حاصل کرنے

کو۔

ایک جانب تیلیوں کی نمائش لگی تھی۔ ہم اسے چھوڑ کر سامنے ایک نیم تاریک ہال میں داخل ہوئے۔

اس نیم تاریک ہال میں ہم جیسے ہی داخل ہوئے توچ میں لکڑی کے ایک بڑے پلیٹ فارم پر آٹھ افریقہ بھی تھے۔ ان کا انداز ایسا تھا۔ جیسے کسی جنگل کو سمار کرنے جارہے ہوں۔ آنکھوں میں غصہ، سوغڑیں تھیں اور کان کسی کے کھلے اور کسی کے لپٹے ہوئے تھے۔ محسوس بھی نہیں ہوتا تھا کہ یہ اصلی ہیں یا کاپی۔ ہم ان کے قدموں میں بونے لگ رہے تھے۔ سرجی ٹھکھٹا کر بولے۔ ”متم سے پورا جسم لرز رہا ہے۔“

بلکی بلکی روشنی تھی اور وہ بھی ان شوکیوں سے باہر آتی ہوئی جو ہال کے دونوں جانب تھے۔ ان میں افریقہ کے جانوروں کو ان کے قدرتی ماحول میں دکھایا گیا تھا۔ روشنیوں کے صوتی اثرات نے ایک قدرتی ماحول پیدا کر دیا تھا۔ ہم ایک لمبے میں غو یارک سے کسی ٹائم شین کے ذریعے افریقہ کے جنگلات اور وسیع صحراؤں میں جانوروں کے سچ آگئے تھے۔ صحراؤں اور جنگلات میں جنگلی حیات کو اپنے قدرتی ماحول میں اس ایسے انداز میں دکھایا گیا تھا کہ انسان دیکھتے ہی خود کو وہیں محسوس کرنے لگے۔

ایک لمبی ودی بیابان میں شیروں کا ایک غول کھڑا ہے۔ ایک نر اور بانی مادہ تھے۔ بہت سے شیروں کے بچے ارد گرد گھومتے نظر آ رہے تھے۔ سرجی بولے۔ ”شیر کی زندگی ہر انسان کو چینی چاہیے۔“

شہباز نے پوچھا۔ ”وہ کیسے؟“

وہ بولے۔ ”ایک مرد ہے اور کتنی بیویاں اور بچے ہیں۔“ پھر رشک کرتے ہوئے بولے۔ ”شکار بھی شیر کی بیویاں کرتی ہیں، خود پورا دن کھانیاں اڑاتا رہتا ہے۔“

میں نے دیوار پر معلق ایک تحریر پڑھتے ہوئے کہا۔ ”اسی لیے تو پندرہ سال ہی زندہ رہ سکتا ہے اور آخری عمر میں تو کبھی بھی نہیں اڑا سکتا۔“

یہ سن کر شہباز کی طرف بغور دیکھتے ہوئے بولے۔ ”اسی لیے تو کہتے ہیں کہ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔“

اس بات پر شہباز کو بخشنے کی کوئی ضرورت نہ تھی مگر وہ اس لیے بحث پڑا کہ گیدڑ کہتے وقت سرجی اسے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

پھر کہیں دکھایا گیا تھا کہ کلی منہارو پہاڑ کے پس منظر میں

نی گینڈے کھڑے ہیں۔ بارش ہو رہی ہے اور ہوا میں بھی پانی دکھائی دیتی ہیں۔ صوتی اثرات سے پانی چپکنے کی آواز کے چلنے کی آواز میں ہم بھی سن رہے تھے۔ روشنیوں کی اختراں سے شام کا منظر اور دھواں دکھایا گیا تھا اور ہم تحریر سے کلی بخارو کے سامنے میں خود کو کمزور محسوس کر رہے تھے۔ لیسیا کا صحرا تھا جہاں بکولے لٹھ رہے تھے۔ کہیں سرسبز و ٹاداب جنگلوں میں گوریلے کھڑے تھے۔ سرجی نے پھر شرارت کی اور شہباز سے پوچھا۔ ”یہ گوریلے جنگلوں میں کیوں رہتے ہیں؟“

شہباز انہیں گھور کر بولا۔ ”تو کیا ہمارے ساتھ آ رہے ہیں؟“

اپنی نظریں اب انہوں نے شوکیں میں کھڑے گوریلے پر رکھیں اور منہ پھیر کر دے لفظوں میں بولے۔ ”ہم بھی تو اٹھتے رہ رہے ہیں، میں نے تو کبھی اعتراض نہیں کیا۔“

میں نے شہباز کو اشارہ کیا کہ وہ کچھ نہ کہے اور خاموش رہے۔ وہ خاموش رہا تو سرجی اب حیران کھڑے تھے کہ جواب کیوں نہیں آیا۔ انہوں نے متعدد بار شہباز کو دیکھتے ہوئے گوریلے کا پلاٹا پھیر بھی جواب نہ آیا تو حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگے۔ میں خود بھی خاموش تھا اس لیے وہ بلند آواز میں بچنے لگے پلیٹ پر لمبی تحریر پڑھتے ہوئے بولے۔ ”یہ آٹھ فٹ لمبا ہوتا ہے، چار سو پاؤنڈ وزن ہوتا ہے، پانی نہیں پیتا بلکہ پتوں اور پھلوں سے پانی حاصل کر لیتا ہے۔“

شہباز ٹھٹھا کر بولا۔ ”ذرا نیچے دیکھو، یہ بھی لکھا ہے کہ گوریلے کا پوتا دو دھن جلیبیوں بھی ڈال کر کھاتا ہے۔“

یہ سن کر تو انہوں نے اس بات کی بنیاد بنا کر فساد شروع کر دیا کہ میرے دادا کو شہباز نے گوریلے کا پلاٹا کھاتے۔

بجنگل انہیں خاموش کر کے رکھا۔ بڑا مختلف شوکیوں میں شتر مرغ، زبیر، ہرن، بارہ ٹکے اور دوسرے افریقی جانور اپنے قدرتی ماحول میں اس خوبصورتی سے دکھائے گئے تھے کہ ہم محضت بدعنوان رہ گئے۔

یہ جانور افریقہ سے لائے گئے تھے اور پھر انہیں اسٹیف کیا گیا تھا۔ یہاں تک تو بات ٹھیک تھی مگر پھر جس ماحول اور آب و ہوا میں یہ رہتے تھے اور ارد گرد کا جو منظر تھا، اسے دیکھنے کے لیے سامنے ان، نوٹو کر افریڈ آرٹس افریقہ بھیجے گئے۔ انہوں نے دیر سچ کی۔ پورے سال کی موسمی تبدیلیوں کو پرکھا کیا اور اسی مناسبت سے ایک مصنوعی منظر کشی تخلیق کر کے ان جانوروں کو اپنی معمولات میں دکھایا گیا اور یہی اس کا حسن

تھا۔

دکنوریہ جھیل کے مشرق میں تخرانیہ کے جنگلات میں پائے جانے والے جانور اپنے قدرتی ماحول میں ہر رب کو اپنی جانب دیکھنے پر مجبور کر رہے تھے۔ سیاہوں کا رش تھا۔ ہر کوئی تصویریں بنارہا تھا۔ بچے کیا، بڑے بھی خوش ہو رہے تھے۔ کرۂ ارض کے مختلف حصوں کو جس خوبصورتی سے یہاں دکھایا گیا تھا اس سے کسی کو بھی اس علاقے کی بنیادی معلومات فراہم ہو جاتی ہیں۔

دین فارست کے گھنے اور سرسبز و شاداب جنگلات کا نقشہ اور منظر ایسی ذہانت اور کارگیری سے بنایا گیا کہ ہم اپنے آپ کو وہیں محسوس کر رہے تھے۔ کینا کا جنگلات اور ان میں شیروں کا اپنے فطری ماحول میں نظر آنا ہم سب کے لیے دل چسپی کا باعث تھا۔

ایک ایسا منظر آیا کہ میں اس میں الجھ گیا۔ میں ایک نیلگوں جھیل کے کنارے کھڑا تھا۔ شام کے رنگ اتر رہے تھے مگر جھیل کی نیلا آسمان میں بھی مکمل کی تھی اور اس نیلگوں منظر میں آسمان تلے براؤ کرتے برندت اور صوبہ خاوش اور دل میں چینی تھائی۔ گومیرے ارد گرد شور شرابہ تھا کہ میں خود کو جھیل کنارے تہا کمزور محسوس کر رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں بھی ان پرندوں کے ہمراہ فضا میں پرواز کر رہا ہوں۔ یہ منظر میرے لیے کوئی انعام تھا۔ میں ایسے منظر کو کا شیدائی رہا ہوں، جو لوگ میری فوٹو گرافی دیکھتے ہیں وہ بہتر جان سکتے ہیں کہ میری چینی ہر تصویر عام طور پر فطری مناظر اور تھائی میں گھری ہوئی ہے۔ گو میں کیمرے کے پیچھے ہوتا ہوں مگر جب اس تصویر کو بعد میں دیکھتا ہوں تو اس منظر میں میرے علاوہ کوئی نہیں ہوتا۔ میں بھی آج اسی منظر میں کھویا تھا کہ اتنے میں سر جی میری جانب آ کر بولے۔ ”لگتا ہے، جھیل میں پھلیاں پکڑنے کا پروگرام بن رہا ہے؟“

سرجی کی مداخلت نے تصور کا تپا ناچ کر دیا۔ وہاں سے نکلے تو ایک اور بڑے ہال میں آگئے۔ یہاں افریقہ کے لوگوں کی تہذیب، قدیم مصر سے لے کر آج کے دور تک کی دکھائی گئی تھی۔ ان کی تہذیب، طرز پرکش اور ان روایتوں کو عمہ طریقے سے منظر کشی کی گئی تھی۔ یہ تہذیب اب ختم ہو گئی ہیں یا مشکل نظر آتی ہیں۔

ان مناظر سے سمجھ میں آ گیا تھا۔ وہ چار قسم کے ماحول میں رہتے تھے۔ سرسبز چراگا ہوں کے آس پاس، صحراؤں میں یا جنگلوں میں اور پھر دریاؤں کے کنارے ان کی تپاں،

تھیں۔ اس ماحول میں ان کی رسم و رواج، رہائش اور خوراک کی عکاسی میں حقیقت پسندی کے ساتھ کی گئی تھی۔ ان کی مذہبی، سیاسی، معاشرتی اور گھریلو زندگی کو دکھایا گیا تھا۔ کھیتی باڑی، شکار اور جنگوں میں استعمال ہونے والے ہتھیار کے ساتھ ہی استعمال کے جوئے پڑے تھے۔ ان کی موسیقی کے آلات سجائے گئے تھے جن میں ڈوم، دف اور منہ سے بجانے والے مختلف آلات تھے۔ ان کی بکتیاں، جمونہ، جاور، مکانات، بانی عورتیں، کھیتوں میں کام کرتے مرد و خواتین تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سب اپنے کام پر آ رہے تھے اور ہمیں غریب یا کروہیں ساکت ہو گئے ہوں۔

ایک چیز نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ یہ کہ بعد میں جس تہذیب یا علاقے کو میں نے دیکھا تو سب میں مشترک چیز بیلوں کے پیچھے مل جوڑ کر کھیتی باڑی کرنا تھا۔ وہ ہزاروں سال پہلے کی تہذیب دکھا رہے تھے جب آدم و حوا کے ذرائع نہ ہونے کے برابر تھے۔ ایشیا ہو کر افریقہ تک کھیتی باڑی کا یہی طریقہ تھا۔ ہمارے علاقوں میں اب تک کچھ مقامات پر بیلوں کے پیچھے مل ہاندہ کر زمین بنائی جاتی ہے۔ میرے بچپن میں تو یہ طریقہ عام تھا اور میں نے کئی بار اسے دیکھا۔ میں اس دن غنہ یارک کے میوزیم میں کھڑا حیران تھا کہ میں نے ہزاروں سالہ پرانی تہذیب کو جیتے جاگتے اپنے سامنے دیکھا ہے۔ لوگ ہمارے علاقے ڈیڑھ اسامیل خان میں دیے ہی رہتے تھے جیسے ہزاروں سال پہلے کے لوگ رہا کرتے تھے۔ اپنے اوزار دیے ہی بننے میں نے دیکھا جیسے ہزاروں سال پہلے بننے تھے۔ فصل کی کٹائی دیے ہی میں نے دیکھ رکھی تھی جیسے قدیم دور میں ہوا کرتی تھی۔ گھراور بکتیاں وہی ہیں جیسے ماضی میں ہوتی تھیں۔ میں یہ کیوں سوچوں کہ ہزار سال پہلے کے لوگ کیسے زندگی گزارتے ہوں گے؟ کیونکہ میں اس زندہ تہذیب کو اپنی آنکھوں سے بیسویں صدی میں دیکھ چکا ہوں۔ صرف فرق یہ تھا کہ اس دور میں گھوڑا، ڈھالیں، تیرکمان استعمال ہوتے تھے اور اب بات بمثل تک آچکی ہے۔ دوسرا قدیم دور کے زیورات آج سے مختلف تھے۔ ان دنوں وہ لوگ شکل یا مذہبی رسومات کے لیے چہرے پر ماسک چڑھایا کرتے تھے۔ وہاں ڈاؤن اور ہٹنے والے تاثرات کے کئی ماسک رکھے تھے۔ قدیم مصر کے آثار، زوکی اور کاگو کے جنگوں کی قدیم تہذیب کو نہایت ہی خوب صورتی سے دکھایا گیا تھا۔ جانوروں کے سینک، مورتیاں، پھروں کے ہار کئے تھے۔ کئی جگہوں پر ان کا رواجی

ڈانس دکھایا گیا تھا۔ ایک بھول بھلیاں تھیں جہاں دوسرے لوگوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ شکر پیا کھیرے سا بھی ابھی تک دیکھی سے یہ سب کچھ نیکھتے تھے اور ان میں کوئی بحث نہ ہوئی تھی۔

میں ایک راہداری سے مڑا اور وہیں الحمد للہ کہہ کر کہ گیا کیونکہ وہاں لکھا تھا۔ ”پاور آف اسلام“۔ ساتویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کی افریقہ آمد کی تیش تھی۔ جنگل و دیوار میں مسلمان خانہ بدوشوں کا قافلہ تھا۔ جمونہ پڑے تھے اور ہاں قہوہ بنائی ایک عورت تھی، سجدے کی حالت میں اپنے رب کے حضور ایک مومن تھا۔ ہتھیار اٹھائے پھرہ دینا ایک جری تھا کلڑی پر مری میں لکھے کچھ الفاظ تھے۔ میری تصویر چشم مجھے دور میں لے گئی جب اسلام قاز سے پھیل کر یمن، شام اور کچھ مصر سے ہوتا ہوا افریقہ میں داخل ہوا تھا۔

عرب بدوں کے خیمے کا اندرونی منظر مجھے کسی اور دور میں بھیچے لے آیا۔ باہر اونٹ بندھے ہیں۔ زمین دریاں اور چارے کے ٹکڑے رکھے ہیں، چوہے کے برتن ہیں لو ساتھ ہانسی کی دھڑاؤں آ رہی ہے۔ ہم کسی بھی تہذیب کے حصے میں آئے تو ہمیں وہاں کی موسیقی سنائی دیتی تھی۔ دھڑکے پرانے بازاروں میں ریڑھے، ٹھیلے، گدھا گاڑیاں لو آتے جاتے لوگ۔ بازاروں اور گلوں کے مناظر اور گھروں کے باہر بندھی سواریاں۔ اس کے علاوہ چوکوں میں بیٹھے قتیق اور پاس سے گزرتے مرد و زن۔ سلطنت اومان کی منظر کشی قرآن پاک کے قدیم نسخے، خانہ کعبہ کے صحنوں پہلے کے مناظر مجھے اپنوں میں لے آئے۔ میں دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت میں اکیسویں صدی میں موجود نہ تھا۔ میرے اپنے آپ کو صدیوں پہلے کی اسلامی تاریخ میں گھومتا پھرتا محسوس کر رہا تھا۔ میرے سامنے سب مناظر آ رہے تھے کہ جیسے میں ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی کے اسلامی ماحول میں جی رہا ہوں۔ سچی سچی کے دل میں پتا نہیں کیا آیا وہ بلند آواز میں بولے۔ اگر انہیں دیکھ دیکھ کر تھک گئے ہیں تو آگے بڑھیں۔ ان کی آواز مجھے گردن سے پکڑ کر بارہویہ یاد رکھ کر منہ لائی اور میں بھجلا اٹھا۔

اس کے بعد ہم اس حصے میں آئے جہاں ایشیا کا لینے والوں کا تہذیب و تمدن دکھایا گیا تھا۔ اس میں چائنا، سینزل ایشیا، برصغیر، تبت، سامیریا، روس کے علاوہ وادی سندھ کی تہذیب دکھائی گئی تھی۔ سینزل ایشیا کی تہذیب میں وہی برتن میں نے دیکھے جو پچھلے سال شمال کے ایک ہوسیدہ میوزیم

میں دیکھا تھا۔ شمال کے نوادرات جو مٹی میں اٹے پڑے تھے، وہ یہاں قیمتی شوکیوں میں بندھے تھے۔ شمال میں تو تارڑ صاحب موسیقی کے آلات کو بجانے کی کوشش کرتے تھے اور یہاں چھوٹے کی اجازت نہ تھی۔ جو چیزیں ہنزہ کے ہتھ فورٹ میں دیکھیں وہ یہاں چین اور سینزل ایشیا کی تہذیب میں شامل تھیں۔ ہندوستان کی پرانی بستیوں کے مناظر، مغل دور کے حالات، وادی سندھ میں سندھ کنارے بسنے پھیردوں کی کشتیاں اور دریائے خوبصورت مناظر پرودا ہاں اور آلات جراحی و اصول طب مجھے پاکستان میں اپنے شہر ڈیڑھ اسامیل خان پہنچا لائے۔

مغرب میں اصول طب نے بہت بعد میں ترقی کی لیکن برصغیر و چائنا اور خطہ عرب میں اصول طب کی سوسال پہلے ہی عروج پر تھا۔ برپاری کا علاج دریافت ہو چکا تھا۔ طب کا جب بھی ذکر ہوتا مجھے کراچی کے ڈاکٹر عزیز اللہ یاد آ جاتے ہیں۔ بڑے قابل ڈاکٹر تھے۔ یہ شاید اسی کی دہائی کا ذکر۔ ڈاکٹر صاحب اسپتال میں گئے تھے۔ غم دالم میں اچھے ڈرائنگ روم میں سر پکڑے بیٹھے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ ایک شخص فون اٹھانے بڑھا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے اسے روک دیا اور خود اٹھ کر فون تک گئے۔ ریسورٹا کر دوسری جانب کی آواز سننے لگے پھر بولے۔ ”گھر نہ کریں، میں آدھے گھنٹے میں پہنچتا ہوں۔“ پھر انہوں نے گاڑی نکالی اور اسپتال پہنچ گئے۔ ایک ڈینٹ کا کس تھا۔ مریض کے ساتھ بہت سے لوگ تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر عزیز پر پہلے کنٹرول شروع کر دیے کہ حکومت نے لوگوں کی جان بچانے کے لیے نوکری دی ہے لیکن یہ ڈاکٹر تنخواہ حکومت سے لیتے ہیں اور پرنسپل کیلینکوں پر کرتے ہیں۔ مریض مہربا ہے لیکن آپیں پروا نہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی نظروں لوگوں پر ڈالی اور آپریشن روم میں داخل ہو گئے۔ کافی دیر آپریشن میں گزار گیا۔ جب باہر آئے تو مطمئن نظر آ رہے تھے۔ باہر بیٹری طرف دیکھ کر بولے۔ ”گھر نہ کریں مریض خطرے سے باہر ہے۔“

ڈاکٹر صاحب اپنی کار پر واپس جا چکے تھے لیکن تہرہ کرنے والے لفظوں، طعنون کی شکل میں اپنا ہتھ نکال رہے تھے۔ جب ایک نرس ان کے پاس آئی اور بولی۔ ”آپ نے ڈاکٹر صاحب کو کتنی گالیاں دینی تھیں؟“ اب میں ایک خبر آپ کو بتا رہی ہوں۔ آج ڈاکٹر صاحب کا اکلوتا بیٹا روڈ ایکسیڈنٹ میں مارا گیا ہے۔ عمر کے بعد نماز جنازہ بھی لیکن

آپ کا کس آ جانے پر انہوں نے وقت تہویل کر دیا۔ اب مغرب کے وقت جنازہ پڑھایا جائے گا۔ انہیں بیٹے کے آخری رسوم ادا کرنے تھے لیکن مریض کا سن کروہ اسپتال چلے آئے۔ تمام لوگ خاموش ہو گئے۔ نرس نے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب جیسا جگر آپ میں سے کسی کے پاس ہے تو ان کو گالیاں دینے کا اس حق ہے۔“ اس وقت مجھ سمیت تقریباً بیس افراد ہاں تھے لیکن ایسی خاموشی چھا گئی تھی کہ پتا نہیں سکتا۔ پہلے ہمارے پاں طیب کاروہ یہی کہی تھا۔ وہ اپنے غم کو چھپا کر مریضوں کو زندگی دینا فرض سمجھتے تھے۔ میں ڈاکٹر عزیز اللہ کو یاد کرتا ہوں۔ آگے بڑھ گیا۔

مجھے اسفہان شہر کا منظر اور اسکندریہ کی تہذیب کے منظر بہت اچھے لگے۔ چھ سو سال پہلے پینٹنگ شہر کا مناظر اور نقشہ بہت ہی مطابقتی تھا، مصرائے کوئی کے مناظر دیکھنے کے قابل تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ میں ان مقامات کی سیر کر رہا ہوں۔ ان کے آلات، اوزاروں، برتن بہن میں یکسانیت تھی۔ سینول اور جنوبی امریکا کی تہذیبوں میں مماثلت تھی۔ امریکا کے یڈاٹین اور جنوبی امریکا کی تہذیب میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا۔ جنوبی امریکا کے بھاری بھر کم پرعدوں کو سب حیرت اور خوشی سے دیکھ رہے تھے۔ یورپ میں داخل ہوئے تو آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ حسین ٹھیلیں، جنگلات، رنگین پرعدے، کوہ الپس کے خوبصورت برقانی مناظر، پتے چشے، بھرنے، آبشاریں، میٹر ہارن کی برقانی چوٹی، جس کی مشابہت مشہور پاکستانی مشاہیر سے ملتی ہے، اسکاٹ لینڈ کا ہائی لینڈ ایریا اور ہرسو پیملا سبزہ۔ میں یہ سب دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ آج میں نے گیارہ ڈالر میں پوری دنیا گھوم لی۔

ایمیزون کی تہذیب دیکھیں تو ننگ دھڑنگ عورتیں اور مرد کھیتوں میں کام کرتے نظر آ رہے تھے۔ ہر جگہ پروڈیکٹر لگے تھے جہاں ان تہذیبوں کی ٹھیلیں مل رہی تھیں۔ آپ کو ہر طرح کی معلومات دے رہے تھے کہ آپ تشنہ نہ رہ جائیں۔ ہم بھی سمجھتے تو آرام دہ کرسیوں پر بیٹھ کر ٹھیلیں دیکھنے لگتے۔ ہم بھی میز چائے چڑھ کر اوپر کے قہور پر آئے اور بھی بیچے اتر آئے۔ ایک ہال میں گئے تو بیالوجی کے ہر نظام کو تفصیل سے بتایا جا رہا تھا۔ یہ میوزیم نہ تھا بلکہ ایک ہاؤس دس تھی، جہاں پیکچر روم تھے۔ IMAX فیئر تھے جہاں ہر چیز کے شہوے رہتے ہیں۔ کہیں نظام لکھ کر کوئی فلم چل رہی ہے اور کہیں زہنی اور آسانی حقیقتوں کو دکھایا جا رہا ہے۔ کائنات کے ایک ایک نظام کو ہر طرح سے دکھایا جا رہا

تھا۔ میں نے یہ شواہے بعد کے دنوں میں دیکھ لیے تھے۔ میں ایک ایک چیز کو بیان کروں تو پڑھنے والے اکتا جائیں گے اس لیے چیدہ چیدہ چیزیں لکھ رہا ہوں۔ آپ خود سوچیں کہ جیتنا لیس ہاں ہیں اور ہر ہاں میں کم از کم ایک ٹھنڈا لگتا ہے اور دن میں آٹھ گھنٹوں کے لیے یہ میوزیم کھلتا ہے، تو اسے دیکھنے کے لیے چودن درکار ہیں۔

مجھے ڈارون کے سیکشن میں بہت معلومات ملیں اور شاید دنیا کے کسی میوزیم میں اس سلیفے یا طریقے سے نہ دکھایا گیا ہو جس طرح یہاں بتایا گیا تھا۔ انسانی زندگی کے ارتقا کے عمل کو بڑی تفصیل سے بتایا گیا ہے۔ بندر نما انسانوں سے آج کے مکمل انسان تک پہنچنے کی تکمیل تک ہر مراحل کو دکھایا گیا ہے۔ پرانے زمانے کا انسان جب کے جانوروں کی طرح غاروں میں رہتا تھا۔ لے کر آج کے انسان کے رہن سہن، اٹھنا بیٹھا، اشکال، کھانا پینا سب ایک تفصیل سے دکھایا گیا تھا۔

ان غاروں کا ماحول بھی دیکھا جب انسان جانوروں سے چھپ کر رہتا تھا۔ پرانے زمانے کے انسان کی ہڈیاں، اعضا اور کھوپڑیاں بھی رکھی تھیں۔ پھر انسان نے ترقی کی۔ آگ جلائی، ہتھیار بنائے، زراعت سیکھی اور دیہاتوں کے کنارے ایک دوسرے سے مل کر بستیاں بنائیں۔ جانوروں کے حملوں پر ان کا مقابلہ اپنے بنائے گئے ہتھیاروں سے کرنے لگا۔ اپنی خوراک زمین سے بھی حاصل کرنے لگا۔ پھر ایک تہذیب و تمدن میں رہنا سیکھ گیا۔ وہ غور و فکر کرنے لگا، سوچنے لگا اور ترقی کرتا چلا گیا۔

بات انسان کے اپنے ارتقا کی ہوتی تو ذہن مان بھی لیتا۔ میں کوئی بیا لو جسٹ یا انٹراپالوجسٹ نہیں کہ اپنا کوئی نظریہ پیش کر سکوں۔ ڈارون کہتا ہے کہ اربوں سال پہلے پانیوں کے اوپر ایک کالی پیدا ہوئی۔ کروڑوں سال پہلے اس کالی سے ایک مسم کا جڑو مد پیدا ہوا اور اسی سے مختلف جڑوے والی زندگی کا آغاز ہوا۔ پھر اس زندگی نے اپنے ماحول میں علیحدہ علیحدہ مختلف شکلیں اختیار کیں۔ اسی سے سب نباتات و حیوانات پیدا ہوئے۔ ان سب کو مختلف ماحول ملا اور مختلف شکلیں اختیار کرنے لگے۔ ڈارون کا کہنا ہے کہ وہ بندر سے آج کے مہذب انسان تک ایک ارتقا کی مکمل سے تبدیل ہوتا گیا۔ اس نظریے کو جھٹلایا بھی گیا اور مادہ پرستوں نے پذیرائی بھی دی۔ جو ایک خالق کے وجود سے انکاری تھے ان کے لیے ایک جواز مہیا ہو گیا کہ کوئی رب نہیں (نعوذ باللہ)۔

ڈارون کے پاس اپنے نظریے کا کوئی ثبوت نہیں۔ بس

اس نے پانچ سال تک جنوبی امریکا سے افریقا اور آسٹریلیا کا سفر کیا اور اپنے مشاہدات کو نظریے میں تبدیل کر کے ہمیں دے دیا۔ اگر میں اس کے نظریے کی مخالفت میں اس کے مخالف نظریے دینا شروع کر دوں تو اپنے سفر نامے سے ہٹ جاؤں گا۔ میں نے ڈارون کو پڑھا اور اس کی مخالفت میں بھی بہت کچھ سنا اور پڑھا۔ ڈارون کہتا ہے کہ جب کوئی جاندار اپنی بقا برقرار نہیں رکھ سکتا تو وہ دوسری شکل اختیار کر لیتا ہے مگر کوئی قائل قبول مثال نہ دے سکا۔

میری طرح سرجی بھی ڈارون کی مخالفت میں اڑ گئے اور کہنے لگے۔ ”اگر انسان بندر سے اس مقام تک پہنچا ہے اور باقی بندر جو آج موجود ہیں تو وہ کیوں نہیں بدلے؟“

”ان کے بقول امیر بندر انسان بن گئے اور غریب بندر تو بندر ہی رہے؟ کچھ نہ بولنا سیکھ لیا اور باتوں کو نہیں سکھایا؟“ شہباز نے کہا۔ ”یہ سیپا ڈارون کا چھاپا ہوا ہے۔ خود کی شکل بندر جیسی تھی تو سب کو بندر کی اولاد بتادیا۔“

سرجی نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ بندر پہلے انسان تھے اور پھر اپنے اعمال کی وجہ سے بندر بن گئے ہوں؟“ پھر شہباز کو دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔ ”میری تو ہر بات سب کو بری لگتی ہے مگر کچھ کے بغیر وہ بھی نہیں سکتا۔“

مجھے معلوم تھا کہ وہ کچھ شرارت کرنے والے ہیں اسی لیے میں امر اصرار کرنے لگا۔ ”نہیں آج کچھ کہہ دیں۔ ہم نے پہلے بھی رہا تھا۔“

تو وہ بولے۔ ”شہباز کے اعمال اتنے خراب نہ تھے، اسی لیے بننے بننے رہ گیا۔“

میں سمجھا کہ ابھی فساد شروع ہو گا مگر شہباز غلاف توقع ہنس پڑا۔

اس کے بعد ہم سمندری مخلوق دیکھنے فرسٹ فلور پر آئے۔ یہاں سمندری مخلوق کے نمونے اور سائنسی معلومات دی گئی تھیں۔ چوتے فٹ سے زیادہ لمبی وکیل مچھلی لگی ہوئی تھی۔ ہم سے اس سے زیادہ معلومات ہمیں نہیں ہو رہی تھیں۔ ابھی ہم نے میوزیم کا ایک تہائی حصہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ بہت کچھ باقی تھا۔

شہباز شور کرنے لگا تھا۔ ”یہ سیپا سارا آج ہی دیکھنا ہے، کوئی حد ہوتی ہے۔“

سرجی نے کہا۔ ”سینٹرل پارک کی سمیں بھی آ چکی ہوں گی۔“

ہمیں اب لگتا تھا کیونکہ اب میں خود بھی تھک چکا تھا

اور میوزیم بند ہونے کا وقت بھی ہونے والا تھا۔ بھوک سب کو لگی تھی۔ سرجی بولے۔ ”سب بات کوئی، پہلے دال روٹی۔“ وہ مجھ سے روکتا اور ماحول کے مطابق بولتے تھے مگر اکثر بے عمل بھی کچھ کہہ جاتے تھے۔ ہم نوکٹے تو یہی کہتے۔ ”آپ لوگوں نے مجھے استاد مان رکھا ہے تو میں بھی آپ کی تعلیم و تربیت کو اپنا فرض سمجھ کر کچھ نہ کچھ عقل کی باتیں بتاتا رہتا ہوں۔“ وہ اس طرح سے اپنے بے عمل کے مجھ اور دوسروں کا جواز دیتے رہے تھے۔ یہ بات ہمارے لیے ایک شغل بن گئی تھی کہ سرجی کے مہموات سن کر ان سے محفوظ ہوں۔

ہم کئی منزل میں فوڈ کورٹ میں آ بیٹھے۔ ایک بڑے ہال میں رنگین کرسیاں صاف و شفاف میزوں کے گرد لگی تھیں۔ بہت سے تھکے ہارے اور غم حال ان کرسیوں پر آڑے تر جھٹے بیٹھے تھے۔ سرجی فٹس برگر اور آلو کے قندے لے آئے۔ شہباز وینڈنگ مشین سے کوک کے ٹن پیک نکال لایا اور میں نے بیک سے آلو کے پرائے نکالے۔ پھر سب نے آلو کے پرائے کھائے اور فٹس برگر میرے بیک میں سما گئے۔

ہم باہر نکلے تو شام اترنے میں کچھ دیر تھی۔ عمارتوں کی روشنائیاں ابھی چل تھیں۔ گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس بھی چلی تھیں۔ باہر سڑک پر کم کھڑے تھے اور آتی جاتی ٹریفک کا بے انتہا شور تھا۔

سرجی میرے پاس آئے اور دکان میں بولے۔ ”سمیں پارک میں آگئی ہوں کی؟“ میں نے کہا۔ ”معلوم نہیں۔ شاید آپ کا انتظار کرتے کرتے چلی نہ گئی ہوں۔“

کہنے لگے۔ ”اس معاملے پر مذاق مجھے بالکل پسند نہیں ہے۔“ پھر کہنے لگے۔ ”جلدی پارک میں چلے ہیں، کہیں چلی نہ گئی ہوں؟“

شہباز دور کھڑا تھا۔ قریب آ کر بولا۔ ”پھر کیا سیپا ہے؟ میں نے پارک کے علاوہ کہیں نہیں جانا۔“

پارک تو دیکھنا تھا مگر میرا خدشہ بھی ہے جانتا تھا کہ وہاں تمسنا کارن پڑے گا۔ میں نے ان دونوں سے کہا تھا کہ پارک میں شام سے پہلے لڑکیاں نیکریں پہن کر جا چک گئے تھیں۔ میں اسی ترفیہ پر انہیں میوزیم لے آیا تھا کہ شام سے پہلے پارک میں بھاگتی اچھلتی اور عریاں لباس پہنے گوریاں دکھائیں گا مگر مجھے خود معلوم نہ تھا کہ ایسا ہوتا بھی ہے یا نہیں۔

اب سینٹرل پارک سامنے تھا اور میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ اگر

وہاں ان کے مطلب کا کچھ نہ لگتا تو میری تو شامت آ جائے گی۔ اب پارک میں جائے بغیر کوئی جا رہی تھی نہ تھا اور یہی سوچ کر میں پارک میں داخل ہو گیا کہ اگر کچھ نہ ملا تو کوئی اور کہانی گھڑ لوں گا۔

اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ سینٹرل پارک میں کیا خاص بات ہے جو میں اسے اتنی اہمیت دے رہا ہوں تو میں صرف یہ کہوں گا کہ میں جتنا بھی اسے اہمیت دوں وہ اس سے زیادہ اہمیت کا مقام رکھتا ہے۔ میں یہ سوچ کر بھی حیرت زدہ رہ جاتا ہوں کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ نئے پارک کی بلند بالا اور آسمان کی بلند یوں میں کھڑی عمارتوں کے درمیان ایک جنگل آباد ہے، جس میں جمیں ہیں، رنگتائی عداویاں ہیں، سینکڑوں سالہ پرانے ٹرودار درخت ہیں، پرندے ہیں اور یہ کوئی چھوٹا سا پارک نہیں بلکہ نو سو ایکڑ میں پھیلا ایک ایسا دیار ہے جس کے گرد دنیا کا سب سے بڑا شور سڑکوں پر برپا ہے۔ ایسا نہیں کہ ارد گرد کا ڈاؤن ٹاؤن اس کی تہائی کو کھاسکتا ہے بلکہ یہ پارک مہمن کی چٹ و پکار کو گھونٹ کر داتا ہے۔ یہ وہ پارک ہے جہاں درجنوں ہائی ووڈ کی مشہور فلمیں شوٹ ہو چکی ہیں جن میں میری پسندیدہ فلمیں home alone 2 اور when harry met sally بھی شامل ہیں۔ یہ کوئی پارک نہیں بلکہ میرے لیے جنگل ہے جس میں زندگی کا راجا بھی ہے اور تہائی کے نرم گوشے بھی ہیں۔ سینٹرل پارک میں ٹورسٹ شاید ایک بار محو کر واپس چلے جاتے ہیں کیونکہ انہیں اپنے کم دنوں میں اور بھی بہت کچھ دیکھنا ہوتا ہے مگر نئے پارک کی تو یہ جنت ہے۔ ایک سال میں اتنی لاکھ لوگ اسے دیکھنے آتے ہیں۔ برف باری میں اس کا حسن سفید چادر اوڑھ کر اور ٹھہراتا ہے۔ لوگ یا تو اسے گرمیوں میں دیکھنے آتے ہیں یا پھر سردیوں کی برف باری میں آ کر یہاں فوٹو گرائی کرتے ہیں، جب درخت برف سے ڈھکے ایک وحند میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ گرمیوں میں یہ پھولوں سے بھرا ہوتا ہے۔ درخت ہوں یا پودے، ہر جانب بھاری ہوتی ہے جیسا دینے والا موسم نئے پارک میں نہیں پڑتا، اسی لیے یہاں بہار اپریل سے اگست تک رہتی ہے۔ خزاں کے رنگ کسی اور طرز میں یہاں دیکھتے ہیں جب پتے زرد، گلابی اور سرخ پڑ جاتے ہیں۔

ہم آئے تو ابھی نہ دیکھیں تھیں، نہ بہار اور نہ ہی خزاں، ایک کشش یہاں ہر ایک کو محسوس ہوتی تھی۔ پندرہ لوگ تھے مگر پھر بھی سناٹا تھا۔ سامنے گہرے اور

تھے۔ سو کئی ٹہنیوں سے ڈھلتے سورج کی کرنیں زمین پر روشنی نہیں بلکہ ان ٹہنیوں کا سایہ ڈالتی تھیں۔ ایک ویران راستہ تھا جن کے دونوں جانب لاتعداد بونچ خالی پڑے تھے۔ میں سیدھا ایک طوفان بدینیزی سے گویا سا ڈنڈ پر وف کمرے میں آ گیا تھا۔

ہم چلتے ہوئے اس معبد خانے میں گھٹتے چلے گئے۔ سر جی اور شہباز بھی اس طلسم کدے میں خاموش ہو کر ادھر ادھر زیادہ دیکھتے تھے۔ سر جی سے پوچھا، ”کونسا آیا؟“

جواب نہیں ملا اور مجھے کچھ دیر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ زیر لب کچھ پڑھ رہے تھے۔ قسم کیا تو بتایا۔ ”آیت الکرسی پڑھ رہا تھا۔“ پھر خود کہنے لگے ”ان درختوں کو دیکھا ہے جیسے یہ ہمیں ڈرانے کے لیے عجیب و غریب شکلیں بنائے کھڑے ہیں۔“

بات وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ پھر کہنے لگے۔ ”قسم سے ایسے درختوں پر جن میں چڑھیں اپنا گھر بناتی ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”کیا ڈر لگ رہا ہے۔“

تو بولے۔ ”مجھے نہیں مگر لگتا ہے کہ شہباز سہا ہوا ہے، دیکھیں رنگ بھی فنی ہو گیا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”آیت الکرسی تو آپ پڑھ رہے تھے۔“ ”پڑھ کر شہباز پر چومک رہا تھا۔“ انہوں نے جواب پہلے سے شاید سوچا ہوا تھا۔

شہباز اسی دوران درختوں کے تنوں کو ہاتھ لگاتے نبھانے کیا محسوس کر رہا تھا۔

ہم چلتے ہوئے ایک بہت پرانے ہلے تلے سے گزرے۔ وہاں ایک چھوٹی سی جمیل گی جس کے کناروں کے ساتھ ساتھ بہت سے کچھوے سرائٹھا اٹھا کر ہمیں دیکھتے اور پھر پانی میں اتر جاتے تھے۔ جمیل کے پانیوں پر ٹہنیوں کے سائے ڈراؤنی شکلیں بناتے تھے۔ پس منظر میں اونچی اونچی عمارتیں کوئی انوکھا تاثر دیتی تھیں۔ معلوم نہ پڑتا تھا کہ شہر میں کوئی جنگل ہے یا جنگل کے باہر کوئی شہر ہے۔

سر جی کہنے لگے۔ ”یہاں گیدڑ بھی ہوں گے؟“

میں نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ ہوں۔“

وہ بولے۔ ”یہاں یہ عمارت صحیح فٹ ہو سکتا ہے کہ گیدڑ کی جب موت آتی ہے تو شہر کا رخ کرتا ہے۔“

کہہ کر وہ ٹھیک رہے تھے کہ یہاں سے نکلا کوئی بھی جانور گاڑیوں تلے کھلا جا سکتا ہے۔

سائے ایک ہل آیا۔ اس کا نام بالکونی برج تھا۔ نیچے

پانی کھڑے تھے اور برج کا کس ان کے اندر سے ہمیں جھانکنا تھا۔ یہاں سے کئی اسکاکی لائن کا جمیل کے اوپر سے منظر سب سے اچھا دکھائی دیتا ہے۔ ایک فوٹو گرافر کیرا ایک اسٹینڈ پر لگائے بہت دیر سے وہ فوٹو گرافر سے نبھانے کیا دیکھے چلا جا رہا تھا۔

سر جی کو تیسریں بھول چکی تھیں۔ وہ اور شہباز اس ماحول سے خاموش نظر آ رہے تھے۔ ہم ایک اور ہل کے نیچے سے گزر رہے تھے جہاں بہت سارے درخت کھڑے تھے اور ایک بوے پھیلاؤ میں ان کی ٹہنیاں تھیں۔ وہیں ایک لڑکی جاگنگ کرنی قریب سے جب گزری تو سر جی کو اپنی بخولی ہوئی نیکریں پہنے تیسریں یاد آئیں۔ پہلے اسے دور تک جاتا دیکھتے رہے پھر مجھ سے بولے۔ ”یہ تو پاجاسے میں ہے، آپ نے تو کہا تھا کہ نیکر پہنی ہوگی۔“

شہباز نے کہا۔ ”اسے روک کر قسم اٹھا لو، اس نے نیکر بھی پہنی ہوگی۔“ اب سر جی شپٹا گئے اور کہنے لگے۔ ”یہ عورت ذات کی بے حس ہے کہ اسے روک کر پوچھا جائے کہ آپ نے نیکر پہنی ہوئی ہے؟ اور وہ بھی جب وہ مصوم بھاگ رہی ہو۔“

ہر جانب سناٹے کا عالم تھا کہ ہمیں ایک بوڑھی عورت نظر آئی جو رنگین کپڑے پہنے، سر پر سرخ رنگ کی دگر رکھے اور بے تحاشا میک میں جمیل کے اندر اپنا کچھ دیکھ رہی تھی۔ پھر اپنے آپ کو دیکھ کر نوزائیدگیوں کی طرح سکرادیتی۔

میں نے سر جی سے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔ ”یہ آپ کے راجا اندر کا اکھاڑہ ہے۔“

انہوں نے اس عورت کو غور سے دیکھا اور پھر کچھ اور قریب جا کر اسے دیکھا اور مایوس ہو کر واپس آ کر بولے۔ ”شوہن بڑھیا، چٹائی کا لہجہ۔“

شہباز سر جی سے بولا۔ ”ایک تو مجھے آپ کے یہ سیاپے سمجھ میں نہیں آتے۔ معلوم نہیں کیا کہہ جاتے ہیں کہ اکھا ایک گھٹنا ہمیں سوچنے میں گزرا تا پڑا ہے۔“

اس پر وہ بولے۔ ”بوڑھی کھوڑی، لال لگام کا تو ہوتا ہے نا۔“

بات ہمیں سمجھ میں آگئی تھی اور ہم دونوں سر جی کو ان کے اہل زبان ہونے پر مبارک باد دے رہے تھے۔ اس پر وہ بولے۔ ”میں تو آپ کو گھٹنا کو کچھ نہ کچھ ہرقت سکھاتا رہتا ہوں مگر آپ ہیں کہ صدر وہ پڑھ کر بھی اجس رہے۔“

شہباز بے بس کھڑا اپنے دونوں ہاتھ کھر پر رکھے یہ کہہ

بیٹھے اور سرگوشی کی بجائے زور سے بولے۔ ”شہباز کو حرام جانور کا کھانا کھلاتے ہیں کیونکہ حرام اسے آسانی سے مضم ہو جاتا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ راضی ہو گئے اور شہباز نے کہا ہوا آگے چل پڑا۔ ”یہ سیاپا تو کسی جن کی طرح مجھے چٹ گیا ہے۔“

ہمیں جانب جمیل کے سبز پانی تھے اور ساتھ بنے راستے پر ہم چلتے جا رہے تھے۔ اب شام کا اندھیرا چھیلنے لگا تھا۔ پارک کے پار کھڑی بلند عمارتوں کی روشنیاں جھمکا رہی تھیں اور ڈاؤن ڈاؤن کا منظر یہاں سے ایک خاموشی لیے دھنکا تھا۔ پارک کا ماحول طلسمانی ہو گیا تھا۔ شام کے سائے جمیل کی سطح پر لہرانے لگے اور میرے سامنے اپنی جھڑپ بھول کر پھر سے ایک ہو کر خوش گپیاں کرنے لگے۔ اکاؤنٹنگ نظر آ جاتے مگر جاگنگ کرتے ہوئے جلدی سے غائب ہو جاتے تھے۔ غصہ کچھ بڑھ گئی تھی اور ہم نے اپنے آپ کو باندھوں میں کس لیا تھا۔ سر جی کی پھندے، والی ٹوٹی اڑلوں سے ان کے سر پر تھی اور ان کی پچھان بن گئی تھی۔ کسی جگہ میں اگر ہمیں سر جی کو ڈھونڈنا ہوتا تو ہم سر جی تلاش نہ کرتے بلکہ بہت سی ٹوپیوں میں پھندے والی ٹوپی دیکھا کرتے تھے جو ان کی حوالی چال سے دائیں بائیں لہرا رہی ہوتی تھی۔

جمیل کے ساتھ ایک چٹان رکھی نظر آئی۔ جس کے آس پاس بہت زیادہ درخت تھے۔ چٹان کے ساتھ ایک کینوٹی بنی تھی۔ اس کو ہرگز بیڈ راک (بگے کے سر کی مشابہت والی چٹان) کہتے ہیں۔ ہم اس راک پر کھڑے ہو کر جمیل کا نظارہ کرنے لگے۔ کئی رنگ اس میں اترتے تھے اور وہی رنگ پانی میں گل کر کوئی انوکھی قوس قزح میں بدلتے تھے۔ اس خاموش منظر میں ہم کھڑے تھے اور خاموشی سے اس جمیل کے پانیوں کو دیکھتے رہے۔ میں شکر کر رہا تھا کہ اس وقت یہاں رش نہیں تھا ورنہ اس جگہ کی پراسراریت میرے سامنے نہ نکلتی۔

آگے ندی بہہ رہی تھی اور اس پر چھوٹے چھوٹے پرانے ہل بنے تھے جنہیں درختوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ چٹیل قدی کے لیے ٹرائل بنے تھیں ویرانوں کی جانب نکلتے تھے۔ کیا مناظر تھے جن کو میں شہر کے بچے جنگل میں دیکھ رہا تھا۔ میں اسے پارک لکھتے ہوئے جھمکتا رہا ہوں کیونکہ پارک سے کسی شور بھرے لان کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے مگر یہاں تو کوئی اور مناظر تھے۔ ایک جگہ گھاس سے ڈھکا دور تک پہلا میدان تھا جس پر شام کا گھنگنا اندھیرا اتر رہا تھا۔ جمیل کے پانی زیادہ گہرے اور شوخ رنگوں میں بدل چکے تھے۔ جاگنا۔

رہا تھا۔ ”اب یہ کیا بول گئے ہیں؟“ ہم آگے آئے تو پھر کاٹا ایک عجیب و غریب ساخت کا بیج بہت سے درختوں کے درمیان رکھا تھا۔ ایک گوشہ تنہائی تھا۔ بیج کی ساخت ایسی تھی کہ اس کے دلوں کو نے اندر کی جانب مڑے ہوئے تھے۔ بیج فٹ کے قریب لہبا تھا۔ بیج کے ساتھ ایک تحریر لکھی تھی۔ گریٹنڈ کا بیج 1936 میں اس وقت کے میئر نیارک کو تحفے میں دیا تھا۔ بیج کی خاص بات یہ تھی کہ اگر کوئی ایک کونے میں بیجہ کر سرگوشی کرے تو آواز کی لہریں دوسرے کونے میں سنائی دیتی ہیں۔ اسی لیے اس کو Whisper Bench (سرگوشی والا بیج) بھی کہتے ہیں۔ اب شہباز کوئی بات ایک کونے میں بیجہ کر سرگوشی میں کرتا اور میں بیج فٹ دور بیٹھتا ہوں سن لیتا تھا۔

شہباز نے اپنی جانب سے سرگوشی کی ”سر جی کو یہیں چھوڑ جاتے ہیں اور یہ اس پارک سے اکیلا کسی نہیں گل سکے گا اور کوئی دیکھی بھی ان کی مشکل زبان کی آواز کون نہیں سمجھ سکے گا۔“ سر جی دور کھڑے تھے کہ سرگوشی میری بجائے ان کے کانوں تک صاف و شفاف پہنچی اور وہ وہیں کھڑے کھڑے بگڑ گئے۔ اب وہ اوٹلا کر رہے تھے۔

”شہباز کی آنکھوں میں سازش میں نے پہلے ہی دیکھی تھی جو وہ میرے خلاف تیار کر رہا تھا۔“

شہباز کہنے لگا۔ ”کب دیکھی تھی وہ سازش؟“ وہ کہنے لگے ”جب میں نے تم کو میوزیم میں ریچھ کہا تھا۔“

اب شہباز بگڑا اور جھٹلا شروع ہو گیا۔ میں بیج پر بیٹھا ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا اور سر جی کہہ رہے تھے ”لوگوں نے میرے خلاف محاذ بنالیا ہے۔ میں تو پہلے سے ہی جانتا تھا کہ کوئی گزیر چل رہی ہے۔“

شہباز گالیاں دے رہا تھا کہ کبھی مجھے ریچھ کہتا ہے اور کبھی کوئی اور.....“ پھر مجھ سے کہا۔ ”آپ بھی اسے نہیں روکتے۔ اسے ایئر پورٹ سے ہم لاتے بھی نہیں۔“

سر جی بھی بولے جا رہے تھے ”مجھے معلوم ہے، میں سب کو کھٹک رہا ہوں۔ میرا احسان تو آپ دونوں پر ہے کہ لڑکیاں چھٹا کر آپ کو ویں اور آپ التامیرے خلاف مصلحتی سازشیں کر رہے ہیں۔“

مجھے معلوم تھا کہ شہباز بھی معنوی غصہ کر رہا ہے مگر اپنے سر جی واقعی روٹھ چکے تھے۔ اب وہ اس بات پر مانے کہ وہ بھی مجھ سے کوئی سرگوشی میں بات کریں گے۔ وہ ایک کونے میں جا

نہیں بار بار آنے کی قسمی مگر میں جب بھی بعد میں یہاں آیا تو دیکھا کہ شور و غل نے اس پارک کے حسن کو روند ڈالا ہے۔ یہ وہ جنگل نہ تھا جو میں نے اپنے دوستوں کے ہمراہ اسے پہلی بار دیکھا تھا۔

آگے چری مل فاؤنٹین آیا۔ ایک لمبے گول سرکل کے اندر یہ فوارہ اس لیے مشہور ہوا کہ یہاں بہت سی غلوں کی شوٹنگ ہوتی ہے۔ یہ جگہ فوٹو گرافی کے لیے بہت مقبول رہی ہے۔ یہیں کئی مجسمے جگہ جگہ کھڑے نظر آ رہے تھے، ایک مجسمے نے اپنے دائیں ہاتھ پر عقاب اٹھا رکھا تھا۔ یہ پرندوں اور انسان کی دوستی کی علامت تھا۔ سامنے ایک بارہ دری سی آئی جس کی چھت کو خوبصورت نقش و نگاری سے سجایا گیا تھا۔

پارک کے آخر میں ایک بڑی یادگار بنی تھی۔ ایک بڑا مینار تھا جس کے اوپر سنہری رنگ کے گھوڑوں کے مجسمے تھے اور ایک عورت نے بائیں ہاتھ میں کچھ اٹھایا ہوا تھا، جو مجھے ٹھیک سے نظر نہ آ رہی تھی۔ مینار کے ساتھ بھی کئی مجسمے رکھے تھے۔ یہ یادگار 1898ء میں تیار ہوئی جب کیوبا کی اسپین سے جنگ میں دو سو ساٹھ فوجی ایک دھماکے میں ہلاک ہوئے تھے۔ یہاں کچھ لوگ ارد گرد بیٹھے نظر آئے۔ یہاں سے اب ہم پارک کے باہر نکل سکتے تھے۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو پارک گورنر کی سیاحی ٹنگے کی کوشش میں تھی۔

ہوٹل ہمارا قریب ہی تھا۔ ٹیکسی کیب نے ہمیں ہمارا کمر پندرہ منٹ لگا دیے۔ ہمارا ہوٹل 8th ایویو اور 47th اسٹریٹ کے کونے پر تھا۔ یہ ہوٹل ایک تو معیاری بھی تھا اور ساتھ ٹائم اسکوئر سے تین منٹ کی پیدل داک پر تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور پاکستانی تھا۔ میں اس سے کچھ معلومات لیتا رہا۔ وہ ہمیں بتا رہا تھا کہ حلال ریسٹورنٹ کہاں کہاں ہیں، بائے کا ناشتا کہاں سے ملے گا اور ریڈ ایریا کہاں ہے۔ اس نے ہمیں ہوٹل کے سامنے اتارا، اپنا فون ہم پر دیا اور پھر میٹر کے لیو کو کھمایا اور ہمارے بجائے نکل گیا۔

ہم اپنے چھوٹے ٹیک پکڑے ہوٹل کے سامنے کھڑے تھے۔ مین دروازے کے آگے دو بڑے ستون تھے۔ دیواروں پر شیشے کی بڑی بڑی کھڑکیاں اور ان پر لگی پرانے طرز کے لائٹ فکڑ تھے۔ پرانے طرز تعمیر پر بنے اس ہوٹل کی عمارت شاید پانچ منزلہ تھی۔ میں نے ارد گرد دیکھا تو ساتھ ایک سرخ رنگ کی عمارت بھی جس میں نیچے ٹریول ایجنسی کا دفتر تھا۔ سامنے کوئی فوڈ مارکیٹ تھی اور بائی اپارٹمنٹ بلڈنگ تھیں۔ ان اپارٹمنٹ بلڈنگز کے باہر لوہے کی میڑھیاں دگ دگ تھیں

پہلی منزل سے آخری منزل تک چڑھتی تھیں۔ یہ سب عمارتیں لگ بھگ سو سال پرانی تھیں۔ یہ میڑھیاں میں نے مینہ کی بر پرانی بلڈنگ کے باہر دیکھی تھیں۔ لوہے کی ان میڑھیوں نے عمارتوں کے قدیم ہونے کا ثبوت ارجا کر کیا ہوا تھا۔ سڑک پر ٹریفک اتنی زیادہ تھی اور شور شرابہ نہ تھا جس کا مجھے خدشہ تھا۔

ہم تینوں تھکے ماندے ہوٹل کے استقبالیہ میں داخل ہوئے تو وہ خالی پڑا تھا۔ چھت پر لگے قانونوں سے لابی جگہ رچی تھی۔ کرسیاں اور گول میزیں میزوں کے ساتھ لگی تھیں جن پر بیٹھ کر سڑک پر آتی جالی ٹریفک کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ استقبالیہ لابی ایک بڑے کمرے میں بنا تھا جس کی دو جانب کاؤنٹر تھے۔ استقبالیہ کے سامنے لابی میں دیوار کے ساتھ ایک بڑا کاؤنٹر رکھا تھا جہاں تازہ جوس، کافی مشین، مائیکرو ویو، جاکیٹ، چپس، ہلکٹ، ایک اردو ونڈر رکھے تھے۔ ایک ریک پر بوتلیں دیکھنے کے لیے بہت سے بھروسہ، نشے، بس ٹرپ کپنیوں کے پمفلٹ اور ہر مشہور جگہ کی معلومات رکھی تھیں۔ میں نے اپنے کام کے بھروسہ اٹھالے۔ ہم تینوں خوش تھے کہ ہمیں ایک اچھا ہوٹل ایک اچھے مقام پر ملا ہے۔

ہم کھڑے جانے لے رہے تھے کہ کاؤنٹر کے پیچھے ایک دروازے سے ایک صاحب نکل کر آئے اور ہمیں دیکھ کر مسکرانے لگے۔ وہ جوں سال تھا وہاں کا لے سوٹ میں اس کی شخصیت زیادہ گھر رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ آفاقی صاحب کو تو ہر ہوٹل میں استقبالیہ پر کوئی نہ کوئی لڑکی ملتی ہے اور ہٹ صاحب اس کا نام معلوم کرنے کی کوشش میں ہوتے تھے مگر مجھے ناتھ امریکا میں ہوٹل کے پہلے تجربے میں کسی مرد کا سامنا ہوا ہے۔

میں نے اس صاحب کو اپنا نام بتایا اور کہا۔ ”ہمارا تین بیڈ کا کمر اکل بک کر دیا گیا تھا۔“

اس نے کمپیوٹر پر کچھ دیکھا اور بولا۔ ”دوسری منزل پر آپ کا کمر ایک ہے اور آپ کے لیے طارق صاحب کا کئی بار فون بھی آچکا ہے۔ اس نے کچھ کاغذ پرنٹ کر کے میرے سامنے رکھے اور میں نے دستخط کر کے دیئے تو اس نے تین کارڈ ہمارے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ کمرے کی تین چابیاں ہیں۔“ میں کمرٹ کا ڈسٹ سائز کے کارڈ لیے حیران کھڑا سوچ رہا تھا کہ یہ کس قسم کی چابیاں ہیں۔“

سرخ بولے۔ ”یہ ہیں بے خوف پاکستانی سمجھ کر ہمارا مذاق اڑا رہا ہے۔“

میں خود شش و پنج میں تھا۔ وہ ہماری مشکل سمجھ چکا تھا۔ کہنے لگا۔ ”میں آپ کو کمرے تک چھوڑ آتا ہوں۔“ ایک لفٹ سے ہم دوسری منزل پر آئے۔ خاموش اور دیران پڑی لمبی لابی میں دونوں جانب کمروں کے دروازے تھے۔ لابی قفوں کی روشنی سے جگمگا رہی تھی فرش پر دبیز سرخ کارپٹ بچھا تھا۔ ایک دروازے کے سامنے وہ رک گیا۔ کارڈ کو دروازے پر لگی ایک سلاٹ میں ڈالا اور کلک کی آواز آئی اور ہینڈل کھما کر اس نے دروازہ کھول دیا۔ یہ کہتا ہوا وہاں پہنچا گیا کہ ”ناشتا تین سات سے نو بجے تک آپ کو لابی میں فری ملے گا۔“

اب سرخی وہ تینوں کارڈ اپنے ہاتھ میں تھا ہے حیرت سے دیکھ رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔ ”امریکا نے تو مجھے ششورہ کر کے رکھ دیا ہے۔“

ہم کمرے کے اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہ ایک بڑا کمر تھا جس میں تین سنگل بیڈ ایک لائن میں لگے تھے۔ ہر بیڈ کے بیچ ایک نائٹ ٹیبل تھی جس پر رکے لیپ روشن تھے۔ سامنے دیوار کے ساتھ ڈریسنگ ٹیبل تھا جس کے اوپر پی دی لگا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل پر فون رکھا تھا اور ساتھ ایک فریج بھی رکھا تھا جسے کھول کر سرخی کھینچ رہے تھے۔ ”یہ سر کے کی بوتلیں یہاں کیوں پڑی ہیں؟“

شہباز نے دیکھا تو بولا۔ ”سرخی! اتنے معصوم نہ بنیں، یہ شراب کی بوتلیں ہیں۔“

وہ کہنے لگے۔ ”کیا یہ بھی کرائے میں شامل ہیں؟“ میں نے نائٹ ٹیبل کی دراز کھولی تو وہاں بائیل بھی رکھی تھی۔

دروازے کے ساتھ واٹس روم کا دروازہ نظر آیا۔ وہ ایک صاف ستھرا اور نفاست سے سجادش روم تھا۔ نہانے کے لیے ٹب تھا۔ سب سے پہلے میں نے اپنی تھکاوٹ اتارنے کے لیے گرم پانی سے غسل کیا۔ تازہ دم ہوا تو آسودگی سے اپنے بیڈ پر لیٹ گیا۔ پھر سرخی واٹس روم میں جا گئے اور اسی دوران شہباز کے خزانے کو جھنجھے لگے۔

اتنے میں فون بجنے لگا۔ اٹھایا تو طارق تھا۔ کہنے لگا۔

”میں پریشان ہو رہا تھا کہ آپ لوگ کہاں ہیں؟“ میری آج کی روئیداد اسی تو کونے لگا۔ ”تمہارا دماغ خراب ہے۔ معلوم نہیں کہاں کہاں دھکے کھا رہے ہو۔ میوزیم اور پارکس میں بھی کوئی کھونے جاتا ہے؟“

فون پر پھر ایک چیمک سنائی دی اور پھر کہنے لگا۔ ”کل

کس وقت واپس آؤ گے؟“

جب مجھ سے یہ سنا کہ ہو سکتا ہے کہ ایک رات اور ہوٹل میں ٹھہر جائیں تو چھٹ پڑا۔ ”تم کیا مجھ سے ملنے آئے ہو یا درخت اور ٹھنڈے دیکھنے؟“ تم پہلے تو پاگل نہ تھے، اب کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“

میں نے پوچھا۔ ”پاگل سے کیا مطلب ہے تمہارا؟“ وہ بولا۔ ”مجھے ویران بیچ پر بیٹھے ہوتے ہو، کبھی سورج کو دیکھنے لگتے ہو اور کبھی کوئی کو۔ اچھے خاصے تھے، اب فلاسفر بنے پھرتے ہو۔“

اب کی بارہ چھینکا تو چیمکٹا چلا گیا اور جب رکا تو پھر بولنے لگا۔ ”مجھے تو ڈر ہے کہ تم اپنے فارمیسی کے لائسنس کے امتحان کیسے پاس کرو گے۔“

دراصل طارق نے تیسری باری پر امتحان پاس کیا تھا اور اسے یہ خدشہ تھا کہ میری دہائی اب پڑھائی کرنے کی بجائے کھونٹے پھرنے پر زیادہ ہے۔ کو اس کے خدشات میں نے اس وقت درگزر دیا ہے تھے جب سب ”اقانات اللہ کی مدد سے پہلی ہی کوشش میں پاس کر لیے۔ آخر میں انہی نصیحتیں کر کر کے ٹھک گیا تو فون بند کرنے سے پہلے یہ کہا کہ اگر کل بھی رکنا ہو تو مجھے فون کر دینا، میں صدمہ کر دوں گا۔“

اتنے میں سرخی نہا کھڑا ہو کر باہر آچکے تھے۔ اپنے چند بالوں کو ڈرائی کرنے کے بعد سر سے چپکارا ہے تھے۔ پھر اپنی مونچھوں کو ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے میں غور سے دیکھا، لاکا سا مسکرائے، پھر کچھ دیر سوچا اور پھر مطمئن ہو کر کہنے لگے۔ ”شہباز کے خزانے میرے کانوں میں بم کی طرح پھونٹے ہیں۔“ پھر قریب سے خزانے پھرتے شہباز کو دیکھا اور بولے۔ ”قسم سے ایسا لگتا ہے کہ کسی تیل کا زخرو ابھی کاٹا گیا ہو۔“ یہ کہہ کر پھر فریج کھولنے لگے۔ یہ دوبارہ پوچھنے لگے۔

”کیا یہ بوتلیں بھی کرائے میں شامل ہیں؟“

میں نے پوچھا۔ ”اگر شامل ہیں تو پھر؟“

کہنے لگے۔ ”میں نے اس لیے پوچھا ہے کہ اگر فری ہیں تو لا حول و پڑھ سکوں۔“

کچھ دیر ٹھہرتے رہے اور دوبارہ واٹس روم میں چلے گئے۔

واپس نکلے تو پوچھنے لگے۔ ”اب پوگرام کیا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”آپ ایک بار پھر واٹس روم سے ہو آئیں۔ اتنے میں سوچ کر آپ کو بتاتا ہوں۔“

یہ سن کر میرے کہنے کا مطلب تلاش کرنے لگے اور پھر

بستر میں گھس کر بیٹھ گئے۔

میں نے سوچا کہ آج کی نمازیں پڑھ لی جائیں۔ میں وضو کرنے والی روم میں جانے کے لیے اٹھا تو سرجی نے پوچھا۔ ”پھر کیوں جا رہے ہو؟“
میں بولا۔ ”آج کوئی نماز نہیں پڑھی، سوچا وضو کر کے اپنی قصر نمازیں ہی پڑھ لوں۔“
اس بات پر وہ بستر پر بیٹھے بیٹھے بولے۔ ”سربجہ سے میں اور من بدلوں میں۔“
”یا اللہ میرے گناہ بخش دے۔“ شہباز نے آنکھیں کھول کر بغیر کہا۔
”کیا اسے خند میں چلنے کی عادت ہے؟“ سرجی نے تشویش سے کہا۔ ان کی نظریں کبل اوڑھے شہباز پر ٹھہر گئی تھیں۔

بیٹھے کھانا کھا رہے تھے اور کچھ پیمک کروا کر اپنے ساتھ لے جا رہے تھے۔ سامنے کاؤنٹر کے پیچھے ایک پاکستانی عورت سفید اپرن باندھے آرڈر وصول کر رہی تھی۔ شوکیس میں تازہ بنے کھانے رکھے تھے۔ سہمی نے شوکیس کے اندر کا جائزہ لیا اور خوش خبری سنائی کہ بریانی، کڑھائی گوشت، چٹپلی، کباب کے ساتھ پائے بھی ہیں۔ اندر تھوڑے سے تازہ گرم روٹیوں کی مہک ہم تک آرہی تھی۔ ہمیں اعزاز ہو گیا تھا کہ یہاں کے سب گاہک ٹینکیاں چلانے والے ہیں۔ ان کو جیسے ہی وقت ملتا ہے تو وہ یہاں بیٹھ کر کھانا کھانے کے علاوہ کچھ دیگر آرام بھی کر لیتے ہیں اور جلد ہی میں ہوتے ہیں سینڈویچ، چائے یا کولڈ ڈرنک اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔

رات گیارہ بجے تک موجود رہتے ہیں۔ روزانہ کے حساب سے تازہ کھانا تیار کیا جاتا ہے۔

اڑے کی زردی 250 گرام کرسٹل زرخیز، مرہم کرتی ہے
اور کرسٹل مرہم اثرات سے آج کون واقعہ نہیں تھا۔ میں اس
کی زیادہ مقدار خون کی شریانوں میں جم جاتی ہے جس کی وجہ سے ہائی
پریشر اور اس میں قلب لاحق ہو سکتے ہیں۔ اسے ہاہین تغذیہ
چاچا اور بی بی ہفتہ تجویز کرتے ہیں جب کہ چالیس سال کی عمر کے
بعض افراد میں اور کی کڑی دے تو تھرتے۔

کہنے لگے۔ ”ڈائمنو سارے بھی بڑے مل بورڈ ہیں، دل کرتا ہے کہ انہیں دیکھتا رہوں۔“

بات انہوں نے میرے دل کی کمی تھی اگر ایک دو مل بورڈ ہوتے تو بندہ ایک دو پارڈ دیکھ کر کسی اور جگہ کا رخ کرتا مگر وہاں چاروں جانب روشنیوں کا یہ سمندر رواں تھا۔ ان بے انتہا روشنیوں کے بیچ سکرکاتے، تھمتھکتے اور حیران چہرے مگھوتے پھر رہے تھے۔ بیشتر جوڑے اور فیملیز تھیں۔ بقول سر جی کے یہاں کھوے سے کھوا چھل رہا ہے۔ یہاں ٹیبلر تھے جہاں ڈرامے مناجا ہوتے تھے۔

دونوں جانب فٹ ہاتھوں پر کوئی کچھ بچ رہا تھا کوئی گٹار، برائی ڈھن پھیرے، ٹیک مائک رہا تھا۔ کچھ آرٹسٹ بیٹھے بیٹسل سے لوگوں کے اچانک بنا کر اپنی دیہاڑی لگا رہے تھے۔ فٹ ہاتھوں کے ساتھ ریہ نوٹس، پیراسٹور، کیفے، پب اور روشنیوں میں نہائی دکانوں کے اندر گاہکوں سے زیادہ دھڑلے شاپنگ کرنے والے تھے۔ بس ایک میلہ لگا تھا جہاں ہر ایک نے اپنی دنیا باریک دیکھی۔

سائینے وہ بلند اور تھا جہاں نئے سال کی آمد پر ایک بال اوپر سے آہنگی کے ساتھ نیچے آتی ہے۔ 1907ء سے یہ بال باقاعدگی کے ساتھ ہر سال 31 دسمبر کو نیچے گرتی ہے۔ ہر فورسٹ ایک بار اس جگہ کو بغور ضرور دیکھتا ہے۔ سکرکرو نو بنواتا ہے اور پھر بڑتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ دنیا میں پیدل گھومنے والوں کا سب سے بڑا مقام ٹائم اسکوائر ہے۔ میں کبھی بھی روشنیوں کے بیچ خوش نہیں ہوتا۔ ماحول میں تیرکی اور ٹیم اندھرا ہمیشہ مجھے آسودہ رکھتا ہے مگر یہاں آکر میں بھی خوش تھا کیونکہ ایسی جگہیں ہر وقت آپ کو دیکھنے کو نہیں ملتیں۔ بروس میں شانزے لیزے ہو یا لندن کی آکسفورڈ اسٹریٹ، سوئٹزرلینڈ میں زیورچ ہو یا ہالینڈ کا امسٹرڈیم، شکاگو کی میکینفٹ اسٹریٹ ہو یا سان فرانسسکو کی گولڈن گیٹ برج، یہ سب بہت پر رونق مقامات ہیں مگر ٹائم اسکوائر کان سے کہیں بڑھ کر ہے۔ میری رائے میں اس کا مقابلہ کسی اور جگہ سے نہیں ہو سکتا۔ پانچ کروڑ نو سو تھیں ہر سال ایک جگہ آتے ہیں اور ایک دن میں ساڑھے تین لاکھ کے قریب لوگ یہاں سے گزرتے ہیں۔ ویک اینڈ پر یہاں سے پیدل گزرنے والے ایک دن میں پانچ لاکھ تک ہوجا جاتے ہیں۔ اس سے آپ اس جگہ کی شہرت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

1904ء میں جب نیویارک ٹائم کا ہیڈ آفس یہاں شفٹ ہوا تو اس کا نام ٹائم اسکوائر پڑ گیا۔ پہلے یہ کسی اور نام

سے نکالا جاتا تھا۔ انیسویں صدی کے آخر میں یہاں دو تین منزلہ عمارتیں تھیں، چیمبر تھے، پینٹ اینٹوں سے بنی مکمل سڑک تھی اور اس پر تانے چلا کرتے تھے۔ مل بورڈ نہ تھے مگر دکانوں کے باہر ہاتھوں سے بڑے بڑے حروف میں ان دکانوں کے نام لکھے ہوتے تھے۔ سو سال سے لاکھوں لوگ نئے سال کی خوشی میں یہاں جمع ہو رہے ہیں۔ جب سے 11/9 ہوا ہے تو اب نئے سال میں ہر چار ہندوں پر سادہ لباس میں ایک پولیس والا مقرر ہوتا ہے۔

ہم تین تھے مگر ہر ایک علیحدہ علیحدہ ہو کر چاروں جانب دیکھ رہا تھا۔ اتنی زیادہ رنگ برنگی روشنائی تھیں کہ اب ہماری آنکھیں انہیں دیکھ کر خیرہ ہوئے لگیں اور پھر ہم ایک دوسرے کی جانب متوجہ ہوئے۔

سر جی بولے۔ ”ہم تو جنگلوں میں گھومتے رہے اور یہاں تو سماں بندھا ہوا ہے۔“ پھر تانف بھرے لہجے میں بولے۔ ”گیا وقت کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔“

ٹھنڈا تر رہی تھی اور لوگوں نے اپنے آپ کو ڈھانپا ہوا تھا۔ وہ منظر نہ تھے جو گرمیوں میں نظر آتے ہیں مگر پھر بھی ایک جوش و دلور تازگی اور دلچسپی ہر سانس لگتی تھی۔ زندگی ایک بھر پور اور پر شور دلہن میں نظر آ رہی تھی۔

کچھ بڑے بڑے مل بورڈ نیم عریاں لڑکیوں کے تھے جن میں وہ بھر پور انداز میں جلوہ گر تھیں۔ یہیں سر جی پھنس کر رہ گئے۔ ان مل بورڈ کو بغور دیکھ رہے تھے۔ جب شہباز نے ہنس کر پوچھا۔ ”سر جی! اس کے باقی ماندہ کپڑے تو رہنے دیں۔ کیا پورا کھٹکا لیں گے اسے؟“

سر جی کہنے لگے۔ ”مجھے تو جھرجھری آ رہی ہے۔ اتنی سردی میں کسی کو کم لباس میں دیکھیں تو خود کو بھی بہت سردی لگتی ہے۔“

شہباز نے مذاق میں ان کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”مگر آپ تو چپ رہے ہیں۔“

اس پر وہ بہت غصا ہوئے۔ میں نے کان میں پوچھا۔ ”کیا واقعی چپ رہے ہیں۔“

سر جی کہنے لگے۔ ”اتنا بھی نہیں، جتنا شہباز بتا رہا ہے، اسے تو ہر بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی عادت ہے۔“ یہ کہہ کر فٹ ہاتھ پر ایک اچانک بنانے والے ایک آرٹسٹ کی جانب دوڑ پڑے۔

ہم بھی ان کے پیچھے پیچھے گئے۔ ایک چینی اپنے سامنے ایک اسٹول پر کسی خوب صورت لڑکی کو بٹھا کر اس کا اچانک بنا رہا

تھا۔ لڑکی انتہائی حسین تھی۔ سنہری بال، بڑا آنکھیں، تانباں چہرہ اور لمبی گردن۔ اس کا حسین دیکھ کر تو ہم سے بولا ہی نہ گیا۔ سر جی کی نظر جب پڑی تو بھی ادھر دوڑے چلے آئے تھے۔ وہ لڑکی ایک حسین مسکراہٹ سجائے بنی بیٹھی تھی اور چینی آرٹسٹ اس پر نظریں گاڑے، اچانک پھر اس کا چہرہ بناتا تھا۔ شہباز بولا۔ ”کون خوش قسمت اس کا سامنا ہوگا؟“

سر جی ادھر ادھر دیکھ کر بولے۔ ”ماشاء اللہ اکیلی لگتی ہے۔ اسے کافی پیسے کی دعوت دیں؟“

میں نے سر جی سے کہا۔ ”آپ کی دعوت پر اگر وہ چلتی ہے تو تمام عمر آپ چینی کافی پیسے، وہ میری جانب سے فری ہوگی۔“

میری بات نظر انداز کر کے وہ بولے۔ ”ماشاء اللہ! اس سے خوشیوں کے جھونکے آ رہے ہیں۔“

چینی آرٹسٹ نے غور سے سر جی کو دیکھا جو اس کے ہاتھوں میں کپڑے اچانک پر اس اپنی نظروں کے تیر گاڑے کھڑے تھے۔ سر جی ایک دم انہیں میں پڑ گئے اور ایک دم بول اٹھے۔ ”میں نے اپنا اچانک بنواتا ہے۔“

اس چینی نے بیٹسل سے اس خود پری کی جانب اشارہ کر کے سر جی سے کہا، ”اس کا اچانک ابھی مکمل کر کے آپ کا بناتا ہوں۔“

اب سر جی کو وہاں کھڑا رہنے کا جواز مل گیا اور ساتھ نہیں بھی۔ میں اور شہباز بھی موقع ملنے ہی اس روشن چہرے کو دیکھ رہے تھے جو سب سے بے نیاز تھا۔ اس کا غور اسے زیادہ جاذب نظر بنا رہا تھا۔ ارد گرد چمکتے مل بورڈ اس کے چہرے سے پھوٹی روشنی کے آگے مدھم بڑتے نظر آ رہے تھے۔

سر جی نے مجھے اور شہباز کو اتنا تنہک دیکھا تو شکایت کرنے لگے۔ ”آپ دونوں اپنی والی ٹورنٹو چھوڑ آئے اور یہاں میری والی پر غلط نظریں رکھ رہے ہیں۔“

ان کے الفاظ انہی قسم بھی نہ ہوئے تھے کہ اس کا اچانک مکمل ہو گیا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور چینی سے کانڈ لے کر اپنا اچانک دیکھ رہی تھی۔ سر جی اسے اپنا مال متروک سمجھ کر ٹھنڈے سے کھڑے ہماری جانب سٹائی نظروں سے دیکھتے رہے۔ اتنے میں اس کا ہوائے فریڈ آ گیا۔ جیسے ہی ہم نے اسے دیکھا تو میں گرتے گرتے بچا۔ شہباز کا رنگ پہلے زرد ہوا اور پھر سرخ۔ سر جی اپنا منہ کھولے حیرت اور صدمہ کی کیفیت میں نظر آئے۔ وہ کوئی ساڑھے چوٹ کا بچہ و نیم سیاہ فام تھا۔ جین کی پینٹ اس نے نیچے تک کھسکی ہوئی تھی اور زیر جامہ

بھی نظر آتا تھا۔ سر پر سرخ رنگ کی ٹی کپ، اپنی جینز دھکی تھی۔ آتے ہی لڑکی اس کی گردن سے لٹک گئی۔ دونوں نے کھڑے کھڑے ایک دوپٹے لے لیے اور ہنسنے ہوئے چلے گئے۔ سر جی اور ہم ابھی تک شاک میں تھے کہ اتنی حسین لڑکی کے ساتھ اتنا بدوخت انسان بھی ہو سکتا ہے۔ میں مکمل کی بات ہرگز نہیں کر رہا مگر اس کا ہالیا کی موٹاپا اور جسامت کی طرح اس لڑکی سے مکمل نہیں لگتا تھا۔ شہباز نے کہا۔ ”خود کے ساتھ لنگو تو ساتھ مگر رنگ کا جھگ نہیں سنا تھا۔“

اتنے میں اس چینی آرٹسٹ نے شدید صدمے میں جھلا سر جی کو پکڑ کر اسٹول پر بٹھا دیا تھا۔ وہ پندرہ ڈالر مانگ رہا تھا اور سر جی اپنی ”قیمت“ کم کر دانا چاہتے تھے۔ چینی آرٹسٹ نے دس ڈالر کی حالی بھری اور سر جی سے نوٹ لے کر اپنی جیکٹ کی جیب میں غولس لیا۔ پھر کانڈ بیٹسل اٹھا کر لائیں بنانے لگا۔ سر جی نے مصنوعی مسکراہٹ اپنے چہرے پر سجانے کی کوشش کی مگر بری طرح ناکام تھے۔ میری اور شہباز کی آنکھیں کانڈ مارا جڑا ہوا تھا جو ابھی یہاں سے ہمیں شدید ذہنی دھچک دے کر رخصت ہو چکا تھا۔ سر جی اسٹول پر بے زار بیٹھے سطرار ہے تھے۔ آرٹسٹ نے پانچ منٹ میں اپنا کام ختم کیا اور اچانک بنا کر کانڈ سر جی کے حوالے کر دیا۔ سر جی کے چہرے کا پہلے رنگ بدلا اور پھر حق ہو گیا۔ میں نے کانڈ ان کے ہاتھ سے لیا تو معلوم پڑا کہ اس نے سر جی کا کارڈن بنا ڈالا تھا۔ چار گڈا بڑا، لٹکتی ناک، چھوٹا سا چہرہ اور ناچتی مونچھیں۔ میری تو لمبی نکل گئی۔ شہباز بھی ہنس ہنس کر دو ہرا ہوا اور کہا کہ ہاتھ تھا۔ ”ہے تو کارڈن مگر پھر بھی سر جی لگتا ہے۔“

سر جی چینی آرٹسٹ سے سر تا پا احتجاج تھے اور چینی کہہ رہا تھا کہ پندرہ ڈالر میں اچانک بننا ہے اور دس میں کارڈن۔ یہ سر جی کے لیے دوسرا صدمہ تھا۔ پہلا وارہ لڑکی کے کاچکی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی سر جی نے وہ کارڈن موڑ توڑ کر جیب میں غولسا اور ہمیں وہیں کھڑے چھوڑ کر وہاں سے چلے گئے۔

سر جی صدمے سے باہر اس وقت تک نہیں نکلے جب تک لوگوں کے جھوم میں سے ایک کی ماؤس کے پیٹے میں کسی نے بڑھ کر سر جی کو گھٹے لگا کر اٹھا نہیں لیا۔ سر جی بھی اسے بری طرح پٹ گئے۔ سر جی کو شاید گدگدایاں ہو رہی تھیں جو وہ بچوں کی طرح ہنس بھی رہے تھے اور کسی ماؤس کی بانہوں میں ہاتھ پاؤں بھی مار رہے تھے۔ سر جی کو خوش کر کے کسی ماؤس کے رینگھٹھا کارڈن نے ان سے پانچ ڈالر دو بچ لیے اور سر جی کو

ہجوم میں کھڑا کر کے کسی اور شکار کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

سرجی ابھی تک نہیں رہے تھے۔ شہباز نے پوچھا۔
”اس میں ہنسنے والی کیا بات تھی؟“

تو بولے۔ ”زنا نہ کس پر مگر کدی ہوتی ہے۔“
میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ کوئی عورت تھی؟“

اس پر فرمایا۔ ”تجربے کی بات ہے! اتنا جاہل بھی نہیں کہ نہ انداز مردانہ بھی کو پہچان نہ سکوں۔“

شہباز بولا۔ ”اگر کوئی لڑکی ہوتی تو آپ کو ایک کھلونے کی طرح نہ اٹھالتی؟“

کہنے لگے۔ ”یہاں کی لڑکیاں بھی بہت درزشیں کرتی ہیں۔ ماشاء اللہ بہت طاقتور ہوتی ہیں۔“ پھر شادمانی کی کیفیت میں بولے۔ ”مہینوں بعد طبیعت باغ و بہار ہو گئی ہے۔“

سرجی کو بھی معلوم نہ تھا کہ وہ عورت تھی یا مرد مگر وہ اسے لڑکی سمجھ کر تصور میں خوش ہو رہے تھے۔ ہمارے لیے یہی بہتر تھا کہ انہیں خوش ہی رہنے دیں اور ان کے حیرے کو کر کرانہ کریں اور اسی لیے ہم بھی خاموش ہو گئے۔

سامنے ایک یادگاری بنی تھی۔ اس کے سامنے کشادہ سبز حیاں ایک جوتے پر جاری تھیں۔ ان سبز حیوں پر متعدد ٹورسٹ جن میں عورتیں، مرد اور بچے شامل تھے وہ بیٹھے سستارے تھے۔ ہم اوپر چڑھے تو نیچے دور تک کا منظر ہمارے نیچے بہہ رہا تھا۔ چندھیا دینے والے بڑے بڑے تل بورڈز، آسان کی بلندی کو چھوٹی عمارتیں اور نیچے ہزاروں مطمئن لوگوں کا ہجوم اور ان کے قہقہے ہمیں سنائی دے رہے تھے۔ ہم درجنوں اور لوگوں کی طرح ان سبز حیوں پر بیٹھے وہ سو سے کھا رہے تھے جو سرجی کو نہ ٹورنٹ والی عورت نے تجھے میں دیے تھے۔

سرجی ان بلند و بالا جگہ کی عمارتوں کو دیکھ کر بہت خوشی اور حیرانگی سے یہ کہتے سنے گئے۔ ”ان عمارتوں کو بتانا سرے کنواں کھودنے کے برابر ہے۔“

اب یہ سرے کنواں کھودنے والی بات ہماری سمجھ میں بالکل نہ آئی تو کسی نڈل اسکول کے استاد کی طرح انہوں نے سمجھایا کہ اس کا مطلب ہے کہ جان جو کھوں کا کام ہے۔

شہباز بڑبڑایا کہ آسان طریقے سے جان جو کھوں کا کام بھی تو کہہ سکتے تھے تو کہنے لگے۔ ”سمجھا پوت دہا نہیں

جاتے۔“ اب ہم دونوں اپنا سر پکڑے ان سبز حیوں پر بیٹھے تھے اور وہ اس کا مطلب یہ سمجھا رہے تھے کہ جب اپنی عقل نہ ہو تو استاد کی عقل سے بھی کام نہیں چلا۔

کچھ دیر ہم یہ نظارہ دیکھتے رہے اور پھر شہباز کہتا تھا کہ اس نے خوابوں میں بھی نہیں سوچا تھا کہ یہ مقام اتنا مڑوٹی اور اتنی زیادہ روشنیوں سے منور ہوگا۔ میرا اپنا بھی یہی خیال تھا۔ اگر نام اسکو لڑکوں کا لیا جاتا تو شکار کا ڈاؤن ٹاؤن کئی درجے مجھے بہتر لگا۔ شکار کو میں مٹی گن ایک کے کنارے سے ڈاؤن ٹاؤن کا منظر اور اس کی اسکاٹی لائن جتنی خوبصورت نظر آتی ہے وہ سان فرانسسکو میں بھی نظر نہیں آتی اور نہ دریا بڈسن سے نیویارک میں نظر آتی ہے۔ کم از کم میرا اپنا بھی مشاہدہ ہے۔

روٹی ابھی تک نام اسکو لڑکے کی تھی جیسے تین گھنٹے پہلے نظر آ رہی تھی۔ رات کا ایک بج رہا تھا اور ہم تھک بھی چکے تھے۔ شہباز تو سبز حیوں پر لیٹ گیا۔ سرجی بولے۔ ”میرا خیال ہے کہ وہاں ہوش پلٹے ہیں۔“ پھر شہباز کو لے دیکھ کر بولے۔ ”اس سے پہلے کہ اس کے خزانے کو ہمیں اور ہم دھر لے جائیں، ہمیں جلد یہاں سے کھمک لیتا جاوے۔“

میں نے کہا۔ ”اس کے خزانے لینے پر ہم کیوں دھر لے جائیں گے؟“

کہنے لگے۔ ”آپ کو نہیں لگتا کہ جیسے کوئی ہم پہننے والا ہو۔“

ہوئی ہم پانچ منٹ میں پہنچ گئے۔ نام اسکو لڑکے کے پیچھے کا علاقہ ویران پڑا تھا۔ ہوا کا عالم تھا۔ ہوش میں ہمارے کمرے کے آرام وہ بستر ہمیں ایک انعام اور عینیت کی طرح لگتے تھے اور جب لینے تو تھکاوٹ کی وجہ سے نیند میں چلے گئے۔

میری آنکھ لگی تھی کہ سرجی نے جھنجھوڑ دیا۔ میں نے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا۔ وہ حواس باختہ ہو رہے تھے۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

ان کی حالت دیکھ کر میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ ساتھ ہی ساتھ زبانون سے نکلا۔ ”خیریت کیا ہو گیا؟“

”برابر والے روم میں تین نہایت حسین و جمیل لڑکیاں ٹھہری ہوئی ہیں۔“

”اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔

میں ان سے باتیں کر رہی رہا تھا کہ پولیس آگئی۔

پولیس کا نام سننے ہی میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

(جاری ہے)

کتب خانے

ایاز راہی

زندہ قومیں اپنی ایک پہچان رکھتی ہیں۔ غلم کا ورثہ محفوظ رکھتی ہیں تاکہ آنے والی نسل اپنی جڑوں، اپنی تاریخ سے آگاہ رہ سکیں لیکن اب کوئی اس نکتے پر غور و فکر ہی نہیں کرتا۔



ایک مختصری مگر جہالت اہم تحریر

وین اسلام (سلامتی کی راہ) کی ابتدا (قرآن پڑھیے) سے ہی ہوئی ہے۔ پڑھنا یا مطالعہ کا مفہوم بڑا وسیع اور جامع معنوں کا حامل ہے۔ سرسری مطالعہ، دیکھ بھل کر کے مطالعہ، تدریس و تحقیق کی نیت سے مطالعہ وغیرہ۔ مطالعہ کتاب کا ہو یا صفحہ ہستی (کائنات) کا۔ دو آنکھوں کی طرح دونوں ہی لازم و ملزوم ہیں کسی ایک کا نہ ہونا بد صورتی اور کج روی ہی کہلاتے کی۔ سو جب تک محفّذ ہستی (کائنات) رہے گا کتاب کا وجود اس میں ہمیرے کی مانند جگہ کا تارہے گا۔

قرآن حکیم کو پہلے کتاب ہی کی صورت محفوظ کیا گیا بعد میں آج کے جدید ترین ذرائع اپنائے گئے۔

کتاب کا ذکر ہو تو کتب خانے کا خیال بالاحوال ذہن میں آتا ہے کہ تمدنی معاشرت میں جہاں انسانوں کے شہر اور ممالک وجود میں آتے ہیں وہیں حوروں کی ہستی (کتب خانہ) بھی حسن و خیر کے لیے نمود پاتی اور گوہر شب تاب کی مثل جہالت کے اندھیروں میں جگمگاتی ہے۔ اس ضمن میں کل از صبح کے قدیم کتب خانہ کتب خانہ سکندریہ (مصر) سے متعلق کچھ معلومات اور ایک دو باتیں مذکر قارئین ہیں۔ مقدونیہ (یونان) کے سکندراعظم 356 ق م تا 323 ق م (میل دور شمال) نے جب مصر فتح کیا تو وہاں اپنے نام پر ایک شہر بسایا جسے سکندریہ شہر کہا گیا۔ یہ شہر قاہرہ سے 118 میل دور شمال مغرب میں بحیرہ روم کے کنارے پر بنا۔ یہاں آبی بندرگاہ اور بحری فوج کے لیے اڈا بھی تعمیر ہوا۔ سکندراعظم نے اسی کو مصر کا دارالحکومت قرار دیا۔ سکندراعظم کے بعد خاندان بطالہ کا دور شروع ہوا جس کے حکم ران علم کی فراوانی اور قدر دانی کے باعث مشہور ہوئے۔ یوں شہر سکندریہ نے بہت ترقی کی اور رونق پائی۔ حکیم بطلمیوس (323 ق م تا 283 ق م) اسی شہر کے قارون جزیرہ پر ایک بہت بڑا مینار بنوایا جو دنیا کے سات عجائبات میں گنا جاتا تھا۔ یہ مینار بھی سکندراعظم کی طرف منسوب تھا۔ اس مینار کو قاری میں آئینہ سکندری کہتے ہیں۔ دوسری طرف حکیم بطلمیوس سوتر نے شہر سکندریہ میں ایک بہت بڑا کتب خانہ بنوایا جس میں آگے چل کر سات لاکھ کے قریب کتابیں ذخیرہ ہوئیں یوں سکندریہ شہر اس وقت پوری دنیا میں علم اور سائنس کا مرکز بنا۔ یہاں اپنے وقت کے ذہین ترین عالم۔ حکیم (سائنسدان) ماہر اور فلسفی غور و فکر میں مصروف رہتے تھے جس میں اقلیدس، اپولونیوس اور ہیرون زیادہ مشہور ہوئے۔ یہ لوگ سرتا علم و کتاب کے آوی تھے۔ یہاں دور دراز سے کتابیں خرید کر لائیں اور جمع کی جاتی تھیں۔ اس کتب خانے میں دس ہزار سے زائد کتابیں جمع تھیں جن میں نباتاتی (باغ و فصلی) رصدگاہ، چڑیا گھر اور جراحی کے آلات کے لیے الگ الگ کمرے تھے۔ اسی طرح حکمت (سائنس) اور بحث و گفتگو کے لیے بھی علیحدہ کمرے مخصوص تھے۔

اس کتب خانے سے متعلق ایک دو باتوں کا تذکرہ یہاں ایک ماہر ریاضی دان خاتون استاذی اس کا نام ہانی پیشیا تھا جسے پہلی ریاضی دان خاتون کہا جاسکتا ہے۔ سکندریہ شہر کے تیسویں نامی ایک فلسفی اور ریاضی دان کے مگر 370 عیسوی

میں ہانی پیشیا نے جنم لیا جو بے حد خوبصورت اور ذہین بھی تھی۔ جوانی میں ہی اس نے فلسفہ، طبیعیات اور علم ریاضی پر عبور حاصل کر لیا، یوں صرف تیس برس کی عمر میں ہی وہ افلاطونیت کے ایک مدرسے کی سربراہ بن گئی۔ تیسری صدی عیسوی میں نو افلاطونیت ایک فلسفیانہ اور مذہبی نظام قاضی میں زیادہ تر افلاطون (423 ق م تا 348 ق م) کی تعلیمات، مشرقی نظام اور یونانی تصوف کا آمیزہ تھا جس پر بعد میں عیسائیت اثر انداز ہوئی۔ ہانی پیشیا ریاضی اور فلسفہ پر حاضری دی۔ اس کی ذہانت، حسن اور قابلیت نے سینکڑوں شاگرد بنائے جو اس سے باقاعدہ درس لیتے تھے اس کے علم کی شہرت اور حسن کی وجہ سے بہت بڑی تعداد میں اس کے لیے رشتے آئے مگر اس نے سب کو ٹھکرا دیا کہ وہ علم و تحقیق کی دلدادہ تھی۔ وہ شب و روز تحقیق و تعلیم میں مصروف رہی۔ چنانچہ شہرت نے پر پھیلانے اور خوش بوین کے چاروں طرف پھیل گئی اسے مستند استاد کا درجہ مل گیا لیکن بد قسمتی سے اس وقت ملک پر رومیوں کا راج تھا جہاں مذہبی لوگ بہت طاقت ور تھے اور یہ لوگ عقل و حکمت (سائنس) فلسفہ اور ریاضی کو کفر گردانتے تھے۔ علم و حکمت کا چراغ مذہبی جہالت کی زد میں تھا مگر پروانہ علم ہانی پیشیا شمع علم کے گرد نقصان دہیل درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ حکیم بطلمیوس کی کتاب اقلیدس پر تبصرہ کیا۔ شرح بطلمیوس دیکر بڑے بڑے ریاضی دان اور فلسفی کتابوں کی شرح بھی لکھی جن میں اپولونیوس کی مشہور کتاب کنکس اور ڈیالکٹکس کی کتاب ارشدہ ٹیک شال ہیں۔ اسی طرح سائنس نامی ریاضی دان سے اس عالم کی خط کتابت بھی ان خطوط سے ظاہر ہوا کہ ہانی پیشیا نے اضطراب اور پابندیوں کو اپنے دماغ میں سانس کی گدگد کی گویا وہ مکملی اور بحر جاتی حکمت (سائنس) سے بھی آشنا اور باہل عالم تھی۔ ہانی پیشیا ایک رومی گورنر کی گہری دوست تھی جس سے سکندریہ شہر کے بڑے باوری آرتھ بپ سائزل کے دل میں حسد کی آگ بجڑ گئی تھی۔ سوسا نے ہانی پیشیا کے قتل کا منصوبہ بنا کر اپنے کئی لوگوں کو اکسایا کہ ہانی پیشیا اسی تک کفر و الحاد (ریاضی) کی تعلیم دے رہی ہے اور بازنطیں آری لہذا اس کی بیکسی مزا ہے کہ اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے تاکہ مزید بے دینی نہ پھیلے۔

415 عیسوی میں ایک روز ہانی پیشیا اپنی سبھی پرسوار کہیں جا رہی تھی کہ قتل کے اندھے مذہبی جنوں نے اسے بھی سب سے پہلے پھینک کر اتارا اور سمندری کھوکھوں سے بے

تیز دار ہتھیاروں سے اس کا گوشت کھرچ کھرچ کے اتار ڈالا۔ ہانی پیشیا بیری طرح تڑپتی۔ جتنی چلائی اور دہائیاں دیتی رہی۔ جنم ملک نے دکھ سے آنکھیں میچ لیں۔ جب گوشت ہڈیوں سے اتر گیا تو لاش کو جلا دیا گیا۔ ادھر بڑے باوری آرتھ بپ سائزل کا درجہ بڑھا کر اسے سینٹ (ولی اللہ) بنا دیا گیا۔ ہانی پیشیا کے دو احوال بڑے خیال افروز ہیں۔

1۔ سوچنے کا قوت ضرور استعمال کرو اگر تم غلط بھی سوچو گے تو یہ نہ سوچو گے بہتر ہوگا۔

2۔ توہمات کو بچ جان کر بڑے آدمیوں کو عمل کرنے سے زیادہ خطرناک اور خوفناک بات اور کوئی نہیں۔

اسی کتب خانہ سکندریہ سے متعلق ایک غلط فہمی نے سر اٹھایا جو متعصب مسیحی مؤرخین نے مسلمانوں سے متعلق من گھڑت روایت کے طور پر لکھی اور پھیلائی حالانکہ خود غیر متعصب مسیحی مؤرخین نے اس کی مکمل نفی اور تردید بھی کی مگر اس غلط فہمی سے غیر قوی غیر اپنے مسلمان علماء بھی نہ بچ سکے اور عقل سلیم کے باوجود غوغائے رقیبان کی زد میں رہے۔

خامہ بخت بہ دعاں کہ اسے کیا لکھیے
ناقص سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے

متعصب مسیحی مؤرخین نے افسانہ یہ تراشا کہ حضرت عمر (583 عیسوی تا 644 عیسوی) کے عہد میں مصر فتح ہوا تو مسلمان پہ سالار عمرو بن العاص (585 عیسوی تا 664 عیسوی) نے حضرت عمر کے حکم پر سکندریہ کا کتب خانہ جلا کے راکھ کر دیا جو سراسر بہتان تھا۔

اس ضمن میں خدائے سخن۔ نظم و نثر کے رب النوع مرزا اسد اللہ خاں غالب کا ایک خط اور مولانا غلام رسول مہر (15 اپریل 1895 عیسوی تا 16 نومبر 1971 عیسوی) کی مدلل تردید پیش خدمت ہے۔ مرزا غالب کے خطوط اردو ادب کا طرہ امتیاز ہیں۔ مولانا غلام رسول مہر نے بڑی عقیدت سے خطوط غالب۔ مہر جب اسے ان کی تشریح و توضیح بھی کی لیکن ساتھ ساتھ مبالغہ آرائی کی نشان دہی اور کج بھی کی۔ یہی ان کا ادبی کارنامہ ہے۔ مرزا غالب کا مذکورہ خط مولوی ضیاء الدین خاں ضیاء دہلوی کے نام ہے یہ خط غالباً اوائل فروری 1866 عیسوی کو لکھا گیا۔ جس اعلیٰ و اکمل مولوی ضیاء الدین خاں ضیاء دہلوی۔ (بہشتی دارا پور تحصیل دہلی) کے جاگیردار خاندان میں سے تھے دہلی کالج میں تعلیم پائی۔ مولوی ملک اعلیٰ نانوتوی اور مفتی صدر الدین آذرود سے بھی عربی اور فارسی پڑھی پھر دہلی کالج میں مدرس مقرر ہوئے۔ بالآخر عربی کے

2011ء کا نوبل امن انعام تین خواتین کو مشترکہ طور پر دیا گیا ہے جن میں سے دو لائبریا کی ہیں ایک موجودہ صدر ایلین جانسن سرلیف ہے۔ دوسری حقوق انسانی کے لیے کوشاں لیبامبوی تیسری تو کل کرمان۔ توکل عبدالسلام خالد کرمان معروف بد توکل کرمان یمن کے صوبے تعز (Taiz) واقع موضع خلاف میں 7 فروری 1979ء کو پیدا ہوئیں۔ تعز۔ یمن کا تیسرا بڑا شہر ہے اور یمن جیسے قدامت پسند ملک میں علم و ہنر کا گہوارہ ہے۔ توکل کرمان کے والد عبدالسلام کرمان ایک وکیل ہیں اور علی عبداللہ صالح حکومت میں وزیر قانون بھی رہے ہیں پھر انہوں نے استعفیٰ دے دیا۔ توکل کرمان کا تعلق ایک بڑے گھرانے سے ہے، ان کا بھائی کرمان شاعر ہے اور توکل بھی شعر کہتی ہیں۔ آپ کے شوہر کا نام محمد اسماعیل النہی ہے جن سے آپ کے تین بچے ہیں۔
ایڈ ٹیکنالوجی سے بی کام کیا، پھر منشاء یونیورسٹی سے ایم اے سیاسیات کیا۔ تعلیم و تربیت میں ڈپلوما بھی لیا اور پھر امریکا سے صحافت میں ڈپلوما کیا۔ 2005ء میں انجمن صحافی خواتین بلا قیود Women without chains کی بنیاد رکھی جو یمن میں نہ صرف حقوق نسواں بلکہ انسانی حقوق کے لیے بھی کوشاں ہے جن میں اٹھارہ راءے کی آزادی، پریس کی آزادی اور احتجاج کی آزادی شامل ہیں۔ توکل 2005ء سے اخبار الرشورہ (انقلاب) سے شغوک ہیں۔
مرسلہ: ڈاکٹر سید خالد محمود رذی

ہنری ملاح

طارق عزیز خاں

جہاز رانی کو فروغ دینے میں عرب کے باشندوں نے بھرپور کوشش کی لیکن یورپ سے بھی کئی ایسے نام آتے ہیں جنہوں نے اس صنعت کو اوج پر پہنچایا۔

ایک شہزادے کا ذکر جس نے جہاز رانی کو نئی جہت دی

پرتگال کے بادشاہ جان اول (1357-1433) کا بیٹا شہزادہ ہنری، جو تاریخ میں ہنری ملاح کے نام سے مشہور ہے۔ وہ پہلا یورپین تھا کہ جس نے 15 ویں صدی عیسوی کے دوران یورپی جہاز رانی میں نئی نئی جہتیں روشناس کروائیں۔ اس نے ملاحوں کی تربیت کا ایک پروگرام شروع کیا جس کے نتیجے میں شمالی بحر اوقیانوس میں دریافوں کے بہری دور کی شروعات ہوئی۔

14 ویں صدی عیسوی کے دوران یورپ میں کرہ ارض



در اصل مرزا غالب کو اپنی فارسی دانی پر بہت ناز تھا جو پنجابی تھا وہ ہند میں سوائے امیر خسرو (253 عیسوی تا 1325 عیسوی) کے کسی کو کامل شاعر تسلیم کرنے سے انکاریا کرتے تھے چنانچہ فارسی سے متعلق کتاب ”قاطع برہان“ نامی جس کا متنی و شہت رو عمل سامنے آیا لوگوں نے جوہا تردیدی و تائیدی رسائل اور کتابیں لکھیں اور لسانی بحث کا بازار گرم ہو گیا۔ اس سلسلے میں اسی خط سے متعلق مزید وضاحت مولانا غلام رسول مہرویوں کرتے ہیں کہ فاضل جلیل عتار الدین صاحب آرزو کا اندازہ ہے کہ مرزا غالب۔ مولوی ضیا الدین صاحب کو قاطع برہان کی بحث میں موید وہم نوا بنانے کے خواہاں تھے مگر مولوی صاحب خلاف ہی رہے۔ حتیٰ کہ مرزا نے مولوی امین الدین چٹاوی مولف ”قاطع القاطع“ کے خلاف ازالہ حیثیت عربی کا جو دعویٰ کیا تھا اس میں بھی مولوی ضیا الدین نے خلاف گواہی دی۔ ہنگ آمیز قہروں کی توجہ یہ ایسی کردی کہ وہ بے ضرر سے معلوم ہوں۔ فارسی پر مکمل قدرت رکھنے کی بنا پر مرزا غالب فارسی زبان کے بارے میں کس قدر حساس تھے اس کا اظہار بھی انہوں نے اسی خط میں کیا ہے۔ ذرا آخر میں مرزا کا یہ شدہ بھی ملاحظہ کیجئے گا (آگے چل کر لکھتے ہیں اعیانِ نجم و یلغائے عرب نے فارسی و عربی کو باہم ربط دے کر ایک اردو پیدا کیا۔ سبحان اللہ۔ وہ زبان نگلی کہ نہ نری فارسی میں وہ خزائن نہ نری عربی میں وہ ذوق۔ زبان فارسی قواعد کے کتب خاکستر ہو گئے تھے اس میں طرہ یہ کہ عربی قواعد کے بڑے بڑے جلیل القدر رسالے مرتب ہو گئے تھے اور ہوتے جاتے تھے۔ بے چارہ فارسی زبان غریب الوطن ہے سرد سامان۔ نہ اس کی کوئی فرہنگ نہ اس کے قوانین کا کوئی رسالہ۔ نہ علم پاری کا کوئی عالم باقی۔ دو چار ہزار لغت و اسم و مشہ زبان و اہل عصر ہوں گے۔ فارسی کا حرف کہاں؟ فارسی کا نمونہ کہاں؟ فارسی زبان اعراب کی لوٹری۔ جو چاہا نام رکھ دیا۔ ضوالتہار کہہ کر پکارا۔ غسالتہار کہہ کر یا دیکھا اور لوٹری چھو کر کہہ کر بلالیا۔ سو بھی جو اکابر فریقین مؤید زبان اردو ہوئے تھے۔ وہ تیسرے قواعد پاری کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ 800 ہجری۔ 900 ہجری میں ہوں تاک لوگ فارسی کے فرہنگ لکھنے پر متوجہ ہوئے۔ نہ ایک نہ دو۔ بلکہ ہزار ہزار فرہنگیں فراہم ہو گئیں یہاں والا نا نام۔ دل مہر پور فارسی میں وضاحت کرتے ہیں کہ یہ بیان دہا۔ دہا۔ بالکل پڑتی ہے۔

پروفیسر ہو گئے۔ 1877 عیسوی میں کالج ٹوٹ گیا تو ایکسٹرا اسٹنٹ ہو گئے۔ آخر پشلی۔ مدت العمر پڑھاتے رہے طویل عمر پائی اور 1909 عیسوی کے قریب انتقال کیا مولوی صاحب موصوف کے نام مرزا غالب کا یہ خط خاصا طویل ہے لہذا یہاں خط سے مطلوبہ اقتباس ہی درج کیا جائے کہ تفصیل خطوط غالب میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اسد اللہ خاں غالب لکھتے ہیں یہ خدمت والا جناب عظیم۔ مسلم علماء عرب و عجم۔ مولوی ضیا الدین خاں صاحب ضیا دہلوی بنیرہ نواب سابق بستی داراپور۔ جناب مولوی صاحب! دو تین ہزار برس قبل آج سے کہ عرب و عجم بے گانہ ہم درگتھے۔ اہل پارس اپنے مطالب علم بلکہ علوم متنوعہ کو کس زبان میں شروع کیا کرتے تھے؟ اور تعلیم و تعلم و سوال و جواب کا مدار کن الفاظ پر ہوگا؟ بے شبہ وہ الفاظ پاری ہوں گے۔ جب خلیفہ ثانی کے عہد میں یزدجرد مارا گیا اور پارس پر اعراب مسلط ہوئے۔ دہش کا دایلی کا جوہر آمیز چہرہ بارہ بارہ ہو کر تازیان اسلام میں بٹ گیا۔ کتاب خانے پارس کے کیا بادشاہی کیا رعایا کے چوہے ہیں جمو کے گئے یعنی ان سے حمام گرم ہوئے جیسا کہ میں نے ایک جگہ اس واقعہ کو فارسی عبارت میں لکھا ہے۔

دہی ہذا، کتاب خانہ ہائے پارسیاں افروزیہ گلشن گرماہ ہائے بغداد شد۔ ہانا احکام آتش پرستی ہم با آتش باز گشت۔ یہاں مولانا غلام رسول مہر۔ پادریق میں باقاعدہ مدلل تردید کرتے ہیں کہ یہ بیان بھی سراسر تا درست ہے کیونکہ کوئی کتب خانہ تھا ہی نہیں جلایا گیا ہو۔ ایسا ہی ایک افسانہ مسیحیوں نے کتب خانہ اسکندریہ کے متعلق تراشا تھا حالانکہ مدت سے خود مغربی محققین تسلیم کر رہے ہیں کہ اصل کتب خانہ (اسکندریہ) جو پینس سیزر (13 جولائی 100 ق م تا 15 مارچ 44 قبل از مسیح) نے مسلمانوں سے صدیوں پیشتر جلادیا تھا اس کے بعد جو کتابیں جمع ہوئیں وہ قطعاً خطیہ کے شہناہ تھوڈ و پینس کے فرمان کے مطابق 389 عیسوی میں تباہ کی جا چکی تھیں یعنی مسلمانوں کے ورود سے کچھ کم تین سو سال پیشتر۔ اسی اقتباس میں شامل مرزا غالب کے فارسی جملوں کی توضیح و تفسیر مولانا غلام رسول مہرویوں کرتے ہیں کہ یہ عبارت۔ مہرشم روز۔ کی ہے لیکن اصل بیان کے غلط ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ایران فتح ہوا تو بغداد موجود ہی نہ تھا جب عباسی برسر اقتدار آئے تو منصور عباسی (704 عیسوی تا 770 عیسوی) نے بغداد کی بنیاد رکھی یہ فتح ایران سے ایک سو سال بعد کا واقعہ ہے۔

پر خشکی کے تین بڑے خطوں (براعظم) کے ہونے کا نظریہ مشہور تھا۔ امریکا کے وجود سے بے خبر یورپین اقوام کی دلچسپی کا محور مرکز مشرق میں واقع ایشیائی سرزمین تھی اور ان کا ایشیا سے رابطہ کاسب سے بڑا ذریعہ ایشیائے کوچک کا زمینی راستہ سلک روٹ اور روڈن ایشیا روٹ (بحیرہ روم، بحیرہ احمر اور بحیرہ عرب کا بحری راستہ) تھا۔ بد قسمتی سے دونوں مروجہ راستوں پر پٹنی ترکوں اور طاقتور تاجروں کی اجارہ داری قائم ہونے کی وجہ سے مغربی یورپ اقتصادی بد حالی کا شکار تھا۔ اپنی بنیاد پرستی کو سہارا دینے کے لیے مغربی یورپ کی دو بڑی طاقتوں اسپین اور پرتگال اس کوشش میں تھے کہ ایک دوسرے سے پہلے اپنے دریافت کردہ بحری راستوں سے ایشیائی منڈیوں تک رسائی حاصل کر لیں۔ اسپین سے رقبے، آبادی اور وسائل میں کم تر ہونے کے باوجود پرتگال کا محل وقوع جہاز رانی کی صنعت کے فروغ میں معاون تھا۔ 1381ء میں جان اول نے پرتگالی حکومت کی باگ دوڑ سنبھالنے کے بعد ہندوستان تک رسائی کے نئے بحری راستے کو دریافت کرنے کی منصوبہ بندی شروع کی۔ یہی وہ ہیں منظر تھا جس میں اس کے بیٹے ہنری کے تربیت یافتہ ملاطوں نے بحراوقیانوس میں دریافتوں کے دور کی بنیاد رکھی۔

ہنری 4 مارچ 1394ء میں پرتگال کی بندرگاہ اوپورٹو میں پیدا ہوا۔ وہ پرتگال کے بادشاہ جان اول اور انگلستان کے بادشاہ ہنری چہارم کی بہن فلپا کی تیسری اولاد تھا۔ ہنری کا بچپن مغربی پرتگال میں بحراوقیانوس کی لہروں گنتے ہوئے گزرا۔ اسے 1410ء میں پرتگال کی بحریہ میں بطور ملاح مقرر کیا گیا۔ تاہم جغرافیہ اور جہاز رانی سے متعلق اپنی قابلیت کے بل بوتے پر وہ جلد ہی کپتان کے عہدے پر پہنچ گیا۔ اُس نے 1415ء میں شمالی مراکش میں واقع سینٹا کی اہم بندرگاہ پر قبضے کی مہم میں حصہ لیا۔ آنے والے برسوں کے دوران ہنری کی توجہ ہندوستان تک رسائی کے بحری راستے کی دریافت پر مرکوز رہی۔ 1418ء میں شہزادہ ہنری دارالحکومت لڑبن میں تھا کہ اسے پرتگالی مہم جو، جوآؤ گون کیلوس زارکو (Joao Goncalves Zarco) کی طرف سے شمالی بحراوقیانوس میں خط استواء سے 32 ڈگری شمال اور 16 ڈگری مغرب پر واقع میڈیرا کے جزیرے کی دریافت کی خبر ملی۔ پرتگالی ساحلوں سے 900 کلومیٹر جنوب اور مراکش سے 650 کلومیٹر مغرب میں واقع 794 مربع کلومیٹر رقبے پر مشتمل میڈیرا وہ مقام تھا جہاں سے مشرق میں آیتانے جبل

الطارق اور جنوب مغرب میں بحراوقیانوس کے بحری راستوں کو کنٹرول کیا جاسکتا تھا۔ میڈیرا کی دریافت نے ہنری کی سوچ کا دھارا بدل کر رکھ دیا۔

اس نے یہ اندازہ لگانے کے بعد کہ بحراوقیانوس کی مغربی وسعت کو شکست دینا فی الحال ایک پرخطر اور مہنگا منصوبہ تھا، جنوب کی طرف سے بحراوقیانوس کو پار کرنے کی منصوبہ بندی شروع کی۔ ہنری نے سوچا کہ اگر لیے فاصلے طے کرنے والے بحری جہازوں کے ساتھ ساتھ قابل مہم جوؤں کی ایک مہم تیار کی جائے تو مستقبل میں افریقا کے گرد گھوم کر ہندوستان تک رسائی کا بحری راستہ دریافت کیا جاسکتا ہے۔

1420ء میں ہنری کی تحریک پرتگالی مہم جو، بارٹولومیو پیرسٹریلو اور شادو پریکسیس نے میڈیرا میں پہلی پرتگالی کالونی کی بنیاد رکھی۔ اسی سال پرتگالی بادشاہ جان اول نے ہنری کو جنوبی پرتگال پر مشتمل صوبے الگارویو کا گورنر مقرر کر دیا۔ 25 مئی 1420ء کو پرتگالی بادشاہ کی طرف سے ہنری کو حکومت کے اہم عہدوں پر تقرری کے اختیارات حاصل ہو گئے۔ ہنری نے اپنے ان اختیارات کو جہاز رانی سے متعلق اپنے منصوبوں کی تکمیل کے لیے فیذاکشا کرنے کی غرض سے استعمال کیا۔ اس نے جنوبی پرتگال کے علاقے کیپ ساؤ سین لے کی بندرگاہ ساگرےس میں نہ صرف یورپ بلکہ دنیا کے اولین ”جہاز رانی کے اسکول“ کی بنیاد رکھی۔ ہنری نے پرتگال بھر سے جن جن کرم جوئی کے شوقین افراد کو اس اسکول میں بھرتی کیا اور انہیں جہاز رانی اور مہم جوئی کی تربیت دی۔

ہنری کے زمانے میں یورپ میں بادبانی بحری جہازوں کی ایک قسم ”کاراک“ اور ”کیراول“ منظر عام پر آچکی تھیں۔ یہ دونوں اقسام کے بحری جہاز دسویں صدی میں سکندریہ نیویا میں چلنے والے والی تنگ اور 13 ویں صدی میں شمال مغربی یورپ میں چل رہے ہوگ۔ بحری جہازوں کی ترقی یافتہ شکل تھے۔ ہنری نے اپنے اسکول میں کیراول بحری جہازوں کے نئے ڈیزائن کی تیاری کا کام شروع کیا۔ اس نے جہاز رانی سے متعلق نئے اصول وضع کیے اور سمندری سفر میں مددگار قطب نما، نقشے اور بحری چارٹ تیار کیے۔ وہ 1425ء تک ایسے کیراول بحری جہازوں کے ڈیزائن تیار کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا جو محفوظ اور لمبے سفر کے لیے موزوں تھے۔ ان بحری جہازوں کی لمبائی 75 سے 90 فٹ، چوڑائی 40 فٹ تک اور وزن 60 ٹن کے قریب تھا۔ ہوا موافق چلنے پر وہ

تقریباً 7 کلومیٹر فی گھنٹہ (3.78 ناٹ فی گھنٹہ) کی رفتار سے سفر کر سکتے تھے۔ دو منزلوں پر مشتمل ان بحری جہازوں پر چھ بڑے بادبان لگانے کے تجربات کیے گئے۔ نئے کیراول جہازوں کی تیاری کے بعد ہنری کے تربیت یافتہ جہازرانوں نے شمالی بحراوقیانوس اور افریقا کی مغربی ساحلی پٹی کی دریافت کا کام شروع کیا۔

1427ء میں پرتگالی مہم جو، گونٹالوویل ہونے پرتگال سے 1400 کلومیٹر مغرب جبکہ خط استواء سے 37 ڈگری شمال اور 25 ڈگری مغرب کے خط پر واقع جزائر دوس کور ریافت کیا۔ 1433ء میں جان اول کے انتقال کے بعد نئے پرتگالی بادشاہ افسانوی حکمت اور حوصلہ افزائی سے ہنری نے اپنا کام جاری رکھا۔ 1434ء میں اس کے شاگرد گل ایش نے جنوبی مراکش میں واقع کیپ یوفاؤڈر کی براعظمی نوک دریافت کی۔ 1441ء میں نوٹو فرشاؤڈ اور این تاذ گون کیلوس نے جنوبی مراکش اور موریطانیہ کی سرحد پر واقع کیپ بلاک کو دریافت کیا۔ 1443ء میں پرتگالی بحریہ نے موریطانیہ کے ساحلوں کو دریافت کیا اور 1448ء میں کیپ آگروئن کے علاقے میں ایک فوجی قلعہ تعمیر کیا۔ 1444ء میں ڈی نس ڈیاس نے سینی گال کے ساحلوں پر راس ورث (Cape Vert) اور 1446ء میں مغربی افریقا میں دریائے گیمبیا (Gambia) کا دہانہ دریافت کیا۔ 1450ء کے عشرے میں پرتگالیوں کو سینی گال کے مای گیروں نے شمالی بحراوقیانوس میں واقع جزائر کیپ ورڈے کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں۔ 1455ء میں الیوئس کاڈاموسٹو نے کینارے کے جزائر کی سیاحت کی جنہیں فرانسیسی ملاح 1334ء میں دریافت کر چکے تھے۔ کاڈاموسٹو نے 1456ء میں پرتگال سے 2500 کلومیٹر جنوب اور سینی گال سے 550 کلومیٹر مغرب میں واقع کیپ ورڈے کے جزائر کو دریافت کیا۔ 1460ء کے آغاز پر پیڈر روڈی سینترانے مغربی افریقا میں خط استواء سے 8 ڈگری شمال اور 12 ڈگری مغرب پر واقع سیرالیون کے موجودہ علاقے کو دریافت کیا۔ افریقا کی مغربی ساحلی پٹی کی دریافت کے بعد اب شہزادے ہنری کی نظریں جنوبی بحراوقیانوس پر مرکوز تھیں۔ وہ جنوبی افریقا کی طرف ایک مہم روانہ کرنے کی سوچ رہا تھا کہ 13 نومبر 1460ء کے دن 66 سال کی عمر میں اس کا انتقال ہو گیا۔

شہزادے ہنری کی وفات کے بعد پرتگالی حکومت نے میڈیرا، ایزورس اور کیپ ورڈے کے ساتھ ساتھ مغربی افریقا کی تین

گزشتہ ایک صدی میں جو سائنسی ایجادیں منظر عام پر آئیں ان میں سنیما کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے، اگرچہ آج ہمارے لیے سنیما جو بے نہیں ہے لیکن انیسویں صدی کے آخر میں جب اس کی ایجاد ہوئی تھی تو دنیا کے لیے یہ معجزے سے کم نہ تھا۔ فوٹوگرافی کی ایجاد سے عکس کو دیر پا بنادیا گیا تھا لیکن اس کو متحرک بنانے میں کئی برس تک کئی سائنسدان سرگرداں رہے۔ متحرک فلموں کی کہانی اس لحاظ سے ایک بہت ہی دلچسپ داستان ہے۔

سنیما کا پہلا مرحلہ تھا لیمپٹو گراف جو 19 ویں صدی کے آخر میں ایجاد کیا گیا۔ لیمپٹو (Kinema) دراصل یونانی لفظ ہے جس کے معنی حرکت کرتی ہوئی تصویریں ہیں۔ بہت عرصے تک یورپی میں لیمپٹو گراف لفظ رائج رہا لیکن بعد میں فرانسیسی لفظ ”سنیما گراف“ چل پڑا۔

مرسلہ: زاہد علی زاہد - کراچی

ہزاروں کلومیٹر طویل ساحلی پٹی پر اپنا قبضہ مستحکم بنانے پر توجہ دی۔ جس کے بعد شمالی بحراوقیانوس میں ان کے کیراول بحری جہاز دہانتے پھر رہے تھے۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی ہے کہ ہنری سے 2 ہزار سال پہلے فرعون مصر نیچو کاہیزہ وکارا کی ملایا، جنہو، افریقی ساحلوں کی چٹان بین کر چکے تھے۔ تاہم ہنری کے مقابلے میں قدیم افریقی مہم جوؤں کی دریافتوں کے اثرات محدود رہے۔ ہنری کے ڈیزائن کردہ جدید کیراول بحری جہازوں کے مقابلے میں ان کے کمزور بحری جہاز اس قابل نہیں تھے کہ بحراوقیانوس کی دسویں صدی کوئی نئی کھوج یمن کرتے۔ شہزادہ ہنری نے بذات خود کسی علاقے کی دریافت میں حصہ نہیں لیا، تاہم جہاز رانی اور مہم جوئی سے متعلق اس کی خدمات کو دیکھتے ہوئے اسے ”ہنری ملاح“ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ 1960ء میں ہنری کے 500 ویں یوم وفات کے موقع پر پرتگال کے دارالحکومت لڑبن کی بندرگاہ کے قریب دریائے ٹاغوس کے دہانے پر دریافتوں کی ایک عظیم الشان یادگار کا افتتاح کیا گیا۔ ہنری کی صلاحیتوں کو خزانہ حسین پیش کرتی یہ نئی یادگار ایک بڑے بحری جہاز کے اگلے کھلے حصے کی ہے جس میں ہنری کو مہم جوؤں کے ایک گروپ کی قیادت کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔



قسط نمبر: 5

ناسور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ ایک سیدھا سادہ معصوم فطرت نوجوان تھا اور اس کے گرد سازشی ذہنیت والوں کا انبوه تھا۔ ایسے سازشیوں کے لیے وہ ترنوالہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے پھیلائے ہوئے تار عنکبوت میں پھنسا چلا جا رہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اب مفر کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اسے بھی ان کا جواب دینے کے لیے خم ٹھونکنا ضروری ہے اور پھر اس نے کمر کس لی۔ انہی کے لہجے میں انہیں جواب دینے کی کوشش کی۔

ایک ایک طویل کہانی جس کا ہر باب ایک نئی کہانی ہے

رانا بشری بیوی نائل ہو گیا تھا اور اترام آیا تھا احمد حسین پر۔ اس جرم میں اسے پھانسی ہو گئی۔ احمد حسین کا بیٹا نعمان ایڈووکیٹ زخمی کے ساتھ مل کر اصل قاتل کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی دوران رانا بشری اپنی بیٹی کے ساتھ نعمان کے دروازے پر پہنچا۔ وہ معافی مانگنے آیا تھا کیونکہ اسے بھی لگ رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ایک لاری اڈے کی یونین میں نائب منشی صدر بن گیا تھا۔ کچھ لوگ چاہتے تھے کہ یہ اڈا ختم ہو جائے اور اس کی زمین پر عمارت بن کر فروخت کی جائے۔ اس سلسلے میں کچھ لوگ تنہی سے کام کر رہے تھے لیکن ان کی چال نعمان انہی پر اٹھ دیتا، ابھی وہ اس مسئلے پر غور کر رہی رہا تھا کہ رانا بشری کی بیٹی نے اسے ایک ڈائری دی جو تنہی کی تھی جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ان دونوں مسئلوں پر کام کر رہی رہا تھا کہ ایک دن اس کے بھائی نعیم نے اس سے کہا کہ میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا کہ ہم ایک جوان ہیں کے بھائی نعیم ہیں اس کے لیے کچھ سوچنا چاہیے پھر اس نے کہا کہ میں نے بہت کواکثر رات میں کسی سے فون پر بات کرتے دیکھا ہے۔ باتوں سے لگا کہ وہ کسی کو پسند کرنے لگی ہے۔ نعیم کے جاننے کے بعد میں سوچ میں ڈوب گیا تھا کہ فرحانہ کا بیٹا آگیا کہ اسے ڈائری کا بارٹ فون کیا ہے۔ اگلے دن زخمی کہ ساتھ میں فرحانہ کے کمر گیا تو ڈائری کے واقعات سے جس نے رفعت کل کے دلچسپ کو حیران کیا تھا۔ اس دن میں اڈے پر بیٹھا تھا کہ کچھ لوگ آگئے۔ ان میں عزیز خان بھی تھا جس پر اختر کی بہن ڈوبی کی گمشدگی کا ذمہ دار سمجھا جا رہا تھا۔

(اب آگے پڑھیں)

کام میں مصروف رکھنے کا یہ طریقہ نکالا تھا؟ یہ بھی ممکن تھا کہ یہ واقعی خود چھپا کھانا چاہتے ہوں اور ساتھ ہی کاروبار کو ایک ہم جوئی کے طور پر کرنے کا ارادہ رکھے ہوئے ہوں۔ دوسری جو سب سے اہم بات میرے نزدیک تھی وہ میرے دیدہ و نادیدہ دشمنوں کی کوئی "پلاننگ" سازش تھی، ضروری نہیں تھا کہ یہ تینوں ہی میرے دشمنوں کے گھر سے ہوں، ان میں سے کوئی ایک گھر ہو سکتا تھا اور وہ میرے مجھے جاگیر دار مہران خان کا یہ لاڈلہ بیٹا۔ عزیز خان ہی لگتا تھا اور بانی دونوں اس کے دوست شاہ نواز اور بشری خان تھے۔ تاہم ابھی اپنے ان غداشات پر میری پوری طرح یقین کرنا، قبل از وقت ہی تھا مگر موجودہ حالات کے پیش نگاہ یہ سب سوچنا از بس ضروری بھی تھا۔

میں نے طور پر شاہ نواز تو جا مشورو کے کسی ڈزیرے میر لکھ میر خان کا داماد تھا، جو مقامی تاجر اور کسرتی جسم کا مالک تھا، دھک گورا تھا، نقوش پُر و جہیز تھے۔ بشری جان درمیانے قد و قامت کا تھا، وہ کسی زمینداری اولاد تھا جبکہ عزیز خان تھوڑا بلکے قد کا مگر خوب گھٹی ہوئی جسامت کا حامل نوجوان نظر آتا تھا، اس کا رنگ بھی گہرا اسناٹا تھا۔ آنکھیں چھوٹی اور مکارانہ تاثرات کی جھلک دیتی محسوس ہوتی تھیں۔ ان تینوں نے کاشن کی پیش قیمت مختلف شلواریں زیب تن کر رکھی تھیں۔

جب عزیز خان نے اپنے باپ حاجی مہران خان کا نام بتایا تو میں نے دزدیدہ نظروں سے اپنے قریب بیٹھے چاچا انور شاہ کی طرف دیکھا تھا، مقصد صرف ان کا رد عمل

میری نظریں عزیز خان کے چہرے پر جمی گئی تھیں اور اندر سے میرا پروردہ وجود، جیسے دل کے ساتھ ہی دھک دھک سا کرنے لگا تھا۔ وہ نہ صرف اس تصویر والے نوجوان کے نقوش سے ملتا جلتا جو میں نے یونیورسٹی کے ایڈمنسٹریٹس کے اس کا ڈیٹا فارم سے حاصل کی تھی، بلکہ اختر نے بھی مجھے عزیز خان نامی جس نوجوان کا حلیہ بتایا تھا یہ عزیز خان اس پر بھی پورا اترتا تھا۔

بہر کیف..... میں نے فوراً اس کے بشرے سے نظریں ہٹائی تھیں اور ٹھیکے دار سائیں رکیو سمیت باری باری ان سب کے چہروں پر ایک کاروباری سی مسکراہٹ سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"آپ لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوئی..... تعارف کا سلسلہ تو ہو چکا، اگر مناسب سمجھا جائے تو کچھ کاروباری بات کی جائے۔"

اس دوران میں ان تینوں نوجوانوں کے چہروں کا بڑے غور سے جائزہ بھی لے چکا تھا۔ یہ تینوں مجھے "ایگریٹریک" ایک مین" ٹاپ کے نوجوان دکھائی دیتے تھے۔ عموماً ایسے "ریس زادوں" کے مشاغل کچھ آدمی ہوتے ہیں، یعنی موج مستی، سیر پائے اور جیش جیتی گاڑیوں میں ہائی فائی ساؤنڈ سسٹم کے اسٹیریوؤں ڈیک براؤچی آواز میں ڈسکو گیت سننا، وغیرہ..... یہ بھلا کیوں اور کیسے خود کو اس عمر میں کاروباری جمعیوں میں ڈال رہے تھے؟ یا مہران کے "بڑوں" نے انہیں اس قسم کی آوارہ گردیوں سے بچانے کے لیے انہیں

کو سنجیدگی سے لینے کی ہے تو میں بھی آپ لوگوں سے کچھ کہنے کی کوشش کروں گا، اس امید پر کہ آپ لوگ بیٹھا برا نہیں منائیں گے، کیوں کہ ابھی تک ہمارے درمیان کوئی بات فائل نہیں ہوئی ہے۔"

"نہیں، اس میں بھلا برا منانے کی کون سی بات ہے۔" اس بار سائیں رکیو کے قریب والی کرسی پر براجمان شاہ نواز نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "یوں بھی کاروبار اور باہمی اعتماد کے لیے یہی ضروری ہوتا ہے کہ جو بات ہو وہ پہلے ہی یکسر کر دی جائے۔ یہ اچھا ہوتا ہے۔"

"میں یہی چاہ رہا تھا۔" میں نے اس کی تائید میں گردن ہلائی اور اضافہ کیا۔

"درحقیقت ہمیں آپ کی بات پر کوئی اعتراض نہیں ہے، ہم خود بھی یہی چاہتے ہیں کہ اچھے عوام کو سواری کے ساتھ ساتھ یہاں کاروباری لوگوں کو بھی ترسیل کی سہولیات مینیر آتی رہیں، لیکن اگر یہ معاہدہ کرایہ بات کی جائے نامتنا پائرنشپ پر کی بات تو میرا خیال ہے زیادہ بہتر ہوگا۔" پائرنشپ میں نے اس ہونے والے معاہدے کی اصل حالت ظاہر کر ڈالی۔ کمرے میں تھوڑی خاموشی کا وقت گزرا، اس کے بعد عزیز خان نے میری طرف دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔

"بہر پہلے ہی سے تین پائرنشپ اور جتنا روپیہ لگا تھا وہ ہم لگا چکے ہیں، مزید کی ابھی ہمیں کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نہ ہی ہم جو تھے پائرنشپ کی الحال تبدیل ہو سکتے ہیں۔ ہاں آگے چل کر ممکن ہے ہم ایسا کوئی ارادہ رکھیں گے تو پھر سوچا جاسکتا ہے مگر اب تو بالکل بھی نہیں۔" وہ اتنا کہہ کر چپ ہو رہا۔ اس کا لہجہ تھی سا محسوس کر کے میں نے بھی اسے مزید فورس کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا اور ہولے سے مسکرا کر اپنے سرکوشات میں جنم دے دی۔

اس کے بعد ہمارے درمیان سر دست کرایہ وغیرہ کے معاملات طے پائے اور زبانی کلامی جتنی نتیجہ پر پہنچے تک اس کاروباری معاہدہ کو ایک ہفتے کے اندر اندر کاغذی شکل دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ یوں یہ معاہدہ خوش اسلوبی کے ساتھ طے پا چکا تھا، ہم نے ایک دوسرے کو اپنے کون ٹیکٹ نمبرز بھی دے دیے تھے۔

ان سب کے رخصت ہونے کے بعد جب میں اور انور شاہ اکیلے رہ گئے تو وہ جیسے چھوٹے ہی مجھ سے بولے۔ "اوائے بیٹھے! اس عزیز خان نامی نوجوان نے اپنے باپ کا جو نام بتایا تھا کہیں یہ ہی حاجی مہران خان تو

ہو نہیں تھا لہذا جب انہوں نے قدرے چونک کر میری بات دیکھا تو میں نے انہیں آگے کے ہولے اشارے سے نشان دہی کر کے کہا اور یہی میرا اصل مقصد بھی تھا کہ کہیں وہ میرا ان خان کے نام پر اپنے منہ سے کچھ بول نہ پڑیں۔ ان کی آگے کے اشارے پر ان کی بے چینی کچھ کم ہوئی تھی۔ ان کے وہ مجھ پر پورا بھروسہ کرتے تھے۔ جانتے تھے کہ انہوں نے خدشات سے بچ کر اپنی منزل کا راستہ بنانا خود بخوبی

میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ بالخصوص عزیز خان، میری ماں بڑے غور غور سے نکلے بھی جا رہا تھا۔

میں نے حال ہی میں "اسکائی شاپ" سے ایک خفیہ لبر این خرید رکھا تھا۔ اسکائی شاپ کی خصوصی پروڈکٹ تھی جو سیل فون پر اکثر آیا کرتے ہیں، میں نے ان کی ڈیوڑی سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ خفیہ کمر اپن فون کر کے منگوایا تھا۔ بیٹھنا یہ ایک عام آئٹم تھا اور کوئی بھی اسے اس کی مخصوص ساخت سے پہچان سکتا تھا، اسی لیے میں نے اس کی ساخت کافی حد تک پیچیدگی کر دی تھی اور اب یہ مل سے کافی مختلف دکھائی دیتے لگا تھا۔ وہ پھر اس وقت ہی میری جیب میں اٹکا ہوا تھا۔ میں نے یوں ہی اپنی شرٹ کی جیب کے ساتھ چھپڑ چھڑا کر دوران اسے آن کر کے اس کی ہانگروٹس کارخ ایک مختلط انداز سے سے عزیز خان کی طرف موڑ کر اس کی مختلف زاویوں سے چند تصاویر اور پتھری دیوٹیکل بھی لے لیں۔

کاروباری گفتگو کی ابتداء کرتے ہوئے سائیں رکیو نے میری طرف دیکھ کر اپنے ساتھ آئے ان تینوں نوجوانوں کی نمائندگی کے طور پر مجھے مخاطب کر کے کہا۔ "نعمان صاحب! ہمارے آنے کا مقصد تو آپ کے علم میں پہلے ہی آچکا ہوگا، اب ملاقات بھی ہو گئی اور تعارف بھی ہوتا گیا، اب خیال ہے اب کاروباری بات ہو جائے تو بہتر ہوگا۔"

"جی رکیو صاحب! آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔" میں نے اس کی بات کے اختتام میں اس کی طرف دیکھ کر فوراً کہا۔ اس دوران دوسرے چائے اور کچھ بسکٹ وغیرہ ہاں

تھوڑے توقف کے دوران میں نے انہیں چائے پینے کا کہا اور سائیں رکیو کے جواب میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "رکیو صاحب! مجھے آپ لوگوں سے ہر باری مراسم رکھنے میں خوشی ہوگی اگر بات ان معاملات

ہے کیوں کہ اس کا انتخاب چاچا نور شاہ نے بہت سوچ بچھ کر کیا تھا تو وہ غلط نہیں ہو سکتا تھا۔

بہر کیف..... مجھے اسے عزیر خان سے متعلق مصراحت بتانا پڑی۔ اس نے مجھ سے تصادف لیں اور رخصت ہو گیا۔ باقی میں نے اسے عزیر خان کی اپنے اسارت فون پر ویڈیو کلپ دکھادی تھی۔

اس کام سے فراغت کے بعد میں نے عطا صاحب کو فون کر کے آج کی میننگ کے بارے میں بتا دیا کہ کاغذات کی تیاری کے بعد کرانے کی مدد ہمیں پارٹی کی جانب سے چھ ماہ کا کرایہ ایڈوائس مل جائے گا۔ وغیرہ۔

اس کے بعد میں اپنے کچھ ضروری..... کاموں میں مصروف ہو گیا۔ دو گھنٹے تک میں بغیر سرائے کے کام میں بڑی رہا۔ اس کے بعد کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر میں ٹھکن سی اتارنے لگا تو ایسے میں مجھے کالیا کی فون کال موصول ہوئی۔

”اے لے جگری.....! دشمن کر گئے اپنا کام..... خاور..... میرا مطلب ہے عارف مجھ پر جیل سے فرار کی کوشش میں مارا گیا.....“ کالیا نے چھوٹے سے مجھے اس چوکا دیے والی خبر سے آگاہ کیا تو میں جیسے سکتے میں آگیا۔ پھر بہ مشکل میرے سلق سے چپٹی چپٹی آواز برآمد ہوئی۔

”کک..... کیسے اور کک..... کب ہوا یہ سب؟ میں نے تو آج کا اخبار پڑھا تھا اس میں تو.....“

”آج شام کا اخبار بڑھتا..... میری خبر تو ان اخبار والوں سے بھی پہلے پہنچتی ہے جگری.....! وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔“ لگتا ہے اس بلڈر لینڈ مافیائی ذون نہ ستار کو پتا لگ چکا تھا کہ خاور یعنی عارف مجھ پر اب آئندہ کسی چٹھی میں اس کا نام بھی اگلے والا ہے۔“

”لیکن یار! اسے بھلا کیسے پتا چلا کہ عارف اپنے اگلے کی بیان میں اس کا نام بھی اگلے والا ہے؟“

”اے لے جگری! آسان سی اور سمجھ میں آنے والی بات ہے تو.....“ وہ بولا۔

”عارف مجھ پر کے پہلے بیان کے بعد ہی سے اسے اپنا خطرہ بھی ہو گیا ہوگا، اسی لیے اس نے اس کا دھڑن تختہ کر دیا۔“

اس کی بات پر تھوڑا غور کرنے پر مجھے بھی کالیا کی بات میں وزن محسوس ہوا تھا۔ بولا۔

”اگر یہ سچ ہے تو بہت برا ہو گیا یا رکالیا!“ میرے لہجے میں ٹھکرانہ مزاح شامل تھا جسے محسوس کرتے ہوئے کالیا ازراؤ تیشی اپنے مخصوص لہجے میں مجھ سے بولا۔

”اے لے جگری! ٹو کیوں ٹھکر رہا ہے، اپنا اپنی پھٹکیوں سے پہلے بھی پالا پڑتا رہا ہے۔ اسی لیے میں نے اس روز عارف کو منور والے کمرے میں لا کر اس کے منہ سے اصل اور ساری حقیقت اگوائی بھی کیوں کہ میں اس کے کورٹ کے پہلے والے بیان سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوا تھا۔ ہمیں تو معلوم ہی ہے ناں کہ یہ ساری سازش اسی سینہ ستاری تھی۔“

”لیکن میرے یار! عارف کا ابھی والا یہ دوسرا اور تفصیلی بیان زیادہ کارآمد ہو سکتا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”جس طرح اس کے پہلے بیان پر اس راشی پولیس افسر ادا جلا اور کی جٹی اتڑی تھی، اب کی بار سینہ ستاری باری ہوتی، وہ سید حاجیل جاتا۔“

”جگری! تیرے دشمن بہت درندہ صفت ہیں۔ ایک ذرا سے شے پر اپنے ہی آدمی کو مار ڈالنے سے بھی نہیں بچکتا ہے، سچ تو یہ ہے مجھے تیری فکر ستانے لگی ہے یار!“

کالیا نے اس بار پُر تشویش لہجے میں کہا تو بے اختیار مجھے بھی اپنے پورے وجود میں ایک جبر جمیری آگئی۔ آخر میں بھی عام انسان ہی تھا، درندہ نما انسانوں کے اس جنگل میں میرے معصوم اور بے گناہ باپ کو پھانسی لگا دی گئی۔

داؤن اور عارف جیسے لوگ بیدردی سے ہلاک کر دیئے گئے تو ان با اثر مافیائی طاقتوں کے سامنے میری کیا حیثیت تھی! لیکن میں پھر بھی اپنے محمد و درو سال اور کم مائیگیوں سمیت ان ”قد آرز“ مافیائی چٹھس“ کے آگے ڈٹا ہوا تھا۔ کیوں؟ بس! ایک آگ بھی اندر میرے..... ایک جذبے کی آگ

میری سرشت میں ان ارضی خداؤں کے آگے جھکتا یا پھر ڈالتا، شامل ہی نہ تھا۔ نہ تپیں وہ کون سی طاقت تھی جو مجھے اپنے سے کئی گنا زیادہ طاقت ور دشمنوں کے آگے ابھی تک سبسہ پلائی دیوار بنائے رکھے ہوئے تھی۔ کچھ تو ایسا تھا میرے اندر کہ میں ابھی تک کامیابی سے ان کا مقابلہ کر رہا تھا۔

”اے لے جگری! تجھے تو سانپ سوگھ گیا، میرا مطلب تجھے ڈرانا نہیں تھا یار! میں تو بس اسی لیے کہہ رہا تھا کہ ٹو اپنے دشمنوں کو اتار ہلا مت لینا۔“ مجھے چپ سا

بارودہ بولا۔

”میں تو بس اسی لیے کہہ رہا تھا کہ ٹو میرا ایک فلسفہ نبھ لے..... اور وہ یہ کہ زہر کو ہمیشہ ہر سے ہی کاٹا جاتا ہے مگر تو زہر کو شہد سے کاٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ اب تک قانون ان بد معاشوں کو کیا گاڑ پایا ہے جو اس سماج میں ”عز زبے پھر رہے ہیں؟ مگر ٹو ہے کہ بس..... اب کیا کہوں میں.....“ وہ چپ ہو رہا۔ میں نے کہا۔

”کالیا! زہر کو زہر سے ہی لوگ کاٹنے کی کوشش کرتے ہیں جو درحقیقت ان سماجی درندوں سے ہار مان چکے ہوتے ہیں۔ ہاں کالیا! اگر ہم بھی وہی طریقہ اختیار کریں جو یہ مجرم کرتے ہیں تو ہمیں اور ان میں کیا فرق باقی رہ جائے گا؟ یہ پولیس، قانون، عدالتیں کچھ یاں..... کون ان پر اعتبار کرے گا؟ ہر طرف کالے قانون کی سمرانی نظر آنے لگے گی۔ میں نے اگر اپنے دشمنوں کے خلاف علم بلند کر رکھا ہے تو وہ صرف اور صرف قانون کی بالادستی کے لیے ہی نہیں کر رکھا ہے بلکہ حق و راستی کا بول بالا دکھانے کے لیے کر رکھا ہے تاکہ اس میں میرے اللہ کی مدد بھی شامل رہے اور اس سے بڑھ کر طاقت درمیں کسی کو نہیں سمجھتا ہوں۔“

”میرے یار! پھر تو میں تیرے لیے دعا گو ہی رہتا ہوں کہ اللہ تجھے کامیاب کرے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں یہ ضرور کہوں گا کہ کبھی کبھی ٹیڑھی گلی کر کے بھی نکالا جاتا ہے اور ایسا ہوتا رہا ہے۔“ کالیا ایک گہری سانس خارج کر کے بولا۔

”وہی ہے تیرے لیے ایک مشورہ تھا میرا..... اگر تو مانے تو.....“

”کیسا مشورہ؟“

”سینہ ستار کو دھمکانے کا۔“

”یہ میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”تاکہ وہ زیادہ اپنی طاقت کے غماز میں نہ رہے اور نہ ہی مجھے کمزور بخوف زدہ ہو کر چپ بیٹھ رہنے والوں میں سے سمجھے۔“

یہ کہتے ہوئے میں نے اسے اس روز والے واقعے سے آگاہ کر دیا جب بلڈر سینہ ستار اپنی بیش قیمت اور لمبی ہڈی کا ریش اپنے ٹھٹھلے گن مین کی معیت میں سوار تھا اور کچھ کار میں بیٹھے بیٹھے دھمکی دی تھی کہ میں اس کا راستہ کھوتا رہنے سے باز آ جاؤں۔ بہ صورت دیگر میں ایک بھائی کا ہی نہیں بلکہ جوان بہن کا بھائی بھی ہوں۔

”واہ میرے یار.....! ٹو تو واقعی چمپا رستم

لگلا..... سینہ ستار تو منگ ہو کر رہ گیا ہوگا پھر۔“

”ہاں! اسی کی ہر ضرورت طاقت کے پیش محل میں اسی دن دروازہ ڈال گئی تھی اور اس کا گھنڈہ ترخ کر رہ گیا تھا جب میں نے اس کے آفس جا کر اسے دھمکایا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”اسی لیے کالیا! ٹو بے فکر رہ، جہاں میں سمجھتا ہوں کہ انکی ٹیڑھی کرتی پڑے گی وہاں میں ایسا کرنے سے بھی نہیں چوکتا، بس! موقع محل کے مطابق سب چلا رہتا ہے، کبھی گرم تو کبھی ٹھنڈا۔“

”اے لے جگری! جیو..... جیو!“ کالیا خوشی سے نعرہ بلند کرنے کے انداز میں بولا اور میں بے اختیار فٹس پڑا۔

تھوڑی دیر مزید باتیں ہوتی رہیں، اس کے بعد کالیا نے کہا کہ وہ اپنے طور پر عارف کے بارے جانے کے اسباب کا کھوج لگانے کی کوشش کرے گا۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ جیسے ہی اسے اس سلسلے میں کوئی اہم بات معلوم ہو وہ مجھے ضرور آگاہ کرے۔

راہبہ متعلق کرنے کے بعد میں چند ٹاپے کے لیے گہری سوچ میں مبتلا ہو گیا تھا۔

کالیا کی بہت سی باتیں میرے دل و دماغ میں گردش کرتی رہتی تھیں، وہ زمانے کا ”پکھا“ ہوا تھا اور جانتا تھا کہ سینہ ستار جیسے لوگوں سے کس طرح ٹھنڈا جاتا ہے۔

لیکن میرا طریقہ کار دوسرا تھا۔ میں تو دشمنوں کے سلسلے میں بھی قتل و قمارت گری کا قائل نہ تھا بلکہ ان کے لیے تو میں موت سے بڑی سزا بھی سمجھتا تھا کہ وہ مجھے بازار میں رسوا ہوں، ان کے چہروں سے وہ نقاب اتار بھیجوں، جنہیں ہمیں کر یہ خود کو شرفاء ظاہر کیے ہوئے ہیں اور یہی ان جیسوں کے لیے موت سے بڑھ کر سزا ہوتی ہے۔ ارشاد دشمن کی مثال میرے سامنے تھی۔ اس نے میرے ساتھ جو کچھ کیا تھا اگر کوئی اور غصہ و انسان ہوتا تو اس کے ہاتھوں جان سے ہی ہاتھ دھو بیٹھتا یا مجھے پیش آ جاتا تو میں اسے ہلاک ہی کر ڈالتا مگر پھر کیا ہوتا؟ ارشاد دشمن مر جاتا، جو کہ وہ ایک فیچ زیادتی کی صورت میں مجھ سے کر رہا تھا، اس کی زیادتی پر غالب آ جاتا اور میں جیل چلا جاتا تو کوئی بے حد نہیں مجھے پھانسی بھی لگ جاتی، یوں میری آخرت و دنیا دونوں غارت جاتیں، جبکہ ارشاد دشمن جیسا بد معاش دونوں جہانوں میں سرخورد رہتا، محض اس لیے کہ وہ قتل ہوا الین ہی سزا سے قانون کے دائرے میں ملے تو اس کی دنیا و آخرت دونوں ہی

خواب ٹھہر۔ وہ آج بھی محلے میں کسی کو نہ دکھانے کے قابل نہیں رہا تھا، میڈیا میں اس کے ”سیاہ کارنامے“ کے چار داغ چھپے ہوئے۔ وہ تو محلہ چھوڑنے کا بھی روادار نہ ہو سکا تھا کہ جہاں بھی جاتا وہاں اس کی ”شہرت“ پہلے سے پہنچی ہوئی ہوتی۔ لہذا اس نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ جتنی بھی ذلت کی زندگی باقی بچی ہے خاموشی کے ساتھ اسی محلے میں گزار دے اور وہ اب گزار رہا تھا۔ یہی نہیں اب اس پر ایک اور قیامت ٹوٹ پڑی تھی تو میں ہی اس کی مدد میں سب سے آگے تھا۔

شاید میرے حوصلوں کو ہمیز کرتی ہوئی یہی وہ نامعلوم قوت تھی جو مجھے اپنے سے زیادہ طاقت ور دشمنوں سے نیرو آزا ہونے کا حوصلہ عطا کرتی تھی۔ میں نے بھی سینہ ستار جیسے دشمنوں کو ایسی ہی شکست سے دو چار کرنا چاہا تھا کہ وہ میرے ہاتھوں طیش میں قفل ہو کر مظلوم نہ قرار پائیں اور نہ ہی ان کے گناہ اس طرح جو جانے کا باعث بنیں بلکہ میں انہیں آخرت اور دنیا میں بھی کیوں کا نہیں چھوڑنے والا تھا۔

کالیا کے فون کے بعد میں نے چاچا انور شاہ کو بتایا کہ میں ایک ضروری کام سے ذرا کہیں جا رہا ہوں، پھر انہیں کچھ ضروری امور سمجھا کر اپنی پھر ان کا میں متعلقہ تھانے کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں ایک چوراہے میں سرخ سنفل پر رک کر میں نے ایک ہا کر سے تازہ شام کا اخبار خرید لیا تو اس میں مجھے عارف کے فرار اور پولیس مقابلے میں مارے جانے کی خبر پہلے ہی صفحے پر چلی حروف میں چٹنی چٹکھائی ہوئی نظر آگئی۔ اس دوران جی ہز ہو گئی اور میں نے اخبار لپیٹ کر براہروی نشست میں پھینک کر کار آگے بڑھا دی۔

نصف گھنٹے بعد میں متعلقہ تھانے میں تھا اور وہاں ابھی تک لوگوں کا اچھا خاصا ہجوم دکھائی دیا۔ ان میں صحافی برادری سے متعلق لوگ بھی تھے اور انتظامیہ کے بھی، احاطے سے باہر گیت پر بھی اتنی ہی لوگوں کا ہجوم نظر آتا تھا جو اندر داخل ہونے کی کوشش میں تھے مگر گیت پر تینوں پولیس کے چند اہلکاران کا راستہ روکے ہوئے تھے۔

میں کار میں ہی بیٹھا، اسٹیرنگ پر دونوں ہاتھ رکھے ہونٹ بیٹھے کچھ سوچتا رہا۔ میں جانتا تھا، میں جا ہے جتنی بھی کوشش کروں مجھے اندر جانے کی اجازت نہیں مل سکتی اسی لیے میں چند سیکنڈوں تک اسی طرح کار کی سیٹ پر براجمان رہا۔

میرا خیال نہیں تھا کہ یہاں ایسی صورت حال ہوگی

اسی لیے میں اندر جا کر کچھ دریافت کرنے کا ارادہ رکھے ہوئے تھا مگر اب یہاں اندر جا ہر اس قدر ہجوم دیکھ کر میں سوچا کہ اس وقت وہاں لوٹ جانا ہی بہتر تھا پھر بھی یہاں آتا تو شاید ایسی صورت حال نہ ہو۔ لہذا ابھی میں واپس لوٹنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ راجا ایک میں بری طرح ٹھٹھا۔ مجھے انیسٹر کی دروی میں ایک خزانہ شخص دکھائی دیا جو اپنے ساتھی پولیس اہلکاروں کے ساتھ اندر سے باہر لیے بے ڈک بھرتا ہوا گیت کی طرف ہی آ رہا تھا اور قریب تک کر وہ باہر کھڑے لوگوں کے ہج سے درشت لہجے میں چلا کر انہر وہاں سے چلے جانے اور ”اندرا“ کر دینے کی تہد یہ بھی کیے جا رہا تھا۔ میں اسی کی طرف پہنچی پہنی آنکھوں سے دیکھا کہ اپنی کار سے نیچے اتر آیا تھا مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ انیسٹر کی دروی میں، میں ایک ایسے پولیس آفیسر کو دیکھ رہا تھا جس کی کچھ روز پہلے ہی منگلی محل میں آئی تھی اور اس کی بچی اتروا کر اسے کوارٹنگھاٹ بھی کر دیا گیا تھا۔ لیکن اس وقت میری پہچان ہوئی آنکھیں اُس راشی افسر ایس ایچ او انیسٹر راجا دلاور کا ایک تکلف وہ حیرت سے کچے جاری تھیں، میری سانس اندرونی اہال سے بے ترتیب سی ہونے لگی تھیں اور رگور میں دوڑتا بوجھم ہونے لگا تھا۔ اب میرا یہاں سے واپس لوٹنا محال ہی تھا، میں نے لرزے ہاتھوں سے انیسٹر سوا آف کیا اور کار کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا، اس کے بعد تیز قدموں سے چلا ہوا گیت کے قریب جا پہنچا، چہرہ اب پولیس اہلکار وہاں موجود ہج پر اب باقاعدہ لاشی چارٹا کرنے لگے تھے، اسیا وہ شاید اپنے افسر کی موجودگی یا اسی کے ایماء پر کرنے لگے تھے، اسی اثناء میں مجھے آگے بڑھنے کا موقع ملا، میری چلتی چلتی نظریں ہنوز راجا دلاور پر جمی ہوئی تھیں۔ اسی وقت ایک اہلکار لاشی سونے میری جانب بڑھا تھا اور یہی وہ وقت تھا جب میں ملے کے مل چلا گیا تھا۔

”راجا دلاور.....!“ وہ اتنی تیز اور بلند آواز میں یوں بغیر منصب کے اپنا نام کسی کو لینے دیکھ کر چونکا تھا اور پھر خزانہ سی نظروں کو آواز کے تعاقب میں دوڑتا ہوا میری طرف متوجہ ہو گیا۔ تب تک وہ اہلکار خامے چارحانہ انداز میں مجھے اپنی لاشی کے زور پر پرے دھکیلنے کے لیے میرے نزدیک آچکا تھا۔

”ٹھہر جا.....“ انیسٹر دلاور نے اسی اہلکار کو روکا۔ ”اسے ذرا میرے قریب آنے دو، یہ مجھے اچھی طرح دیکھ لے۔“ وہ خاصا مطمئن پایا ہوا تھا۔ گیت لگزی کا تھا جس کے

بالی دار چوٹی فریم کے نزدیک وہ کھڑا میری جانب گھور رہا تھا۔

اپنے افسر کے حکم کی قیاس میں میرے نزدیک لاشی سونٹ کر آنے والا وہ اہلکار ایک دم ایک طرف کو ہویا اور میں نے آگے قدم بڑھا دیئے۔

اب میرا اور راجا دلاور کا چہرہ آنے سائے تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ہمارے درمیان میں چوٹی فریم کا خلا تھا۔

”تم..... تم یہاں کیسے؟“ میرے منہ سے جیسے بہ مشکل یہ پھسلا تھا، میرے ان آنکھتے ہوئے الفاظ میں جھٹک، طیش اور ایک طرح کی شکست خوردگی بے بسی پنہاں تھی، جس سے وہ غیثت گویا حیا اٹھاتے ہوئے اپنی ہنڈوں کو اچکا کر استہزائے لہجے میں بولا۔

”تو کیا پھر میری جگہ نہیں اس دروی میں یہاں ہونا چاہیے تھا؟ ہاں! ایک دروی تمہارے لیے پہلے سے تیار رکھی ہوئی ہے میں نے، نمبر دس کی دروی جو عترت تم پہننے والے ہو۔“ میں اس کا اشارہ سمجھ کر جھٹک لیا لیکن ظاہر ہے اس حاضر رس پولیس افسر کے ساتھ میں کسی قسم کی تیز یا بدگامی نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم اپنے اندر کے بال کو کم کرتے ہوئے میں نے اس سے فقط اتنا پوچھا۔

”کیا عارف پھندہ تیار ہی کھڑی میں ہی یہاں سے فرار ہوتے ہوئے مارا گیا تھا؟“ یہ استفسار کرتے ہوئے غیر ارادی طور پر میری نگاہ اس کے عقب میں پڑی تھی۔ اندر پہنچ جانے میں کامیاب ہجوم کے لوگوں میں سے ایک شخص نے مجھے اس طرف کو متوجہ ہو گیا تھا اور اسی طرف ہی آ رہا تھا، یہ مجھے کوئی صحافی ہی لگا تھا کیوں کہ اس کے ہاتھ میں ایک نوٹ پیڑ اور قلم تھا، ایک چھوٹا سا ٹیکہ بھی اس کی شرٹ میں اڑسا ہوا تھا۔ نیز اس کے عقب میں ایک اور شخص کافی پھرتی کے ساتھ چلا آ رہا تھا جس نے بڑا سا ویڈیو کیمرہ کا نہرے پر اٹھا رکھا تھا۔

میرے سوال پر اس غیثت راجا دلاور کے ہر ہیت ہونٹوں پہ ایک شیطانی سی پر غرور مسکراہٹ رقصاں ہوئی تھی اور جواب دینے کی بجائے اس نے ایک ہلکا سا قہقہہ بھی اگل ڈالا تھا۔

”یہی..... یہ وہی ہے، جسے کچھ روز پہلے کوٹ کے مہم کے مطابق چٹنی اتروا کر کوارٹنگھاٹ کر دیا گیا تھا، اسے وکری سے بھی سسپنڈ کیا گیا تھا، مگر یہ یہاں کیوں اور کیسے دوبارہ تعینات ہوا ہے؟ اس سے پوچھو یہ سوال.....“ میں

جیسے اس کھلی نا انصافی اور اندر مگر می چو پٹ راج کے ستائے ہوئے بے بس انسان کی طرح ہش پائی انداز میں چلا کر اس صحافی سے بولا تو اس نے فوراً آگے بڑھ کر اپنا ٹیکہ میرے قریب کر دیا، پن وہ اپنے کان میں اٹکا چکا تھا۔

”یہ لائیو کورج ہے نوجوان بولتے رہو.....“ اس صحافی نے مجھے اکسیا، اس کا سامنے ہم پر اپنا کیمرہ فوکس کرنے لگا۔

”یہی..... یہ ایک نمبر کا راشی پولیس افسر اور لینڈ بانکا کا زرخیز ڈاٹ ہے.....“ داؤد والے مرڈر کیس میں قاتلوں کا ساتھ دینے کے جرم میں اسے نوکری سے معطل کر دیا گیا تھا اور..... اور اب اسی کیس کے ایک اہم گواہ عارف پھندہ کو بھی دانستہ فرار کا موقع دیتے ہوئے اسے ہلاک کرنے کی سازش بھی اسی کی تیار کر رہے تھے۔

”کیوں کرتا ہے یہ.....“ راجا دلاور غصے سے بھنا کر بولا۔ ”یہ خود داؤد کا قاتل تھا اور اس نے بیسوں کے بل پر اپنی ضمانت کر والی، بہت جلد یہ دوبارہ قانون کی گرفت میں آنے والا ہے۔“ اتنا کہنے کے ساتھ ہی اس نے اپنے سامنے اہلکاروں کو مخصوص اشارہ بھی کیا، انہوں نے مجھے اور اس صحافی کو پرے دھکیلتا شروع کر دیا جبکہ خود راجا دلاور مجھے ختم آلود نظروں سے گھورتا ہوا وہاں ہٹ گیا۔

پولیس والے مجھے پرے دھکیلنے لگے اور اندر اس صحافی اور کیمرہ میں کو ہٹانے لگے، وہ دانستہ کوئی ایسی حرکت نہیں کر رہے تھے کہ ان کی ویڈیو لائیو چینل پر نہ آجائے اسی لیے ان کی کوشش یہی تھی کہ وہ دانستہ اس رپورٹر اور کیمرہ میں کے سامنے آ رہے تھے، تاکہ مجھے ”کلب“ نہ کر سکے۔ جبکہ باہر تین اہلکار اب مجھے باقاعدہ زد و کوب کرنے لگے تھے، یہاں تک کہ مجھے دھکیلے ہوئے وہ احاطے کے گیت سے دور لے گئے اور پھر میرے آگے راستہ روکے تن کر کھڑے ہو گئے تاکہ میں دوبارہ گیت کا رخ کروں تو مجھے آگے بڑھنے نہ دیں۔

میں نے گیت کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھا، میرا خیال تھا شاید اس صحافی کے لیے یہ سبھی خیر خبر ہوگی لیکن مجھے یہ دیکھ کر ایک حیرت آمیز سی مایوسی ہوئی کہ وہ اپنے کیمرہ میں کے ساتھ مجھے نظر انداز کر کے یوں ہٹ گیا تھا جیسے اس نے اپنے کیمرے کا جتنا ”پینٹ“ بھرتا تھا وہ بھرا ہوا تھا، اب حریف سبھی خیر کی ”باز یافت“ کے لیے وہ میرے ہم

احاطے سے باہر آنے کا ریسک لینا نہیں چاہتا تھا کہ دوبارہ اسے اندر داخل ہونے دیا بھی جاتا کہ نہیں اور وہ احاطے کے اندر کی سستی خیز خبروں سے محروم ہو جاتا۔ مجھ سے اسے ایک ہی خبر تھی جو اس کے لیے ناگانی ہوئی۔ چاہے اندر سے ہزاروں جھوٹی خبریں ملیں وہ اس کے لیے صحیح نہیں، مگر باہر آ کر وہ ایک جھٹی خبر کو مل کر تنہا دینا نہیں چاہتا تھا، آخر کو اس صحافی نے بھی اپنا ”کام“ چلانا تھا، یہاں اس کے سچائی کی تلاش تھی؟ یہاں تو بس ”ریننگ“ کی دوشمگی اور اپنے ”زنبیل“ کو زیادہ سے زیادہ چٹ پٹی اور مختلف النوع خبروں سے بھاری کرنا تھا۔

میں مایوس ہو کر پلٹ گیا اور اپنی کار میں آن بیٹھا۔ پولیس اٹکار لافیاں زمین پر ٹکائے مجھے استہزائیہ مسکراہٹ سے یوں گھور رہے تھے، جیسے کہہ رہے ہوں۔
”جاؤ یہاں!..... جاؤ تم یہاں کہاں کی جھاڑی اپنے ناٹواں کا دعویٰ پر اٹھائے آگئے ہو۔ یہ تم پر ہی مگر مارٹر الٹ دی جائے گی اور اپنے بچ کے ساتھ تم خود بھی خاستر ہو جاؤ گے۔ اپنی خبر متاؤ اور ہمیں ڈیوٹی کرنے دو..... چلو شاہاں!“

اور میں واقعی وہاں سے مایوس ہو کر چلا آیا۔ لاری اڑے پر میرا جانے کوئی نہیں چاہتا تھا۔ میں نے زنجیر کو فون کیا وہ اپنے آفس میں آئی تھی، میں نے اسے اپنے پیچھے کا کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

میں اس وقت سخت انتشار کی زد میں تھا۔ وہ رہ کر میرے اندر سے ایک ابال سا اندر رہا تھا۔ یہ کیسی اندر تھی؟ ایک پولیس آفسر جیسے منظم نظر کیا تھا وہ کھنچ چند روز گزرنے کے بعد وہ نہ صرف اپنی سابقہ سیٹ پر موجود تھا بلکہ بڑے دھڑلے کے ساتھ اس نے میرے دشمنوں کے ”ٹاسک“ پر عمل پیرا ہوتے ہوئے سیٹ سنبھالنے ہی دادوں قل کیس کے ایک اہم گواہ کا چالاک سے مراد بھی کروا دیا تھا جبکہ یہ خود بھی اسی کیس میں انوالو تھا۔

میں اندر طوقان کی طرح کار دوڑاتا ہوا زنجیرہ کے چیمبر میں پہنچا۔ وہ کئی گھنٹہ کے ساتھ مصروف گفتگو کی اس کی ٹیکریٹری میں منجر اقبال جو ایک ادیب و محقق خاتون تھیں، میں انہی کے کمرے میں سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ میرا اندر ابھی تک مل رہا تھا، حالاں کہ میں اس کی فطرت کا مالک نہ تھا، بہت آبی حراج رکھتا تھا اور یہی میرا اختیار بھی تھا جس کی بدولت میں دشمنوں پر فتح بھی پاتا رہا تھا، لیکن اس بار

جانے کیا ہوا تھا کہ میں اپنی فطرت کے بالکل برخلاف کیفیات و بچان کا شکار ہو رہا تھا، یہ شاید اسی لیے تھا کہ میں نے اپنی زندگی میں آج تک ایسی اندر بھی نہیں دیکھی تھی۔ اگرچہ میرے باپ کا بے گناہ چھائی لگنا بھی کسی ”اندھر“ سے کم نہیں تھا، مگر اس میں سارے شواہد کا رخ بڑی ہمارت اور مربوط دے دارغ منصوبہ بندی کے ساتھ میرے بے گناہ باپ کی طرف موڑ دیا گیا تھا۔ لیکن یہاں تو سب کچھ سب کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس کے باوجود بھی یہ سب ہونا جھگ کے قانون ہی کے مترادف تھا۔

سامنے اپنی میز پر بیٹھی منجر اقبال، اپنی خفاف عدسوں والی ٹیشر فریج کی میٹک سے مجھے بھی کئی روز دیہ کی لگا ہوں سے بچنے لگتی تھی۔ وہ شاید میری اندرونی کیفیات کا اندازہ لگا رہی تھی۔ یہ حال ہی میں یہاں اپائنٹ کی گئی تھی۔ مجھے اس کے بارے میں زیادہ علم نہیں تھا اور نہ ہی شاید اسے میرے بارے میں بھی۔ تاہم وہ اسے ایک معمول کی روٹین سمجھ کر ذرا دیر بعد ہی اپنے کام میں متہمک ہو گئی اور میں خود کو پرسکون کرنے کی سعی میں مصروف ہو گیا۔

لیکن مجھے جانتا تھا۔ میں نے اسے ایک گلاس ٹھنڈا پانی لائے لگا لیا۔ وہ کالج کے ایک گلاس میں میرے لیے پانی بھر لایا جسے میں ایک ہی سانس میں چڑھا لیا۔ اندر زنجیرہ کو میرے آنے کی خبر کر دی گئی تھی، تھوڑی دیر بعد میں نے اس کے کمرے سے ایک بوڑھے شخص کو اور دوسری ایک خاتون تھیں۔ ان کے جاتے ہی منجر مجھ کا بڑا گونا، میں سمجھ گیا، زنجیرہ نے مجھے ہی بلایا ہوگا، میں پہلے ہی اندر کھڑا ہوا اور منجر مجھ کی طرف دیکھنے لگا اس نے ایک جھن پٹ کر کے کچھ سنا اور میری جانب دیکھ کر ہولے سے مسکرا کر اپنی گردن اٹھات

میں ہلا دی۔ میں تیزی سے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔
”خیریت؟“ خاصے جوش میں نظر آ رہے ہو؟“ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اس نے ہلکے گلابی رنگ کے لباس پر سیاہ رنگ کا کورٹ گاؤن پہن رکھا تھا۔ گلابی لباس اور سیاہ رنگ کی گاؤن کا احتراز اس کے خوب رو چرے اور گورے رنگ پر خاصا عجیب رہا تھا۔ کشادہ آنکھوں میں ہلکا کاہل جھلک دکھار رہا تھا۔

”تم نے شاید آج کا اخبار نہیں پڑھا، لو پڑھ لو.....“ کہتے ہوئے میں نے شام کا خبر پڑھا ہوا تازہ اخبار اس کی جانب بڑھا دیا۔ مجھے دیکھ کر اس کا کھٹا چہرہ یک دم بھیدہ سا ہو گیا۔ اخبار لے کر اس نے اس خبر پر نظریں جمادیں اور

اگلے ہی لمحے اس کا چہرہ تاریک سا پڑ گیا۔
”دیکھو..... سچی اندر میری ہے تمہارے اس کالے قانون کی دنیا میں.....“ میں نے دل کی بھڑاس نکالی۔ وہ ایک گہری ہمساری خارج کر کے بولی۔ ”قانون کالا نہیں ہوتا..... لوگ کالے ہوتے ہیں اور وہی اسے کالا بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔“

”ایک ہی بات ہے، ناک کو چاہے آگے سے پکڑو یا اتھمکھا کر پیچھے سے.....“ میں نے غمی سے کہا اور پھر اسے یہ بھی بتا دیا کہ میں نہ صرف متعلقہ تھا نے سے آ رہا تھا بلکہ اس اچھ اور ادا دار سے بھی ملا تھا، نیز وہ اتنے بڑے دانتے کے ہاؤس پر ریٹائرڈ تھوٹش زدہ ہونے کی بجائے کتنا مطمئن اور بے فکر نظر آ رہا تھا، اس کا بھی کوئی بتا یا تو وہ بولی۔

”جن لوگوں کی پٹ پر طاقت و رہنمائی تو میں ہوتی ہیں وہ ہر قسم کا غیر قانونی کام اسی اطمینان اور دھڑلے سے کیا کرتے ہیں لیکن قانون کے ہاتھ بھی لیے ہوتے ہیں، کبھی نہ کسی وہ اس کے نتیجے میں آتے ضرور ہیں۔“

”مجھے اس دن کا بے چینی سے انتظار ہے۔“ میں نے کہا۔

”کیا تنگواؤں تمہارے لیے؟“ اس نے میرے دیکھتے ہوئے اچانک پوچھا۔

”کچھ نہیں، ششہ سے پانی کی طلب تھی وہ انتظار گاہ میں بی بی چکا۔“ میں نے لٹی میں سر ہلایا اور آگے بولا۔ ”اس غیبت اس اچھ اونے مجھے ضمانت منسوخ کروانے کی دھمکی بھی دی تھی۔ کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے؟ حیرت ہی کی بات ہے اسے اپنا کوئی ڈراما کہ عارف مجھ پر اس کی کھڑی میں ہلاک ہو جانا اس کے خلاف حکم جاری تادیبی کارروائی کا بھی باعث بن سکتا ہے مگر وہ الٹا مجھے اندر کروانے کی دھمکی دے رہا تھا۔“

”دورمان میں ضرور کوئی بڑی گڑبڑ ہوئی ہوگی، میں پہلے اس کا پتا چلاؤں اور یہی بات تمہاری ضمانت وغیرہ کی تو اس سلسلے میں بے فکر ہو، میں ابھی ایک درخواست تاپ کرانی ہوں، تم اس پر اپنے دخل کر دینا یہ تمہاری طرف سے ہوگی جبکہ دوسری میری طرف سے یعنی تمہاری دیکل کی حیثیت سے۔“

اس کی بات پر میں نے پرسوج انداز میں اپنے ہونٹ کھینچے اور اس سے رخصت ہونے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

”بھنگو کے نہیں؟“ اس نے پوچھا۔
”نہیں، میں چلوں گا، جب تک تم بھی اس سلسلے میں ضروری کام نہ کر لو..... اور ہاں! میں نے تمہارے اکاؤنٹ میں فیس کی ادائیگی کے سلسلے میں کچھ رقم جمع کرادی ہے۔“ میری اس بات پر میں نے دیکھا کہ زنجیرہ کا چہرہ ایک دم بھگ سا گیا، اسی لمحے میں بولی۔

”اس کی کیا ضرورت تھی نمنان؟ میں نے کب تم سے فیس کا تقاضا کیا تھا؟“

”میرے لیے کبھی بہت ہے کہ تم میرا ہر کام بہت دل جمعی سے اور اپنا کچھ کے انجام دیتی ہو..... فیس پر تو تمہارا دیے بھی حق بنتا ہے۔ چلوں گا۔“

میں اسے خدا حافظہ کہہ کر چلا آیا۔
شام ٹھنکے گئی تھی۔ زنجیرہ کو اس کی بالمشافہ اطلاع دینے کے بعد میں نے کار چلائے ہوئے اپنے سیل پر کالیا کو بھی مطلع کرنا ضروری سمجھا۔ اگرچہ عارف کی پولیس کھڑی میں ہلاکت کی سب سے پہلے خبر اس نے ہی مجھے دی تھی مگر وہ بہر حال یہ نہیں جانتا تھا کہ وہاں راجا دلاور دوبارہ متعین کیا جا چکا تھا۔

”ابے لے..... جگری! یہ ٹو کیا کہہ رہا ہے؟“ وہ چھوٹے ہی بولا۔
میں نے اسے مختصر امرات کے ساتھ وہی کچھ بتا ڈالا جو زنجیرہ کے گوش کرار کر چکا تھا۔ وہ بھی ہکا بکا سارہ گیا تھا۔

”لگتا ہے ان نامرادوں کے ہاتھ قانون سے بھی زیادہ لیے ہیں لیکن خبر..... ٹو بے غم رہے جگری! کہاں تک جا میں گئے، یہ ہم بھی دیکھ لیں گے۔ پر جگری! ٹو اپنی ضمانت کے سلسلے میں ابھی سے کچھ کر لے، ایسا نہ ہو کہ.....“ کہتے ہوئے اس نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے ایک گہری سانس خارج کر کے اسے بتا دیا کہ میں اس سلسلے میں پہلے ہی ایڈوکیٹ زنجیرہ کو مطلع کر چکا ہوں۔

”یہ تو ٹو نے بہت اچھا کیا جگری!“ وہ بولا۔ ”لیکن یار! اس سیمہ ستار کے ساتھ فیڈس لٹی کرنا پڑے گی، اسے بتانا پڑے گا کہ وہ اگر جلیبی کی طرح گھیر کھا دے جو ہر کھاسکا ہے تو ہم بھی وہی کچھ اس کے ساتھ کر سکتے ہیں، فرق صرف اتنا ہوگا کہ وہ قانون کی آڈ میں اسے بھر مہرے آگے کھسکا تا ہے ہم دھڑلے کے ساتھ اس کی گردن دیوہیں گے، پر جگری! ٹو اتنا بے تاب نہ.....“

”کالیا! کسی خوش فہمی میں مت رہنا۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”سینہ ستار اگر اپنی سیاہ کاریاں قانون کی آڑ میں کرتا ہے تو وہ اس کے علاوہ کبھی بہت کرنے کی سکت رکھتا ہوگا۔ اس کے پاس غنڈوں، بد معاشوں کی کیا کمی ہوگی، ایک سے ایک کرانے کا قاتل اس کا راتب خور ہوگا۔ کئی بڑے سرکاری افسر اس کے راتب نواز ہوں گے۔ مگر وہ یہ سب جانتا ہے کہ اپنے کون سے مخالف سے کس ہتھیار سے لڑتا ہے۔ مگر وہ وہی ہتھیار استعمال میں لاتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ تم یا تمہارے اس استاد بھابھا کا گروہ سینہ ستار کے مقابلے میں کتنا طاقت ور ہے لیکن ایک بات کا ادراک میں بھی رکھتا ہوں کہ تمہارے گروہ جیسے نجانے کتنے گروہ اس کی سرکردگی میں ہوں گے، بہ قول تمہارے حریف گروہ لاڈلہ سائیں کی مثال تمہارے اور میرے سامنے ہے جسے سینہ ستار کی آشیر باد حاصل ہے۔“

میرے دل میں جو تھا وہ میں نے کالیا کی ناراضگی کی پروا کیے بغیر کہہ ڈالا تھا۔ وہ بھی برا متائے بغیر ہنستے لہجے میں بولا۔ ”اے لے..... جگر! شاید تو سینہ ستار سے خاصا خائف اور مرعوب لگتا ہے۔“

”یہ بات نہیں ہے میرے یار کالیا!“ میں نے تھوڑا جذبہ بانی ہو کر کہا۔ ”میں نہیں چاہتا کہ تو سینہ ستار جیسے مافیائی ڈان کو کمزور سمجھ کے جوش میں آ کر کوئی ایسی ویسی حرکت کر بیٹھے جو بعد میں خود خدا اوست تیرے لیے ہی نہیں میرے لیے بھی خمیر کی غلغل اور پچھتاوے کا سبب بن جائے، تو میرا اچھا اور سچا دوست ہے اور تیرے لیے میرے دل میں بڑی قدر و قیمت ہے، اسی لیے سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہمارے لیے بہتر ہوگا۔“

”اے لے جگر! تو کیا اپنے یار کاوڑ اتوڑ کے نکلا ہوا سمجھتا ہے..... زمانے کا چمکا ہوا ہوں میں، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے میں نے، گروہ میں استاد بھابھا کے بعد میرا نمبر آتا ہے، ہل.....! گروہ کی بات بھی چھوڑ۔ صرف اپنے بل بوتے پر اکیلے میں نے ایک دنیا کو کھنکی کا ناچ نچایا ہے۔ کون کتنا پانی میں ہے، اس سالی تقدیر سے یہی تو اب تک سیکھا ہے میں نے، ہر بات تمہارا سینہ ستار تو میں جانتا ہوں وہ کتنا دم رکھتا ہے لیکن ایک بات یاد رکھنا میری جگر!.....! طاقت ور دشمن کے حملوں کا کامیاب دفاع کرنا ہی بڑی بات نہیں ہوتی، اس کا اُسے سود کے ساتھ جواب لوٹانا بھی ضروری ہوتا ہے ورنہ وہ ایک کے بعد ایک اور..... ایک

سے بڑھ کر ایک زور آور حملے کرتا رہے گا، دشمن کو اپنی طاقت بھی دکھانا ضروری ہوتی ہے۔“

”تو سینہ ستار کے ساتھ کیا کرنا چاہتا ہے؟“ بالآخر میں نے اس کی بات پر غور کرنے کے انداز میں کہا۔ تو وہ بولا۔ ”جیسے کو تیرا، میں سینہ ستار جیسے کاروباری لوگوں کی فطرت سے خوب واقف ہوں، جو اپنی اولاد سے زیادہ اپنے مال پر مرتے ہیں۔ ان کی املاک کو نقصان پہنچا دو تو یہ ان کے لیے اپنی اولاد کے مرنے سے بھی بڑا گم ہوتا ہے، اپنے مال و منال کی تباہی پر یہ قہر اٹھتے ہیں۔ خیر..... جگر! وقت کے ساتھ ساتھ تجھے میری باتیں سمجھ میں آ جائیں گی، فقط اس بات سے ڈرتا ہوں کہ کہیں دیر نہ ہو جائے۔“

مجھے کالیا کی باتوں سے ہی نہیں، اس کے لہجے سے بھی برسوں کے گرگ باران دیدہ تجربے کی بو آتی محسوس ہوئی۔ میں اس کے ماضی سے کچھ زیادہ واقف نہ تھا ہر لگتا ایہ ہی تھا کہ وہ مجھ سے زیادہ، نامساعد حالات کی دودھاری چھری پر پاؤں رکھ کر نہیں، اپنی گردن رکھ کر گزارا ہے اور ج بات وہ کرتا تھا، وہ بے پرکی باؤنٹ نہیں ہوتی تھی اور نہ تو کسی گروہ ہی ”استاد“ کی طاقت کے زعم میں کی ہوتی تھی، اس کا ”زعم“ صرف اس کے وہ پیش آمدہ حالات ہوتے تھے جن کی گود میں وہ ہل کر جواں ہوا تھا۔ کالیا جیسے لوگوں کے لیے یہ کہا جاسکتا تھا کہ وہ اپنی ذات میں ایک پورا ”گروہ“ تھے۔ گروہ ان سے نہیں بلکہ ان سے گروہ تھا لہذا وہ جو بات کہتا تھا اپنے انجری بات کی روشنی میں کرتا تھا۔

میں نے کہا۔ ”تو کیا اس کا بوٹ تین والا آفس تیار کرنا چاہتا ہے یا اس کی فکشن میں واقع دو ہزار گز پر میٹا عایشان کوئی گواگ لگا چاہتا ہے؟“

”کرنا تو میں اس سفاک انسان کے ساتھ ایسا ہی کچھ چاہتا ہوں جگر!..... لیکن ابھی تھوڑا مزید دھار کا اندازہ کرلوں اور ذرا اس حقیقت کا بھی چٹا کرلوں کہ آخر یہ راجا دلا در اور عارف والا معاملہ کیا ہے؟ یہ دلا در و بارہ اپنی سیٹ پر بحال کس طرح ہوا؟“

”ٹھیک ہے تو جب تک یہ پتا کر کوئی خاص بات معلوم ہو جائے تو مجھے ضرور بتانا۔“ میں نے کہا اور پھر رابطہ منقطع کر دیا۔ میں نے کار کی رفتار بڑھا دی اور گھر کی راہ لی۔

محلے میں داخل ہوا تو یہاں کی جو سیم غالب آنے لگیں۔ منے مہاں کی گمشدہ بیٹی ثوبہ..... کے سلسلے میں ایک

مضبوط کلیمزیر خان کی صورت میں میرے ہاتھ لگ تو چکا تھا اور اس کے پیچھے میں نے سدو بھائی کو لگا دیا تھا۔ میرے خیال میں ثوبہ کے سلسلے میں یہ ایک اچھی پیش رفت تھی۔ جس سے یقیناً اس کے باپ نے میاں کو زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت ڈھارس ضرور مل سکتی تھی۔ اسی لیے میں پہلے گھر پہنچا۔ فہیم اور عاصمہ گھر پہنچے ہی تھے۔ مجھے بھی گھر پہنچنے پہنچنے تقریباً رات تو ہو ہی گئی تھی۔

حسب معمول رات کا کھانا ہم تینوں بہن بھائیوں نے مل کر کھایا۔ اس روز میرے اور فہیم کے درمیان ہونے والی عاصمہ بہن سے متعلق کچھ عجیبہ نوعیت کی گفتگو کے بعد میں نے یہ بات محسوس کی تھی کہ فہیم، عاصمہ سے کچھ کچھ کھنچا سارہنے لگا تھا۔ کھانا بھی خاموشی سے کھا کر اٹھ جایا کرتا تھا۔ عاصمہ اس سے کوئی بات کرتی بھی تھی تو وہ محض ہوں، ہاں کہہ دیتا۔ عاصمہ نے بھی یقیناً اپنے بھائی کی یہ بے رخی یا اوپر اپنی ضرورت محسوس کیا ہوگا لیکن وہ کسی چپ رہی تھی بلکہ اب تو اکثر ایسا بھی ہونے لگا تھا کہ فہیم ہمارے ساتھ اکٹھے بیٹھ کر کھانا بھی کم ہی کھایا کرتا تھا۔ بڑے بھائی کی حیثیت سے میں گھر کا بڑا اور سربراہ تھا، تاہم میں ان دونوں کے ساتھ محبت اور شفقت سے ہی پیش آتا تھا لیکن مجھے فہیم کا یہ رویہ پسند نہیں تھا۔ ابھی تو میں کھانے سے فارغ ہو کر ذرا دیر کے لیے حاجی کریم بخش کے ہاں جانے کا ارادہ رکھے ہوئے تھا۔ واپسی میں گھر آ کر میں نے سوچ رکھا تھا کہ فہیم کو اس کے رویے پر نوٹس اور سمجھانے کی کوشش کروں گا۔

کھانے سے فراغت کے بعد میں فوراً گھر سے باہر نکل گیا اور سیدہ حاجی صاحب کی بیٹھک کا رخ کیا۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے کہ ہر روز رات یا شام میں محلہ کمیٹی کے صدر حاجی کریم بخش کے ہاں مختصری ”بینٹک“ لگا کرتی تھی۔ جس میں محلے ہی کے لوگ ہوتے تھے یا پھر ان کے قریبی دوست احباب۔

”میں وہاں پہنچا تو یہ بیٹھک خالی تھی۔ فقط ان کا وہی دھان پان سا ملازم اسلم موکا..... موجود تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی سلام کیا اور میں نے مسکرا کر اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے دریافت کیا۔

”بھئی خیر تیرے تو ہے، یہ آج بینٹک کی رونقیں کیوں مانند پڑ گئی ہیں؟“

خلاف توقع وہ کچھ عجیبہ سا نظارہ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ ”ارے نعمان میاں! ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی سب

یہاں بیٹھے تھے کہ منے میاں اپنے بیٹے اختر کے ساتھ حواس باختہ سے یہاں آئے اور بولے۔ ایڈمی کے لاوارث مردہ خانے سے فون آیا ہے۔ کسی نوجوان لڑکی کی لاش انہیں کہیں سے ملی ہے، دونوں باپ بیٹے وہیں گئے ہیں اور حاجی صاحب بھی ان کے ساتھ ہو لیے تھے۔

یہ اطلاع میرے لیے بھی لرزا دینے والی تھی۔ نوجوان لڑکی کی لاش کے ذکر پر ایسا ایسی ہی میرے سینے پہنچنے ذہن میں منے میاں کی گمشدہ بیٹی ثوبہ کا نام یاد ابھرا تھا۔

”کک..... کب گئے وہ لوگ یہاں سے؟“ میرے منہ سے پھٹی پھٹی سی آواز، بے شکل ہی برآمد ہوئی تھی۔ میرا دل دھک دھک کرنا شروع ہو گیا تھا۔

”ارے جناب! ابھی آپ کے آنے سے کوئی دس، پندرہ منٹ پہلے کی بات ہو گی!“

”ایڈمی کے اس لاوارث مردہ خانے کا کچھ ات پتا ہے تمہیں تو مجھے بھی بتا دو، میں بھی چلا جاتا ہوں؟“ میں نے پوچھا۔ میری بات پر اس نے نفی میں سر ہلادیا۔

”مجھے تو یہ پتا نہیں چل سکا لیکن اگر آپ حاجی صاحب سے ان کے موبائل فون پر بات کر لیں تو.....“ اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ میں نے فوراً اپنی جیب سے اپنا ہیل فون نکال کر حاجی صاحب کا نمبر کھینچا، دوسری جانب بل جالی رہی مگر فون ریسپونڈ نہ ہو سکا، میں نے پُرسوج انداز میں اپنے ہونٹ میچھنے لیے۔

”نہیں ملانبر؟“ اسلم موکا نے میرے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں، شاید ابھی راستے میں ہیں۔ ممکن ہے فزیکل کے شور میں بل نہ سن پارے ہوں۔“ میں نے کہا۔ اچانک مجھے اختر کے نمبر کا خیال آیا کہ شاید وہ فون انیڈ کر لے لیکن پھر کچھ سوچ کر میں نے اسے فون کرنے کا ارادہ ہٹا کر دیا اور اسلم سے بولا۔ ”تم ایک کام کرنا جیسے ہی حاجی صاحب وغیرہ تشریف لے آئیں تم مجھے ذرا آکر مطلع کر دینا، میں ابھی جاگ ہی رہا ہوں۔“

”بہت بہتر جناب!“ اسلم موکا نے اپنے سر کو فدیہ داند جنبش دیتے ہوئے کہا اور میں داکھ گھر لوٹ آیا۔ عاصمہ اور فہیم اپنے کمرے میں تھیں۔ دروازہ فہیم نے ہی کھولا تھا اور پھر اپنے کمرے کا رخ کیا تھا۔ میں آج عاصمہ بہن کے سلسلے میں اس سے بات کرنا چاہتا تھا، اسے سمجھانا چاہتا تھا کہ وہ بہتا ہے اس قسم کا رویہ نہ رکھے جبکہ ابھی ایسی کوئی بات نہیں

ہوئی تھی جس سے وہ یوں بہن سے ناراض رویہ رکھے لیکن ابھی نے میاں والے اس تازہ واقع کی خبر سن کر میں نے سر دست اپنا ارادہ بدل دیا۔ مجھے حاجی صاحب اور سنے میاں کے کوٹنے کا بے چینی سے انتظار تھا اور بار بار یہی دعا کر رہا تھا کہ خدا خیر کرے۔

میں نے وال کلاک پر ایک نگاہ ڈالی، رات کے دس بج رہے تھے۔ میں کسی اخبار کار کوئی پرانا سٹنڈے ایڈیشن لے کر بیڈ پر آکر نیم دراز ہوا ہی تھا کہ اچانک میرے سبیل پر بیچ کی ٹون ابھری، میں نے ہاتھ بڑھا کر قریب تپائی پر رکھا اپنا سبیل اٹھالیا۔ اسکرین پر دیکھا اور جب بیچ پر نظر پڑی تو یکبارگی میرا دل بے طرح انداز میں دھڑکنے لگا۔ یہ فوزیہ کا ایس ایم ایس تھا۔ میں نے جلدی سے اسے اوپن کر کے پڑھا۔ لکھا تھا۔

”ہیلو! کیسے ہو؟ سو تو نہیں گئے؟“ میرے ہونٹوں پہ بے اختیار مسکراہٹ کھج گئی، میں نے فوراً رپلائی دے دیا۔

”میں ٹھیک ہوں، جاگ رہا ہوں اور تم؟“

”میری نیند تو اس وقت سے ہی ایک خواب بن کر رہ گئی ہے، جس دن تم نے اپنی محبت کی مہر جیت لی تھی۔“ اس کے جوابی پیغام کے آگے ایک ”ہشک“ تکمیل بٹک کر رہا تھا۔ میں جان گیا تھا کہ وہ کس روز دوانی ”مہر جیت“ کی بات کر رہی تھی۔ میں نے فوراً لکھا۔ ”اپنا بھی یہی حال ہے۔ تمہارے نرم لیوں کی حلاوت انگیز پیش ابھی تک میرے احساس کی شمعیں روشن کئے ہوئے ہیں کہ دل بے قرار کو کسی طور چمک نہیں آ رہا۔“

”ہوں۔۔۔ تو آپ جناب کو شاعری بھی آتی ہے۔“

”آتی نہیں تھی اب آگئی ہے جب سے تمہیں دیکھا تم سے ملا اور۔۔۔“ میں نے دانستہ معنی خیز انداز میں عبارت ادھوری چھوڑ کر ”ڈائس“ دے دیے اور بریکٹ میں لکھا ”کال کرو نا۔۔۔ تمہاری آواز سننے کوئی چاہ رہا ہے۔“

فوراً رپلائی آیا۔ ”ابھی کرتی ہوں۔“

میرا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ میں نے فوراً اپنا سبیل فون ”سائنٹسٹ“ پر کر دیا۔ اسی وقت ڈپلے پرفوزیہ کا نام ابھرا۔ اس کی کال آ رہی تھی جو میں نے دھڑکنے والے کے ساتھ فوراً اٹھینڈ کی۔

”ہیلو!۔۔۔ کیسے ہیں آپ؟“

بہت دھیمی، چھٹی اور مرتضیٰ اس کی آواز ابھری تھی۔ کسی کو دل کی گہرائیوں سے پسند کیا جائے اور پھر اس کی

آواز سنو تو اسی طرح ہی ساتوں میں رس گھولتی محسوس ہوتی ہے۔

”آپ کہنا ضروری تھا؟“ میں نے بھی محبت پاش لہجے میں کہا۔ جواب میں اس کی کھٹکتی سی آواز ابھری۔

”محبت میں احترام بھی شامل ہوتا ہے جذ بہ دل کو حریہ نکھارتا ہے۔ ہاں! البتہ آپ مجھے تم کہہ سکتے ہیں۔“

شیریں لب و لہجے میں گوندی اس کی آواز میں بھی ایک فسوں تھا۔ اس کے خیالات کی عذرت بے مثال تھی۔

”واہ۔۔۔“ بے اختیار میرے منہ سے برآمد ہوا تھا۔

”ارے! کس بات کی واہ؟“ اک ادا نے دل آرام سے پوچھا گیا۔

”آپ کے خیالات مجھے بلند پایہ محسوس ہوئے، اسی پر بے اختیار واہ کرنے کوئی چاہا۔“

”اجھا!۔۔۔! شکر یہ جناب!“ وہ ہولے سے دل رہا انداز میں کھٹکلائی۔

”بھلا شکر کیسے کیا بات ہوئی۔“ میں بھی ہولے سے مسکراتے لہجے میں بولا۔ اچانک کال بیل بجی۔ میں چونکا۔ میں سمجھ گیا ہاں اسلم موکا ہوگا۔ آواز سبیل پر شاید فوزیہ نے بھی سن لی تھی۔ بہت دھیرے سے مستحضر ہوئی۔

”باہر کوئی آیا ہے؟“

”ہاں!“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”میرا ہی کوئی جاننے والا ہے۔ پلیز! مجھے تھوڑا ایسکیمپ ذکر کی تم؟“

”آف کورس!“ وہ بھی یک دم بولی۔ ”آپ جا کر مل لیں، باتیں تو بعد میں بھی ہوتی رہیں گی۔“

”ٹھیکس۔“ میں نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا تو اسی وقت فہیم کرے میں داخل ہوا۔

”بھائی جان! وہ اسلم آیا ہے۔ آپ کو بلارہا ہے۔“

میں جب تک اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ سبیل میں نے جیب میں رکھا اور فہیم کو بتایا۔

”میں نے ہی اسلم کو بلایا تھا۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اُسے ساری بات بتا دی۔

”خدا خیر کرے، میں حاجی صاحب سے مل کر ابھی آتا ہوں۔ تم جاگ رہے ہو نا؟ ہو سکتا ہے مجھ نے پاس تھوڑی دیر ہو جائے۔“

”جی جی بھائی جان! آپ آرام سے آئیں، میں جاگ ہی رہا ہوں، دروازہ کھول دوں گا میں۔“ وہ بولا۔

”اللہ واپسی خیر کرے بھائی جان! اپنا نہیں کیا ہوا ہوگا؟“

میں ہولے سے اس کا اندھا چہ تپتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

باہر اسلم موجود تھا۔ میں نے بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ خاصا سا ہوا تھا۔ مجھے فوراً اندازہ ہوا کہ معاملہ نازک تھا۔

”خیریت ہے؟“ میں نے اس کے ساتھ ساتھ نیم تاریک سی گلی میں آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ مجھے اندازہ تو تھا کہ حاجی صاحب کی واپسی کے بعد اسے بھی حالات کا علم ہو گیا ہوگا کیونکہ اسلم ان کا پرانا ملازم تھا اور ہر بات کی جان کاری اسے بھی ہوتی تھی۔

”خیریت کہاں ہے جناب!“ وہ جواباً بولا۔ ”بس آپ خود ہی چل کر سن لیجئے گا سب کچھ۔“ میں نے پرسوج انداز میں اپنے ہونٹ بیچنے لیے اور اس کے ساتھ چلتا ہوا، حاجی صاحب کی بیٹھک تک جا پہنچا تو کیا دیکھا ہوں وہ وہاں بیٹھنے سے میاں کو تلیاں دینے میں مصروف تھے۔ اختر بھی کم صدم سا بیٹھا تھا۔ ان تینوں کے علاوہ وہاں اور کوئی تھا تو وہ میں اور اسلم تھے، مجھے دیکھتے ہی حاجی کریم بخش نے مجھے بیٹھنے کو کہا۔

”مجھے اسلم سے پتا چلا تھا کہ آپ لوگ مردہ خانے گئے تھے۔ اللہ خیر کرے کہ کوئی ایسی بات ہے؟“ میں نے حاجی صاحب کی طرف دیکھ کر کہا اور آخر میں سنے میاں کے روتے ہوئے چہرے پر نظر میں مجا دیں۔

”بس بیٹا! اللہ ایسی بری کھڑی سے سب کو بجائے، کچھ مدت پوچھو، اپنے بھائی خورشید پر کیسی قیامت پڑی ہے۔“

”کچھ اندازہ تو ہو رہا ہے مجھے، خورشید بھائی پر اللہ رحم فرمائے، آخر پتا تو چلے، آپ لوگ مردہ خانے گئے تھے؟“

”ہاں نعمان بیٹا! مردہ خانے سے خورشید بھائی کو کال آئی تھی، نمبر انہی کی بیٹی ثویہ کا تھا، جو انہیں لاش سے ملا تھا، اسی سے ہی انہوں نے کال کروائی۔“

”لل۔۔۔ لاش؟“ میرا دل دھکے لگا۔

”نعمان بیٹا! ہم مردہ خانے سے ثویہ بیٹی کی لاش دیکھ کر آ رہے ہیں خدا عارت کرے نہ جانے کس بد بخت شیطان نے اس کے ساتھ ایسا گھناؤنا سلوک کیا ہے۔“

حاجی صاحب آزرہ سے لہجے میں بولے اور سنے میاں نے پھر دنا شروع کر دیا۔ ایسے میں اچانک میں نے دیکھا کہ

سنے میاں کا بیٹا یعنی بد نصیب ثویہ کا بھائی اختر وہاں سے اٹھ کر تیزی سے باہر نکل گیا شاید اس کی غیرت نے یہ گوارا نہیں کیا تھا کہ وہ اپنی جوان بہن کے بارے میں یہ سب سنے جس کی حاجی کریم بخش مجھے تفصیل سناتے والے تھے۔ انہوں نے ایک گہری اور درد کھری سی سانس خارج کر کے جو کچھ مجھے بتایا، اس کا لب لباب یہی تھا کہ ثویہ کی لاش دو روز قبل پندرہ نمبر پلر کے قریب واقع ایک خشک تالے کے قریب سے ملی تھی۔ اسے سب سے پہلے ایک کوڑا پکڑا اٹھانے والے دو مردوں نے دریافت کیا تھا اور فوراً ان قادیوں میں اطلاع دے ڈالی تھی۔ پولیس لاش کو متعلقہ تھانے لے گئی۔ وہاں سے اسے خود کشی کا کیس اور لاوارث قرار دے کر ایڈمی کے لاوارث مردہ خانے بھیج دیا گیا۔ جہاں سے سالہ کو اس کے بلاؤز کے اندر سے ایک سبیل فون ملا جو اس نے فوراً منتقم کے حوالے کر دیا سبیل فون آف تھا اسے آن کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس کی بیٹی ڈائون ہو چلی تھی۔ اس میں دوسری بیٹی ڈال کر اسے آن کیا اور اس میں کوئی ایسا نمبر تلاش کیا گیا جو اس کے کسی قریبی مزید یارشتہ دار کو ظاہر کرتا ہو۔ بالآخر آخر بیگم کے نام سے ایک نمبر ملا تو اس پر منتقمین نے اطلاع کر دی۔ سنے میاں کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کریں؟ تاہم انہوں نے سیدہ حاجی صاحب کے گھر کا رخ کیا اور انہیں ساری بات بتانے کے بعد اپنے ساتھ ایڈمی کے اس مذکورہ مردہ خانے چلنے کی استدعا کی تھی، حاجی صاحب اس مشکل کھڑی میں بھلا کب انکار کرتے، فوراً ان دونوں بد نصیب باپ بیٹوں کے ساتھ چل دیئے۔

وہاں پہنچے تو ان پر یہ لرزہ دینے والا انکشاف ہوا کہ وہ لاش لاوارث نہیں بلکہ بد نصیب ثویہ کی تھی۔ اپنی جوان بیٹی کی لاش دیکھ کر سنے میاں تو دین میں شش کھا گئے تھے، ان کے بیٹے اختر نے ہی اسے سنبھالا تھا۔ ہوش آنے کے بعد حاجی صاحب نے انہیں یہی مشورہ دیا کہ وہ اب اسی تھانے جا کر اس کی رپورٹ کروائیں تاکہ پوسٹ مارٹم کیا جاسکے۔ وہ اس پر راضی نہ تھے لیکن ایڈمی کی انتظامیہ نے اپنا فرض ادا کرتے ہوئے متعلقہ تھانے اس کی اطلاع دے ڈالی تھی کیوں کہ وہ ایسی کسی بھی صورت میں اس بات کے پابند تھے کہ جیسے ہی انہیں مردہ خانے میں پڑی کسی لاش کے وارث کا پتا چلے تو وہ فوراً متعلقہ تھانے اس کی خبر دیں۔ پولیس لاش کو پوسٹ مارٹم کرانے کی غرض سے ایک

قریبی سرکاری اسپتال لے گئی تھی۔

”خدا کے لیے حاجی صاحب! آپ لوگ کچھ سمجھیں، میری بیٹی کی لاش کو چر بھاڑ سے بجا نہیں، ہوگا کچھ نہیں، ہماری جگہ ہنسائی ہو جائے گی۔“ خورشید خاں المعروف نے مہاں نے حاجی کریم بخش کی طرف دیکھ کر منت کی تو میرا دل بھی اس کے لہجے کی بے چارگی پر دکھنے لگا۔ حاجی صاحب خود بڑے مغموں سے ہو رہے تھے۔ وہ اسے جواب دینے کی بجائے میری طرف دیکھ کر بولے۔

”نعمان بیٹا! تم ہی انہیں سمجھاؤ کہ یہ ضروری ہے، کم از کم پتا تو چلے یہ آیا کہ ہے یا خود کشی اور خود کشی کی بھی ضرورت کوئی وجہ ہوتی ہے جبکہ بد نصیب کو بیٹے تو پہلے ہی سے گمشدہ تھی۔“ میں تمہارا سوچ میں پڑ گیا اگرچہ میں بھی حاجی صاحب کی بات سے متفق ہی تھا مگر ایک قباحت تھی جس کا اظہار کرتے ہوئے میں نے کہا۔

”بات تو آپ کی درست ہی ہے حاجی صاحب! لیکن مسئلہ یہ ہے کہ پولیس بھی تو ہم سے تفتیش کرے گی اور ہم ان سے یہ بات نہیں چھپا سکتے کہ ٹوپے کچھ روز پہلے ہی سے تم بھی کیوں کہ پولیس یہی سوال کرے گی کہ ہم نے اس کی اطلاع تھانے میں کیوں نہ دی؟“

”بات تو تمہاری بھی غلط نہیں ہے۔“ حاجی صاحب پُر سوچ لہجے میں بولے اور چپ ہو رہے۔ میں نے کہا۔ ”لیکن میرے خیال میں یہ کوئی اتنا بڑا انٹوینس ہے، پولیس کو ہم کہہ سکتے ہیں کہ معاملہ بدنامی کا تھا اسی لیے پہلے ہم اپنے طور پر پُرکوش کر رہے تھے، تاہم ہمیں پولیس کو اطلاع تو دینا ہی تھی، یا پھر ہمیں اس کا پتا دیر سے لگا وغیرہ۔ لیکن اصل ایٹو یہی ہے کہ ہمیں اس بات کا کھوج لگانا چاہیے کہ آیا یہ واقعی خود کشی تھی اور اگر تھی تو اس کے پس منظر میں وہ کون سے عوامل کارفرما تھے جس کی وجہ سے ٹوپی نے خود کشی کی، اگر نہیں تو پھر یہ کیس قتل کی واردات تو نہیں جسے خود کشی کا رنگ دینے کی کوشش کی ہو۔“

میری بات پر حاجی صاحب نے تو صاف کیا تھا، مگر نے مہاں نے میری صراحت پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ بے چارہ ابھی تک اپنی پیشانی تھا سے اور سر جھکائے ٹولیدہ خاطر بیٹھا تھا۔

”کیوں بھی خورشید خاں! کیا کہتے ہو؟ ہمیں یہ تو کرنا ہی پڑے گا، اب تو ایسی ہی انتظامیہ نے بھی از خود ہی یہ معاملہ پولیس کے حوالے کر ڈالا ہے۔“

خورشید خاں پھر بھی خاموش رہا تو میں نے ہی ان کے قریب اپنی کرسی ڈرا کھکا کر ان کے کانہ سے کوہ آہستگی چھپاتے ہوئے کہا۔

”دیکھو خورشید صاحب! معاملہ اس وقت بدنامی سے زیادہ اہم مجرم تک پہنچتا ہے۔ اصل مجرم کا کیڑا کردار تک پہنچنا ضروری ہے۔ باقی انسان کی زندگی میں ایسے اتار چڑھاؤ آتے ہی ہیں جو آپ پر اور آپ کے گھروالوں پر اس وقت بیت رہی ہے اس کا ہم سب کو افسوس اور بہت ملال ہے۔“ میرے سمجھانے پر خورشید خاں نے اپنا ستا ہوا ٹمکین سا چہرہ اٹھایا اور کمروری آواز میں بولا۔

”آپ لوگ جو مناسب سمجھتے ہو وہ کرو۔“ میری تو اپنی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ کہتے ہوئے بے اختیار اس کا لہجہ رندہ گیا اور اس نے پھر اپنا سر جھکا لیا۔ ایسے میں حاجی صاحب نے میری طرف دیکھ کر مجھے ایک ہلکا اشارہ کیا، جس کا مطلب میں نے یہی سمجھا کہ اب اس موضوع کو ختم کر دینا چاہیے کیوں کہ خورشید خاں نے یہ نازک معاملہ ہمارے ہاتھ میں دے دیا تھا اور اب اس نے دی کچھ کرنا تھا جس کا ہم اسے مشورہ دیتے۔ لہذا آٹھویں دیر بعد میں اٹھ کر چلا آیا۔ میں نے ابھی ان لوگوں کو عزیر خان کے متعلق کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

رات نصف کے قریب تھی۔ محلہ سنان تھا اور گھیاں ویران۔ کوئی اکاڑا اسٹریٹ لائٹس روشن تھیں۔ گھروں کے درمیان گلی کے باہر میں روڑ پر بھی یہی کسی گاڑی کے تیزی سے گزر جانے کی آواز آ جاتی تھی اور پھر وہی اتھاہ خاموشی کا رات طاری ہو جاتا۔

چند قدموں کے فاصلے پر وہ گلی تھی جہاں میرا گھر تھا۔ میں گھر میں داخل ہوا۔ فہیم نے ہی دروازہ کھولا تھا۔ میں نے اسے آج والے اندوہناک واقعے کے بارے میں بتادیا، ہم دونوں کمرے میں ہی آ گئے تھے۔

”جیسی کرنی ویسی بھرنی۔۔۔۔۔ یہی تو وہ بد بخت تھا جو اباجان کے بھائی تھے ہی، بجائے ہمارا نام بانٹنے کے اس مردود ارشاد منٹن کی ہاں میں ہاں ملایا کرتا تھا اور ہمارے خلاف اس کا ساتھ دیتا تھا۔ ہمارے مکان کے پیچھے پڑ گیا تھا۔“ فہیم خچی سے بولا۔ ”ہمیں یہ مکان زبردستی بیچنے کے لیے کسی کسی دھمکیاں دیا کرتا تھا۔ حرام گوشت کھلاتا تھا یہ اس کے اعمالوں کی سزا ہے۔“

”نہیں فہیم! ایسا نہیں کہتے۔“ میں نے اسے سمجھایا۔

”ہر انسان خود اپنے اعمالوں کا خدا کو جواب دہ ہے۔ انسانی ہمدردی کا تقاضا یہی ہے کہ ہم مشکل میں سارے اختلافات بھلا کر ایک دہکی انسان کی مدد کریں۔“ فہیم نے خاموشی سے بات سنی اور واپس اپنے کمرے کی طرف لوٹنے لگا۔ میں نے ہولے سے اسے نکارا۔

”فہیم!“ وہ دروازے کے قریب پہنچ کر رکا، پلٹا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔

”جی بھائی جان؟“

”میں کچھ دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ عاصمہ سے تمہارا رویہ کچھ ٹھیک نہیں ہے، نہ تم اس سے کوئی بات کرتے ہو اور نہ ہی اس کی کسی بات کا جواب سیدھے منہ دیتے ہو۔“ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر تنبیہ کی سے کہا تو وہ کچھ شامی نظروں سے میری طرف دیکھ کر بولا۔

”کیا عاصمہ نے آپ سے میری کوئی شکایت کی ہے؟“

”نہیں۔“ میں نے نفی میں اپنا سر ہلایا۔ ”میں نے خود یہ بات محسوس کی ہے، اسی لیے تم سے کہا تھا۔“ میری بات پر وہ پچھلے انداز میں مسکرایا تھا۔

”میرا خیال ہے تمہیں اپنا رویہ درست کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سے پہلے کہ عاصمہ بہن مجھ سے تمہاری کوئی شکایت کرے۔“ میرے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی تمہاری سی خچی اترا جی تھی جسے فہیم نے بھی فوراً محسوس کر لیا تھا اور اس نے مجھے کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھا تھا۔ اس کے بعد خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں اسی طرح پُر سوچ انداز میں اپنے ہونٹ پیچھے کھڑا رہا۔

فہیم کے انداز سے مجھے کچھ ایسا ہی محسوس ہوا تھا جیسے اسے میری بات بری لگی ہو۔ بہر کیف میں سر جھٹک کر اپنے بستر پر آ کر دروازہ ہو گیا۔

آج کی بھگا دوڑی نے مجھے خاصا تھکا مارا تھا اسی لیے بستر پر لیٹنے ہی سو گیا تاہم صبح اپنے معمول کے وقت پر ہی جاگ گیا۔ صبح معمول مجھے عاصمہ بہن نے ہی جگایا تھا۔ میں نہما دھوکو فارغ ہوا اور ناشتے کی میز پر آ گیا۔ ماسمہ ناشتا لگا چکی تھی اور اب میرے سامنے والی کرسی پر براہمان تھی۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر ایک گردش نظر آس پاس ڈال کے اس سے فہیم کے بارے میں پوچھا۔

”کیا ہوا ابھی تک نہیں اٹھا ہے؟“

”بھائی تو اپنے وقت پر ہی جاگ گئے تھے۔“ وہ جوابی بولی۔ ”لیکن بجائے کیوں وہ آج ناشتے کی بغیر ہی آفس چلے گئے۔“

”اچھا!“ میں نے کہا۔ ”ہوسکتا ہے اسے جلدی ہو آج آفس جانے کی۔“ کہتے ہوئے میں نے کن انگیوں سے عاصمہ کی طرف دیکھا تھا۔ وہ چپ رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کا چہرہ اترا اترا سا نظر آ رہا تھا۔ ناشتا بھی وہ بڑی بے دلی کے ساتھ کر رہی تھی۔ ایک آدھ تو س کھا کر وہ چائے پینے لگی۔ میں ذرا ناشتا بھاری کیا کرتا تھا۔

ناشتا کرنے کے بعد میں اپنے لاری آؤ سے پر جانے کی تیاری کرنے لگا، گاڑی کی چابی منگوائی اور جب عاصمہ کو دروازہ بند کرنے کا کہہ کر باہر مہن میں دروازے تک آیا تو وہ بولی۔

”بھائی جان!“

”ہاں کہو؟“ میں اس کی جانب پلٹا۔ میری نظریں اس کے چہرے پر تھیں۔

وہ بولی۔ ”بھائی جان! اگر آپ کو جلدی نہ ہو تو آپ سے ایک بات کرنا تھی۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں بیٹا! کہو کیا بات ہے، مجھے کوئی جلدی نہیں ہوتی۔“

”وہ۔۔۔۔۔ پپ۔۔۔۔۔ پتا نہیں کیوں فہیم بھائی مجھ سے آج کل کچھ خفا خفا سے رہنے لگے ہیں۔“ اس نے اسی طرح جھکے جھکے سر سے کہا تو میں ڈرا چوٹا۔ میں تو جانتا ہی تھا کہ فہیم، عاصمہ سے آج کل کچھ کھینچا کھینچا سا رہنے لگا تھا۔ تاہم ہولے مسکرا کر بولا۔

”ارے! وہ کیوں تم سے نا ارض ہونے لگا؟ ایک ہی تو بہن ہے ہماری پیاری سی۔“ پریشانی لہجے میں یہ کہتے ہوئے میں نے پیار سے اس کے سر پر اپنا ہاتھ بھی رکھ دیا مگر وہ ہنوز چپ رہی تو میں نے اسے اسے دیتے ہوئے مزید کہا۔

”چلو! تم دل چھوٹا نہ کرو میں اس سے پوچھ لوں گا بلکہ کان کھینچوں گا اس کے۔۔۔۔۔ ٹھیک؟ چلو اب تمہارا مسکرا دو، تم نے تو ذرا سی بات پر اپنی گڑبادی صورت ہی اتار لی ہے۔“ میری بات پر عاصمہ بہنا نے ہولے سے مسکرا کر میری طرف دیکھا تھا۔

”شاباش! یہ ہوئی نا بات، اچھا چلتا ہوں دروازہ بند رکھنا۔“ یہ کہہ کر میں باہر آ گیا۔ میری مہراں گھر کے باہر ہی

کھڑی ہوتی تھی۔ میں ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہو گیا۔ میرا دھیان سنے میاں والے معاملے کی طرف تھا۔ میں چند ٹاپے کچھ سوچتا رہا اس کے بعد کارا اشارت کر کے آگے بڑھا دی۔

لاری اڑے پہنچا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ گیارہ بجے تک میں وہاں کے مختلف امور منتا رہا، اس کے بعد میں نے اپنے چمورکے دوسو کو کھانے بنائے کا کہا۔ اسی وقت میرے سیل فون کی تیل مشکلتی..... فون فرحانہ کا تھا۔ اس کی جوش بھری آواز ابھری۔

”نعمان صاحب! آ..... آپ اس وقت کہاں ہیں؟“ میرا مطلب ہے اگر میں ابھی آپ سے ملتا چاہوں تو کہاں ملاقات ہو سکتی ہے آپ سے؟“ میں اس کی جوش میں لرزتی آواز پر ہی نہیں بلکہ لہجے پر بھی چونکا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اسے کسی خاص بات کی بھگ لگی ہو۔ وہ صرف میرے معاملے میں ہی نہیں بلکہ اپنی ماں کے اصل قاتل کو کیلبر کردار تک پہنچانے کے لیے بھی پرمز مٹی۔ میں بولا۔

”کوئی خاص بات ہے تو بتا سکتی ہیں مجھے..... میں اس وقت اپنے کام کی جگہ پر ہوں جو آپ کی رہائش گاہ سے کافی دور ہے۔“

”نو پراہم! گاڑی میں کیا مشکل ہے، آپ کہیں بھی ہوں گے میں یہ آسانی آپ کے پاس کیج جاؤں گی۔ بات اہم ہے جو میں فون پر نہیں بتا سکتی، میرے پاس کچھ اسٹف بھی ہے آپ کو دکھانے کے لیے۔“

میں نے کچھ سوچ کر اسے یہاں کا پتا دیا۔ اس دوران دوسو چائے بنالایا۔ چائے ختم کرنے کے بعد میں اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ حضرت لعل شہباز قلندر کا عرس قریب تھا اور مجھے کم از کم سات لاریوں کا اضافی بندوبست کرنا تھا جن میں سے تین لاریاں میں نے اپنے اڑے سے اٹھادی تھیں باقی ”روٹ“ بھر گئی ہوئی تھیں جبکہ باقی چار لاریاں میں نے ٹھیکے پر اٹھائی تھیں۔ اس سلسلے میں، میں مختلف پارٹیوں سے رابطے کر رہا تھا۔ لگھوڑی کوچز تو مل رہی تھیں لیکن وہ بھی بڑی تھیں، پوں بھی اس میں اتنے لوگوں کے سامنے کی گنجائش نہیں ہوتی جبکہ عام مسافر لاریوں میں لوگوں سے کچھ بچ بھرنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں، چاچا انور شاہ نے غصہ کے ایک لاری اڑے ”اشارت“ سے بات کی تھی۔ اس نے صرف دو لاریاں

پہنچانے کا وعدہ کیا تھا، باقی دو لاریوں کا بندوبست کرنے کے لیے میں اپنی سی کوششوں میں مصروف تھا مگر ابھی تک مجھے کچھ خاص کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

دھابے جی میں بھی ایک لاری اڑا تھا مگر اس کے رابطے کے لیے میرے پاس کوئی کونٹیکٹ نمبر نہیں تھا، میں اسی کوشش میں لگا ہوا تھا۔

کافی دوڑ دوڑ چلا اور ادھر ادھر فون کھڑکانے کے بعد بالآخر میرا رابطہ گھارو کے ایک اشارت سے ہو گیا۔ اس نے تھوڑے زیادہ ریٹ پر دو لاریاں دینے کا وعدہ کر لیا۔ ان کا سونے فارغ ہوا تو اچانک میری نگاہ کھڑکی سے باہر پڑی۔ ایک نیلے رنگ کی ہینڈ اسٹی اس کی طرف کو آ رہی تھی جہاں انتظامی امور منتا نے کی یہ پتہ کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں۔ میں نے کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر فرحانہ کو بیٹھے دیکھ لیا تھا۔ اس کے چہرے پر تن گھاسز تھے اور بالوں کو غصا سے گوندھ کر پیچھے کیے ہوئے تھے۔

میں نے دوسو کو آواز دے کر اسے ”کار والی“ کو سیدھا ادھر ہی لانے کے لیے باہر بھیج دیا اور خود کرسی کی پشت گاہ سے ٹھیک لگے آرام سے بٹھار۔ تاہم خدا ندر سے میں بھی بے چینی سے سوچ رہا تھا کہ آخر فرحانہ ایسی کیا اہم خبر لائی تھی جس کا تذکرہ اس نے فون پر کرنے کی بجائے مجھ سے اتنی دور لٹے کو ترجیح دی تھی؟ مطلب صاف تھا کہ وہ ضرور کوئی اہم خبر لائی ہوگی۔

ذرا ہی دیر میں فرحانہ اندر داخل ہوئی۔ اس کے عقب میں دوسو تھا۔ فرحانہ نے گھاسز اوپر کر لیے تھے، اس کی کھلی گوری شفاف رنگت پر سیاہ رنگ کا دھوپ والا چشمہ خاصا جگ رہا تھا۔ وہ پیش قیمت سمرلان سوٹ میں تھی اپنی اسے سی کار سے ڈرا دیر کے لیے باہر نکلے ہی اسے گری لگنا شروع ہو گئی تھی۔ میرے کمرے میں روم کو کھڑا، لیکن ظاہر ہے اسے ہی کے مقابلے میں یہ روم کو کھڑا حیثیت رکھتا تھا۔

وہ مجھے دیکھتے ہی مسکرائی تھی، میں نے خیر مقدمی مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا۔ یہاں وہ پہلی ہی بار آئی تھی۔ ہائے، جیلو کے بعد وہ میرے سامنے والی کرسی پر براجمان ہو گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک خوبصورت اور تھیں قسم کا پنڈ بیک تھا۔ وہ ایک سرسری سی نگاہ اطراف میں ڈالنے کے بعد ہلکی مسکراہٹ سے بولی۔

”خاصا کلاسیکل ماحول ہے یہاں کا..... پسند آیا۔ ورنہ تو اب تک میں نے تیشوں والے وال نو وال پیچہ زاو

نجانے کیسے کیسے ڈیکور ہڈ چسو سے سجے ہوئے قلی از کنڈیشنڈ آفس ہی دیکھے تھے، ایسا خالص کلاسیکل ماحول پہلی بار دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔“

میں نہیں جانتا تھا کہ اسے واقعی یہ غریبانہ طرز کا ماحول اچھا لگا تھا وہ محض مردوایا کبہ رہی تھی۔

”شکر ہے!“ میں نے مختصراً کہا اور اس کے پُر رونق چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”کیا تیش لگی آپ؟“ ٹھنڈا.....“

”کچھ نہیں“ کہتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا پنڈ بیک اپنے سامنے میز پر رکھ دیا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر فوراً مقصد کی بات کہہ ڈالی۔

”کیا کوئی خاص بات تھی؟“ ”ہاں!“ اس نے اپنے منہ سے ایک ہکاری سے مشابہ سانس خارج کی۔ پھر اس نے اپنے بیک کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ساتھ ہی ایک اہمگی ہوئی سی نگاہ قریب کھڑے دوسو پر ڈالی۔ میں اس کا مطلب سمجھ گیا اور دوسو کو میں نے باہر جانے کا اشارہ کر دیا۔

”یہ میں آپ کو دکھانا چاہتی تھی۔“ دوسو کے کمرے سے نکلے ہی اس نے اپنے پنڈ بیک کی زپ کھول کر ایک پوسٹ کارڈ ساز کی تصویر نکال کر میری طرف بڑھائی اور ایک عجیب سی مسکراہٹ سے بولی۔

”نعمان صاحب! اس تصویر کو غور سے دیکھئے اور بتائیے مجھے پہلے کہ اس میں آپ کو کیا خاص بات نظر آ رہی ہے؟ آپ کی یادداشت کا امتحان بھی ہو جائے گا۔“ تصویر پر نظر ڈالنے سے پہلے میں نے اس کے دلکش چہرے کی طرف دیکھا تھا جو خاصا پُر جوش سا نظر آ رہا تھا۔ اس کے بعد میں نے تصویر اپنے ہاتھ میں لے کر پھر اسے دیکھنا شروع کیا۔

اس نے اپنا پنڈ بیک ہنوز کھولے رکھا تھا، انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ اس کے اندر سے اور بھی کچھ نکالنا چاہتی ہو۔ بہر کیف میں تصویر کو بغور دیکھنے لگا۔

یہ زمین تصویر تھی اور کسی پارٹی میں کھینچی ہوئی گنتی تھی کیوں کہ اس میں آس پاس کا ماحول کچھ ایسا ہی نظر آتا تھا۔ تصویر میں چار افراد نظر آ رہے تھے۔ ان میں ایک تو فرحانہ کا باپ رانا بشیر تھا جبکہ دوسری ایک خاتون باقی دو آدمی تھے۔ ایک تو رانا بشیر کی عمر کا تھا جبکہ دوسرا نسبتاً جوان ہی نظر آتا تھا۔ ماسوائے رانا بشیر کے باقی تینوں افراد بہ شمول خاتون،

میرے لیے اجنبی تھے۔ البتہ یہ تینوں افراد مجھے ایک ہی خاندان سے متعلق لگتے تھے یعنی باپ بیٹا اور ماں تاہم پھر بھی میں ان کو بغور دیکھنے اور پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر مجھے یاد نہیں آ سکا تھا کہ میں نے ان مذکورہ تین افراد کو پہلے کبھی دیکھا ہو۔ بالآخر میں نے سامنے بیٹھی فرحانہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ جس کی نگاہیں بہ دستور میرے ہی چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”میں سوائے آپ کے چپا کے کسی کو نہیں پہچان پارہا۔“

”آپ ان تین افراد کو پہچان بھی کیسے سکتے ہیں؟ کیوں کہ آپ نے پہلے ہی ان افراد کو دیکھا ہی کب ہے؟“ اس نے کہا اور میں اس کی بات پر چونکے بغیر نہیں رہ سکا کیوں کہ میں یہی سمجھا تھا کہ اس نے یہ تصویر مجھے اسی لیے دکھائی تھی تاکہ میں ان تینوں افراد کو پہچاننے کی کوشش کروں جو میرے لیے بالکل اجنبی تھے مگر اب اس کی یہ بات سن کر کہ اس نے یہ تصویر تو مجھے کسی اور مقصد کے لیے دکھائی تھی، میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

”اس تصویر میں، میں آپ کو کچھ اور چیز دکھانا چاہ رہی ہوں، اب یہ سوچ کر ایک بار پھر اس تصویر کو غور سے دیکھیں۔“ وہ مجھ سے دوبارہ بولی۔

میں نے قدرے اہمگی ہوئی نظروں سے ایک ذرا اس کی طرف دیکھا اور پھر دوبارہ تصویر پر نظر س جمادیں۔ اب میں ان میں موجود ایک فرد کو غور سے دیکھنے لگا۔ یہ تینوں فل کوٹ سوٹ میں تھے، خاتون بھی ایجنڈ تھیں۔ جس نے پیش قیمت ساز میز پر رکھی تھی۔ اب میں ان کے لباس تک کو بھی بڑے انتہاک سے محو رہا تھا میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر فرحانہ مجھے اس تصویر میں ایسی کیا شے دکھانا چاہ رہی تھی، جب کہ اُسے بھی معلوم تھا کہ اس کے باپ کے علاوہ میرے لیے باقی تین افراد پر براجمانی بھی تھی؟

ایسے ہی وقت میں جب میں بارمان کر تصویر فرحانہ کے حوالے کرنے کا ارادہ کر رہا تھا تو اچانک میری نگاہ نسبتاً جوان نظر آنے والے شخص کی ٹائی پر پڑی اور جیسے مجھے ایک جھٹکا لگا، میری آنکھیں پھیل گئیں، میں نے تصویر کو ایک دم اپنی پچھلی پچھلی آنکھوں کے بالکل قریب کر لیا۔ میری نظریں مذکورہ آدمی کی ٹائی پر جم کر رہ گئی تھیں۔

”اس تصویر میں، جو اہم اور چونکا دینے والی شے میں چھپیں دکھانا چاہتی تھی، وہ شاید تم نے دیکھ لی ہے۔“ معا

میری ساتھوں میں فرحانہ کی آواز ابھری۔

”ہی..... تو وہی ٹائی پن ہے۔“ میرے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا۔

”ہاں! بالکل وہی ہے۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے دوبارہ اپنے بیک میں ہاتھ ڈالا۔

”لو! دیکھو.....“ اس نے اپنے بیک سے وہی ٹائی پن نکال کر میری طرف بڑھا لی۔ وہی ٹائی پن بھی جو رفعت خانم کے قتل کے کچھ عرصے بعد اس کے شوہر رانا بشیر کو اس کی اپنی اسٹڈی روم میں لگی تھی۔

میں نے فوراً اس کے ہاتھ سے وہ ٹائی پن لی جو ساتھ ہی لے آئی تھی۔ میں نے وہ ٹائی پن تصویر کے ذرا قریب کرتے ہوئے اس نوجوان کی ٹائی پن کے ساتھ کر کے دیکھی۔

”پن یہی ہے۔“ وہ بولی۔ ”میں نے اس تصویر کو اپنے اسمارٹ فون کے ویڈیو میں ڈال کر اور اتاراج کر کے دیکھا ہے۔“ کہتے ہوئے اس نے مجھے اپنا لبا چوڑا اسمارٹ فون آگے کر کے دکھایا۔ اس میں وہ ٹائی پن سامنے تھی، میں نے سبل لے کر ہاتھ میں پکڑی ٹائی پن کو نیچے کیا تو دمک رہ گیا اور فطرتاً جوش سے بولا۔

”صد فیصد یہی ہے وہ ٹائی پن..... اس کا مطلب ہے یہی وہ پراسرار شخص تھا جسے تمہاری متولہ مرحومہ ماں نے اپنے گھر میں دیکھا تھا۔“

”آف کورس۔“ وہ بھی جوش سے اپنے سر کو اثبات میں ہلاتے ہوئے بولی۔

”کیا تم انہیں پہچانتی ہو؟ کون ہیں یہ لوگ اور کہاں رہتے ہیں؟“ میں نے فوراً پوچھا۔

”میں تو نہیں پہچانتی لیکن پاپا ضرور پہچانتے ہوں گے۔“

”آپ کو تو پہلی فرصت میں ان سے پوچھنا چاہیے تھا۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”ویسے یہ تصویر آپ کو ملی کہاں سے؟“ ذہن میں اچانک ابھرنے والے اس سوال پر میں نے فوراً پوچھ لیا۔ وہ جوابا اپنے بالوں میں اٹکے ہوئے سن گلاسز کو اتار کے میز پر اپنے بیک کے قریب رکھتے ہوئے بولی۔ ”اوہ ویسلی! میں یہی کرنا چاہتی تھی لیکن پاپا کل صبح سے اپنے ایک ضروری بزنس ٹرپ پر آؤٹ آف تھی ہیں۔ آج رات کو ہی ان کی واپسی

ہوگی۔“ اتنا کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکی اور پھر میرے دوسرے سوال کا جواب دیتے ہوئے آگے بولی۔

”درحقیقت کل رات میں اکیلی گھر پر بور بور ہی تھی۔ اگرچہ میری کچھ سہیلیاں بھی آئی ہوئی تھیں مگر وہ کب تک میرے ساتھ رہیں؟ شام تک وہ لوٹ گئیں، اکیلی ہوتے ہی ماما کی یادیں مجھ پر پلٹنا کرنے لگیں تو میں سوچنے لگی آخر میری ماما کا قاتل کون ہو سکتا ہے؟ اور اس نے کیوں ان کی جان لی؟ ویسے بھی دن بے دن میرے اندر یہ خواہش بلکہ ایک عزم شدت کے ساتھ جڑ پکڑتا جا رہا تھا کہ کاش! کچھ ایسا ہو جائے، کوئی ایسا کلیو مجھے مل جائے کہ جس سے ماما کا قاتل بے نقاب ہو کر اپنے انجام کو پہنچے، پھر اچانک مجھے اس ٹائی پن کا خیال آیا۔ میں اُسے یہ غور دیکھ کر یہ سوچنے لگی کہ یہ اس نامعلوم اور اصل قاتل تک پہنچنے کے لیے ایک اہم کلیو ہو سکتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ اس کا کونج کس طرح لگایا جائے؟ اس بارے میں تو اکثر اور بہت بار میں نے اپنا دماغ لڑایا بھی، بالآخر کل رات شاید میں کچھ زیادہ ہی تنہائی محسوس کر رہی تھی اسی لیے..... میرے پاس سوچنے اور ذہن پر زور دینے کا زیادہ وقت بھی تھا تب ہی میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ابھرا کہ قاتل جو بھی تھا وہ یقیناً پاپا کا کوئی دوست نہ دشمن بھی ہو سکتا ہے کیوں نہ پاپا کی اہم دیکھی جائے۔ میں نے پاپا کی ڈیجر ساری تصاویر قانون پر پھیلا دیں، مجھ پر ایک جنون سا سوار ہو گیا میں ساری رات، حتیٰ کہ فجر تک پاپا کی مختلف تصاویر کو بڑے غور سے دیکھتی رہی بالآخر یہ تصویر مجھے ملی تو جیسے میری رات بھر کی تلاش بسیار کی منت وصول ہو گئی۔“

وہ اتنی صراحت دینے کے بعد خاموش ہوئی تو میں نے اس کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔

”تو کیا آپ نے ان تینوں افراد کی اور بھی تصاویر تلاش کی کوشش چاہی تھی؟“

”ہاں!“ اس نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔ ”لیکن..... ان تینوں افراد کی حریف کوئی تصویر مجھے نہ مل سکی۔“ اس نے جواب دیا۔ میں ہونٹ پیچھے کچھ سوچتا ہوا گیا وہ میری طرف دیکھ کر اُمید میرے لیے میں بولی۔

”تمہارا صاحب! آپ کیا کہتے ہیں؟ کیا ہم اب قاتل کے قریب پہنچ سکتے ہیں؟“

”یتیم! ہمارے ہاتھ ایک اہم کلیو تو پہلے ہی سے لگ چکا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن..... اس کی کونج باقی

تھی، اب وہ بھی سمجھو مکمل ہونے والی ہے۔ تاہم ابھی ہم یہ دیکھیں گے کہ تمہارے پاپا اس تصویر کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔“ پھر اچانک ہی میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کودا، میں نے کچھ سوچ کر اس سے پوچھا۔

”کیا آپ نے ابھی تک اپنے پاپا کو اس تصویر کے بارے میں بتایا ہے؟ میرا مطلب ہے فون وغیرہ پر آپ نے اس کا تذکرہ کیا ہے ان سے؟“

”نہیں، ابھی تک تو نہیں کیا لیکن ارادہ تو کیے ہوئے تھی۔“ اس نے جواب دیا۔

”ابھی آپ ان سے ایسی کوئی بات نہ کریں۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں، یہ موضوع آپ ان سے تب ہی چھیڑیں جب میں اور ایڈووکیٹ زبیرہ بھی وہاں، یعنی آپ کے گھر موجود ہوں۔“

میری بات پر وہ کچھ اُمید آئیں امیر سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی اور پھر اسی لمحے میں بولی۔

”اس کی وجہ پوچھ سکتی ہوں؟“

”کچھ خاص نہیں۔“ میں نے پہلو تہی کرنا چاہی تو وہ بے اختیار ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ”تمہیک ہے جیسے آپ کی مرضی لیکن..... پاپا، مجھ سے یہ ضرور سوال کریں گے کہ انہیں پہلے کیوں نہیں بتایا؟“

”اس کا آسان مل ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آپ جس وقت اپنے پاپا سے اس تصویر کا ذکر کریں گی تو مجھے اس سے تعویذی دیر پہلے ہی مطلع کر دینے کا تب تک آپ اس تصویر کو تلاش کے بہانے ہمارے پہنچنے تک تاخیر کر سکتی ہیں۔ اپنے پاپا کو یہ ضرور بتا دینے کا کہ آپ نے ہم سے بھی فون پر اس تصویر کا ذکر کیا ہے اور اسی وقت تبادلہ خیال کے لیے ہمیں بلایا بھی ہے۔“

”کچھ عجیب سی ہی لگ رہی ہے آپ کی یہ بات مجھے.....“ وہ گونگو سے لمحے میں میری طرف دیکھ کر بولی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”آپ کو عجیب لگ رہی ہے، لیکن..... اتنی ہے نہیں۔“

اس نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے میرے چہرے پر ایک عجیب سی نگاہ ڈالی۔ کچھ دیر پہلے اس کا جوش اور ایک خوشی کی تمازت سے کھلا کھلا چہرہ اب مجھے یک دم بے رونق سا دکھائی دینے لگا تھا۔ شاید وہ میری بات کی جہ تک نہیں تو کم از کم اس کا ”مطلب“ ضرور سمجھ گئی تھی۔

مگر..... مجھے بھی اس کی چنداں پروا نہ تھی کہ وہ میری بات کا کیا مطلب لیتی ہے اور اس کا برا سامنا ہی ہے۔ بالآخر وہ کرسی سے اٹھ کر رخصت ہونے کی غرض سے بولی۔

”ٹھیک ہے، جیسا آپ سمجھیں، میں اب چلوں گی۔“ اس بار اخلاقیات میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ایک چوری آخری نگاہ میرے چہرے پر ڈال کر چلی گئی۔

میں دوبارہ اپنی کرسی پر براجمان ہو گیا۔

وہ میری اس بات کا مطلب سمجھ تو گئی تھی کہ میرا اور زبیرہ کا اس طرح اس کی رہائش گاہ پر آنا ”چشمعی“ رکھتا تھا لیکن میرے خیال میں یہ از بس ضروری تھا کیوں کہ پولیس کی طرح میں بھی سب سے پہلا شبہ گھر کے فرد پر ہی کرتا تھا اور میری نظر رانا بشیر پر بھی تھی۔ اگرچہ اس سلسلے میں پہلے بھی میرے اور فرحانہ کے درمیان تعویذی سی فون پہلی تھی مگر بات کسی تاراسکی کے بغیر ختم ہو جاتی تھی۔ یوں بھی مجھے اس کی تاراسکی کی بجائے پروا تھی۔

درحقیقت میں رفعت خانم مرزا کیس سے متعلق کسی بھی رونا ہونے والے یا اس سلسلے میں کسی نئی پیش رفت پر سب سے پہلے فرحانہ کے باپ رانا بشیر کے تاثرات کا یہ غور جائزہ لینے کا خواہ ضرور رہتا تھا اور یہی بات فرحانہ کو نیچے لگتی تھی مگر مجھ سے اس بارے میں وہ کچھ زیادہ احتجاج یا اختلاف رکھنے کی جرأت نہیں کرتی تھی۔

بہر کیف..... میرے لیے یہ نئی اطلاع خاصی اُمید افزا اور سنسنی خیز تھی۔ میں نے اسی وقت زبیرہ کو فون کر کے اس کے بارے میں مطلع کر ڈالا۔ اُس کے لیے بھی یہ خبر خاصی چونکا دینے والی تھی۔ تاہم اس نے آج شام میرے ساتھ رانا بشیر کی رہائش گاہ پر جانے کی معذرت کر لی تھی۔ وہ آج رات تک کسی اہم کیس کے سلسلے میں مصروف تھی۔ اس کے پاس میرے لیے ابھی کوئی خاص خبر نہ تھی کہ عارف محمد کے سلسلے میں کیا ہوا تھا؟ وغیرہ۔

میں پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ تعویذی دیر گزری تھی کہ باہر موٹر بائیک کے رکنے کی آواز ابھری۔ میں نے گردن گھما کر کھڑکی سے باہر جھانکا اور چونک پڑا۔ سدو بھائی آیا تھا اور اپنی بائیک کو سائینڈ اسٹینڈ پر پکڑی کر کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ شاید مزیر خان کے سلسلے میں کوئی خبر لایا تھا۔ میں بے چینی سے اس کے اندر داخل ہونے کا منتظر رہا۔ اگلے ہی لمحے وہ دروازے پر تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر ہولے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش

ماہنامہ سرگزشت

دوران وہ والا گودام نہیں کھولا گیا لیکن میں ایک موقع پا کر اورتالے کی چابی حاصل کر کے اندر پہنچ گیا، جہاں وہی ٹرک کنٹینر سمیت کھڑا تھا۔ اس کا دروازہ بھی لاک تھا۔ میں ناکام واپس لوٹ آیا اور سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ ان گوداموں کا مالک رازق خان میرا محسن تھا، وہ ایک نیک شریف اور پرہیزگار غریب پرورد آدمی تھا۔ میں نے اسے ساری بات بتادی۔ اس نے میرا نام رازق میں رکھتے ہوئے وہ گودام کھلوا دیا تو چلتا چلا کہ اس ٹرک میں نشیات تھی۔ اس میں چرس، بھنگ اور ہیروئن پائے والے بیکٹرز اور انجم کی پٹیاں لدی ہوئی تھیں۔ بے چارے رازق خان جیسے شریف آدمی کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ سادہ مزاج اور شریف انسان تھا، اس نے پولیس کو مطلع کرنا چاہا تو میں نے اسے منع کر دیا کہ کسی اور گڈاؤں کپڑا صاف مگر جائیں گے اور الٹا آپ چس جاسیں گے اور لاڈلہ سائیں جیسے نشیات فروش کنسلٹر سے بھی دشمنی مول لیں گے، لہذا بہتر یہی ہے کہ کسی کو بتائے بغیر ایک دن اور گزر جائے دیں جب تک یہ ٹرک یہاں سے نکال نہ لیا جائے۔ اس کے بعد آپ دشمنی پیار دلال اور قاسم بھائی کو نوکری سے بغیر کوئی وجہ بتائے فارغ کر دیں۔

رازق خاں کو میری یہ تجویز اچھی لگی، اس نے ایسا ہی کیا مگر اس کے بعد اس کا دل اس کا رو بار سے خراب ہو گیا اور اس نے اپنا گودام بیچنے کا فیصلہ کر لیا مگر مجھے اس نے نہیں چھوڑا اور کہا کہ وہ مغرب ڈرائی فروٹ سپلائی کرنے کا کاروبار شروع کرنے والا ہے لیکن تب تک میں کہاں جاتا، اس دوران آپ کے چاچا انور شاہ وہاں آئے اور رازق خان نے میرے بارے میں انہیں بتایا اور یوں وہ مجھے یہاں آپ کے پاس لے آئے۔ وہ اتنا بتا کر خاموش ہو گیا۔

میں یک تک اس کے چہرے کی طرف دیکھتا جا رہا تھا۔ میں اب تک یہی سمجھتا تھا کہ یہ یہ ظاہر اول جلول سا نظر آنے والا سدو بھائی..... مجھ پر اپنی تمام تر عادات و نفسیات سمیت مکمل چپکا ہے مگر اس کی باتیں سن کر مجھے لگا کہ یہ تو ابھی "ہنزو دلی دوراست" والی بات تھی۔ "چھپا رستم" والی مثال، شاید ایسے ہی لوگوں کے لیے مستعمل ہوتی تھی۔ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جمائے رکھتے ہوئے کہا۔ "اب سلسلہ کلام وہیں جوڑ دو جہاں سے تم مجھے عزیز خان اور اس کے دونوں دوستوں کے بارے میں

بتا رہے تھے۔"

"عزیز خان کی رہنمائی کرنے کے دوران..... اس نے آگے لہا، شرع کیا۔"

"مجھے ان کے فائٹ پر یہی شخص نظر آیا تھا۔ ان کے اپارٹمنٹ میں مگر کب باتیں سننا میرے لیے ناممکن تھا کیوں کہ وہاں صرف چار فلور پر میزبان کے علاوہ چھ اپارٹمنٹ تھے اور نیچے گیٹ پر انٹر لاک تھا، جس کے پاس چابی ہوتی تھی وہی اوپر جاسکتا تھا، نیز ایک چوکیدار بھی وہاں تعینات تھا۔ مطلوبہ اپارٹمنٹ دوسری منزل پر تھا۔"

میں وہیں کہیں قریب ہی کھڑا ہو کر ان کے اترنے کا انتظار کرتا رہا۔ آخر گجک بھنگ دو گھنٹوں بعد وہ شخص، یعنی لاڈلہ سائیں نیچے اتر آئے تو اس کے ہمراہ عزیز خان اور شاہنواز بھی تھے۔ لاڈلہ سائیں اپنی اسی سفید جپ میں آیا تھا وہ اس میں سوار ہو گیا جبکہ عزیز خان اور شاہنواز ایک سیاہ رنگ کی ہنڈا سٹی میں سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ میں نے اپنی بائیک ان کے پیچھے لگا دی اور مختصر دوری کے ساتھ ان کا تعاقب کرتا رہا، کئی بار ایسا ہوا کہ تیز رفتاری کے باعث دونوں گاڑیاں نظروں سے اوجھل بھی ہوئیں لیکن ٹریفک کے رش اور کچھ میری چابک دستی کے باعث میں ان دونوں گاڑیوں کو پھر سے چالیتا، اسی طرح یہ تعاقب کا کھیل کوئی گھنٹا پون جاری رہا اس کے بعد یہ لوگ مغورا چورنگی کو کراس کرتے ہوئے اولڈ ریس کورس گراؤنڈ کے سامنے واقع ایک متول رہائشی علاقے میں داخل ہو گئے، جس کے داخلی راستے پر ایک بڑے سے بورڈ پر "گلشن عمیر" درج تھا۔

یہاں ایک منزل اور دو منزلہ بنگلوں بنے ہوئے تھے۔ وہاں سینکڑوں کے ایک بچکے کے گیٹ کے باہر ہی یہ دونوں... گاڑیاں کھڑی ہوئیں۔ یہ شام کا وقت تھا۔ اپارٹمنٹ یا فلیٹ کے مقابلے میں کسی بچکے یا گھر میں داخل ہونا آسان ہوتا ہے مگر یہاں بھی یہ شے مجھے ناممکن ہی نظر آ رہی تھی ایک تو بچکے کے گیٹ پر سب گارڈ موجود تھا۔ دوسرے یہ ایک بڑا سا سیسٹن نسل کا کتا بھی وہاں ٹہل رہا تھا۔ تیسرے یہ کہ میں نقب زنی کا کوئی ایسا خاطر خواہ بندوبست بھی کر کے نہیں آیا تھا، تاہم میں نے وہ بگناہرو وغیرہ ذہن نشین کر لیا تھا۔ اس کے بعد میں واپس لوٹ آیا۔"

یہاں تک بتا کر اس نے اپنی بات ختم کر دی۔ میں مرسوچ انداز میں ہونٹ پیچھے کچھ چھپاتا رہا۔ نشیات سے بھرا ٹرک، لاڈلہ سائیں کا عزیز خان سے ملے جوڑ، ہمارے اڈے

میں گڈز کا ٹھکانا حاصل کرنا۔ یہ سب مجھے ایک سوچی سمجھی منصوبہ سازی محسوس ہونے لگی تھی۔ اگر ایسا تھا جیسا کہ میں سدو بھائی کی رہنمائی کی تفصیل سننے کے بعد بہت سی باتوں کا اندازہ قائم کر رہا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ میں نے بروقت لینڈ مافیا کے دو بڑے ڈان یعنی حاجی مہران خان اور بندر سیٹھ ستار کے اہم ممبروں کی دم پر پاؤں رکھ دیا تھا کیوں کہ عزیز خان حاجی مہران کا لاڈلہ بیٹا تھا جبکہ لاڈلہ سائیں سیٹھ ستار کا دست راست۔

اس کے بعد میں نے سدو بھائی کی توصیف کرنا ضروری سمجھتے ہوئے اسے نئی ہدایت دی۔

"تم نے بہت اچھا کام کیا، اسی طرح اپنا کام جاری رکھو اور لاڈلہ سائیں سے زیادہ صرف عزیز خان پر کڑی نظر رکھو..... مجھے لگتا ہے کہ عزیز خان اور لاڈلہ سائیں کا آپس میں کوئی ملے جوڑ ہے اور عزیز خان کے دونوں دوست شاہنواز اور بشیر خان بھی اسی کے زیر اثر ہیں۔

"جی ہاں سر!" وہ بولا۔ "رازق خان کے گودام سے ناکامی کے بعد لاڈلہ سائیں یقیناً اب اپنے نشیات کے کاروبار کے سلسلے میں ان نوجوانوں کو استعمال کر رہا ہوگا۔" اس کی بات پر میں نے بالآخر اسے بتا دیا کہ ہم عزیز خان اور اس کے مذکورہ دونوں دوستوں کو اپنے لاری اڈے میں گڈز قائم کرنے کا ٹھیکہ بھی دے چکے ہیں۔ یہ سن کر سدو بھائی کے چہرے پر حیرت و فکر کے آثار ابھرے۔ اسی لمحے میں بولا۔

"اچھا سر! تو اس کا پھر صاف مطلب ہے کہ وہ گڈز کی آڑ میں اپنا نشیات فروشی کا دھندا کرنا چاہتا ہے، یہ آپ کے لیے بہت خطرناک ہوگا سر! انہیں فوراً اپنے اڈے سے بے دخل کر کے ڈیل کینسل کر دیں سر!"

"کرنا تو جی پڑے گا، مگر ابھی نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں ابھی یہ دیکھنا چاہوں گا کہ اس کا لے دھندے میں میرے دشمنوں کی فہرست میں اور کون کون لوگ شامل ہیں، اس کے بعد ہی میں کوئی ایسا لائحہ عمل ترتیب دوں گا کہ ہم پر بھی بات نہ آئے اور دشمن قانون کے شکنجے کی گرفت میں آجائیں۔"

میں نے تھوڑی دیر بعد سدو بھائی کو کچھ مزید نئی ہدایات دے کر رخصت کر دیا۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ سدو بھائی کی اطلاعات میرے لیے بڑی کارآمد تھیں لیکن میں جس چیز کا سراغ لگا

چاہتا تھا وہ ابھی تک نہیں لگ سکا تھا، یعنی ٹوپیہ اور عزیز خان کے درمیان کس قسم کے تعلقات تھے؟ نیز بد نصیب ٹوپیہ کے مرنے یا خودکشی کے پیچھے کن لوگوں کا ہاتھ تھا اور عزیز خان کس حد تک ٹوپیہ کی بد قسمتی میں شامل تھا۔

ٹوپیہ کی لاش پولیس کے سپرد کر دی گئی تھی اور اب نجانے پوسٹ مارٹم کی کیا رپورٹ آئی تھی۔ اس سلسلے میں حاجی صاحب اور سنے میاں اپنی ہی ہماگ دوڑ اور کوششوں میں مصروف تھے جبکہ میں نے ابھی کئی مناسب وقت کے انتظار میں حاجی صاحب اور سنے میاں کو یہ حقیقت نہیں بتائی تھی کہ اختر نے اپنی بہن ٹوپیہ کو جس شخص (عزیز خان) کے ساتھ دیکھا تھا اس کا میں پتا لگا چکا ہوں۔

سدو بھائی کو گئے ہوئے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی ہوگی کہ راجا جک میں نے بائیک کی گھون گھون کرتی آواز سنی، ایسا لگا جیسے کوئی بائیک سوار بڑی جلدت میں یہاں آیا ہے۔ میں یہی سمجھا شاید سدو بھائی دوبارہ آگیا ہے مگر جب میں نے کھڑکی کے باہر جھانکا تو بری طرح ٹھٹھ گیا۔ وہ کاٹا تھا اور خاصا کھیرا ہوا لگتا تھا۔ وہ سیدھا میرے کمرے میں گھس چلا آیا تھا۔

"اے لے جگری! چل اٹھ میرے ساتھ چلنا ہے تجھے۔" وہ اندر آتے ہی مجھ سے بولا۔ میں جب تک اس کے استقبال کے لیے اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ "یار خیریت تو ہے..... کہاں لے جانا چاہتا ہے ٹو مجھے؟ کچھ بتا تو سہی۔" میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا، خود میرا ناول بھی تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔

اس نے ادھر ادھر دیکھا، پھر میرے کمرے میں کسی کو موجود نہ پا کر قریب آکر بولا۔

"تیری ضمانت منسوخ ہو گئی ہے اور وہ غیبت ایس ایچ او..... راجا دلاور کسی بھی وقت تجھے گرفتار کرنے کے لیے یہاں آسکتا ہے۔" اس نے مجھے ایک پریشان کن اطلاع دی۔ میری پیشانی پر سولہاں اجمرا آئیں، مگر مجھے اس کا اندازہ تھا کیوں کہ راجا دلاور نے مجھے یہی دھمکی دی تھی مگر مجھے نہیں پتا تھا کہ یہ سب اتنی جلدی ہو جائے گا۔

"اے لے جگری! تو سوچ میں پڑ گیا؟ چل میرے ساتھ۔" وہ مجھے سوچتا پا کر بولا۔

"یار! مجھے اپنے وکیل سے تو بات کر لینے دے۔"

میں نے کہا۔

"اس وقت کوئی وکیل تیرے کام نہیں آسکتا جگری!

ٹوہکتا کیوں نہیں۔“ وہ بولا۔

”اس بار تیرے خلاف دشمنوں کے تہر بڑے خطر ناک ہیں۔ سوچ ذرا..... راجا دلدار کا دوبارہ اپنی نوکری پر بحال ہونا اور دشمنی وادون خان کے سرور کیس کے اہم گواہ کا خاتمہ اور اب تیری ضمانت کی منسوخی اور گرفتاری کے احکامات..... کیا مطلب ہے اس کا اور..... تیرے ساتھ بھی عارف چمندر والا حشر کرنا چاہتے ہیں۔ دیر مت کر میرے یار! ابھی چل میرے ساتھ، بعد میں بے شک اپنی وکیلہ سے مشورہ کر لینا۔ ابھی تیرا پولیس کے ہتھے چڑھنا انتہائی خطرناک ہو سکتا ہے۔“

وہ میرا اشارہ سمجھ گیا تھا، اسی لیے اس نے ایڈووکیٹ زنیہ کا بھی تذکرہ کر ڈالا تھا۔ میں نے جلدی اپنا کچھ ضروری سامان سمیٹا اور اس کے ساتھ ہو لیا۔

اس نے مجھے اپنی بایک کے پیچھے بٹھایا اور طوفانی رفتار سے گیٹ کی طرف بایک دوڑاتا چلا گیا، ابھی ہم گیٹ کراس کر کے باہر کی طرف لپٹے ہی تھے کہ اچانک ایک پولیس موہاںل سامنے سے آئی دکھائی دی جس کے ڈرائیونگ سیمین میں مجھے ڈرائیونر کے برابر والی سیٹ پر ایس ایچ او راجا دلدار بڑے فیسے کے ساتھ براجمان دکھائی دے گیا تھا۔

”ابے لے.....“ کالیا کے منہ سے بے اختیار نکلا اور اس نے اپنی بایک کا انکیسی لیٹر پورا ٹھکرا دیا۔ متروک باؤل کی طاقت ورجن والی جی ٹو اودون ٹو فائیک کی وحشی ساخت کی طرح غرائی اور اس کا اگلا تارو پر کواٹھا۔ میں پیچھے کرتے کرتے بھا اور خود کو سنبھالا۔ کالیا نے تیزی سے سامنے آئی پولیس موہاںل کا راستہ کاٹا اور ایک زوردار زانے سے اس کے قریب سے گزرتا چلا گیا۔ ٹھیک اسی وقت مجھے عقب سے پولیس سائرن کے بنگارنے کی آواز سنائی دی اور میں نے ذرا اپنی گردن موڑ کر پیچھے دیکھا تو پولیس موہاںل کور پورس ہو کر اپنے قناتب میں آتے دیکھا۔

”پولیس موہاںل ہمارے پیچھے لگ چکی ہے۔“ میں نے بایک کے طوفانی شور میں کالیا کو خبر کی۔

”بے غم ہو جا بھری! یہ ہمارے سامنے کو بھی نہیں چھو سکتے، بس تو مجھے ٹائٹ پکڑا رکھ۔“ وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا اور بتدریج بایک کی رفتار بڑھاتا چلا گیا مگر بایک کی رفتار سے زیادہ میرا دماغ تیزی کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ ان گفت پریشان کن سوچوں کا ایک جال سا مجھ پر آن پڑا تھا۔

میرے دمن کس قدر چالاک اور شاطر تھے، خود سحر عام پر آنے کی بجائے پروردہ رہتے ہوئے محض اپنی دولت اور اثر ورسوخ کے بل بوتے پر مجھ پر ایک کے بعد ایک وار کیے چلے جا رہے تھے۔ لاری اڈے کی زمین خالی کرنے کی ایک بڑی سازش میں نے ان کی بری طرح ناکام بنادی تھی، جسے سینٹھ ستاروں نے پونے داسوں خرید کر کوئی پلازا بنانے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔

کالیا بایک سواری کا ماہر تھا، ہل کے ہل وہ پولیس موہاںل کی بھاری گاڑی کو جمل دے کر تنگی میں سے گزرتا ہوا، میں شاہراہ پر آ گیا۔ یہاں سے اس نے کورنگی انٹر سٹریل ایریا کا رخ کیا۔ نصف گھنٹے میں وہ ایک نیم رہائشی کالونی میں داخل ہوا اور ایک کشادہ سے مکان کے سامنے بایک کھڑی کر دی۔ بایک کے شور کی آواز سے نجات ملی تو پتا چلا میرے سبل فون پر کسی کی کال آ رہی تھی جو نجانے کب سے جی چلی جا رہی تھی کیوں کہ جب تک میں نے سبل جبب سے نکالا، بتل بجا بند ہو چکی تھی۔ میں نے اسکرین پر دیکھا تو زنیہ کی ہانچ چومڑ کالیں آ چکی تھیں۔

مجھے کچھ اندازہ نہ تھا کہ وہ مجھے کیوں کالیں کر رہی ہوگی مگر میں نے ابھی اس سے رابطہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

کالیا بایک سے اترا اور میرے ساتھ مکان کے دروازے پر آیا۔ وہ دروازے پر زور زور سے دستک دینے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں جیل لڑکے نے دروازہ کھولا تھا میں اُسے دیکھ کر پہچان گیا تھا یہ اس کا ساتھی ہی تھا۔ کالیا کے بیشتر ساتھی میرے بھی دیکھے بھالے تھے مگر ابھی تک میں ان کے ناموں کو ذہن نشین نہیں کر پایا تھا۔ کالیا مجھے لیے غراب سے اندر داخل ہوا تھا۔ محن دھوپ کی شدت سے جمل رہا تھا۔ وہ مجھے ایک کمرے میں لے آیا۔ یہاں اسے سی لگا ہوا تھا۔ یہی کمرنگی اینٹوں کا یہ مکان اندر سے بھی خاصا آرام دہ معلوم ہوتا تھا۔ یہاں مجھے چار پانچ افراد نظر آئے، باقی تو میری اور کالیا ہی کی عمر کے تھے جبکہ ایک شخص ذرا بچی عمر کا تھا اور خاصا صحت مند نظر آتا تھا۔ اس کا قد ٹھکان اور رنگت خاستری تھی۔ وہ سفید رنگ کے شلوار کرتے میں سبلوس تھا۔ منہ میں پان تھا۔ آنکھیں موٹی تھیں۔ وہ ایک صوفے کی پشت گاہ سے ٹیک لگے سبل فون پر کسی سے باتیں کرنے میں مصروف تھا۔ ہم پر نگاہ اس کی پڑی تو اس نے میری طرف دیکھ کر ہلے لے اپنے سر کو اٹھائی جنبش دیتے ہوئے اپنے ایک ہاتھ سے ہمیں قریب ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو

کالیا نے مجھے ہولے سے ٹھوکا دیا۔ میں خاموشی سے بیٹھ گیا اور دروازہ پر نظر دے کر دو پیش کا بھی جائزہ لینے لگا۔ وہاں موجود چار پانچ لڑکوں میں سے دو تین میرے جان پہچان کے تھے جو میری طرف دیکھ کر ہولے سے اشارہ سکرانے بھی تھے ان میں سے کچھ کے ہاتھ میں ٹی ٹی پستولیں بھی ہوئی تھیں اور وہ خواہ مخواہ ہی ان کے کلب چپک کر رہے تھے۔ پھر ان میں سے تین کسی اندرونی گونے میں کھٹنے والے دروازے کی طرف جا کر غائب ہو گئے۔ باقی دو وہیں دو کرسیوں پر بیٹھے رہے۔ میری نظر جب سامنے بیٹھے، فون پر باتیں کرتے ہوئے اس بھاری حسامت کے ٹھٹھنے آدی پر پڑی تو اُسے میں نے اپنی طرف ہی گھورتے پایا، اگرچہ وہ ہنوز فون پر باتیں کر رہا تھا۔ میری نظریں ملتے ہی اس نے جلدی سے فون پر کسی کے ساتھ اختی جملہ کار اور پھر رابطہ منقطع کر دیا۔

”یہ ہمارے استاد جی ہیں۔ استاد بھابھا.....“ کالیا نے فوراً مجھ سے اس ٹھٹھنے شخص کا تعارف کر دیا۔ اور اس کا مجھ سے۔

”اور..... استاد جی! یہ ہے اپنا بھری! نعمان احمد..... جس کے بارے میں، میں آپ کو بتا چکا ہوں۔“

میں اٹھ کر اس کی طرف ہاتھ ملانے کو بڑھا تو جب تک وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا مگر اس نے میرا مصافحے کے لیے بڑھا ہوا ہاتھ تھامنے کی بجائے اپنے دونوں بازو پھیل کر مجھ سے ہٹ گئیں ہو گیا۔ وہ مجھے خاصا جاندار محسوس ہوا۔ اس کے بعد مجھ سے بڑی گرجوٹی کے ساتھ ہاتھ ملایا اور اسی طرح میرا ہاتھ پکڑے مجھے اپنے قریب صوفے پر بیٹھا دیا اور خود بھی براجمان ہو گیا۔ پھر سامنے کھڑے کالیا کی طرف گھورتے کے انداز میں دیکھتے ہوئے بس کراس سے بولا۔

”تو بھی بیٹھ جا، تجھے کیا سزا ملی ہوئی ہے کھڑے رہنے کی۔“

”ارے استاد جی! کیا ظالم زمانہ یاد دلایا.....“ کالیا، استاد بھابھا کی بات پر ایک یاس زدہ سی ہنکاردی خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”ابھی اسکو سزا میں یاد آ جاتی ہیں، جب ماسٹر صاحب سبق پڑھتے ہوئے پرینچ پر کھڑا کر دیا کرتے تھے۔ آج سوچتا ہوں کہ کتنا اچھا کرتے تھے، اس وقت کھڑے ہوتے تو آج آرام اور سکون سے بیٹھے ہوتے۔“ کہتے ہوئے کالیا اس صوفے پر بیٹھ گیا جہاں

تھوڑی دیر پہلے میں بیٹھا ہوا تھا۔ کالیا کی اس ”اسکو سزا“ والی بات کے پیچھے اس کا تلخ تجربے بول رہا تھا۔

”بھلا دے اپنے نامی کو میرے شیر کالیا.....! آج کی بات کر یہ بتاؤ اپنے اس یار سے مجھے صرف ملوانے آیا ہے یا کوئی اور کام ہے؟“ استاد بھابھا نے کالیا کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ ایک نظر مجھ پر ڈال کے جوابا اس سے بولا۔ ”دونوں ہی کام کچھ لو استاد جی! لیکن اس بار میرا یار برا پھنسا ہے۔“ کالیا نے کہا اور اسے ساری تفصیل سنا ڈالی۔ جسے استاد بھابھا نے بڑے غور سے سنا اور پھر سوچ انداز میں اپنے سر کو اٹھائی جنبش دیتے ہوئے بولا۔

”معاہدہ واقعی کمیر ہے..... یہ تو نے اچھا کیا کہ اپنے یار کو سیدھا دھر لے آیا کیوں کہ اس بار یہ پولیس کے ہتھے چڑھا تو سمجھ گیا، مجھے لگتا ہے یہ ساری وہی ٹیم جس نے اس کے باپ کو بے گناہ چھوڑ دیا تھا۔“ مجھے استاد بھابھا کی بات پر کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے بھی کہ کالیا اُسے میرے بارے میں غائبانہ بہت کچھ بتا چکا تھا، دوسرے یہ کہ جو اندازہ اسے میرے دیدہ وندا دیدہ دشمنوں کے بارے میں تھا وہی مجھے بھی تھا۔

میں نے کہا۔ ”لیکن اس مسئلے کا حل صرف یہ نہیں ہے کہ میں پولیس سے چھپتا رہوں۔ مجھے اس کا سبب باپ بھی کرنا ہوگا۔“ اس پر کالیا نے مجھ سے کہا کہ میں اب آرام سے ایڈووکیٹ زنیہ کو فون پر ساری صورت حال بتا سکتا ہوں مگر یہ نمی کہ اس وقت میں کہاں اور کس کے پاس ہوں۔ میں نے اپنا سبل نکال کر زنیہ سے رابطہ کرنے کے دوران اُسے بتایا کہ زنیہ کی اس عمر میں چار پانچ کالیں آ چکی تھیں۔

”نعمان! تم کدھر ہو؟ میرا فون کیوں نہیں اٹینڈ کر رہے تھے؟ میں تو کبھی تمہیں پولیس لے جا چکی ہے؟“ رابطہ ہوتے ہی اس نے تیزی سے کہا۔ اس کا لہجہ بہت متوجش اور کائی ہراساں ہو رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی اپنے کا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اس کا میرے بارے میں اس قدر تشویش زدہ اور شکر ہوتا مجھے بے چین کر دیا کرتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ میرا اور زنیہ کا تعلق اب تک ایک وکیل اور کلائنٹ سے بہت کر ایک طرح کی یا یوں سمجھ لیں انسانی ہمدری نماد دوستی میں بدل چکا تھا لیکن باوصف اس کے وہ مجھے جب بھی کسی مشکل یا معیبت میں پھنسا محسوس کرتی تھی تو اس طرح فکر مند ہو جاتی تھی جیسے میں اس کا اپنا

ماہنامہ سرگزشت

آواز خوف سے کانپ بھی رہی تھی۔ اس اطلاع پر میں سکتے میں آگیا۔ میرا صلیب سوکھنے لگا، تاہم ہمت کر کے بولا۔

”کک..... کب ہوا ہے؟“
”بالکل ابھی ابھی ہوا ہے..... ایک موٹا سا پولیس انسپکٹر مجھے بھی بڑی گندی دھمکیاں دے کر گیا ہے۔“ وہ لرزیدہ لہجہ میں بتانے لگی اور میرے اندر بول سے اٹھنے لگے۔
”وہ کہہ رہا تھا، جیسے تمہارا اپنے بھائی نعمان سے رابطہ ہو، کہہ دینا پولیس میں اپنی گرفتاری دے دے ورنہ وہ..... وہ فہیم بھائی کا براہِ شرم.....“ فرط غم سے وہ اپنا جملہ پورا نہ کر سکی اور ہچکیاں لے کر رو پڑی۔ بہن کو روتا بلکا اور اس خبیث انسپکٹر کی دھمکی کا سن کر غم و غصے سے میری حالت غیر ہونے لگی اور گون میں دوڑتا بھوکسی لاوے کی شکل اٹھنے لگا۔ میں نے جلدی سے کہا۔

”بہنا! تم حوصلہ رکھو، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ میں ابھی مگر پہنچتا ہوں۔“ میں نے دھک دھک کرتے دل سے اُسے تسلی دینے کی کوشش کی چاہی لیکن وہ فوراً ہراساں ہو کے بولی۔
”نن..... نہیں بھائی جان! آپ گھر مت آنا ورنہ پپ..... پولیس آپ کو بھی.....“

”تم فکر نہ کرو، حوصلہ رکھو، بہنا، فہیم کو بھی کچھ نہیں ہوگا۔ میں کچھ کرتا ہوں۔“ میں نے اپنے دل و دماغ کے جوار بھانے پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
”جہیں اگر ڈر لگ رہا ہے تو تم حاضری صاحب کے ہاں جا سکتی ہو، میں ابھی انہیں فون کرتا ہوں۔“

”نن..... نہیں بھائی جان! میں یہاں ہی ٹھیک ہوں، اپنے گھر پر۔“ آپ بس! فہیم بھائی کے لیے کچھ کیجئے۔“ وہ ایک دم روہانے لہجہ میں بولی اور میں نے اسے اثبات میں جواب دے کر رابطہ منقطع کر دیا۔

غریب موجود کالیا کی ایک تنگ نظریں میرے چہرے پر عی جی ہوئی تھیں۔ وہ فون پر ہماری گفتگو سے بہت کچھ اندازہ لگا چکا تھا، تاہم میں نے اسے بتادیا۔ اس کے چہرے پر بھی ایک لمبے کوتاہی کے آثار نمودار ہو گئے۔ اسی لہجہ میں بولا۔

”مجھے اس خطرے کا احساس تو تھا مگر.....“ اس نے دانت بچھنے ہوئے کہا اور پُرسوج انداز میں اپنا جملہ نام لے کر کے زار کا اور پھر بولا۔

”تو پریشان نہ ہوا اور مجھے کچھ سوچنے دے ڈرا.....“
”اب سوچنے کے لیے کیا رہ گیا ہے کالیا!“ میں نے

مایوسی سے کہا۔ ”وہ مردود پولیس افسر میرے گھر تک جا پہنچے اور میری بہن کو گندی دھمکیوں کے علاوہ بھائی فہیم کو گرفتار کر کے لے گیا۔“ یس اندر میرے یار.....! میں جی جان سے جل اٹھا، فرطِ جذبات سے میری آواز لڑکھانے لگی تھی۔ کالیا میری ڈوبتی ہوئی حالت دیکھ کر مجھے دونوں بازوؤں سے تھامنے کے انداز میں پکڑے ہوئے بولا۔

”حوصلہ کر جگر! تمہیں انہی اندھیروں کا پامردی سے مقابلہ کرنا ہے۔ سمجھا نہیں؟ دیکھ! مجھے دیکھ! یار اپنا کھمبہ ہے ناں مجھے تو بے غم ہو جانا..... اب وقت آگیا ہے کہ اس انسپکٹر کی جڑوں پر حملہ کیا جائے، میں ذرا استاد بھابھا کو صورت حال بتا کر آتا ہوں۔“

”نہیں کالیا!“ میں نے فوراً کہا۔ ”میرا خیال ہے مجھے ایڈوکیٹ زبیرہ کی بات مان لینی چاہیے تھی، میں اس سے بات کروں پہلے۔“ کہتے ہوئے میں نے اپنے سبل سے زبیرہ کا نمبر ملایا۔ وہ جیسے میرے ہی فون کی خستہ سی، پتلی ہی جانے والی سبل پر اس نے فون ریسیو کر لیا تھا۔ اس کی آواز سننے ہی میں نے اسے ساری بات بتا ڈالی۔ وہ پہلے سے زیادہ تشویش زدہ لہجہ کی شدت سے بولی۔

”فونی..... فونی! جلیز فارگا ڈسک! میری بات مان لو، مجھ پر بھروسہ کر دو، تمہارے دشمن تمہاری گرفتاری سے زیادہ تمہارے اس طرح سے روپوش ہونے پر خوش ہوں گے اور یہی ان کی کامیابی ہے۔ تم خود سوچو اس طرح چھپ کر تم کب تک رہ سکتے ہو، جلدی فیصلہ کرو فونی! ایسا نہ ہو کہ وقت نکل جائے اور میں بھی تمہارے لیے کچھ نہ کر سکوں۔“
”مجھے کہاں آنا ہوگا؟“ بالآخر میں نے اپنے سینے کے اندر گھٹنے آنسوؤں سے پوچھا۔

”تم میرے پاس آ جاؤ، میں خود جہیں کورٹ لے کر پہنچ جاؤں گی۔ تم اپنی گرفتاری کورٹ میں دو گے، اس کے بعد وہ تمہیں کسی کے بھی حوالے کریں۔ میں اسی وقت تمہاری ضمانت اور اپنی احتجاجی پیشین کے لیے درخواست دائر کر دوں گی۔“

”تم اس وقت کہاں ہو؟“
”اپنے جیمبر میں۔“
”میں وہیں آ جاؤں؟“
”یہی زیادہ بہتر رہے گا۔“
”میں ابھی پہنچتا ہوں۔“ کہتے ہوئے میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔ کالیا کی طرف دیکھا تو اس کا چہرہ دھواں

میں اس پر ہاتھ تھا۔
”ی.....“ یہ ٹو کیا کرنے جا رہا ہے میرے یار مگر! وہ ٹوٹے ٹوٹے لہجے میں مجھ سے بولا۔

”کالیا! میرا چھوٹا بھائی اس رزبل راجا دلاور کے اپنے میں ہے۔ میری جوان بہن کو بھی اس نے گندی دھمکی دے رکھی ہے میرے دشمن اگر میرے ساتھ قانونی جنگ لڑ رہے ہیں تو میں بھی انہیں اسی زبان میں جواب دوں گا۔“
”مجھے کچھ کرنے کو تو دے جگر! ٹو مجھ پر بھروسہ کر، میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ تیرے دشمن تیرے ساتھ قانونی جنگ نہیں لڑ رہے ہیں، یہ تیری بھول ہے۔“ کالیا نے مجھے سمجھانا چاہا مگر میں جانے پر ہند رہا۔

”کالیا! میں چلوں گا، میرے پاس وقت نہیں ہے۔“ میں نے جانے کے لیے قدم بڑھا دیا وہ مایوس نظر آنے لگا، مجھے روکنے سے بولا۔

”غصہ جا پھر، میں خود تجھے چھوڑ آؤں گا۔“ کہتے ہوئے اس نے اپنا چہرہ لٹکایا تھا۔ میں آگے بڑھ گیا۔ مکان سے باہر نکلا، کالیا نے اپنی ہائیک سنچال اور طوفانی رفتار سے اسے دوڑاتا ہوا، بالآخر مجھے ایڈوکیٹ زبیرہ کے جیمبر کے سامنے اتار کر لوٹ گیا۔

القعد کو تھ..... میں نے اپنی گرفتاری دے ڈالی۔ ساتھ ہی زبیرہ کے حوالے سے کورٹ سے استدعا کی کہ وہ مختلف تھانے سے میرے چھوٹے بھائی فہیم کی رہائی کا بھی مسلم نامہ جاری کرے، وغیرہ۔ زبیرہ کو یہ وضاحت دینا پڑی تھی کہ اس کا موکل یعنی میں، پولیس کے خوف اور ضمانت کی منسوخی کے بعد گھبرا گیا تھا اور وہ مجھ سے (زبیرہ) سے ملتا چاہتا تھا اور اسی کے ذریعے وہ سب سے پہلے کورٹ میں حاضر ہو کر اپنی گرفتاری دینا چاہتا تھا۔

بہر کیف..... مجھے انسپکٹر راجا دلاور کے حوالے کر دیا گیا۔ میرا نئے سرے سے چالان بنایا گیا، زبیرہ نے بھاگ دوڑ کر کے اسی وقت میری کورٹ میں پیشی ممکن بنائی، میرے بھائی فہیم کو چھوڑ دیا گیا تھا۔ میرے دل کو کچھ دھارس بندھی لیکن بد قسمتی سے زبیرہ کے پہلے سے داخل شدہ ایس ایچ او راجا دلاور کی نوکری پر بحال کے خلاف احتجاجی پیشین، پبلک پراسیکیوٹر نے اپنے دھواں دھار دلائل سے خارج کر دادی کیونکہ عارف چمندرنے میں آخری وقت میں اپنا بیان بدل دیا تھا یا اس سے بدلوا گیا تھا۔ زبیرہ کو پیشی میں بحث اور دلائل کے دوران ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ عارف کو اسی طرح

پہلے فرار کا موقع دے کر رہائی دلانے کا لالچ دیا گیا ہوگا، پھر اس کے بعد اسے پولیس مقابلہ شوکر کے ہلاک کر دیا گیا جبکہ مجھے جوڈیشل ریماٹر پر سات روز کے لیے راجا دلاور کے حوالے کر دیا گیا۔

میں جس وقت اپنا سر پکڑے لاک اپ کی ٹنگی سلیں زندہ اینٹوں والے فرش پر بیٹھا تھا تو اس وقت زبیرہ خود بہت گھبراہٹ ہوئی پریشان تھی مجھے مغل تیلیاں دینے کی ناکام کوششوں میں لگی ہوئی تھی۔
”تنت..... تم بالکل فکر نہ کرو نعمان! میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑ دوں گی۔“ اس وقت ملاقات میں چاچا انور شاہ بھی اس کے ہمراہ تھے، وہ بھی مجھے تسلی دینے لگے۔

”ہاں بیٹا! تم پریشان نہ ہونا، ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔“ یہ دونوں اور کسی بنانے کن کن الفاظ میں میری تسلی اور تسلی کیے جا رہے تھے اور شاید میری طرح خود ان دونوں کو بھی اپنے لہجے کے ٹھوکے پین کا احساس ہو رہا تھا لیکن مجھے تو جیسے ایک نامعلوم سی ”چپ“ کھا گئی تھی۔ میں نے ایک لفظ بھی ان سے نہیں بولا۔ میرے دل و دماغ میں جیسے مردنی سی چھا گئی تھی۔ میرا اپنا ”انداز“ اس وقت جیسے دم توڑ گیا تھا اور دل چاہتا تھا کہ مجھے یہ دونوں اکیلا چھوڑ دیں۔ جب ایک سنتری نے فرش پر ڈنڈا بجا کر ملاقات کا وقت ختم کرنے کا اعلان کیا تو مجھے سکون ملا کیونکہ زبیرہ اور چاچا انور شاہ وہاں سے جا چکے تھے۔

سہ پہر آپڑی تھی۔ میں پورے اپنی پشت دکھانے خالی الذہنی حالت میں بیٹھا تھا۔ یوں جیسے نہ، نہ، نہ، نہ! خالی کر دیا ہوا اب میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا کیا نہیں، اس بارے میں سوچنا جیسے ذہن اکٹا گیا تھا۔ جو حراں یار میں آئے، یا یوں کہہ لیں جو حراں دشمنان میں آئے۔ اس نذر مایوسی اور بے دلی مجھ پر طاری تھی کہ مجھے انسان تو کیا یہ درد و یار بھی بے سہم و بے مروت محسوس ہو رہے تھے۔ ایک عجیب سی ناقابلِ بیان وحشت چپتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی مجھے اس خاموش اور سرد ماحول سے۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ میرا بلاد آگیا۔ مجھے ایس ایچ او راجا دلاور کے کمرے میں پہنچایا گیا تو میں ذرا چونکا۔ میں تو یہی سمجھے ہوئے تھا کہ اب وہ میرے ساتھ ایک ختم ملاقات کرے گا، دھمکیاں دے گا، کچھ اپنی طاقت کے کن گائے گا اور پھر تشدد کی راہ پر مجھے ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنی مرضی کا بیان مجھ سے دوائے گا لیکن اس کے کمرے میں

ایک کھٹے ہوئے جسامت کا سوٹ پوش شخص کرسی پر براجمان دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ اس کی پشت میری جانب تھی۔ باویسیوں کے اندھروں میں جیسے خواہواہ ایک صبح اُمید منشا مٹی کہ کہیں یہ شخص میری ضمانت کے لیے تو نہیں بیجا گیا تھا؟ پھر میں اپنی اس خوش فہمی پر خود ہی اندر ہی اندر ہنس دیا کہ عالم بے بسی میں ایسے سراب دیکھنے میں آئی جایا کرتے ہیں۔

راجا دلدار اپنی ہماری بھر کم چیز پر بڑے غصے کے ساتھ دھنسا بیٹھا میری ہی طرف خشناک نظروں سے گھور رہا تھا۔

”سینہ صاحب! آپ ذرا اپنی کرسی اس طرف موڑ لیں.....“ راجا دلدار اپنے سانسے نیز پر دھرے سیاہ رول کو اٹھا کر اپنی کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ تنطاب وہی شخص تھا جو اس کے سامنے کرسی پر براجمان تھا۔ اس نے ایک ذرا اپنی مولیٰ چربی کی گردن میری طرف موڑ کر دیکھا تو مجھے اس کا آدھا چہرہ نظر آیا۔ باوجود اس کے میں اسے پہچان گیا۔ اس میں مچھلی شخص کا چہرہ، میں کیسے بھول سکتا تھا۔ یہ بلیو مون اسٹیٹ کا بلڈ ریشہ ستار تھا، اس نے میری طرف کرسی گھمائی، تب تک راجا دلدار بھی چند قدم چلتا ہوا میرے نزدیک آ گیا تھا۔

”کیا سمجھتے تھے تم خود کو؟ پہنے خاں؟ یا تمیں مار خاں..... ہیں؟ بولو.....!“ یہ سینہ ستار تھا۔ اس کا ہماری چہ بیلا چہرہ پیش کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا جبکہ راجا دلدار اسے بولتا پا کر چند قدم پیچھے ہٹ کر یوں کھڑا ہو گیا تھا جیسے سینہ ستار اس کا کوئی بڑا افسر ہو اور یہ اس کا ماتحت۔ کیونکہ یہ کہتے ہوئے سینہ ستار کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اب میرے سامنے کھڑا شعلہ فشاں نظروں سے گھور رہا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ہل کے ہل میرے اندر اتنی ہمت کہاں سے عود آئی تھی کہ میں نے بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسی لہجہ میں کہا۔

”سینہ ستار! یہی تو میری غلطی تھی کہ میں نے اب تک شرافت کا لبادہ اُڑھ مے رکھا تھا اور خود کو تمیں مار خاں سمجھنے کی غلطی نہیں کی تھی۔ جانتے ہو ناں..... جب شریف آدمی شرافت کا لبادہ اتار بھیجتا ہے تو اس سے بڑا بد معاش کوئی نہیں ہوتا۔“ میری ترکی یہ ترکی جوانی کا رروائی نے سینہ ستار کی جیسے آنکھیں بھاڑ ڈالیں۔ اُسے شاید میرے اس طرح بولنے کی امید نہ تھی، اس کا چہرہ غصے اور پیش کی شدت

سے سرخ ہو گیا اور اس نے نفرت سے ہونٹ سکیڑ کر میرے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ جڑ دیا۔ اس کے ہماری ہاتھ کے تھپڑ سے زیادہ مجھے احساسِ ذلت نے بھاڑ کر رکھ دیا، میں چند قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑایا گیا تھا۔ میرے دونوں ہاتھوں میں جھمکریاں تھیں۔

”انسپلر.....! تمہاری موجودگی میں ایک غیر متعلقہ شخص مجھ پر ہاتھ اٹھا رہا ہے۔ یہ کیا قانون ہے؟“ میں غصے کی شدت سے سامنے کھڑے راجا دلدار سے دھاڑ کر بولا تو اس کی آنکھوں میں بھی خون اُتر آیا۔ وہ پُریش انداز میں وائٹ بھیجنے میری جانب بڑھا اور اپنے ایک ہاتھ کے پتھے میں میری گردن دبوچ کر کھینٹا ہوا میرے کمرے لایا اور میرا سر میز کی سطح پر مارا۔ میرے مقل سے کراہ آمیز چیخِ خارج ہو گئی۔ اس نے میری گردن چھوڑ کر اب بالوں سے مجھے دبوچ کر میرا سر دبا دے رکھا تھا۔

”مجھے قانون سیکھائے گا.....“ اس نے بیٹھنے پر جیسی غراہٹ کے ساتھ ایک قہقہہ لگایا اور میری پشت پر ہونے لگا۔ سیاہ رول سے وار کرنے لگا۔ گالی نے میرا سر گھما کر رکھ دیا۔ نچے یوں لگا جیسے ایک اگلی میرے اندر کا شریف انسان دم توڑنے لگا ہو۔ میں مقل کے مل چلا یا۔

”راست خود کسے! اپنی گندی زبان سے میری بہن کا نام مت لے۔“ یہ کہتے ہوئے میں رن بہت حالت میں تڑپا اور اس کی گرفت سے خود کو چھڑانے کی کوشش کی مگر اس بد معاش ایسے اچانک کا پارہ بھی آسمان کو چھونے لگا۔ اس نے مجھے اسی طرح بالوں سے دبوچے ہوئے نچے فرش پر گرادیا اور لاتوں، کون کی مجھ پر بارش کر ڈالی۔ وہ جنوبی کیفیت میں مجھ پر مل پڑا تھا۔

”گھبرو ڈر.....“ معا سینہ ستار نے اسے روکا۔ راجا دلدار ہانپتا ہوا ایک طرف ہو گیا۔ سینہ ستار آگے بڑھا اور اپنا بوٹ میری گردن پر رکھتے ہوئے غرا کر بولا:

”ہم سے مگر لینے کا انجام تمہارا اس سے بھی زیادہ برا ہو سکتا ہے تمیں مار خاں! اب بھی وقت ہے اپنی ضد سے باز آ جاؤ اور لاری آؤے کی زمین خالی کر دو..... ورنہ ادھر تم سلاخوں کے پیچھے پڑے سڑتے رہو گے اور ادھر تمہاری خوب صورت جوان بہن کی عزت کو ہم کھلونا بنا کر رکھ دیں گے۔“

”میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا.....“ اپنی بہن کے بارے میں اس شیطان رز دل کی گندی زبان سے اس طرح

کے کلمات نے میرا دماغ آتش فشاں بنا کر رکھ دیا اور میں نے زمین پر پڑے پڑے لوٹ لگائی، اپنی گردن اس کے ہماری بوٹ سے جھڑاتے ہی میں نے اپنی لات کو حرکت دی جو سینہ ستار کے پہلو سے متعدد مہر گھرائی تھی۔ وہ پیچھے ہٹ گیا، ایسے میں راجا دلوار آگے بڑھا۔

”سر! آپ ادھر بیٹھ جائیں اور بے فکر رہیں، جیسا آپ چاہیں گے ویسا ہی ہوگا۔“ کہتے ہوئے اس نے اندر داخل ہونے والے دو اہلکاروں کو مجھے لے جانے کا حکم دیا۔ وہ مجھے اسی طرح بید روی سے گھنٹینے ہوئے لے گئے اور ایک بار پھر لاک اپ میں لے جا کر پھینک دیا۔

”کالیا! میرے یار! میں نے تیری بات نہیں مانی..... کاش! میں تیری بات مان لیتا۔“ میں لاک اپ کے سیلن زدہ فرش پر پڑا اپنے ہونے پر بڑبڑانے لگا۔ میرے دل و دماغ میں آندھیاں مچی ہوئی تھیں۔ مجھے اب کالیا کی ہر کو زبردستی کاٹنے کی باتیں یاد آئے گی تھیں۔ وہ مجھ سے یہی کہتا تھا کہ دشمن میرے ساتھ ”قانونی بد معاشری“ کر رہے تھے اور میں شرافت کے قانون کا راگ الاپ رہا تھا۔ جس کی اس سانچ میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ دولت، طاقت اور اثر و رسوخ کی لامچی سے ہرسل کی تمبیس کو ہانکا جاسکتا ہے۔ شرافت کی لامچی تو ٹوٹ کر دو ٹکڑے ہو جاتی ہے، یہی حال شریفوں کا ہوتا ہے۔ میں اس قانونی بد معاشری کے آگے ٹوٹ رہا تھا، میری عزت نفس بے رحم ہوئی تھی۔ کیسے کیسے گندے کلمات میں نے اپنی جوان مصوم بہن کے بارے میں سنے تھے۔

میرا خون کھولنے لگا تھا۔ میرے اندر قانون کی پاسداری اور عظمت کا جو بیت تھا وہ ایک لمحے میں سارہ ہو چکا تھا۔ ایک ارشاد دشمن جیسے شخص کو شکست دے کر میں سمجھا تھا کہ میں نے دماغی چال سے بڑی فتح حاصل کر لی تھی مگر اب مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ ہر جگہ دماغ یا عقل نہیں چلتی، کچھ بڑے مگر چھوٹے کے خلاف طاقت کا مظاہرہ بھی ضروری ہوتا ہے، جبکہ میرے دشمن دونوں کا استعمال کر رہے تھے۔ ایڈووکیٹ زنیہ کے رہنے رہنے قانونی اقوال کے مقابلے میں مجھے کالیا کے گرگ ہارن دیدہ اور تجربے کی آگ میں کندن بنے بیخ جیلے زیادہ سچے معلوم ہوئے۔

لیکن اب یہ بعد کی باتیں تھیں، ابھی میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا، اس کے خدشات مجھ سے زیادہ کالیا کو تھے لیکن مجھے زیادہ فکر اپنی نہیں بلکہ عاصم بہتا اور نجم کی طرف سے لاحق ہونے لگی تھی سینہ ستار کی دھمکی نے مجھے اپنے

چھوٹے بہن بھائی کی طرف سے تشویش زدہ سا کردیا تھا۔ وہ سارا دن میرا سولی پر گزارا لگے دیا، مجھے پھر راجا دلوار کے سامنے پیش کیا گیا، اس وقت اس نے انسانیت کا لبادہ اڑڑے ہوئے میرے ساتھ خلاف توقع نارمل انداز میں گفتگو کی اور ساتھ ہی یہ سمجھا چاہا کہ میں ان لینڈ مافیا کے راستے سے ہٹ جاؤں اور لاری اڈے کی زمین خالی کر دوں۔ دوسری اس کی شرط یہ تھی کہ میں منشی دادن کا قتل اپنے سر لے لوں، اس شخص میں اس حرام خورد نے مجھ سے یہی کہا کہ وہ اسے قتل میری بجائے قتل اشتعال کارنگ دیتے ہوئے کم سے کم سزا دلوا کر آ کر اڈا کر دیا جائے گا۔

میں جانتا تھا کہ یہ آئیل مجھے مار دالی بات ہوتی۔ صاف مطلب تھا کہ اس طرح کے خود ساختہ بیان پر دستخط کرنا خود اپنا ”ڈسجھ وارنٹ“ جاری کرنے کے مترادف ہوتا۔

میں نے صاف انکار کر دیا۔ وہ غیث گندی و محسوس پر اتر آیا۔

”مت بھولو کہ تمہاری ایک جوان اور خوب صورت بہن بھی ہے۔“ اس کی بات پر میرا خون کھولنے لگا، میں نے اپنے غیرت جوش کو دباتے ہوئے جواب دیا۔

”اس کی اللہ حفاظت کرے گا۔“

”تو تم نہیں مانو گے؟“ اس کے بولنے کے انداز میں تہدید چھپی ہوئی تھی۔

میں نے ذرا مصلحت اندیشی سے کہا۔ ”منشی دادن کا مرڈ کیس عارف جعفر کی ہلاکت کے بعد کمزور پڑ چکا ہے، اس سے تمہیں اب کیا ڈر ہے؟ ری بات لاری اڈے کی زمین خالی کرنا تو یہ ایک سرکاری ملکیت ہے، جس کا عوامی مفاد میں حاصل کیا گیا بخیر نامہ میرے پاس نہیں ہے۔“

میں نے دانستہ عطا محمد کا نام نہیں لیا تھا۔ وہ بولا۔

”زیادہ چالاک مت بنو۔“ وہ ہولے سے غرایا۔

اپنے خاندان سمیت کب کے ختم ہو چکے ہوتے۔“

”اصل مگر مجھے کون ہے؟“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ میرے یوں استفسار پر اس کے کردہ چہرے پہ ایک تندی لہر اُٹتی اور پھر وہ اسی لہجے میں بولا۔

”اس خطرناک شخص کا نام بھی مت لو، ہرگز کر دو کہ ابھی اسے ہم نے تمہارے بارے میں بتایا نہیں ہے کہ کون ہمارے کام کے سچ روئے انکار رہا ہے وہ نہ تو پہلے ہی دن تمہارا بندوبست کر چکا ہوتا۔ یہ تو سینہ ستار کی مہربانی ہے تم پر کردہ خود ہی تمہارے ساتھ ایک ڈیل کر کے اس سکلے کو نشانہ چاہتا ہے۔“ اس کی منافقانہ بات پر میرا اندر ہٹنے کوئی چاہا تھا کہ یہ مجھے کتنا بے وقوف سمجھے ہوئے تھے۔ میں خاموش ہو رہا۔

”کیا کہتے ہو پھر؟ کر رہے ہو اس بیان پر اپنے دستخط؟“ اس نے اپنی میز کی دروازے سے ایک ٹائپ شدہ اسٹیپ نکال لیا تھا وہی مجھے دکھاتے ہوئے بولا۔

”نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”سوچ لو..... اگلی پیشی میں تو تم پر فرد جرم عائد ہونے ہی والی ہے۔“ وہ مجھے خوف زدہ کرنے کے انداز میں بولا۔

”جہاں نہیں تو عمر قید تو ضرور ہوگی، یہ بھی نہیں تو آٹھ دس سال کی قید تو ضرور ہوگی۔ پورا مافیا گروپ اس وقت تمہارے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ سوچو! دس سال کی قید بھی تمہارے لیے معمولی بات نہیں ہوگی اور یہ مت سمجھنا کہ وہ پھر بھی تمہیں چھوڑ دیں گے تمہارا چھوٹا بھائی، بہن!“

”ایسپیکٹر.....! اب بس!“ میں نے درمیان میں سر دو ساٹ آواز میں کہا۔ اس چلتی ہوئی زبان کو ایک دم بریک لگ گئے۔ وہ بڑی خوشخوار نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔

وہ دن بھی گزر گیا۔

یہ اسی روز کا ذکر تھا۔ میں لاک اپ میں سلاح دار دروازے کے قریب ہی بیٹھا، خلاؤں میں مگھور رہا تھا کہ اچانک مجھے کچھ جگہ شور کی آواز سنائی دی۔ جیسے کوئی زور زور سے باتیں کر رہا ہو۔ میں تھوڑا چونکا۔ بولنے کی یہ آوازیں اسی راہداری کی طرف سے آرہی تھیں جہاں بیٹے عمر اور ایس ایچ او کے کمرے تھے۔ مجھے ایک نسوانی آواز کے ساتھ مردانہ آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں، مردانہ آواز مقابلاً اونچی ہونے کے باعث مجھے اس کے آہنگ سے ہی اندازہ ہوا کہ یہ آواز راجا دلوار ہی کی تھی، نسوانی آواز میں نہیں پہچان پایا، پھر خاموشی سی چھا گئی۔ میں چہرہ

موڑے دیوار سے پشت اور سر اپنا نکالے بیٹھ گیا۔ چند ہی سیکنڈ گزرے تھے کہ سلاخوں پر سنتری نے ڈنڈا مار کے مجھے چونکا دیا۔

”چل! اٹھ! تیری ملاقات آئی ہے۔“ سنتری کی کھر کھرائی آواز میری سامعوں سے گھرائی اور میں نے چونک کر سلاح دار دروازے کی طرف گردن موڑی۔ سامنے زنیہ کھڑی تھی، یوں کہ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا اور سانس بھی پھولی ہوئی تھی۔

میں اُسے دیکھ کر ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا۔

”کیسے ہو تم نوی؟“ وہ اپنی تیز تیز چلتی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

”میں ویسا ہی ہوں جیسا دیکھ رہی ہو لیکن حالات مجھے کچھ ایسے نظر نہیں آرہے ہیں۔“ میں نے سرد مہری سے کہا۔ ”شاید تمہارا مشورہ مان کر میں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے۔“

”یہ تم کیا لہر رہے ہو نوی؟“ وہ قدرے اُلکے سے بولی۔ ”کیا تم نہیں جانتے کہ میں تمہاری خاطر جو کچھ کر رہی ہوں صرف فیس کی خاطر کر رہی ہوں؟ نہیں نوی! میں تمہیں ان ساری مصیبتوں سے نکالنا چاہتی ہوں، جو ناکردہ ہیں۔ تمہیں اس میں ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت پھنسا جا رہا ہے، بالکل اسی طرح جیسے تمہارے باپ کو پھنسا لیا گیا تھا۔“

یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں سسکی اتر آئی تھی۔

میں نے بغور اس کا چہرہ دیکھا، ایک دلادیز سی گفتگو لیے ہوئے اس کا چہرہ دکھ اور کرب کی عجیب غمازی کرتا محسوس ہوا مجھے۔ اس کی کشادہ آنکھوں میں تیرنی نمی کی جھللاہٹ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ میرے دکھ کو اپنا دکھ سمجھے ہوئے تھی، اس میں ہمدردی کے شائبے سے زیادہ کسی اور جذبے کی تمازت چمکتی محسوس ہوتی تھی۔

”اس کے لیے میں تمہارا مشکور رہوں گا۔“ میں نے ہولے سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ تمہیں ایک انسانی ہمدردی کے ناطے نے میرے کیس میں ذاتی دلچسپی لینے پر مجبور کر رکھا ہے۔“

”صرف انسانی ہمدردی؟“ اس نے ہولے سے کہا۔ مجھے اس کی آواز دور سے آتی سنائی دی۔ میں نے چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا، مجھے یوں لگا جیسے اس کے لبوں سے بے اختیار ہی میں یہ جملہ پھللا تھا، جسے فوراً چھپانے کی غرض سے شاید اس نے منقصد کی بات کی طرف

آتے ہوئے کہا۔

”مجھے یہ غیث انجکڑ تم سے ملاقات کرنے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ میں نے بھی اس کے ہوش ٹھکانے لگا دیئے ہیں یہ بتا کر کہ میں تمہارا کیس جو ڈسٹرکٹ کورٹ سے ہائی کورٹ ٹرانسفر کروانے میں کامیاب ہو چکی ہوں اگر اب مجھے وہاں تمہارے کیس کے سلسلے میں تحفظات ہوئے تو سپریم کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹانے کا بھی راستہ میں نے دیکھ لیا ہے، دیکھنا اب تم نوی! سب سے پہلے اس کی وردی اترے گی اور یہ سیدھا جائے گا جیل۔“ میں اس کی بات پر ٹھنکا اور کچھ سوچ کر میری پیشانی پر سلوٹوں کا جال سا بن گیا۔ بولا۔

”ہو سکتا ہے یہ خبر میرے لیے سعد ظہیر سے لیکن جہیں اس غیث دلاور کے منہ نہیں لگتا چاہیے تھا، اسے یہ سب نہیں بتانا چاہیے تھا، مجھے ڈر ہے کہیں میرے دشمنوں کی توپوں کا رخ تمہاری طرف نہ ہو جائے۔“

”میری فکر چھوڑو تم ہم دیکھ لوگ ایسے حالات سے گزرتے رہتے ہیں اور ان سے نیرو آزما ہوتا بھی جانتے ہیں۔“ وہ بولی۔ بس! تم بے حوصلہ ہوتا، اب دوبارہ ایسی بات اسے منہ سے مت نکالنا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے مجھ سے کہی تھی۔ اوکے؟“

آخر میں وہ بڑی گہری نگاہوں سے میرے اترے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی۔ میں نے اس کے لبوں پہ ایک معلوم سے احساس کی تھامت کو چھلنے محسوس کیا اور ہولے سے صرف اپنا سانس ثابت میں ہلا دیا۔ اسی وقت سستری نے ملاقات کا وقت ختم ہونے کا اعلان کر ڈالا۔

”اچھا! اب میں چلتی ہوں، میں تمہیں یہی بتانے آئی تھی تاکہ تم مزید حوصلہ پکڑو، اب میں چلتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ مجھ سے رخصت ہو گئی۔

میں اپنی جگہ پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ایڈووکیٹ زبیرہ کی باتوں سے مجھے کچھ امید تو ہوئی تھی کہ وہ اپنے طور پر میری رہائی اور اس کیس سے چھٹکارا دلانے کے لیے اپنی سی پوری کاوشوں میں لگی ہوئی تھی لیکن مجھے اس کا آج راجا دلاور کے ساتھ یوں منہ ماری کرنا مناسب نہیں لگا تھا، میرے ایک محتاط رویہ خیال کے مطابق زبیرہ نے مجھے جس امید افزا خبر سے آگاہ کیا تھا وہ اسے کم از کم اس غیث تھا نے دارا جادلاور کو نہیں بتانا چاہیے تھی کیونکہ وہ میرے دشمنوں کا زرخیز ہی نہیں ناؤٹ بھی تھا۔ وہ اس کی پشت پناہی کرتے تھے اور وہ ان

کے وسیع تر مفادات کے لیے کام کرتا تھا۔ یہ خبر وہ پہلی بار میرے دشمنوں تک پہنچا سکتا تھا۔

مجھے اب زبیرہ کی جانب سے بے چینی ہونے کی تم میرے ساتھ بہرودی میں ایسی اور جذبے کے نتیجے میں خدا نخواستہ اسے کچھ ہو جاتا تو یہ میرے ضمیر پر ایک پہاڑ ہو جھ کے سزاؤں ہوتا۔

اسی وقت مجھے بھاری بوٹوں کی دھک سنائی دی اس ساتھ ہی قریب کھڑے سستری کے سلیٹ جھاڑنے ٹھکا ٹھکا ابھری۔ میں نے گردن ڈراٹھا کر دیکھا۔ وہ غیث سلاخ دار دروازے کے ساتھ کھڑا مجھے گھور رہا تو اس کے ایک ہاتھ میں موٹا سیاہ رول تھا، جسے وہ ہولے ہولے اسنی سلاخوں پر بجاتے ہوئے مجھ سے بولا۔

”یہ کالے کوٹ والی عورت تمہیں جو خوش خبری سنانے آئی تھی، بڑی خطرناک قسم کی خوش فہمی میں جتا ہے ضرور تمہارا مارا بھی خراب کر گئی ہوگی۔“

میں چپ رہا۔ اس نے موٹا سیاہ رول سلاخوں کے اندر کر کے ہولے سے میرے کانڈھے کو چھپاتے ہوئے دوبارہ کہا۔

”تم اپنی خاطر جمع رکھنا اور کل تک سوچ کر مجھے بتا دینا تاکہ ہم کچھ اور بندوبست کر سکیں، کیوں کہ تمہارے پاس تو ہماری بات ماننے کے سوا اور دوسرا راستہ نہیں ہے لیکن ہمارے پاس بہت سے راستے ہوتے ہیں، ایک نہیں تو دوسرا بھی، دوسرا نہیں تو تیسرا۔ سمجھ گئے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ پُر غور انداز میں ہلکا سا قبچہ لگا کر واپس پلٹ گیا۔

وہ رات بھی میں نے لاک اپ میں گزار دی۔ اگلے دن سلاخ دار دروازے سے کسی نے آج کا تازہ اخبار اندر پھینکا۔ میں چونکا۔ ساتھ ہی ایک آواز میرے کانوں سے گئی۔

”یہ آج کا تازہ اخبار ہے، صاحب نے بھیجا ہے، پڑھ لو، اس میں تمہارے لیے ایک اہم خبر ہے۔“ یہ سستری تھا، کہہ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

میں نے اپنے قریب فرش پر پڑے اخبار کو اٹھایا۔ پہلے ہی صفحے پر ایک چٹنی چٹائی خبر قبل حرف میں چھپی ہوئی تھی۔

”ایڈووکیٹ زبیرہ کل رات کار کے حادثے میں.....“

میں سکتے کے عالم میں آگے خبر پڑھتا چلا گیا۔

(جاری ہے)

بیت بازی

(عبدالبارودی لاہور کا جواب)

عرفان حسین زیدی..... رانی پور
یہ لگتا تھا کہ جیسے میرے مغل پر رومی ہیں
کہ ہیں اقبال ان کے ہم نفس کل شب جہاں میں تھا
(احسان علی کا جواب)

موسو اقبال..... سیالکوٹ
وہ سلسلے تھے جو تعبیر کے اور خواب کے
چھوڑ گئے ہیں دن رات کے قافلے
(فخر عالم راولپنڈی کا جواب)

نزاہت اشفاق..... مہوروہ فتح جنگ
اگر شعور نہ ہو تو بہشت ہے دنیا
بڑے عذاب میں گزری ہے آگہی کے ساتھ
(عبدالکیم شہر کراچی کا جواب)

اتلم الدین صدیقی..... حیدرآباد
یہ زندگی یہ زیت کا فانوس ہفت رنگ
اہل نظر کے واسطے اک عالم خیال
(ڈاکٹر ودی انصاری کا جواب)

سعید احمد چاند..... کراچی
اب کے برس بھی نکلا میں نے اس کے نام دیا چہ
میرے ذکر سے خالی رکھے جس نے اپنے باب تمام
(منشی عزیز نے دہاڑی کا جواب)

ارشاد حسن..... لاہور
یہ کیا کہ سب سے بیاں دل کی باتیں کرنی
فراز تم کو نہ آئیں محبتیں کرنی
(بیر حسن ساجد سرگودھا کا جواب)

طہ یاسین..... حیدرآباد
روز روئے ہوئے کہتی ہے زندگی مجھ سے
صرف اک شخص کی خاطر مجھے برباد نہ کر

قارئین

(محمد خالد زوب کا جواب)

ہادیہ ایمان ماہا ایمان..... فورٹ عباس
میں ڈھونڈتا ہوا آیا ہوں زندگی اپنی
میں تم سے شوق ملاقات میں نہیں آیا
(نزاہت اشفاق فتح جنگ کا جواب)

سدرہ بانو ناگوری..... کراچی
میری فطرت میرا ملک میری مٹا بھی ہے
آری جیتنے بھی ہیں انسان بن جائیں سبھی
ملک فیصل..... لاہور

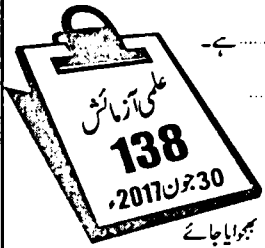
مجھ کو پردیس لیے پھرتی ہے روزی و امف
اپنے بچوں سے بہت دور بہت دور ہوں میں
عنایت مسیح..... کراچی
میری آنکھیں رات دن بس اس کی جانب ہیں شفیق
ان غلاؤں سے پرے وہ کون ہے ٹھہرا ہوا

(احمد جاوید ملتان کا جواب)
نزاہت اشفاق..... فتح جنگ
اس نے قصدا بھی میرے نالے کو
نہ سنا ہو گا مگر سنا ہو گا
(کاش محمود کا جواب)

عبدالبارودی..... لاہور
اب تو چہ سرتے سورج کے بپاری ہیں سبھی
چھڑے تو سڑ کر بھی نہیں دیکھتے
(منجی حسن برٹ لیٹ امریکا کا جواب)

نقد سراج..... منڈی بہاؤ الدین
یہ سرخ سرخ سی آنکھیں جو دیکھتے ہو عزیز
جگر کا خون ہے یہ بادہ شراب نہیں
وحید جہاں..... کراچی

یہ فوٹی حکیم ہم نے کھوایا ہے مجھوں سے
جو لوگ محبت کے مگر ہیں وہ کافر ہیں



میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام..... ہے۔

نام:

پتا:

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی □ سسٹمز □ باکینز □ مرکز شت □ بھجوا دیا جائے
کسی ایک پر ☒ کیجیے۔

آخری نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں



ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ
ماہنامہ سسٹمز ڈائجسٹ
ماہنامہ باکینز ڈائجسٹ

کے حصول میں دقت پیش آرہی ہے یا آپ کو اپنے
علاقے کے بک اسٹال سے کوئی شکایت ہے اور
آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو



مندرجہ ذیل نئی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

ٹریماس 0301-2454188

سرکولیشن مینجر 35802552-35386783-35804200

فیکس نمبر 35802551

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
ماہنامہ سسٹمز ڈائجسٹ پبلی کیشنز
ماہنامہ باکینز ڈائجسٹ پبلی کیشنز
35802551 35802552

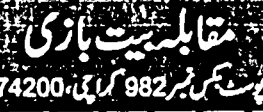


قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی
تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ "بیت بازی"
شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر
کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر
ارسال کر سکتے ہیں۔

نام:

پتا:

محترم! محترمہ..... کے شعر کے جواب میں
شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شامل اشاعت کر لیں
(شعرا لگ کاغذ پر ہے) 99



پست بک نمبر 982 کراچی 74200

(نیلوفر شاہین اسلام آباد کا جواب)

نیلوفر شفیق..... کراچی
یہ نہیں کہتے۔ فراق میں، میں اجڑ گیا یا بکھر گیا
ہاں مجھوں پر جو مان تھا وہ نہیں رہا میرے گمشدہ
محمد احسن جاوید..... ڈیرہ غازی خان
تیرے وصل کی ہے آرزو اپنی الفت کی انتہا
تیرے ہجر کا تصور ہے ناکامیوں کی ابتداء
(سید محمد حسین شاہ حیدر آباد کا جواب)

عبدالجبار رومی..... لاہور

یہاں روز لکھتا ہے سہانا سورج
بارہا کیا ہے میں نے نظارہ صبح کا
(نازش فاطمہ خانپور کا جواب)

رضا احمد اعوان..... دریا خان بکھر

ناموں کا اک جہوم بھی میرے آس پاس
دل سن کے ایک نام دھڑکتا ضرور ہے
(ہادیہ ایمان ماہ ایمان ڈاہرانوالہ کا جواب)

فہیم غوری..... ننگرانہ صاحب

اک کہیں آنکھ نے کچھ دُغم دیے تھے مجھ کو
اب کوئی آنکھ ملاتا ہے تو دل روتا ہے
انور حسین..... کمالیہ

الفت میں تیری ہو گئے مدھوش اس قدر
خود اپنی ذات ہی کو تماشا بنا لیا
ماہ نور تبسم..... ملتان

اے جان کی اُمید پر زندہ ہوں ابھی تک
اک دن شب غلٹ کی بحر ہو کے رہے گی
عابدہ علی..... واہ کینٹ

اپنی تو عادت ہے، یہ بری ہے کہ بجلی ہے
بہتے ہوئے ہر بات زمانے کی سہمی ہے

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے
اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر
قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان
کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مد نظر
رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

امتیاز الدین..... سرگودھا

یہ کیسی سوچ ہے کیسا عمل ہے
خطا کر کے سزا سے لڑ رہا ہوں
عارف شیخ..... چنیوٹ

یہ درد ہمارے دل کا تھا یہ داغ جگر کے اپنے تھے
کس واسطے آس بھر بھر کے یہ اوروں کو دکھلاتے ہم
(نزاب افشار، فتح جنگ کا جواب)

محمد حسن عثمانی..... جھنگ

میں ایک مدت سے ضبط کے پل صراط پر ہوں
کہ میری آنکھوں میں کوئی ساگر الٹ رہا ہے
شیم الدین خیال..... لاہور

مرے ہونٹوں پہ ہے اک امم اعظم
سو میں نے جو بھی سوچا ہو گیا ہے
شبم رحمانی..... شادی وال

میرا ہر اک شعر صیغہ لگتا ہے
مجھ پر فکر کے ہوئے ہیں الہام کئی
اختر عباس..... سرگودھا

موقع ملا تو میرے ہی بچوں کو کھا گیا
رکھا عزیز جس کو میں نے اپنی جان سے زیادہ
(سعید احمد چاند کراچی کا جواب)

عبدالستار..... ساہیوال

رم و دستور ہمیشہ سے یہی ہے نصرت
عیب گنتے ہیں زمانے میں ہنر سے پہلے
(سیف اللہ ملک وال کا جواب)

امین الدین سیف..... سرگودھا

یادوں میں تیری ڈوبا رہتا ہے دل
ہر سو پکار ہے تو آجاتا اب
غفر عباس مرزا..... اسلام آباد

یہ سب تکلفات ہیں ان کی طرف نظر نہ کر
ایک خدا غزل سنا تو زیت جگر نہ کر
انور حبیب..... کوئٹہ

یوں بے خودی شوق میں مد سے گزر گئے
ہم بے خبر رہے وہ یمنیں سے گزر گئے

علمی آزمائش کے اس مفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجے والے پانچ قارئین کو ماہانہ مسرگزشت، مسپنس ڈائجسٹ، جاسوس مسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ”یک صبحی سرگزشت“ کے عنوان تلے مفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور بھر سوچے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ذاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 جون 2017 تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

خالد جہانگیر خان نے انڈین ٹیم کے رکن کی حیثیت سے 1932ء میں انگلستان کے خلاف ٹیسٹ میچ کھیلا۔ دو خالد زاد جاوید برکی اور ماجد خان نے ٹیسٹ میچوں میں پاکستانی ٹیم کی قیادت کی۔ بچپن و لڑپن لاہور میں گزرا۔ وہیں ایک قریبی عزیز جاوید زمان خان نے اسے ابتدائی سطح پر کرکٹ کی تربیت دی۔ 1974ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی کی کرکٹ ٹیم کی قیادت کی۔ پہلی ٹیسٹ ستمبر 81-1980ء میں ویسٹ انڈیز کے خلاف لاہور میں بنائی۔ 1982ء میں انگلینڈ کے دورے کے لیے پاکستانی ٹیم کی قیادت کی اور لاہور کے مقام پر انگلینڈ کو تاریخی شکست دی، جس میں حسن خان کا ان کے بارے میں کہنا تھا۔ ”وہ بہت اچھا کھلاڑی اور اچھا کپتان ہے۔ آج تک وہ بلاوجہ کسی سیاست میں نہیں الجھا۔“ مگر آج کل وہ سیاست میں اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔

علمی آزمائش 136 کا جواب

جگر مراد آبادی 1893ء کو بنارس میں پیدا ہوئے۔ اردو کے شعراء میں ایک بڑا نام ہے۔ غزل گوئی کی وجہ سے ان کا مقام بہت بڑا مانا جاتا ہے۔ 9 ستمبر 1960ء کو گوندہ میں انتقال ہوا۔

انعام یافتگان

1- احسان خان (کوئٹہ) 2- ذیشان افضل (ملتان) 3- نوید حبیب (کراچی)

4- فیض الحسن (کراچی) 5- روی بانو (سکر)

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے قمر زمان قمر، جہانزیب احسن، شاہین اجمل، جاوید احمد، ابرار احمد، جبران صدیقی، سلطان فتح، ملائکہ

اور یس، احسان گل، عارف جال، احمد رشید، صاحبہ بلوچ، حریم فاطمہ، مدثر حسن خان، اور یس خان، وحید حسن، اشفاق حسن۔ لاہور سے بلقیس بیٹ، بتول جعفری، عیش صدیق، بیٹی، زرین سلمان، مجید آفریدی، شہباز خان، مدثر ملک، ریاض الحسن، نازش سیال، ہادی کبیر، کمال حسن، محمد انور، خواجہ صدیق، محمد احسن، کامران احمد، خالد ملک، زرین مجید، رمضان علی، ریاض پاشا، آصف بیٹ، شاہ انور۔ پٹنڈی سے انور خان، حمید الحق، نقیہ ملتان، طلعت امتیاز، اعظم الدین خان، نسیم اسلم صدیقی۔ اسلام آباد سے شاہد ایاز، اسلم ملک، شفیق حسن، صداقت علی، غزالہ حسن، شاکر علی، انور بلوچ، جمیل احمد، توفیق بیچہ، حنیف علی محمد، طارق خان، چراغ حسن، امجد علی، جمیل لوری۔ حیدرآباد سے ندیم حسن، عبید الرحمن، عبدالجبار، عنایت انصاری، جنید حسن، عثمان فصیح الدین، جمیل احمد، عطا اللہ انصاری، ضیف شاہ، محمد اقبال حسن، عمری خان اچکزئی۔ سیالکوٹ سے عباس احمد صدیقی، نسرن ایاز، سوموند، جاوید احمد، انعام احسن، آصف محمد شاہ، اقبال علی، نسیم الدین، خواجہ جاوید، محمد خان، وزیر علی پاشا۔ پشاور سے مختار احمد، شاہ علی، نسیم شاہ بخاری، عنایت کبیر، نیاز شاہ نواز، حسین طوری۔ کوئٹہ سے اشرف محمد خان، نیاز حسن، فرقان، احمد ممتاز، عمیر احمد، محمد دانش، افتخار خان۔ ملتان سے محمد امین چشتی، رضیہ سلطان، وسیم علی احمد، فرحان سرور، فتح فرید، ظفر احمد، اقبال علی۔ رحیم یار خان سے آصف ملک، ماہ زیب، ایاز احمد، آصف ملک، مبین فاطمہ، شرمین فاطمہ، ماہ نور، عنایت ایاز احمد، شاہین احمد۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ سے ظہور احمد، بتول جعفری، اشفاق احمد، حریم، داؤد حسن۔ سرگودھا سے نسیم حیات، صاحب جان، جاوید ملک، عنایت بیٹ، رملہ فاروقی۔ حسن ابدال سے یاسین اشرف، نیما اشرف۔ مل جل ہزارہ سے دانش صدیقی، نسیم جنت نسیم۔ فورٹ عباس سے افتخار، سید محمد علی۔ اوکاڑہ سے درویشان حیات۔ میرپور سے کے سے شاہ بھٹ، فیروز لیاقت۔ انک سے شہباز احسن۔ چکوال سے مدثر علی، کوکب جمال۔ میرپور خاص سے انور کمال جہاں آرا۔ دہاڑی سے ریاض منور شاہ۔ سکسے سے کامران احمد، عبدالغنی، خالد کنور۔ کوٹ اڈو سے عباس خان، نظیر انصاری۔ بہاولپور سے صادق صدیق، بلقیس اختر۔ بہاولنگر سے محمد توفیق، رشید انور۔ جھک سے شازیہ ممتاز، رفیق سلطان۔ فیصل آباد سے میونس احمد، فیصل اختر، راجن پور سے علی زریون، افضل خان۔ گوجرانوالہ سے نعمان حسن، رحیل احمد۔ ساکھڑ سے جبران توفیق، محمد قمر، جہانزیب۔ چترال سے ثمر اختر۔ ڈیرہ غازی خان سے عنایت حسن۔ جھک سے عباس علی، عنایت بیٹی۔ جھک سے فرقان فتح، انیس احمد جاوید، امجد بخاری، عامر سمیل، شاہ احمد، آس محمد، خالدہ فاروقی، اور یس محمد خان۔ شادی پور سے ہارون، نیاز بیٹ، دانش علی، انورین اصغر۔ تلہ ٹنگ سے مرزا کلیم احمد، اختر عباس، صولت حیات، اشرف علی۔ فیصل آباد سے منور سلیم، عباس علی اصفہانی، دلاور حسن۔ بدین سے عباس علی ساندہ۔ کھاناں سے سلیم کامریڈ۔ چکوال سے فرحمن، عارف بیٹ۔ بہاولپور سے مہناز اکرم ملک۔ بہاولپور سے کلیم بخاری، علی علی اوسط زیدی، ہارون محمد، توصیف خان، ملک اختر عباس، الیاس حسن، عباس حیدر، تبیل خان، زاہد علی، طاہر حسن، الیاس اختر بیٹ، صدیق حسن صدیقی، ظفر احمد ظفر۔ پشاور سے سردار سونو سنگھ، ارباب محمد، فتح الحق، زریاب اچکزئی، نادر خان، امیر حسن، ساجد فرحت، نادر حسن زئی، باقر رضی طوری، بخش، نامید سلطان، انور حسن خان، انعم ممتاز، ذیشان فرحت اللہ، دارود خان۔ ساہیوال سے توصیف خان، حسن اختر، کمال الدین، ضیاء الاسلام۔ میرپور سے اسے کے کاظم علی بٹو۔ قصور سے صدیق بھٹی، اشرف بیٹ، عبدالخالق، نیاز حسین سید۔ خان بیلہ سے عنایت علی، یاسین فراز۔ سید محمد عرفان، مغری، گلشن، مشتاق، حبیب الرحمن عبدالرشید۔ لاہور سے خاقان صدیقی، عباس بیٹ عرف جھوٹا پہلوان، ظفر آسین، فیضان بیٹ، اسرائیلی خان، انعام افضل، وسیم انصاری، نیاز فیضان، حق فرید پراچہ، زاہد علی سید، نعمان خان، نفیس الدین، ارباب افضل رسول بخش، احمد پہلوان، اشرف علی ترڈی، نذر نیازی، ماہا خان، انیس احمد گل، رحمت اللہ خان، نوید شہباز، اشرف خان، محمد فیض بخش صدیقی، بتول زیدی۔ راولپنڈی سے ظفر اسماعیل، احمد شیراز، ظفر خان زادہ، سرفراز بیٹ، وسیم الدین، ہمانی، احمد نیاز، معقب الدین، عابد الدین، گل فراز مین، نامید عابد فرحت بانو، ملک ارشد، عبدالوہید، نوشاد کبیر، محمد حسین، سلمان نیازی، سرت بیٹ، نصیر نقوی، نعمان کلیم، عاجز ضیاء عابدی، یاسین خان، اشرف اللہ، بھٹین ظفر، بدر علی، خاقان اچکزئی، ظہیر باری، عمیرین بٹیکو، ضیا بٹیکو، آفتاب بیٹ، عنایت جعفری سید، مرزا ولد ارسلان، کائنات سید، قیام حسین، گل بدین، نذر حسین عابدی، طفیل آفاق، اشرف علی، عثمان عثمانی، بدر علی اور یس، نسیم ہارون، باسط علی۔ اسلام آباد سے یوسف شاہین۔

خود اعتمادی

جناب ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم

انسان میں اگر خود اعتمادی ہو تو وہ اپنی راہ کی ہر رکاوٹ کو ٹھوکر میں رکھ سکتا ہے۔ اس کی زندہ مثال میں خود ہوں۔ میں نے کس طرح حالات کا رخ موڑا اسے آپ بھی ملاحظہ کریں۔ میری زندگی تباہی کے قریب پہنچ چکی تھی لیکن میں نے خود اعتمادی کی بدولت بکھرتی ہوئی زندگی کو سنبھال لیا۔ ایسا کس طرح ممکن ہوا یہ میں نے بیان کر دیا ہے تاکہ لوگ سبق حاصل کریں۔

سعیدہ علی
(لاہور)



میں سمجھ گئی کہ وہ اپنی ماں کے خلاف کچھ سنتا نہیں چاہے۔ اس لیے میں نے بات بڑھانا مناسب نہ سمجھا۔ یہ تو مجھے بعد میں اندازہ ہوا کہ وہ اپنے بھائی بہنوں بلکہ خاندان کے کسی بھی فرد کے خلاف کچھ سنتا پسند نہیں کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس گھر میں میری حیثیت ایک نوکرانی سے زیادہ نہیں بلکہ نوکرانی بھی اپنے کام کا معاوضہ لیتی اور پختے میں ایک دن چھٹی کرتی ہے، جب کہ میں چوبیس گھنٹے کی ملازمہ تھی اور مجھے ہفتہ پانچ چھ گھنٹے سونے کے لیے ملتے تھے۔ ورنہ سارا دن گھر کے کاموں اور شوہر کی ناز برداری میں لگ جاتی تھی۔ پہلی تاریخ کو پہلی جب خرچ کے نام پر کچھ روپے مجھے دے دیا کرتے تھے ورنہ میں اپنی ہر ضرورت کے لیے ان کی محتاج تھی۔

بہت جلدی ساس کا اصل روپ میرے سامنے آ گیا۔ انہوں نے آہستہ آہستہ گھر کا سارا کام مجھ پر ڈال دیا اور خود دن بھر بیٹھیں، اخبار پڑھا کرتیں یا ٹیلی ویژن اپنے رشتے داروں یا ملنے جلنے والوں سے آپ بیتی

آپ سے ہوئی ہے، پورے گھر سے نہیں۔ ٹھیک ہے وہ میری بزرگ ہیں، ان کا ادب و احترام مجھ پر واجب ہے لیکن یہ بے جا پابندیاں مجھے قبول نہیں۔“

”ٹھیک ہے جو تمہارا دل چاہے کرو۔ میں اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ آپ بھی یہی چاہتے ہیں۔“
”یہ میں نے کب کہا؟“ وہ جلدی سے بولے۔
”لیکن ہماری کوشش یہ ہوئی چاہیے کہ انہیں شکایت کا کم سے کم موقع ملے۔“

”آپ نے وہی بات دوسرے پیرائے میں کہہ دی۔“ میں نے تضحیک کر کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ اب میں بھی کہیں نہیں جاؤں گی۔ آپ کہیں گے تب بھی نہیں۔“

”سعدیہ! تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ ذرا سی بات کا بیٹھل بنا رہی ہو۔ ضروری نہیں کہ امی کا موڈ اسی بات پر خراب ہوا ہو۔ کوئی اور وجہ بھی ہو سکتی ہے۔“ اس بار علی کا لہجہ قدرے نرم تھا۔

جب بھی میں اور علی کہیں گھومنے پھرنے جاتے تو میری ساس کا موڈ بگڑ جاتا اور وہ من لپیٹ کر لیت جاتیں۔ غالباً وہ یہ چاہتی تھیں کہ ہم پورے گھر کو ساتھ لے کر جائیں جو عملاً ممکن نہ تھا۔ مثلاً شادی کے کچھ دنوں بعد ہی علی کے کچھ دوستوں نے ایک گیسٹ ٹوگیدر پارٹی کا اہتمام کیا جس میں ان سب کی بیگمات نے شرکت کی۔ میں اور علی اس پارٹی میں چلے تو گئے لیکن میرا وہاں بالکل دل نہ لگا کیونکہ جانتی تھی کہ وہاں ہر کس روئے کا سامنا کرنا ہو گا اور بالکل ایسا ہی ہوا۔ ہماری واپسی رات گیارہ بجے کے قریب ہوئی۔ اس وقت عموں کا گھر کے سب افراد جاگ رہے ہوتے تھے لیکن اس روز سناٹا چھایا ہوا تھا اور سب لوگ اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ ہم دونوں میاں بیوی کا یہ معمول تھا کہ گھر واپس آنے پر ساس صاحبہ کو سلام ضرور کرتے تھے۔ جب علی نے ان کے کمرے میں جھانکا تو وہ من لپیٹ لٹی ہوئی تھیں۔ علی نے انہیں آواز دی تو انہوں نے کروٹ دوسری جانب کر لی۔ یہ گویا اشارہ تھا کہ وہ علی سے بات کرنا نہیں چاہتیں چنانچہ ہم دونوں خاموشی سے اپنے کمرے میں چلے آئے لیکن میرے لیے یہ صورت حال ناقابل برداشت تھی۔ چنانچہ میں نے علی سے کہا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ امی کو کیا ہو جاتا ہے۔ جب بھی ہم لوگ باہر جاتے ہیں ان کا موڈ بگڑ جاتا ہے۔ کیا وہ یہ چاہتی ہیں کہ میں تمہارے ساتھ باہر نہ جاؤں اور گھر میں پڑی سڑتی رہوں۔“

”ان کے اس رویے سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔“ علی نے دھیمے لہجے میں کہا۔

”لیکن میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔ میری شادی

میں بیاہ کر سسرال آئی تو مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ شوہر کا تو کہنا کیا، وہ پہلی رات ہی مجھ پر ٹو ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ ساس، سرورندیں اور دو پور سہیلی مجھ سے بڑی محبت سے پیش آئے۔ ایک مہینہ تک تو ساس نے مجھے کوئی کام نہیں کرنے دیا۔ وہ اپنی بیٹیوں کے ساتھ مل کر سارے کام نشتا لیتی تھیں۔ یہ سب کچھ مجھے بہت عجیب سا لگتا کیونکہ مجھے اپنے گھر میں کام کرنے کی عادت تھی اور میں یونیورسٹی سے آنے کے بعد گھر کے کاموں میں امی کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ شادی کے بعد بھی میں نے اپنی عادت کے مطابق کام کرنا چاہا لیکن ساس نے یہ کہہ کر روک دیا کہ کام کرنے کے لیے ساری عمر پڑی ہوئی ہے۔ یہ تمہارے گھومنے پھرنے کے دن ہیں، نئی دہن کام کرتے ہوئے اچھی نہیں لگتی۔

ایک طرح سے یہ اچھا ہی تھا کیونکہ میں اور علی روزانہ شام کو کہیں نہ کہیں گھومنے چلے جاتے۔ شروعات کے دو مہینے دھوئوں کی نذر ہو گئے۔ آئے دن میکے اور سسرال میں کہیں نہ کہیں کوئی دعوت ہوتی اور ان دھوئوں میں عموں کا گھر کے تمام افراد کو مدعو کیا جاتا تھا۔ صرف ایک بار ایسا ہوا کہ میرے ایک ماموں نے صرف مجھے اور علی کو دعوت پر بلایا جس پر ہماری ساس کا موڈ بگڑ گیا۔ انہوں نے اسے اپنی توہین سمجھا اور باتوں باتوں میں مجھے بہت کچھ سنا دیا۔ اس واقعے سے مجھے ان کی ذہنیت کا اندازہ ہو گیا۔ وہ چاہتی تھیں کہ ہر معاملے میں انہیں اہمیت دی جائے، اپنی اہمیت جتانے کے لیے ہی انہوں نے اب گھر کی کامیابی کے لیے داری مجھ پر ڈالنا شروع کر دی تھی۔ یہ پہلا سبق تھا جو مجھے سسرال میں سیکھنے کو ملا۔

اس کے علاوہ میں نے ایک اور بات نوٹ کی کہ

کرتیں، گوکہ بچن کی پورے ڈنٹے داری مجھ پر تھی لیکن میں اپنی مرضی سے کوئی چیز نہیں بنا سکتی تھی۔ گھر کا سارا خرچ ان کے ہاتھ میں تھا اور وہ اپنی مرضی سے خریداری کیا کرتی تھیں۔ میرے معاملے میں ان کا وہ ہر معاہدہ تھا۔ تمہاری میں وہ مجھے خوب کچھ بھی نہیں لیکن دوسرے لوگوں کے سامنے میری تعریف کرتے ہوئے ان کی زبان نہیں نکلتی تھی۔ علی بھی یہی سمجھتے تھے کہ وہ مجھے بہت چاہتی ہیں۔ میرا بہت خیال رکھتی ہیں۔ اس لیے اگر میں علی سے کوئی شکایت کرتی تو وہ اس پر بالکل بھی توجہ نہ دیتے بلکہ بعض اوقات تو مجھے ہی جھڑک دیتے۔

یہ صورت حال انتہائی تکلیف دہ تھی اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کا مقابلہ کس طرح کیا جائے۔ اس طرح ایک سال گزر گیا اور میں ایک پھول سے بچنے کی ماں بن گئی۔ عدنان کی پیدائش پر سب نے ہی خوشیاں منائیں۔ ساس صاحبہ تو اسے ایک ہل کے لیے اپنے سے جدا نہیں کرتی تھیں۔ وہ میرے پاس صرف فیڈنگ اور سونے کے لیے آتا تھا۔ میں وہاں بھی جیسے اپنے بچے کو گود میں لینے یا پیار کرنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ یہی بات میں نے علی سے بھی کہی تھی تو وہ بولے۔ ”تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ اسی کا اتنا خیال رکھتی ہیں اور تم با آسانی دوسرے کام کر سکتی ہو۔“

ایک دن مجھے سسر حسن کا خیال آیا۔ وہ سوشل ورکر تھیں اور ایک سماجی تنظیم چلاتی تھیں۔ ان سے میری ملاقات یونیورسٹی کے ایک سیمینار میں ہوئی تھی۔ انہیں نہ جانے میری کون سی بات پسند آئی کہ تھوڑی دیر گفتگو کرنے کے بعد ہی انہوں نے مجھے اپنا وزیٹنگ کارڈ دے دیا اور بولیں۔ ”اگر کبھی بھی میری ضرورت محسوس ہو تو بلا تکلف فون کر لیتا۔“ اتفاق سے وہ کارڈ میرے پاس محفوظ تھا۔ میں نے ان کا نمبر ڈائل کر کے اپنا تعارف کر دیا تو وہ فوراً مجھے پہچان گئیں۔

”کہو کیسے یاد کیا؟“ انہوں نے بڑی محبت سے پوچھا۔

”میڈم آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ ایک مشورہ کرنا ہے۔“

”ضرورتاً جب چاہو میرے پاس آ سکتی ہو۔“

”ٹھیک ہے میں ہفتے کے روز آؤں گی۔“

”آنے سے پہلے مجھے فون کر دینا تاکہ میں کہیں نہ جاؤں۔“

میں نے ہفتے کا دن بہت سوچ کر رکھا تھا۔ ویسے تو

میرا گھر سے نکلتا نہیں ہوتا تھا لیکن ہفتے والے دن میں امی کے گھر جایا کرتی تھی۔ اتواری شام علی مجھے لے آیا کرتے تھے۔ حیرت کی بات تھی کہ اتنی پابندیوں کے باوجود میری ساس نے سیکے جانے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ دراصل یہ بھی ان کی ایک چال تھی۔ اس طرح وہ میرے سیکے والوں کی نظر میں اچھی بننا چاہتی تھیں۔ ویسے بھی ہفتہ اتوار کو میری ہنڈیں گھر پر ہوتی تھیں۔ اس لیے کام کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

ہفتے کی سہ پہر میں نے اپنے چھوٹے بھائی ارشد کو ساتھ لیا اور سسر حسن سے ملنے ان کے دفتر پہنچی تھی۔ وہ میرا ہی انتظار کر رہی تھیں۔ انہوں نے ارشد کو دواہل بھیج دیا اور کہا کہ وہ خود مجھے گھر چھوڑ دیں گی پھر انہوں نے میرے لیے چائے اور اسٹیکس منگوائے اور بولیں۔ ”اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟“

میں نے انہیں شادی سے لے کر اس وقت تک کے تمام واقعات اور حالات سے آگاہ کیا۔ ساس، تندوں اور شوہر کے رویے کے بارے میں بتایا۔ اپنی بے بسی اور مظلومیت کا رونا روایا۔ وہ بڑے سکون اور توجہ سے میری داستان سنتی رہیں۔ سچ سچ میں کوئی سوال بھی کر لیتیں، جب میں نے اپنی بات ختم کی تو انہوں نے کرسی کی پشت سے ٹک لگایا اور بولیں۔ ”تم نے اونٹ اور خیرے والی کہانی سنی ہے؟“

”جی ہاں۔“ میں نے کہا۔ ”شاید یہ کورس کی کتابوں میں بھی ہے۔“

”بس تو تم بھی اونٹ بن جاؤ اور بد کو خیرے سے نکال باہر کرو۔“

”آپ بھی کمال کر رہی ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ اس وقت تو یہ حال ہے کہ میں گھر کی ایک چیز بھی ادھر سے ادھر اٹھا کر نہیں رکھ سکتی پھر پورے خیرے پر کس طرح قبضہ کر سکتی ہوں۔“

”میں اسی طرف آ رہی ہوں۔ دیکھو یہ اقتدار کی جنگ ہے اور تمہیں اسے ہر حال میں جیتنا ہے۔“

”وہ کس طرح؟“

”وہی بتا رہی ہوں۔ تم نے بتایا کہ ساس نے گھر کی پوری ڈنٹے داری تمہارے اوپر ڈال دی ہے لیکن تم بے اختیار ہو۔ اپنی مرضی سے بڑی بھی نہیں خرید سکتیں اور نہ ہی اپنی پسند کا کھانا بنا سکتی ہو۔ تمہارے بچے پر بھی انہوں نے قبضہ بنا رکھا ہے۔ کیوں میں ٹھیک کہہ رہی ہوں؟“

”جی بالکل ٹھیک ایسا ہی ہے۔“

”اب میری دو تین باتیں غور سے سنو۔ سب سے پہلے تو تمہیں اپنے دل سے سسرال والوں اور شوہر کا خوف نکالنا ہوگا۔ وہ تمہاری طرح گوشت پوست کے انسان ہیں۔ کوئی شیر بھیڑیے نہیں جو تمہیں کھا جائیں گے۔ ذہین بن جاؤ۔ تمام چیزیں اپنے کنٹرول میں کر لو۔ سب سے پہلے تو اپنے بچے پر قبضہ جماؤ۔ بھانے بھانے سے اسے اپنے کمرے میں لے جاؤ اور دیر تک اپنے پاس رکھو۔ وہ چاہے کتنی آوازیں دیتی رہیں۔ بچے کو لے کر ان کے پاس ہرگز نہ جاؤ اور اگر وہ خود لینے آئیں تو کسی بھانے انہیں مال دو۔ رفتہ رفتہ انہیں احساس ہو جائے گا کہ وہ بچے کی ماں نہیں بلکہ دادی ہیں اور اسے اپنی حقیقی ماں سے زیادہ دور نہیں رکھا جاسکتا۔“

دوسرا مرحلہ شوہر کو قابو کرنے کا ہے۔ اس کے لیے تمہیں ان کا دل جیتنا ہوگا۔ تو تم بتا ہی چکی ہو کہ وہ تمہیں بہت چاہتے ہیں لیکن جب عورت گھر داری میں مصروف ہو اور ایک بچے کی ماں بھی بن جائے تو اس کی توجہ اپنے آپ پر سے ہٹ جاتی ہے جب کہ شوہر اسے بنا سونورا دیکھنا چاہتے ہیں، تمہارے حلیے ظاہر ہو رہے ہیں کہ تم نے بھی اپنے آپ پر توجہ نہ دیا ہے۔ ایک بات یاد رکھو جن مردوں کو اپنی بچی میں چارم نظر نہ آئے، وہ ادھر ادھر بھٹکتے نکلتے ہیں۔ تمہیں اس خطرے کا سد باب کرنے کے لیے ابھی سے تیار ہو جانا چاہیے۔ تم نے بتاؤ کہ علی کو کس لباس میں اچھی لگتی ہو یا وہ تم سے کون سا لباس بار بار پہننے کی فرمائش کرتے ہیں۔“

”انہیں ساڑی بہت پسند ہے۔ ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ میں ساڑی پہنا کر ہوں۔“ میں نے جھینپتے ہوئے کہا۔

”بس تو تم ساڑی کا استعمال زیادہ کرو۔ ان کے ساتھ کسی تقریب میں جاؤ تو ساڑی ہی پہنا کرو، وہ جب شام کو گھر آئیں تو کسی فلمی ہیروئن کی طرح بن سونو کران کا استقبال کرو۔ شام کی چائے کے ساتھ ان کی پسند کی کوئی چیز بنالیا کرو اور ان کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیا کرو۔“

”آپ بھول رہی ہیں کہ میں اپنی مرضی سے کچھ نہیں بنا سکتی۔ ہر کام کے لیے ساس صاحبہ کی اجازت ہوتی ہے۔“

”اس معاملے میں تمہیں تھوڑا سا ڈھٹ ہونا پڑے گا۔ اگر تم شوہر کے لیے کوئی چیز بناؤ گی تو وہ تمہیں منع نہیں کریں گی اور اگر وہ تمہیں ایسا کرنے سے روکیں تب بھی تم اپنا کام کرتی رہنا۔ تمہارے خود ہی خاموش ہو جائیں گی۔“

”ایک اور اہم بات یہ ہے کہ تمہیں علی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا ہے۔ جب وہ گھر میں ہوں تو تم دوسرے لوگوں کو بالکل نظر انداز کر کے ان کے ساتھ چپک جاؤ۔ آئے دن کسی نہ کسی بھانے ان کے ساتھ باہر چل جایا کرو۔ کبھی ڈاکٹر کے یہاں جانا ہے تو بھی بازار۔ علی کے دوستوں اور اپنی سہیلیوں کے گھر جانا شروع کر دو۔ ہو سکے تو کم از کم ہفتے میں ایک بار ان سے فرمائش کرو کہ وہ تمہیں کسی ایجنے سے ریسٹورنٹ میں کھانا کھلائیں۔ بھلیا تمہاری ساس کو یہ بہت ناگوار گزرنے کا اور وہ اس پر اعتراض بھی کریں گی لیکن تم ڈھٹ بن جانا اور اپنی روش جاری رکھنا۔ اس طرز عمل سے تم انہیں یہ یاد کر سکتی ہو کہ میرا شوہر صرف میرا ہے اور جس دن یہ بات ان کی سمجھ میں آئی وہ خاموش ہو جائیں گی۔“

”یہ اتنا آسان نہیں جیسا آپ سمجھ رہی ہیں۔ وہ کبھی بھی یہ برداشت نہیں کریں گی کہ میں علی کے ساتھ باہر جاؤں۔“

”وہ کیا کر لیں گی۔ تمہارا ہاتھ تو نہیں پکڑ سکتیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ تمہیں دو چار باتیں سنا دیں گی یا ناراضگی کے اظہار کے لیے منہ لپیٹ کر لیت جائیں گی۔ ان باتوں سے تمہاری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ تم اپنی روش جاری رکھنا۔ اس طرح اپنی ساس کو یہ جتا سکو گی کہ تمہیں اپنی آزادی اور خود مختاری میں کسی کی مداخلت گوارہ نہیں۔“

”میں آپ کے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کروں گی لیکن مجھے نہیں لگتا کہ یہ اتنا آسان ہوگا۔“

”یہ اسی وقت آسان ہو سکتا ہے جب تم اپنے دل سے سسرال کا ڈر اور خوف نکال دو اور اس کا واحد حل یہی ہے کہ تم ڈھٹ بن جاؤ، کوئی کچھ بھی کہتا رہے، کسی کی مت سنو۔ وہی کرو جو تمہارا دل چاہے آہستہ آہستہ سب کی زبانیں خاموش ہو جائیں گی۔“

یہ کہہ کر وہ لمحو بھر کے لیے رکیں اور پھر مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولیں۔ ”اب میں تمہیں سب سے اہم بات بتا رہی ہوں جس پر عمل کر کے تمہاری زندگی پر سکون ہو سکتی ہے اور تم پورے گھر پر راج کر سکتی ہو۔“

میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”یہ کیسے ممکن ہے؟“

”سب کچھ ممکن ہے اگر تم ہمت کرو۔“ وہ بڑے اطمینان سے بولیں۔ ”تمہارا کہنا ہے کہ ساس نے گھر کی

ساری ڈتے داری تمہارے اوپر ڈال دی ہے اور خوب کاموں سے بری اللہ ہو گئی ہیں۔ میرا ماننا ہے کہ جو کام کرتا ہے۔ اسے اختیار بھی چاہیے اور بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ اگر اختیارات مانگتے سے نہیں ملتے تو جین لے جاتے ہیں۔ تمہیں بھی یہی کرنا ہوگا۔ مثلاً کھانا تم کو پانی ہو لیکن ساس سے پوچھنا پڑتا ہے کہ آج کچے کا۔ بھیجی امی پند اور مرضی کے مطابق بھی کھانا بنایا کرو۔ پھر دیکھو وہ کیا کہتی ہیں اگر بولیں تو اسے نظر انداز کرو اور اگر خاموش ہیں تو انہیں مکمل طور پر اس ڈتے داری سے سبکدوش کرو۔ اس طرح گھر کے معاملات آہستہ آہستہ اپنے کنٹرول میں کر لو پھر دیکھنا ایک وقت ایسا آئے گا کہ سب لوگ ہر بات کے لیے تمہارے محتاج ہو کر رہ جائیں گے۔ انہیں زیرو یا دو اور خود ہیرو بلکہ ہیروئن بن جاؤ۔

”آپ کی باتیں ناقابل یقین لگتی ہیں۔“ میں نے الجھتے ہوئے کہا۔ ”آپ میری ساس کو نہیں جانتیں۔ وہ کس نقاش کی عورت ہیں۔ انہوں نے ہر چیز پر قبضہ کیا ہوا ہے۔“ دیکھو منزل تک پہنچنے کے لیے پہلا قدم اٹھانا ضروری ہوتا ہے۔ جب تم یہ قدم اٹھاؤ گی تو وہ کچھ جائیں گی کہ ان کا وقت پورا ہو چکا ہے۔ ان کی جگہ لینے کے لیے تم آگئی ہو اور انہیں ریٹائر ہو جانا چاہیے۔ حکومت بھی ساتھ سال کی عمر کو پہنچنے پر اپنے ملازمین کو ریٹائر کر دیتی ہے پھر تمہاری ساس کو یہ حق سنے دیا کہ وہ تاحیات گھر کی ملکہ بنی رہیں۔“

میں دم بخود ان کی باتیں سن رہی تھی۔ مجھے گوگو کے عالم میں دیکھ کر وہ بولیں۔ ”یہ ایک ایسا جوا ہے جس میں تمہارے پاس ہارنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ البتہ جیتنے کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔ اگر تمہیں کسی کی ناراضی کا ڈر ہے تو اسے دل سے نکال دو۔ یہ لوگ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اس وقت وہ حاکم اور تم محکوم ہو اگر تم نے میرے مشوروں پر عمل کیا تو ایک دن اس کے الٹ ہو جائے گا۔ یعنی تم حاکم اور وہ محکوم ہوں گی۔“

”ناممکن۔“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔
”مجھے اس لفظ سے چڑ ہے۔ دنیا میں کوئی کام ناممکن نہیں اور وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو ناممکن کو ممکن بنانے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اگر تم صبح منوں میں آزادی اور خود مختاری چاہتی ہو تو میرے کہے پر فوراً عمل شروع کرو۔“

گھر آنے کے بعد میں بھی بہت دیر تک ان کی باتوں پر غور کرتی رہی۔ بظاہر یہ ناممکن نظر آ رہا تھا لیکن دل نے صلاح دی کہ کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ مسز حسن نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ واقعی میرے پاس کھونے کے لیے کچھ نہیں ہے پھر مجھے کس بات کا ڈر، چنانچہ میں نے یہ جوا کھینے کا فیصلہ کر لیا۔ پہلا مرحلہ بنے کون سے دور کرنے کا تھا۔ میں نے یہی کیا۔ جتنی دیر کام کرتی۔ عدنان میری ساس کے پاس رہتا۔ اس کے بعد میں اسے سلانے کے بہانے اپنے کمرے میں لے جاتی اور پورے وقت ہی اپنے پاس رکھتی۔ اگر وہ کہیں بھی تو کوئی بہانہ کر کے انہیں ٹال دیتی۔ رفتہ رفتہ وہ سمجھ گئی کہ میں بچے کو اپنے پاس ہی رکھنا چاہتی ہوں پھر انہوں نے اسے بلانا چھوڑ دیا۔ اب یہ میری مرضی پر منحصر تھا کہ عدنان کو کب اور کتنی دیر کے لیے ان کے پاس چھوڑتی ہوں۔ میں نے مسز حسن کو فون کر کے یہ بات بتائی تو وہ بولیں۔ ”میں نے کہا تھا نا کہ وہ کچھ نہیں کر سکتیں۔ اسی طرح تم دوسرے مشوروں پر بھی عمل کرو۔ اللہ نے چاہا تو اچھا نتیجہ سامنے آئے گا۔“

دوسرا مرحلہ شوہر کو قابو کرنے کا تھا۔ مسز حسن کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے سب سے پہلے میں نے اپنے آپ پر توجہ دینا شروع کی۔ گھر کے قریب ہی ایک بیوٹی پارلر تھا۔ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر میں نے چھوٹی نند کو ساتھ لیا اور وہاں چلی گئی۔ یہ بھی میری ایک چال تھی۔ اگر اکیلے جاتی تو ساس کے پیٹ میں درد شروع ہو جاتا۔ لیکن بیٹی کے ساتھ جانے پر انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ میں نے فیصل کر دیا، بیٹنوں، بیٹنوں اور رشوت کے طور پر نندی بیٹنوں بھی بنواؤں۔ وہ بے چاری بھی خوش ہو گئی۔ فیصل کرانے سے میرے چہرے پر نکھار آ گیا۔ گھر آنے کے بعد میں نے لباس تبدیل کیا۔ علی کے آنے کا وقت ہو رہا تھا میں ہلکا سا میک اپ کر کے ان کے انتظار میں بیٹھ گئی۔ جیسے ہی گاڑی کے پارن کی آواز آئی میں تیزی سے چلتی ہوئی بیرونی دروازے پر گئی اور ایک بھر پور مسکراہٹ کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ انہوں نے مجھے حیرانی سے دیکھا اور بولے۔ ”کہیں جانے کی تیاری ہے؟“

”کیوں؟“ اپنے گھر میں بننے سنور نے پر پابندی ہے کیا؟“

”ارے نہیں، میں تو یوں ہی کہہ رہا تھا۔“

میں ان کے ساتھ چلتی ہوئی کمرے میں آئی تو انہوں

نے مجھے اپنے قریب کرتے ہوئے سرگوشی کے اعزاز میں کہا۔ ”آج تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔“

”اس سے پہلے بری لگتی تھی کیا؟“ میں نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔

”ارے نہیں میری جان، بس تم اسی طرح بنی سنوری رہا کرو۔“ وہ بہت رو مانگ ہو رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کوئی پیش قدمی کرتے میں نے اپنے آپ کو الگ کرتے ہوئے کہا۔

”آپ فریض ہو جائیں۔ میں چائے بناتی ہوں۔“

میں نے بیسن پہلے سے گھول کر رکھا ہوا تھا۔ جلدی جلدی پکڑے تھے، چائے بنائی۔ ایک پلیٹ میں بسکٹ رکھے اور سارا سامان کھانے کی میز پر بچا دیا۔ جانتی تھی کہ علی کو پکڑے بہت پسند ہیں لیکن ساس صاحبہ کی نظر میں تو شام کی چائے بھی ایک فضول خرچی تھی۔ پکڑے کہاں سے بننے علی منہ ہاتھ دھو کر آئے تو چائے کے ساتھ پکڑے اور بسکٹ دیکھ کر خوش ہو گئے اور بولے۔ ”آج تو تم نے بڑا اہتمام کر ڈالا۔ کیا کوئی خاص بات ہے؟“

”نہیں کوئی خاص بات نہیں۔“ میں نے ساس صاحبہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو پکڑے پسند ہیں اس لیے بنا لیے۔“

میری بڑی نند بولی۔ ”واہ بھابی! آج تو چائے پینے کا مزہ آ گیا۔“

ساس صاحبہ سے یہ کیسے برداشت ہوتا کہ کوئی میری تعریف کرے، فوراً بولیں۔ ”بھوڑا دیکھ بھال کر خرچ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ مبینا پورا ہونے سے پہلے ہی سامان ختم ہو جائے۔“

علی ہنستے ہوئے بولے۔ ”کوئی بات نہیں اور آجائے گا۔“

”پھر تم ہی لانا، میری اتنی محبتیں نہیں کہ بار بار چیزیں منگواؤں۔“

علی نے کوئی جواب نہیں دیا اور حیرے سے پکڑے کھاتے رہے۔ گھر کے سبھی لوگوں کو یہ اہتمام پسند آیا تھا۔ اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا کہ ساس کچھ بھی کہتی رہیں لیکن میں روزانہ شام کی چائے کے ساتھ کوئی نئی چیز ضرور بنایا کروں گی۔

اس روز علی بہت زیادہ رو مانگ ہو رہے تھے۔ رات سونے کے لیے لیٹے تو انہوں نے مجھے اپنے قریب کر لیا

حالا نکہ ہمارا پروگرام ہفتے کی شب ہوا کرتا تھا لیکن اس رات وہ کچھ زیادہ ہی سے میرے ہو رہے تھے۔ میں نے بھی کوئی مزاحمت نہیں کی کیونکہ شوہر کی خواہش کا احترام کرنا میرا فرض تھا۔ دوسرے ان کزدو لمحوں سے فائدہ اٹھا کر ان سے کچھ باتیں منوانا چاہتی تھی۔ جب وہ سونے لگے تو میں نے ان سے کہا۔ ”میرا دل چاہتا ہے کہ روزانہ چائے کے ساتھ کچھ بناؤں لیکن۔“

”ہاں ہاں بولورک کیوں گئیں۔“

”گھر کا سارا خرچ امی کے ہاتھ میں ہے۔ اگر آپ مجھے کچھ پیسے دے دیں تو تھوڑا سا سامان لاکر رکھ لوں تاکہ انہیں کوئی شکایت نہ ہو۔“

”ٹھیک ہے صبح دے دوں گا۔“ وہ کدوٹ لیتے ہوئے بولے۔

”ایک بات اور۔“ میں نے ان کا کندھا جکڑتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے آج شید دل کی خاف وری کی ہے اس کا جربانا ادا کرنا ہوگا۔“

”کیسا جربانا؟“

”ہفتے کی شب آپ مجھے کسی ایسے سے رینٹورنٹ میں کھانا کلائیں گے ورنہ۔“

”ورنہ کیا؟“

”پھر نا میں نا میں فش، پھر کوئی پروگرام نہیں ہوگا۔ میں امی کے گھر چلی جاؤں گی۔“

”ارے ایسا غضب مت کرنا۔ مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔“

”صرف میں اور آپ جائیں گے۔ پورے گھر کو دعوت دینے کی ضرورت نہیں۔“

”سوچ لو، میرا تو کچھ نہیں بگڑے گا۔ تم کو ہی باتیں سننا ہوں گی۔“

”سن لوں گی۔ میرا بھی حق بنتا ہے کہ کچھ وقت آپ کے ساتھ گزاروں۔“

”ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔“

دوسرے دن انہوں نے مجھے دفتر جانے سے پہلے پانچ ہزار روپے دیے اور بولے۔ ”اس کی بیک بھی امی کو نہیں پڑنی چاہیے ورنہ وہ میرا جینا عذاب کروں گی۔“

”جب میں سامان لے کر آؤں گی تو وہ پوچھیں گی

نہیں کہ اس کے لیے پیسے کہاں سے آئے؟“

”کہہ دینا کہ تم نے جب خرچ ہے بچا کچھ پیسے جمع

کیے تھے۔

میں بازار گئی اور مختلف چیزیں تیار کرنے کے لیے مچلی، مرغی، آلو، حبش، سموسے بنانے کی درقیاں، لٹائو ساس اور مختلف قسم کی چٹنیاں لے کر آگئی۔ ساس نے جو یہ سامان دیکھا تو ان کا بارہ ایک دم ہائی ہو گیا اور بولیں۔ ”یہ اتنا سارا سامان کس خوشی میں لائی ہو کیا کوئی دعوت ہو رہی ہے؟“

”علی چاہے ہیں کہ روزانہ شام کی چائے کے ساتھ کوئی نہ کوئی چیز بنایا کروں۔ یہ سامان اسی لیے لے کر آئی ہوں۔“

”جیسے علی نے دیئے تھے؟“ انہوں نے تہنیتیں کرنے کے انداز میں پوچھا۔

”جی نہیں، اپنے پاس سے لائی ہوں۔ میں نے اپنے جب خرچ میں سے کچھ پیسے بچائے تھے اسی سے یہ سامان لائی ہوں۔“

”میری نظر میں یہ فضول خرچی ہے۔ اس سے تو بہتر تھا کہ تم اپنے لیے کوئی چیز لے آتیں۔“

میں نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ان سے بحث کرنا بے کار تھا۔ وہ ہمارے ماننے والوں میں سے نہیں تھیں اور اپنی بات اور پرکھتی تھیں۔ اس روز بھی میں نے علی کے آنے سے پہلے لباس تبدیل کیا۔ کچن میں جا کر مرضی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بنائے اور ان پر مصالحہ لگا دیا۔ آج میرا کچن ٹیکس بنانے کا پروگرام تھا۔ اس کے ساتھ آلو کے چپس بھی رکھتے تھے۔ ان کا سوس سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آئی۔ منہ ہاتھ دھو کر ہلکا سا میک اپ کیا اور بالوں کو کھلا چھوڑ دیا۔ علی کو یہی انداز پسند تھا۔

اس روز بھی میں نے دروازے پر جا کر ایک دگش مسکراہٹ کے ساتھ ان کا استقبال کیا اور ان کے ساتھ چلتی ہوئی کمرے میں آئی۔ انہوں نے ستائشی نظروں سے مجھے دیکھا اور بولے۔ ”آج تو تم قیامت ڈھا رہی ہو۔“

میں نے شرماتے ہوئے کہا۔ ”شکر ہے کہ آپ کو بھی میری تعریف کرنے کا خیال آیا۔“

”اس سے پہلے تم نے موقع ہی کب دیا۔ بس تم اسی طرح رہا کرو۔ اچھی لگتی ہو۔“

”جو ختم سرکار کا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آپ فریش ہو کر آجائیں۔ آج میں نے آپ کے لیے ایک خاص چیز بنائی ہے۔“

میں نے جلدی جلدی ٹیکس اور آلو کے چپس تیار کیے۔ چائے بنائی۔ لٹائو ساس اور چٹنی کی بوتل پہلے ہی میز پر رکھ چکی تھی۔ سب لوگوں نے حے لے لے کر کھایا۔ چھوٹی تند بولی۔ ”بھالی! آپ کی بنائی ہوئی ہر چیز لا جواب ہوتی ہے۔ مجھے بھی سکھا دیں۔ میں کل سے کچن میں آپ کے ساتھ کام کروں گی۔“

”اور میں بھی۔“ بڑی تند بولی۔ ”مجھے تو کچھ بھی بنانا نہیں آتا۔“

”میرے ساتھ رہو گی تو بہت جلد سب کچھ سکھا دوں گی۔“

ساس کو یہ گفتگو پسند نہ آئی۔ انہوں نے دونوں لڑکیوں کو باری باری گھورا اور ترخ کر بولیں۔ ”کوئی ضرورت نہیں ہے وقت ضائع کرنے کی۔ تم دونوں اپنی پڑھائی پڑھو۔“

”پڑھائی تو رات کو ہوتی ہے۔ دن میں ہم فارغ ہوتے ہیں۔“ چھوٹی نے جواب دیا۔

علی نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی اور بولے۔ ”کیا حرج ہے اگر یہ کچھ سکھ جائیں تو آج کلے کرائی کے کام آئے گا۔“

اس کے بعد ساس صاحبہ کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ رہا اور وہ خاموش ہو گئیں۔ میں نے بھی سوچا کہ یہ ایک اچھا موقع ہے۔ اگر میں دونوں تندر کو ساتھ ملا دوں تو ساس صاحبہ تنہا ہو جائیں گی اور انہیں مجھ پر زبردستی کرنے کا حوصلہ نہیں ہوگا۔ میں جب رات کا کھانا بنانے لگی تو دونوں کو اپنے ساتھ لگا لیا اور ان سے کہا کہ وہ چند روز مجھے کھانا بناتے دیکھیں اور مختلف ترکیبیں اپنے پاس لکھتی جائیں۔ یہ میں نے اس لیے کیا کہ اگر ایک دم ان سے کام کرواؤں گی تو کہیں وہ گھبرانے لگیں۔

میرا اصل امتحان ہفتہ کی شام کو ہوا جب مجھے علی کے ساتھ کھانا کھانے کا باہر جانا تھا۔ اس روز میں نے گھر والوں کے لیے دو پھر میں ہی رات کا کھانا بنایا تھا۔ شام کو میں بن سنور کر علی کے ساتھ باہر جانے لگی تو ساس کا ہاتھ ٹھکا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہم ان سے اجازت لیے بغیر کہیں جا رہے تھے۔ ان سے برداشت نہ ہوا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق بولیں۔ ”اس وقت تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟“

ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر علی بولے۔ ”ایک دوست نے دعوت پر بلایا ہے۔ وہیں جا رہے ہیں۔“

”اور تم نے مجھے بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا۔“ وہ آنکھیں ٹٹکالتے ہوئے بولیں۔

”ابھی ٹھوڑی دیر پہلے ہی اس کا فون آیا تھا۔ میں نے سوچا کہ جاتے وقت آپ کو بتا دوں گا۔“ علی نے بڑی صفائی سے جھوٹ بولا۔

اب ساس صاحبہ کے پاس کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ دانت پیس کر رہ گئیں۔ اس رات ہم نے خوب انجوائے کیا۔ کھانے کے بعد ہم لوگ ساحل سمندر چلے گئے۔ چاندنی رات میں سمندر بہت حسین لگ رہا تھا۔ ہم کافی دیر سمندر کے کنارے چلتے رہے بارہ بجے کے قریب واپس ہوئی۔ گھر میں سنانے کا راج تھا۔ سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں دیکے ہوئے تھے۔ مجھے اسی رات کی توقع تھی لیکن میں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی اور علی کا ہاتھ پکڑ کر سیدھی اپنے بیدروم میں چلی گئی۔ جہاں ایک حسین رات ہماری منتظر تھی۔ میں نے علی کو پوری طرح اپنے عطر میں جکڑ رکھا تھا۔ سونے سے پہلے میں نے ان سے وعدہ لے لیا کہ اب ہم ہر ہفتہ کی شام باہر گزاریں گے۔

صبح دیر سے آنکھ کھلی۔ کچن میں گئی تو وہاں رات کے چھوٹے برتنوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اتوار کو ماسی بھی نہیں آتی تھی۔ اس لیے وہ سب برتن مجھے ہی دھونا پڑے۔ اس کام سے فارغ ہو کر ناشتا بنایا۔ سر صاحبہ کو ناشتے میں پراٹھے اور آلیٹ پسند تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی سب نے ہی اس کی فرمائش شروع کر دی لیکن اس روز میں نے میز تھیل کر دیا اور جاتے کے ساتھ ڈبل روٹی، مارجرین اور جیلی میز پر رکھ دی۔ ساس صاحبہ کیسے برداشت کر سکتی تھیں کہ ان کی مرضی کے خلاف کوئی تبدیلی کی جائے۔ یہ چیزیں دیکھتے ہی آگ بجولا ہو گئیں۔

”یہ کیا ہے، بو، اٹھ پراٹھے کیوں نہیں بنائے؟“

”جیس کا پریشانی نہیں ہے۔ بڑی مشکل سے تو چائے بنی ہے۔“ میں نے مصمومیت سے کہا۔ اس کے بعد وہ کچھ نہیں بولیں۔ میں نے ہت کر کے کہا۔ ”وہی آپ لوگوں کو اٹھ پراٹھے نہیں کھانے چاہئیں۔ اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جس کے نیچے میں بلڈ پریشر اور دل کے امراض لاحق ہو سکتے ہیں۔“

”بات تو سولہ آنے صبح ہے۔“ علی بولے۔ ”میں تو اب ڈبل روٹی سے ہی ناشتا کروں گا۔“

دونوں تندر نے بھی ان کی تائید کی اور بولیں۔

”بھالی! ہمارے لیے بھی پراٹھے نہ بنایا کریں۔ ڈبل روٹی ہی ٹھیک ہے۔“

سر صاحبہ بھی بول پڑے۔ ”تم ٹھیک کہہ رہی ہو بیٹی۔ واقعی یہ چیزیں ہی مضر صحت ہیں۔“

ساس صاحبہ کہاں ہار مانتے والی تھیں۔ ”بھئی تم لوگ کچھ بھی کہو۔ مجھے تو پراٹھے کے بغیر ناشتا کرنے کا حشر نہیں آتا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں آپ کے لیے ایک پراٹھا بنادیا کروں گی لیکن یہ آپ کی صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔“

اس کے بعد وہ خاموش ہو گئیں اور انہوں نے اپنی بات پر اصرار نہیں کیا۔ اس طرح میں نے بڑی ہوشیاری سے ناشتے کی مشقت سے اپنی جان چھڑائی۔ پھر دوپہر کے کھانے پر بھی یہی ہوا۔ میں نے ساس سے نہیں پوچھا کہ کیا بناؤں بلکہ علی کا بازار بیچ کر سبز یاں منگوا میں اور چائیز رائس کے ساتھ سبز یوں کا سبب بنا کر میز پر رکھ دیا۔ گھر کے سب لوگوں نے حے لے لے کر یہ کھانا کھایا۔ بڑی تند بولی۔

”اب ہمیں چائیز جانے کی ضرورت نہیں۔ بھالی تو گھر میں ہی چائیز کھانے بناتی ہیں۔“

میں نے کن انکھوں سے ساس کی طرف دیکھا۔ ان کا منہ سو جا ہوا تھا میں ان کے غصے کی وجہ جانتی تھی کیونکہ میں نے ان سے پوچھے بغیر اپنی مرضی سے کھانا بنایا تھا۔ اس موقع پر مجھے شرارت سوچی اور میں نے انہیں چیمیزنے کے لیے کہا۔

”امی آپ کچھ نہیں لے رہیں۔ کیا پسند نہیں آیا؟“

”بی بی! ہمیں تو دیکھی کھانے ہی اچھے لگتے ہیں۔ ہم سے یہ الا بلا نہیں کھائی جاتی۔“

”آپ کچھ کر تو دیکھیں۔ اگر حشر نہ آئے تو پیسے واپس۔“ یہ کہہ کر میں نے ان کی پلیٹ چادروں سے بھر دی اور اس پر ڈھیر سارا سوپ ڈال دیا۔ انہوں نے مصنوعی غصے سے کہا۔

”اب تم بھی مجھ سے مذاق کرو گی۔“ یہ کہہ کر انہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے پوری پلیٹ صاف کر دی۔ یہ میری پہلی کامیابی تھی جس پر میں خوشی سے پھولی نہ سہائی اور میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ شام کو میں نے فرائش، آلو کے چپس اور مرغی کا قورمہ بنایا۔ ان کھانوں کی بھی سب لوگوں نے دل کھول کر تعریف کی۔ ساس صاحبہ نے بھی کوئی خاص کتہہ چینی نہیں کی۔ بس اتنا ہی کہا کہ کھانے میں ایک ہی ڈش ہوئی چاہیے۔ ورنہ علی سے کہنا پڑے گا کہ گھر کے خرچ کے لیے زیادہ پیسے

ان کا کہنا بھی صحیح تھا کیونکہ سب نے پھیلی ہی کھا لی۔
 قورمہ کو کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ میں نے وہ سامان
 دوسرے دن کے لیے محفوظ کر لیا۔ اس کے بعد میں اپنی مرضی
 سے کھانا بنانے لگی۔ البتہ جب میری کچھ میں نہ آتا تو ان
 سے پوچھ لیتی کہ آج کیا کھاؤں۔ میں نے رسائل اور نیٹ
 سے کھانوں کا مختلف طریقہ سیکھیں اور آئے دن انہیں
 آزمانے لگی۔ سب مگر والے خوش تھے کہ انہیں نئی
 چیزیں کھانے کو مل رہی تھیں۔ گوکہ خرچ کچھ بڑھ گیا تھا لیکن
 میں علی سے پیسے لے کر پورا کر لیا کرتی تھی۔

اس طرح آہستہ آہستہ میں نے بہت سی چیزیں اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ اب نہ صرف یہ کہ بچن کا پورا انتظام میں نے سنبھال لیا تھا بلکہ سودا سلف بھی فروغ دلانے لگی۔ میری ساس نے بھی مینے کا سودا اکٹھا نہیں منکوا یا۔ جب کوئی چیز ختم ہو جاتی تو منکوائی تھیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ پیسے قسم ہو گئے تو ادھار سامان منکوا دیا۔ مجھے اس بات سے سخت چڑھی لہذا جب پہلی تاریخ آگئی اور علی نے انہیں مگر کے خرچ کے لیے پیسے دینے تو میں کالی لے کر ساس کے پاس بیٹھ گئی اور بولی۔ ”ای جو چیزیں منکوائی ہیں۔ ان کی فہرست بنوائیں۔ میں پورے مینے کا سودا لے آؤں گی۔“

یہ بات بھی میں نے ان کا دل رکھنے کے لیے کہہ دی تھی۔ ورنہ مجھے اعزازہ تھا کہ کون سی چیز کتنی مقدار میں آتی ہے۔ انہوں نے مجھے حیرت سے دیکھا جیسے میں نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو جو ان کی سمجھ میں آگیا کہ تبدیلی آگئی ہے اور اب وہی ہو گا جس چاہوں کی۔ لہذا کھست خوردہ لہجے میں بولیں۔ ”تم خود ہی فہرست بنالو۔ مکن تو تم ہی چلا رہی ہو۔ اس لیے کہیں اعزازہ ہو گا کہ کن چیزوں کی ضرورت بڑھتی ہے۔“

اس کے بعد میں نے ان سے کوئی بات نہیں کی۔ خود ہی گھومتی بھاگی۔ ان سے پیسے لیے اور علی کے ساتھ ایک بڑے پراستور میں چلی گئی۔ جس کے بارے میں مجھے معلوم تھا کہ وہاں بازار سے دس فی صد کم قیمت پر خالص اور معیاری چیزیں ملتی ہیں۔ میں جب سامان سے لدی پھندی گھر واپس آئی اور ساس کو باتیں پیسے واپس کیے تو وہ حیران رہ گئیں اور بولیں۔ ”میں نے تو حساب سے دیئے تھے پھر اتنے پیسے کیسے بچ گئے؟“

اس کے بعد میں نے گھر کے دوسرے معاملات بھی اپنے ہاتھ میں لینا شروع کر دیئے۔ مجھے کئی جگہ بے ترتیبی اور بد نظمی نظر آئی۔ صبح کے ناشتے میں انڈے پر پھاڑوں کا سلسلہ تو میں پہلے ہی ختم کر چکی تھی۔ اب میں نے کھانے کے انتظام پر توجہ دینا شروع کی۔ ہمارے گھر میں دو سو وقت کھانا چلنا تھا اور عام طور پر دوپہر کے کھانے میں دو شیش بنائی جاتی تھیں۔ پہلے ساس صاحبہ نے حکم دیا کہ وال چاول بنالو گھر خیال آیا کہ چھوٹی چاول نہیں کھاتی۔ اس کے لیے تھوڑا سا آلو قہرہ بھی بنالو۔ شام کو دوبارہ کوئی ڈش بنائی جاتی اور بچا ہوا کھانا فرنگ میں رکھ دیا جاتا۔ عام طور پر یہ لوگ فرنگ میں گوشت، دودھ، پھل اور بزیایں رکھتے ہیں۔ ہمارے گھر میں تین دن کے بیچ ہوئے سائن، بزی کی کھجیا اور بچی کوئی سلاور بھی ہوتی تھی۔ میں نے سب سے پہلے اس چیز کو ختم کیا۔ اب میں دوپہر کو ایک سائن بناتی جو دونوں وقت چلتا۔ اس کے دو فائدے ہوتے ایک تو میں دو دفعہ کھانا پکانے سے بچ جاتی اور دوسرے فرنگ میں بچا ہوا کھانا رکھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ میں ضرورت کے مطابق ہی کھانا بناتی تھی۔ اس لیے مجھے کس سوال ہی پیش نہیں ہوتا تھا اور اگر میں جاتا تو وہ دوسرے وقت کام آ جاتا۔

رفتہ رفتہ میں نے گھر کا سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ساس کی حیثیت ایک معزول ہیکر ان جیسی ہو گئی۔ گھر خدا کا کرنا ہی ہوا کہ وہ شدید بیمار ہو گئیں اور انہیں ایک نئے اسپتال میں رہنا پڑا۔ اسی دوران پہلی تاریخ آگنی علی نے گھر کے خرچ کے پے مجھے پکڑا دیے اور بولے۔
”تمہیں گھر کے اخراجات کے لیے پیسوں کی ضرورت ہو گی۔ یہ رکھ لو جو چاہیں گے وہاں کو دے دو۔“

مجھے واقعی بیویوں کی ضرورت تھی کیونکہ پہلی تاریخ کو ہمیں مینے کا سامان خریدنے اسنوہ جایا کرتی تھی۔ اس کے وہ ماسی، دھونی، پکڑے والے اور جو یکبارہ کو خواہ دینے کی ادائیگی بلوں کی ادائیگی کرتا ہوتی تھی۔ لہذا میں نے وہ پیسے رکھ لیے اور جب ساس صاحبہ مگر واپس آئیں تو میں نے پیسے انہیں دینا چاہے تو انہوں نے انکار کر دیا اور میں۔۔۔ جب تم سب کچھ اپنے ہاتھ سے خرچ کرتی ہو تو یہ مجھے بھی اپنے پاس ہی رکھو! اچھا نہیں لگتا کہ تم ہر بار میرے گے ہاتھ بھلاؤ۔۔۔“

اس طرح بالکل غیر محسوس طریقے سے گھر کا خرچ میرے ہاتھ میں آ گیا جو ہر عورت کی دلی تمنا ہوتی ہے۔ اب میں مکمل طور پر گھر کی مالک و مختار تھی۔ جو چاہتی پکارتی جو چاہتی کھلاتی۔ گھر کے لیے اپنی مرضی اور پسند سے چیزیں خریدتی۔ گھر کی تزئین و آرائش اپنی مرضی سے کرتی لیکن اس تمام آزادی اور خود مختاری کے باوجود میں نے ساس کی عزت و احترام میں کوئی کمی نہیں آنے دی۔ کوئی بھی نیا کام کرنے سے پہلے ان سے مشورہ ضرور کرتی۔ وہ بھی خوش ہو جاتیں کہ میں انہیں اتنی اہمیت دیتی ہوں۔ انہیں باقاعدگی سے وقت پر دوا میں دیتی۔ اگر علی کی کوئی مصروفیت ہوتی تو چیک اپ گئے لیے ڈاکٹر کے پاس بھی میں ہی لے کر جاتی۔ جب کبھی شاپنگ کے لیے گئی تو ان کے لیے ایک دوست یا چہل ضرور خرید کر لاتی۔ اس طرح نندوں کو بھی کچھ نہ کچھ دیتی رہتی تھی اور وہ بھی میری بہت عزت کیا کرتی تھیں۔

ایک ایک کر کے دونوں کی شادیاں ہو گئیں۔ سسرکا انتقال ہو گیا۔ عدنان نے اسکول جانا شروع کر دیا تھا۔ اس کی پڑھائی کی ذمہ داری بھی منجھ پر تھی۔ اسکول آنے جانے کے لیے تو دو بین گلوادھی تھی لیکن شام کو وہ قرآن ناظرہ کے لیے مدرسہ جایا کرتا تھا۔ میں ہی اسے چھوڑنے اور واپس لینے جاتی تھی۔ پھر اسکول کا ہوم ورک کروائی۔ میری کوشش ہوئی تھی کہ اس کے آنے سے پہلے پہلے ہی سارے کام نمٹ جائیں تاکہ میں پوری طرح انہیں وقت دے سکوں۔ میں نے ان کی عادتیں بگاڑ دی تھیں۔ شادی کے دس سال بعد بھی وہ ایک ہی چاچے کے میں پہلے کی طرح بن سنور کر ان کا استقبال کروں اور شام کی چائے کے ساتھ روزانہ کوئی نہ کوئی نئی چیز بتایا کر دوں۔

پھر اچانک ہی میری ہستی ٹھٹھکی زندگی میں بھونچال آگیا۔ نہ جانے غلطی کی خدمت اور نذر برداری میں کیا کی رو گئی تھی کہ ان کا دل مجھ سے بھر گیا اور وہ کسی دوسری عورت کی زلف کے اسیر ہو گئے۔ اس کا پتا مجھے بہت بعد میں چلا۔ ان دنوں وہ دیر سے گھر آنے لگے تھے۔ بعض اوقات تو ان کی واپسی دس گیارہ بجے تک ہوتی۔ میں نے پوچھا تو دفتر میں کام کی زیادتی کا بہانہ بنا دیا۔ میں نے کوئی خاص توجہ نہیں دی حالانکہ مجھے چوکنا ہو جانا چاہیے تھا کیونکہ اس سے پہلے بھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ ان کے کام کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ وہ ہمیشہ وقت پر گھر آ جاتے تھے۔ کچھ دن تو میں نے برداشت کیا لیکن جب ہر دوسرے تیسرے روز یہ ہوئے تو

تو میرا تھا خٹکا۔ ایک روز میں نے آٹھ بجے کے قریب ان کے دفتر کے نمبر پر فون کیا۔ کافی دیر ٹھہری جتنی رہی لیکن کسی نے فون نہیں اٹھایا پھر میں نے ان کے سوبائیل پر کال کی۔ وہ بھی بند تھا۔ گیارہ بجے کے قریب وہ واپس آئے میں نے مصنوعی خشکی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

”آخر یہ سلسلہ کب تک چلے گا۔ میں بھی آپ کے انتظار میں بمبئی کی بیٹی رہتی ہوں۔“

”کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ابھی کافی کام باقی ہے۔“ وہ مجھ

پرچا
نہیں ملتا

میں نے ان کے لئے ایسی مقامات سے یہ شکایات مل رہی تھیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچہ نہیں ملتا۔ لیکن ان کی کارکردگی کی بھرپور مثال کے لیے ہماری گزارش ہے کہ ہر پڑھنے کی صورت میں ۱۱:۱۱ سے ذرا پہلے ہمارے اندر یہ ذیلی مضمون نہ دیکھا جائے۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چا دستیاب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام -

☆ ممکن ہو تو مک اشال کا PTCL یا موبائل نمبر -

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

0301-2454188 **ثمر عباس**

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سپهر، حاسوی، یا کیزه، سرگزشت

C-63 فیروزہ ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی میں کوٹنگی روٹ کو چھ

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

سے نظر نہیں چراتے ہوئے بولے۔ ”تم کھانا کھالیا کرو۔ میرا کچھ پتا نہیں کہ کب واپسی ہو۔“
یہ تو میں سمجھتی تھی کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں پھر بھی میں نے انہیں کریدنے کی خاطر پوچھا۔
”پہلے تو یہی ایسا نہیں ہوا کہ آپ کو دیر تک رونا پڑا ہو۔ اب یہ کیوں سا کام نکل آیا؟“
”میری ذستے داریاں بدل گئی ہیں۔ ابھی نئی نئی بات ہے۔ اس لیے دیر ہو رہی ہے۔ کچھ دنوں میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

جب شوہر بیوی سے جھوٹ بولنے لگے تو اس سے الجھنے کی بجائے کسی دوسرے طریقے سے نمٹنا چاہیے۔ یہ بھی مسز حسن کا پڑھایا ہوا سبق تھا جو اس وقت مجھے یاد آگیا۔ چنانچہ میں نے بھی خاموش رہنا مناسب سمجھا اور اس صورت حال سے نمٹنے کی تدبیر سوچنے لگی۔ دوسرے روز میں نے علی کے دفتر فون کیا۔ وہ ہمیں باہر گئے ہوئے تھے۔ ان کے اسسٹنٹ امین نے فون اٹھایا۔ وہ مجھے جانتا تھا میں نے اس کے ایک دو چھوٹے موٹے کام کرا دیے تھے۔ ایک بار اسے قرض کی ضرورت پڑی جس کی وجہ سے وہ میرا احسان مند تھا اور میری بہت عزت کرتا تھا۔

”مٹی میڈم؟“ اس نے منودہانہ انداز میں کہا۔
”فرمائیے، کیسے یاد کیا؟“
”تم سے ایک ضروری کام ہے۔ کیا تھوڑی دیر کے لیے میرے پاس آ سکتے ہو لیکن تمہارے صاحب کو معلوم نہ ہو۔“
”میڈم آپ فکر نہ کریں۔ میں کوئی بہانہ بنا کر کچھ ٹائم میں آپ کے پاس آ جاؤں گا۔“

میں نے جلدی جلدی سارے کام نٹائے اور امین کا انتظار کرنے لگی۔ وہ ڈیڑھ بجے کے قریب آیا تو میں نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ میری ساس اپنے کمرے میں تھیں۔ ویسے بھی وہ ہر معاملے سے لاتعلقی ہو چکی تھیں اور انہیں کسی کے آنے جانے کا بھی پتا نہیں چلتا تھا۔ میں نے امین کے سامنے چائے رکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا میں امید کروں کہ ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو سینہ راز میں رہے گی؟“

”آپ مجھ پر بھروسہ کر سکتی ہیں میڈم۔“
”تمہارے صاحب ان دنوں تقریباً روزانہ ہی دیر سے گھر آ رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ دفتر میں کام زیادہ

ہونے کی وجہ سے دیر تک بیٹھنا پڑتا ہے لیکن جب میں نے ایک دن دفتر فون کیا تو کھنٹی بجتی رہی لیکن کسی نے فون نہیں اٹھایا۔ چنانچہ میرے دل میں شک پیدا ہوا تاکہ فطری سی بات ہے۔ اب تم مجھے بتاؤ گے کہ حقیقت کیا ہے؟“
”میڈم! میں کئی دنوں سے یہ حاشا دیکھ رہا ہوں۔ ایک دوسرے سوچا کہ آپ کا بتا دوں لیکن اس لیے خاموش رہا کہ آپ کو تکلیف ہوگی۔ دفتر سے تو وہ وقت پراٹھ جاتے ہیں لیکن ان کی شامیں میرا کے ساتھ گزرتی ہیں جو ان کی سیکرٹری ہے۔ اسے طلاق ہو چکی ہے اور اس کا کیرئیر بھی اچھا نہیں ہے۔ دفتر میں بھی کئی لوگوں سے طرٹ کر چکی ہے اور اب صاحب پر ڈورے ڈال رہی ہے۔ آپ کچھ کیجیے میڈم۔ اس سے پہلے کہ پانی سر سے اونچا ہو جائے۔“
”جب مردی تر آکر گھما جائے لگے تو عورت کچھ نہیں کر سکتی۔“ میں نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”بہر حال تمہارا شکر یہ کہ تم نے مجھے اتنی مفید معلومات دیں۔ ان کی دشمنی میں میں اپنا بالکل تیار کر سکتی ہوں۔ کیا تم میرا ایک کام کر سکتے ہو؟“
”آپ حکم کیجیے۔ میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں۔“

”تم کچھ روز تک ان دونوں کا قاتب کرو اور دیکھو کہ یہ کہاں وقت گزارتے ہیں اور ہو سکتے تو ان دونوں کی کچھ مشین کر تصدیق بھی لے لو۔ اس کے علاوہ مجھے میرا کی تصویر، اس کے گھر کا پتا اور فون نمبر بھی چاہیے۔“
”سب کام ہو جائیں گے اور میں روزانہ ان کی سرگرمیوں کی رپورٹ دیتا رہوں گا۔“
میں نے پرس کھول کر کچھ پیسے نکالے اور کہا۔ ”یہ رکھ لو۔ تمہیں ابتدائی اخراجات کے لیے ضرورت پڑے گی۔ بعد میں ادورے دوں گی۔“

اس نے پیسے لینے سے انکار کر دیا اور بولا۔ ”اس کام میں میرا کچھ خرچ نہیں ہوگا۔ موٹر سائیکل میں پیرول تو میں خود بھی ڈالوا سکتا ہوں۔“
اس وقت تک میرے ذہن میں کوئی پلاننگ نہیں تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں نے امین سے اس کام کے لیے کیوں کہا۔ میں کچھ دیر اس صورت حال پر غور کرتی رہی۔ اس پوری کہانی میں صرف ایک امید افزا بات تھی اور وہ یہ کہ میرا کیرئیر اچھا نہیں تھا اور مردوں سے طرٹ کرنا اس کا مشغلہ تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ علی کو بے وقوف بنانے کے بعد کسی

اور مرد کی طرف مائل ہو جائے کیونکہ ایسی عورتیں کبھی کسی ایک کی نہیں ہوتیں ورنہ وہ اپنے شوہر سے طلاق ہی کیوں لیتی۔
اچانک مجھے مسز حسن کا خیال آ گیا۔ میں نے فوراً ہی ان کا نمبر لایا اور بولی۔ ”کیا آپ مجھے کچھ وقت دے سکتی ہیں؟“

”تمہارے لیے میرے پاس وقت ہی وقت ہے۔ مسئلہ کیا ہے؟“

”یہ میں طے پر ہی بتاؤں گی۔ کب آ جاؤں؟“
”جاہو تو آ ہی آ جاؤ۔ اس وقت میں فارغ ہوں۔“
”ٹھیک ہے۔ میں آدھ گھنٹا میں آ رہی ہوں۔“

”میں نے عدنان کو دس چھوڑا۔ اس کی چھٹی پانچ بجے ہوتی تھی۔ گویا میرے پاس تین گھنٹے تھے۔ میں نے ساس صاحبہ کو بتا دیا تھا کہ میری ایک طے والی بہت بیمار ہیں۔ عدنان کو دس چھوڑ کر انہیں دیکھنے جاؤں گی۔ مسز حسن میرا ہی انتظار کر رہی تھیں۔ بڑے تپاک سے ملیں۔ میں نے انہیں پوری کہانی سنادی۔ امین کے بارے میں بھی بتا دیا۔ سب کچھ سننے کے بعد وہ بولیں۔ ”یہ تم نے اچھا کیا کر علی سے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی۔ بی الحال ان پر یہی ظاہر کرتی رہو کہ تمہیں کچھ پتا نہیں ہے۔“
”آپ کا مطلب ہے کہ انہیں یہ کھیل کھیلنے دوں اور خاموشی سے حاشا دیکھتی رہوں۔“

”اس کے علاوہ تم کبھی کیا سکتی ہو۔ کیا تمہارے کہنے یا لانے جھگڑنے پر وہ اس لڑکی سے ملنا چھوڑ دیں گے۔ یاد رکھو مرد کی فطرت میں ضد کا عنصر بہت زیادہ ہوتا ہے تم جس کام سے انہیں روکو گی۔ وہ اتنا ہی زیادہ کریں گے۔“

”پھر میں کیا کروں؟“ میں نے بھرتائی ہوئی آواز میں کہا۔

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں کچھ سوچتی ہوں۔ اس مسئلہ کا بھی کوئی نہ کوئی حل ضرور نکل آئے گا۔“
وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولیں۔ ”تم نے بتایا کہ اس لڑکی کا کیرئیر ٹھیک نہیں اور مردوں سے طرٹ کرنا اس کا مشغلہ ہے۔“
”جی ہاں مجھے اس کے بارے میں بھی رپورٹ ملی ہے۔“
”میں تو پھر میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ تمہارے

میاں کو بھی بے وقوف بنا رہی ہے۔ جب اس کا دل بھر جائے گا تو وہ کسی اور سے تعلق استوار کر لے گی۔“
”مجھے ڈر ہے کہ علی اس سے شادی نہ کر لیں۔“
”اول تو ایسا نہیں ہوگا اور اگر شادی ہو بھی گئی تو زیادہ دن نہیں طے کی۔“

”ایسی نوبت ہی کیوں آئے۔ کوئی ایسی ترکیب بتائیں کہ وہ لڑکی علی کی زندگی سے نکل جائے۔“
”اس کے لیے ہمیں کوئی کرائے کا عاشق ڈھونڈنا پڑے گا۔“

”کرائے کا عاشق؟“ میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ”میں کچھ بھی نہیں۔“

”کرائے کے قاتلوں کی طرح کرائے کے عاشق بھی مل جاتے ہیں۔ میری ایک جاننے والی رشتے کرواتی ہیں۔ انہوں نے تین چار ہینڈم اور اساتذہ لڑکے اپنے مشکل پر رکھے ہوئے ہیں۔ اگر کسی لڑکی کا رشتہ ملے میں تاخیر ہو رہی ہو تو وہ ان میں سے کسی ایک کو لڑکی کے والدین سے ملوا دیتے ہیں۔ اس طرح انہیں یہ قسلی ہو جاتی ہے کہ وہ ان کی لڑکی کے لیے سچیدگی سے رشتہ تلاش کر رہی ہیں۔ ہم انہی لڑکوں میں سے کسی ایک کو سمیرا کے پیچھے لگا دیتے ہیں جو اپنے آپ کو ایک امیر کے قصیر خاں کے اس کے ساتھ محبت کا ٹانگہ رچائے گا اور سمیرا اس کے جال میں پھنس کر تمہارے شوہر کو دھکا دے گی اور اس طرح یہ باب ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا۔“

”کیا وہ اتنی آسانی سے اس کی باتوں میں آ جائے گی؟“ میں نے پوچھا۔
”ایسی لڑکیاں کسی ایک مرد پر قناعت نہیں کرتیں اور ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتی ہیں۔ جب ایک اساتذہ، ہینڈم اور امیر لڑکا اس کی جانب بڑھے گا تو وہ بڑی آسانی سے اس کے جال میں پھنس جائے گی لیکن اس کے لیے تمہیں کچھ خرچ کرنا پڑے گا۔“

”وہ کیوں؟“
”یہ رقم دو تین مہینوں میں خرچ ہوگی۔ مثلاً وہ لڑکا سمیرا کو کھانے کے لیے کرائے پر ایک گاڑی لے گا۔ اپنے لیے چند قیمتی جوڑے بنوائے گا۔ سمیرا کو کھلانے پلانے اور تحفے وغیرہ دینے میں بھی کچھ خرچ ہوگا پھر اس کی فیس اگر تم یہ سب کر سکتی ہو تو میں میری بیورو والی سے بات کروں۔“
”میں اپنے سہاگ کو بچانے کے لیے سب کچھ کرنے

کو تیار ہوں۔ آپ بات کر لیں۔“

”ٹھیک ہے۔ تم مجھے سیرا کی تصویر، اس کے گھر کا پتہ اور فون نمبر دے دو۔ انشاء اللہ ایک مہینے کے اندر تمہاری مرضی کے مطابق نتیجہ آ جائے گا۔“

مجھے یہ سب کچھ بہت عجیب لگ رہا تھا۔ بالکل قلعی پھوٹن بھی لیکن سز حسن بہت پُر اعتماد تھا کہ اس کیلئے نتیجہ ہمارے حق میں آئے گا چنانچہ میں نے ان پر یقین کرتے ہوئے..... امین سے مطلوبہ اعتماد لے کر انہیں رقم پہنچا دیں۔ سز حسن نے بتایا کہ لڑکے کا بندوبست ہو گیا ہے اور وہ کل شام ان سے ملنے آئے گا۔ بہتر ہوگا کہ میں بھی ٹھوڑی دیر کے لیے آ جاؤں اور اس سے بالمشاورت گفتگو کروں۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ اسے سہ پہر میں بلائیں تاکہ میں عدنان کو دوسرے چھوڑ کر ان سے ملنے آ جاؤں کیونکہ شام کے وقت میرے لیے گھر سے باہر نکلنا مشکل تھا۔

اس لڑکے کا نام فواد تھا۔ دیکھنے میں ہی وہ بے حد اسارت اور پنڈم لگ رہا تھا۔ اس کی عمر مشکل چوبیس تھیں برس ہوگی۔ اس نے بتایا کہ وہ ایم بی اے کر چکا ہے اور ایک فرم میں ملازمت کر رہا ہے۔ سز عثمان (رشتے کرانے والی) سے اس کی دوری رشتے داری ہے اور وہ کمیشن پر ان کے لیے کام کرتا ہے۔ گوکہ اسے یہ کام پسند نہیں لیکن چیوس کی خاطر اسے یہ سب کرنا پڑ رہا ہے کیونکہ پورے گھر کی ذمہ داری اس پر ہے اور صرف خواہ میں اس کا گزارہ نہیں ہو سکتا۔

سز حسن نے سیرا کی تصویر اور دیگر معلومات اس کے حوالے کیں اور اچھی طرح سمجھا دیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی پُرکشش شخصیت سے سیرا کو متاثر کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ میں نے فواد سے کہا کہ جب سیرا پوری طرح اس کے قابو میں آ جائے تو وہ اسے مجبور کرے کہ وہ ملازمت چھوڑ دے اس طرح اس کا قلعی سے رابطہ ختم ہو جائے گا۔

”آپ فکر نہ کریں میڈم میں ایسا چکر چلاؤں گا کہ وہ ان سے ہمیشہ کے لیے دور ہو جائے گی۔“

”ایک بات اور۔“ سز حسن نے کہا۔ ”تم مجھے روزانہ فون پر رپورٹ دو گے کہ معاملہ کہاں تک آگے بڑھا۔“

میں نے پرس کھولا اور اسے دس ہزار روپے دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ تمہارا ایڈوانس ہے۔ باقی رقم کام مکمل ہونے

پوری جائے گی۔“

اس نے شکر یہ ادا کرنے کے بعد سز حسن سے کہا۔ ”میڈم میں تم دن بعد آپ کو پروکریس بتاؤں گا۔“

اس نے جس اعتماد سے بات کی تھی۔ اس سے مجھے اُمید ہوئی تھی کہ یہ شخص سیرا اور علی کے درمیان فاصلہ پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ سیرا دل پھینک لڑکی تھی اور وہ بھی اس میدان کا پرانا کھلاڑی معلوم ہو رہا تھا اگر وہ سیرا سے راہ دوسم بڑھانے میں کامیاب ہو گیا تو وہ یقیناً اس کی طرف متوجہ ہو جائے کیونکہ وہ علی سے کہیں زیادہ پنڈم، اسارت اور کم عمر تھا۔

چوتھے روز سز حسن نے جو کچھ مجھے بتایا۔ وہ بہت ہی حیران کن تھا۔ فواد ایک کلائٹ کے روپ میں سیرا سے ملا اور اس سے ایک خود ساختہ پروڈکٹ کی کمپین کے بارے میں بات کی۔ میں نے بتانا قبول ہی نہ کی کیونکہ ایک اشتہاری ایجنسی میں کام کرتے تھے اور کلائٹ سے رابطے کا کام سیرا ہی کرتی تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں سیرا، فواد کی پُرکشش شخصیت سے بہت متاثر ہوئی۔ اس کے علاوہ فواد نے اس نام نہاد کمپین کا نقشہ کچھ اس انداز میں کھینچا کہ وہ اس میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گئی اور اسے اس میں اپنا فائدہ نظر آنے لگا چنانچہ اس نے مزید تفصیلات طے کرنے کے لیے اسے دوسرے دن کا وقت دے دیا۔

فواد دوسرے دن مقرر وقت پر اس سے ملنے پہنچ گیا۔ اس روز اس نے خاص اہتمام کیا تھا۔ تھری پیس سوٹ، شوخ رنگ کی ٹائی، ہاتھ میں بریف بیس اور آنکھوں پر قیمتی گھنگڑ۔ سیرا تو اسے دیکھتے ہی دیوانی ہو گئی۔ فواد اس کی کیفیت کو محسوس کر رہا تھا۔ چندرسی باتوں کے بعد اس نے بڑے راز دارانہ انداز میں کہا۔ ”میرے خیال میں یہ جگہ اس گفتگو کے لیے مناسب نہیں۔ کیوں نہ آج آپ میرے ساتھ لنچ کریں۔ باقی باتیں ہم وہیں کر لیں گے۔“

سیرا ٹھوڑی سی حیران ہوئی کیونکہ اس سے پہلے کسی کلائٹ نے ایسی پیشکش نہیں کی تھی۔ وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ کیا جواب دے لیکن فواد نے اسے مزید سوچنے کا موقع نہیں دیا اور بولا۔ ”اس میں آپ کا ہی فائدہ ہے۔ تفصیل بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے آپ میرے ساتھ لنچ کرنے کی ہائی تو بھریں۔“

سیرا کی حالت ایسی ہو گئی جیسے کسی نے اس پر جادو کر دیا ہو۔ وہ انکار نہ کر سکی اور اس نے سکرٹاتے ہوئے

اثبات میں سر ہلا دیا۔ فواد نے اسے ایک قریبی ریسٹورنٹ کا نام بتایا اور کہا کہ وہ ایک بجے اس کا وہاں انتظار کرے گا۔ اس کے جانے کے بعد بھی وہ بہت دیر تک بے خودی کے عالم میں بیٹھی رہی۔ پھر جب انٹرکام پر علی نے اسے اپنے کمرے میں آنے کے لیے کہا تو وہ یوں ہڑبڑا کر اٹھی جیسے گہری نیند سے بیدار ہوئی ہو۔

علی پر جانے سے پہلے اس نے واش روم میں جا کر اپنا میک اپ ٹھیک کیا۔ بال سنوارے، اگر اس کے پاس ٹھوڑا سا وقت ہوتا تو وہ گھر جا کر لباس بھی تبدیل کر لیتی، اس نے ایک بار پھر آئینے میں اپنا بخور جائزہ لیا۔ اس لباس میں بھی وہ خاصی پُرکشش لگ رہی تھی۔ باقی کسر وہ اپنی اداؤں سے پوری کر سکتی تھی اس نے دل ہی دل میں فواد اور علی کا موازنہ کیا تو فواد کا پلڑہ بھاری نظر آ گیا۔ وہ بے اختیار مسکرا اٹھی جیسے کسی فیصلہ پر پہنچ گئی ہو۔

وہ ریسٹورنٹ پہنچی تو فواد اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے پہلے سے ہی ایک ٹیکسٹر پر زور کر دیا تھا وہ دونوں وہاں جا کر بیٹھ گئے۔ فواد نے مینو اس کے سامنے رکھ دیا اور کہا کہ وہ اپنی پسند سے جو چاہے منگوالے۔ سیرا یوں شرابی تھی جیسے پہلی بار فواد کے ساتھ ڈیٹ پر آئی ہو۔ اس نے ایک ادا سے دو پے کا پلو پیچنے کر دیا اور آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔ ”آپ جو منگوائیں گے وہی کھالوں گی۔“

سیرا کی اس حرکت سے فواد کچھ گیا کہ وہ دغبر عورت ہے اور اسے اپنے جال میں پھنسانا کچھ زیادہ مشکل نہ ہوگا۔ چنانچہ اس نے جارحانہ انداز اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ہیرے کو کھانے کا آرڈر دینے کے بعد کہا۔ ”کس سیرا کام کی بات کرنے سے پہلے بہتر ہوگا کہ میں اپنے بارے میں کچھ بتا دوں۔ اس کے بعد میں جو کہوں گا وہ آسانی سے آپ کی سمجھ میں آ جائے گا۔“

وہ خاموش رہی تو فواد نے اسے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ ایک مل اوڈن کا لکھتا بیٹا ہے۔ دو بہنوں کی شادی ہو چکی ہے اور وہ ڈینس میں اپنے والدین کے ساتھ رہتا ہے۔ والد چاہتے ہیں کہ وہ ان کے ساتھ کاروبار میں شریک ہو جائے لیکن وہ سلیف میڈ بندہ ہے اور اپنی صلاحیت کے بل بوتے پر آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ اسی لیے اس نے ایم بی اے کرنے کے بعد ایک کمپنی میں ملازمت کر لی اور ان دنوں ایک پروڈکٹ کی پرموشن کے سلسلے میں کام کر رہا ہے۔ اپنی بات ختم کرنے کے بعد اس نے کن اکھیوں سے

سیرا کے چہرے کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کی اور بولا۔ ”میں نے پہلی ہی ملاقات میں اندازہ لگالیا تھا کہ آپ بہت زیادہ باصلاحیت ہیں لیکن اس کا آپ کو کوئی فائدہ نہیں ہو رہا۔ ساری محنت آپ کرتی ہیں۔ منافع کسی اور کی جیب میں چلا جاتا ہے اور اس کا بہت ٹھوڑا حصہ آپ کو تحواہ کی صورت میں ملتا ہے۔“

”یہ کوئی نئی بات نہیں۔“ سیرا نے آہستہ سے کہا۔ ”ہر جگہ ایسا ہی ہوتا ہے۔“

”بالکل ہوتا ہے لیکن کبھی آپ نے سوچا کہ محنتی اور تجربہ کار لوگ جاب چھوڑ کر اپنا کام کیوں شروع کرتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ جتنی محنت وہ دوسروں کے لیے کرتے ہیں اگر اتنی اپنے کام پر کریں تو سارا منافع ان کی جیب میں آئے گا۔“

سیرا کھانے لے کر آیا تو فواد کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ کھانا ختم کرنے کے بعد اس نے اپنی بات دوبارہ شروع کی اور بولا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی انہی خطوط پر سوچیں۔“

سیرا نے اپنے ہاتھوں کو ایک خاص انداز سے جھکا اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ”ایک ہی ملاقات کے بعد آپ میرے بارے میں اتنی سمجھ کیسے کیوں سوچنے لگے؟“

”اس لیے کہ میں کسی کی محنت اور صلاحیت کو ضائع ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ میں نے اسی لیے آپ کو ریسٹورنٹ میں بلایا ہے تاکہ اس موضوع پر مکمل کر بات کر سکیں۔“

”آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟“

”میں چاہتا ہوں کہ یہ کمپین آپ اپنے طور پر کریں۔ آپ کی ایجنسی کا اس سے کوئی تعلق نہ ہو۔“

سیرا اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے تو بہت بڑے سیٹ اپ کی ضرورت ہوگی اور میرے اتنے وسائل نہیں کہ میں اپنی کمپنی لاؤنگ کر سکیں۔“

”وسائل کی آپ فکر نہ کریں۔ وہ میں مہیا کر دوں گا۔ یوں سمجھ لیں کہ آپ میری پارٹنر ہوں گی۔ سرمایہ میرا، محنت آپ کی۔ منافع آدھا آدھا۔“

”مجھے حیرت ہے کہ آپ دوسری ملاقات میں ہی اتنی بڑی بڑی باتیں کر رہے ہیں جیسے ہماری برسوں کی جان بچان ہو۔“

”در اصل میں کافی عرصے سے ایڈورٹائزنگ ایجنسی

شروع کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن مجھے اس کام کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ کل آپ سے ملاقات ہوئی تو میرے ذہن میں پہلا خیال بھی آیا کہ آپ کے ساتھ مل کر کام کیا جاسکتا ہے۔ اگر آپ کو اس تجویز سے اتفاق نہیں تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ آپ کی انجینی کو بے سود دے دوں گا۔

”ایک منٹ۔“ وہ شوش لہجے میں بولی۔ ”آپ تو ہتھیلی پر سرسوں بجا رہے ہیں۔ مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت تو دیں۔“

”آپ جتنا چاہیں وقت لے لیں۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے لیکن آپ مجھ سے رابطہ میں رہیں گی۔ کل کے ڈنر کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

سیرا خوشی سے نہال ہو گئی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ فواد اتنی تیزی سے آگے بڑھے گا۔ ایک مل اونکا بیٹا اسے ڈنر پر بلارہا تھا۔ وہ کیسے انکار کر سکتی تھی لیکن اس نے تھوڑا سا غرہ دکھانا ضروری سمجھا اور بولی۔ ”ایک شرط پڑاؤں گی۔“

”وہ کیا؟“

”اس کے بعد کا ڈنر میری طرف سے ہوگا۔“

”منگور۔“ فواد نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

دو روزانہ ہی علی کے ساتھ دفتر سے باہر نکلتی اور دونوں کہیں گھومنے چلے جاتے۔ کبھی سینما، کبھی ڈنر تو کبھی لائیک ڈرائیو۔ لیکن دوسرے دن سیرا چھٹی ہوئی علی کو بتائے بغیر دفتر سے چلی گئی۔ گزشتہ پانچ چھ ماہ کے دوران ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ اس روز علی وقت پر گھر آئے لیکن کافی پریشان اور مضطرب نظر آ رہے تھے۔ مجھے اس پریشانی کی وجہ معلوم تھی۔ سزسن پہلے ہی بتا چکی تھیں کہ آج فواد اور سیرا کا ڈنر پر جانے کا پروگرام ہے۔ علی نے دو تین بار سیرا کا نمبر لایا لیکن بات نہ ہو سکی۔ غالباً اس نے اپنا فون بند کر رکھا تھا۔

قصہ مختصر چند روز میں ہی فواد نے سیرا کو پوری طرح شے میں اتار لیا۔ وہ روزانہ اسے مختلف بہانوں سے اپنے ہمراہ لے جاتا۔ شروع شروع میں تو وہ سیرا پر بھی ظاہر کرتا رہا کہ وہ اس کی انجینی کے لیے بھانگ دوڑا کر رہا ہے لیکن چند روز بعد اسے یہ بہانا کرنے کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ سیرا ویسے ہی اس کی قربت کے لیے بے یقین ہوتی جا رہی تھی۔ اب اس کی ہر شام فواد کے ساتھ گزرنے لگی۔ علی کچھ دن تو خامے مضطرب رہے پھر جب انہیں معلوم ہوا کہ سیرا کو ایک نیا دوست مل گیا تو وہ خود ہی پیچھے ہٹ گئے اور پہلے کی

طرح وقت پر گھر آنے لگے۔

ایک مہینے کے اندر ہی سیرا نے علی سے قطع تعلق کر لیا اور تمام وقت فواد کے ساتھ گزارنے لگی۔ میں نے سزسن کے ذریعے فواد کو کھلوا بیجا کہ وہ اپنی اور سیرا کی مشترکہ تصویریں علی کو دفتر کے پتے پر پوسٹ کر دے۔ ان میں اگر کچھ قابل اعتراض حالت میں ہوں تو اور بھی اچھا ہوگا تاکہ وہ علی کے دل سے پوری طرح اتر جائے اور وہ اس سے نفرت کرنے لگیں۔ فواد نے ایسا ہی کیا۔ وہ سیرا کو اپنے ایک دوست کے قلیٹ میں لے گیا اور سیرا کی کچھ ایسی تصویریں بنائیں جنہیں دیکھ کر علی غصے سے ہانگ ہو گئے ہوں گے۔

جب مجھے یقین ہو گیا کہ علی مکمل طور پر سیرا سے خند ہو چکے ہیں تو میں نے فواد سے کہہ دیا کہ اب مجھے اس کی ضرورت نہیں رہی۔ وہ چاہے تو یہ کھیل ختم کر سکتا ہے لیکن اس نے کہا کہ اسے سیرا پسند آ گئی ہے اور وہ اس کے ساتھ مزید کچھ وقت گزارنا چاہتا ہے۔ میرا کام ختم ہو چکا تھا۔ اس لیے میں نے فواد کے بتایا جات دے کر اسے فارغ کر دیا پھر میری اس سے کبھی بات نہیں ہوئی اور نہ ہی یہ معلوم ہو سکا کہ سیرا سے علی کتنے عرصہ قائم رہا۔

کچھ دنوں بعد علی کو ایک دوسری کہنی میں اس سے اچھی خواہ وہ ملازمت مل گئی اور یوں سیرا کا کاٹنا ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ میں سمجھ گئی تھی کہ انہوں نے صرف سیرا کی وجہ سے کہنی تبدیل کی ہے کیونکہ وہ اس سے شدید نفرت کرنے لگے تھے اور اس کی شکل دیکھنے کے بھی رد ادا نہیں تھے۔ میں نے انہیں بھرپور توجہ اور محبت دی تاکہ سیرا کی بے رغبتی سے انہیں جو صدمہ پہنچا تھا اس کا اثر جلد زائل ہو جائے۔ خدا کا شکر ہے کہ چند دنوں میں ہی وہ نارمل ہو گئے اور میرے آنگن میں ایک بار پھر خوشیوں کا راج ہو گیا۔ اس کے لیے میں سزسن حسن کے ساتھ ساتھ اپنی ساس کی بھی شکر گزار ہوں اگر وہ مجھ پر بے جا باندیاں عائد نہ کرتیں اور میں سزسن کے مشوروں پر عمل کرتے ہوئے ان کے خلاف علم بغاوت بلند نہ کرتی تو مجھ میں اتنی خود اعتمادی بھی نہ آتی جس کی بدولت میں نے سیرا کی بھی خطرناک صورت کا پتا صاف کر دیا اور اپنے گھر کو برباد ہونے سے بچا لیا۔ میری تمام بہنوں سے بھی گزارش ہے کہ وہ ہر حال میں اپنی خود اعتمادی پر قرار رکھیں۔ سبکی ان کا سب سے بڑا اختیار ہے جس کی بدولت وہ بڑی سے بڑی جنگ جیت سکتی ہیں۔



جنونی

محترمہ عذرا رسول صاحبہ
سلام تہنیت

میں نے اس سے پہلے کبھی کوئی کہانی نہیں لکھی۔ پہلی بار کہانی تیار کی ہے۔ یہ کہانی اس وقت کی ہے جب میں زیر تعلیم تھی۔ کالج میں میری ملاقات ایک ایسے نوجوان سے ہوئی جو اپنے آپ میں ایک ہزی کہانی تھا۔ وہ کتنا عجیب تھا اس بارے میں آپ خود فیصلہ کریں۔ پلیز یہ کہانی شائع ضرور کریں۔

شمالہ
(کراچی)

ہوئے تھے۔ اس نے شہلا کو نظر انداز کرتے ہوئے میری طرف انگلی اٹھائی۔ ”شاید آج کالج میں تمہارا پہلا دن ہے، ہے نا؟“

”ہاں۔“ میں نے گردن ہلائی۔

وہ کالج میں میرا پہلا دن تھا۔ میں اپنی دوست شہلا کے ساتھ کالج کے احاطے میں گھومتی پھر رہی تھی کہ وہ اچانک میرے سامنے آ گیا۔ ایک دلکش سالو جوان، اچھے بالوں والا۔ جس کی قیاس کے ٹخن کھلے

”میں تم سے ایک سال سینئر ہوں۔“ اس نے بتایا۔
 ”میں تمہیں بہت دیر سے ادھر ادھر کھوتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔“
 ”تو پھر؟“ میں نے ہمت کر کے پوچھ لیا۔ ویسے اس سے کچھ خوف سامعوس ہونے لگا تھا۔
 ”پھر یہ کہ تم مجھے بہت اچھی لگی ہو اور میں تمہیں حاصل کر لوں گا۔“ اس نے کہا۔
 میں سی سی ہو کر رہ گئی۔ اس نے یہ کیسی بات کہہ دی تھی۔ میں تو اس کو جانتی بھی نہیں تھی۔ وہ اتنا کہہ کر تیزی سے ایک طرف چلا گیا تھا۔
 ”شائلڈ“ شہلا خوف زدہ ہو کر بولی۔ ”یہ تو مجھے کوئی پاگل معلوم ہوتا ہے۔“
 ”ہٹائیں کون ہے اور تم نے سنا کیا کہہ رہا تھا؟“
 ”آؤ چلو، واپس چلتے ہیں۔“
 ”وہ تو جا چکا ہے۔ ابھی ہم نے کالج بھی نہیں دیکھا۔ چلو کینٹین میں چل کر بیٹھتے ہیں۔“ میں نے باہر والی کینٹین کی طرف اشارہ کیا۔
 کالج میں دو کینٹین تھیں۔ ایک عمارت کے اندر۔ اور دوسری باہر احاطہ کی دیوار کے ساتھ۔ درختوں کے درمیان جہاں میزیں اور کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس باہر والی کینٹین میں ہر وقت لڑکے لڑکیاں کاش لگا رہتا اور سب دل کھول کر ایک دوسرے سے باتیں کیا کرتے۔
 کالج میں گرچہ یہ پہلا دن تھا لیکن احساس ہو گیا تھا کہ یہاں کا ماحول اسکول سے کتنا مختلف ہے۔ جیسے ایک بڑے بچے سے نکل کر ایک وسیع و عریض پارک میں آگئی ہوں۔
 اگر شہلا کا ساتھ نہیں ہوتا تو بہت انجینئر کا احساس ہوتا۔ شہلا اور میں اسکول میں بھی ساتھ تھے۔ جگہ بھی ایک تھا اور اتفاق سے کالج بھی ایک ہی ملا تھا۔
 ہم نے دین لگوائی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ کم از کم چار برس تک تو ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہی ہیں۔ اس کے بعد جو خدا کی مرضی۔ زندگی کہاں لے جائے۔
 ہم کینٹین میں آکر بیٹھ گئے۔
 یہاں لڑکے اور لڑکیاں تو تھیں لیکن ہمارے لیے نا آشنا۔ ہم کی کوئی بات نہ تھی۔ سوائے ایک دوسرے کے۔
 ہم چائے لے کر ایک طرف بیٹھ گئے۔ ”شہلا، وہ بندہ کون تھا؟ اور کیسی دھمکی دے کر گیا ہے۔“ میں نے کہا۔
 ”خدا جانے، اسے کہتے ہیں سرمنڈا ای او لے

پڑا۔ ویسے مجھے وہ کبھی غیر معمولی محسوس ہوا تھا۔“
 ”کیا مطلب؟ کیا غیر معمولی؟“ میں نے پوچھا۔
 ”تم نے اس کی آنکھیں نہیں دیکھیں۔ کیسی چمک تھی اس کی آنکھوں میں۔“ شہلا نے بتایا۔ ”جنونی لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔“
 ”سب سے، تو پھر کیا کیا جائے؟“
 ”دیکھتی رہو، ہو سکتا ہے کہ اس نے بس یوں ہی پریشان کرنے کے لیے یہ سب کہہ دیا ہو۔“ شہلا نے کہا۔ ”سنا ہے فرسٹ ایئر کی لڑکیوں کے ساتھ اسی قسم کا مذاق کیا جاتا ہے۔“
 ہم نے ابھی چائے ختم ہی کی تھی کہ وہ پھر نظر آ گیا۔ وہ بھی کاؤنٹر سے چائے لے کر کسی طرف بیٹھنے کے لیے جا رہا تھا۔ اس نے ہمیں دیکھا تو کسی لیکن نظر انداز کرتا ہوا آگے چلا گیا۔
 ”یار! میں تو ڈر رہی تھی کہ یہ پاگل پھر ہماری طرف نہ آجائے۔“ شہلا نے کہا۔
 ”ہم نے چائے پی لی ہے، اب اللہ جاؤ۔“
 ہم وہاں سے اٹھ کر اپنی کلاس میں آ گئے۔ لیکن کراؤت شروع ہونے والا تھا۔ ہم نے لیکن رائیڈ کیا اور اپنی اپنی وائز میں ضروری پوائنٹس نوٹ کرتے چلے گئے۔
 پہلے سال کی لڑکیاں اور لڑکے الگ سے پہچان لیے جاتے ہیں کیونکہ وہ کچھ پریشان پریشان سے گھبرائے گھبرائے سے بچے ہیں جبکہ سینئر زبان کا مذاق اڑاتے پھرتے ہیں۔
 دو چار دنوں تک پھر کچھ نہیں ہوا۔ وہ لڑکا ہمیں دکھائی نہیں دیا۔ اسی لیے میں نے بھی گھر میں اس کا ذکر نہیں کیا۔
 ورنہ خواہو اس پریشان ہو جاتے۔
 اور ویسے بھی ابھی کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ ایک لڑکے نے چلتے ہوئے ایک بات کہہ دی تھی۔ اس کے بعد وہ خود دکھائی نہیں دیا تھا۔ بس اتنی سی بات تھی۔
 لیکن چار پانچ دنوں کے بعد وہ پھر ہمارے سامنے آ گیا۔ اس وقت بھی ہم اسی باہر والی کینٹین سے چائے لے کر ایک طرف بیٹھے ہوئے تھے کہ وہ پاس آ کر کھڑا ہوا۔
 اس بار بھی وہ گرچہ معقول لباس میں تھا لیکن پہلے کی طرح بال اچھے ہوئے تھے۔
 ”ہیلو۔“ اس نے بہت شائستگی کے ساتھ کہا۔ ”مجھے شہر کہتے ہیں۔“ اس نے اپنا نام بتایا۔
 اس نے چونکہ بہت سلیطے سے بات کی تھی۔ اسی لیے

اس کا وہ تاثر زائل ہونے لگا تھا جو پہلی بار ہوا تھا۔
 ”میرا نام شہلا ہے۔“ شہلا نے ہمت کر کے اپنا نام بتا دیا۔
 ”اور تم؟“ اس نے مجھے مخاطب کیا۔
 ”میں شائلڈ ہوں۔“ میں نے اپنا نام بتایا۔
 ”گڈ۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”تم دونوں شاید ایک ہی کلاس میں ہو۔“
 ”ہاں۔“ شہلا نے کہا۔
 ”اب میں تم دونوں کو ایک صیحت کرتا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”اس کالج میں بعض لڑکے بہت بد معاش ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بہت پریشان کریں۔ ان کا کام ہی یہی ہے۔ اس لیے اول تو یہ کوشش کرو کہ دونوں ایک ساتھ ہی دکھائی دو۔ پھر بھی اگر کوئی ایسی دیکھی بات کرے تو مجھے ضرور بتا دینا۔ میں دو منٹ میں اس کو سیدھا کر دوں گا۔“
 ہم حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئیں۔
 وہ پھر ایک جھٹکے سے مڑا اور تیزی سے ایک طرف چلا گیا۔ ”مائی گاؤ، کیسا بندہ ہے یہ۔“ شہلا نے حیرت ظاہر کی۔
 ”آج تو بالکل بدلا ہوا لگ رہا تھا۔“
 ”اور آج اس نے پریشان کرنے والی کوئی بات بھی نہیں کی۔“ میں نے کہا۔ ”بلکہ اتنا ہمیں دلا سے دے کر گیا ہے۔“
 ”اسی لیے میں نے کہا تھا کہ یہ جنونی ہے۔ ایسے لوگوں کی ذہنی رو بدلتی ہے۔ یہی کچھ ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھار۔ ان کے کسی بھی موڈ پر پھر دوسرے کیسا جاسکتا۔“
 ”خدا کرے، اس کا دوبارہ سامنا نہ ہو۔“ میں نے کہا۔
 لیکن ایسی دعائیں قبول کہاں ہوتی ہیں۔ دو چار دنوں کے بعد وہ پھر سامنے آ گیا۔ اس بار اتفاق سے میں اکیلی تھی۔
 شہلا کالج نہیں آ سکی تھی۔
 ”ہیلو۔“ اس نے مجھے مخاطب کیا۔ ”کیسی ہو؟“
 میں اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھنا چاہتی تھی لیکن اس نے آگے بڑھ کر پھر میرا راستہ روک لیا۔
 ”کیا بات ہے؟“ اس نے کہا۔ ”تم اس طرح مجھے اکتور کیوں کر رہی ہو؟“
 ”دیکھو، میرا تمہارا کوئی واسطہ نہیں ہے۔“ میں غصے سے بولی۔ ”تم کیوں میرے پیچھے پڑے ہوئے ہو؟“
 ”ابھی کہاں، ابھی پیچھے کہاں پڑا ہوں۔“ وہ عجیب انداز سے ہنس دیا۔ ”ابھی تو بس یوں ہی نہیں دیکھ رہا ہوں اور

ہاں تم نے کہا کہ تمہارا میرا کیا واسطہ؟ چلو ابھی نہ کی، آگے چل کر تو ہو جائے گا۔“
 دو چار لڑکے اور لڑکیاں ہماری طرف آتے دکھائی دے گئے۔ ان کو دیکھ کر میری کچھ ہمت بڑھ گئی تھی۔ ”جاؤ، ورنہ میں تمہارے ساتھ بری طرح پیش آؤں گی۔“
 ”لیکن کیوں، میں نے ایسا کون سا منہ کر دیا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”صرف اتنی سی بات ہے کہ میں تمہیں پسند کرنے لگا ہوں اور تم ہو بھی اچھی۔ اور کسی کو پسند کرنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔“
 ”کسی نے آواز دی۔“ شہر۔“
 اس نے چونک کر آواز دینے والے کی طرف دیکھا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”کوئی بات نہیں۔ پھر ملاقات ہوگی اور ہاں، مجھ سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ایک بے ضرر انسان ہوں۔“
 اتنا کہہ کر وہ آواز دینے والے لڑکے کی طرف چلا گیا۔
 ایک لڑکی تیزی سے چلتی ہوئی میرے پاس آگئی۔
 ”ایکسیکو زنی، کیا یہ شہر آپ کو پریشان کر رہا تھا؟“ اس نے پوچھا۔
 ”ایسا ہی سمجھ لیں۔“
 ”نفسیاتی مرعوض ہے کم بخت، جنونی۔“ لڑکی نے برا سا منہ بتایا۔
 ”شاید تمہارے ساتھ بھی کوئی ایسی ویسی حرکت کر چکا ہے۔“
 ”ہاں، میرے پیچھے پڑ گیا تھا کہنے لگا کہ میں تمہیں پسند کرنے لگا ہوں۔ پھر میں نے جوتا تار کر اس کی سرمت شروع کر دی۔ کچھ اور لڑکے بھی یہ دیکھ کر ہمارے پاس آ گئے اور یہ اس وقت بھی یہی کہتا رہا کہ وہ مجھے پسند کرنے لگا ہے اور اس کی جوتو ہیں ہوئی ہے اس کا بد ضرور لگا۔“
 ”مائی گاؤ، پھر تو بت نہ لڑنا کہ بات ہوگئی ہوگی۔“
 ”بہت زیادہ۔“ اس لڑکی نے کہا۔ ”آؤ کہیں بیٹھ کر بتاتی ہوں کہ اس ذہنی نے اس کے بعد کیا کیا۔“
 ہم ایک طرف کھاس پر آکر بیٹھ گئے۔ ساتھ چلتے ہوئے اس لڑکی نے اپنا نام رعنا بتایا تھا۔ وہ اسی کلاس میں تھی جس میں وہ جنونی تھا۔
 ”ہاں اب بتاؤ۔“ میں نے پوچھا۔ ”کیا کیا تھا اس نے؟“
 ”اس نے کہا تھا کہ وہ مجھ سے اپنی توہین کا بدلہ لے

گا۔“ اس نے بتایا۔ ”اور اس نے بدلہ یہ لیا کہ اپنی ایک کلائی کاٹ لی۔“

”کیا؟“ میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔
 ”ہاں، یاد میرے سامنے۔ اودہ مائی کا ڈھ۔ ابھی بھی یاد کرتی ہوں تو کانپ کر رہ جاتی ہوں۔ وہ مجھے کالج کے احاطے ہی میں مل گیا تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ میں اکیلے ہوں۔ اسی لیے وہ میرے پاس آ گیا۔ سچ ہے کہ اسے دیکھ کر میں بری طرح ہنسنے لگی تھی۔ اس نے کہا کہ میں آج اپنی توہن کا بدلہ لینے آیا ہوں اور یہ بدلہ لینے کے بعد میں بھول جاؤں گا نہیں۔ اتنا کہہ کر اس نے اپنی جیب سے ایک چاقو نکال لیا۔ میرا تو برا حال ہو گیا تھا۔ میں سمجھ گئی کہ میرا آخری دن آچکا ہے۔ پھر اس نے وہ چاقو اپنی کلائی میں اتار لیا۔“

”اودہ گاڈ۔“
 ”ہاں، یاد ہے، تم کو شاید اندازہ نہ ہو کہ اس وقت میری کیا حالت ہو رہی ہوگی۔ اس کی کلائی سے خون بہہ رہا تھا۔ اتنا خون دیکھ کر میں تو بے ہوش ہونے لگی تھی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا آنے لگا تھا۔ پھر اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ”سنو، تم نے میری توہن کی۔ میں نے اس کا بدلہ اپنے آپ سے لے لیا۔ کیونکہ میں اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا جس سے میں بیدار کرتا ہوں۔ میرے اندر کی آگ اس بدلے کے لیے ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ اب میں کبھی تمہارے راستے میں نہیں آؤں گا۔“

اس کی کلائی سے خون بہہ رہا تھا اور وہ بولے چلا جا رہا تھا۔ پھر وہ ایک طرف چلا گیا۔ اور میں وہیں ایک درخت کا سہارا لے کر بیٹھ نہ جانی تو شاید بے ہوش ہو جاتی۔

”اودہ خدا! یہ تو بہت خطرناک صورت حال ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس کے بعد اس کا کیا رویہ ہے؟“
 ”کچھ بھی نہیں۔ اب تو وہ میری طرف دیکھتا بھی نہیں ہے۔ جیسے بھول گیا ہو مجھ کو۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ میرا معاملے میں جنونی ہے۔ جانتی ہو اس نے اسٹر کالج باکسنگ چیمپئن شپ بھی جیت رکھی ہے۔“

”نہیں، یہ مجھے نہیں معلوم۔“
 ”یہ بھی اس کے جنون کی کہانی ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”پچھلا چیمپئن بھی اسی کالج کا تھا۔ شہر جب نانا کالج آیا تھا تو کسی بات پر اس چیمپئن سے اس کی نمائش ہو گئی۔ چیمپئن نے اس کی بہت توہنیں ہی نہیں کی بلکہ اسے مارا بھی تھا۔ شہر پٹنا رہا۔ وہ کچھ نہیں کر سکا۔ کیونکہ وہ چیمپئن کی طرح ہار کر نہیں

تھا۔“

”کیا نام تھا اس چیمپئن کا؟“ میں نے پوچھا۔

”رؤف مائی۔“ رتنا نے بتایا۔

”ہاں، میں نے یہ نام سنا ہے۔“ میں نے تائید کی۔
 ”پھر شہر نے کیا کیا؟“

”وہی، اپنے جنونی ہونے کا ثبوت۔۔۔۔۔ رؤف سے مار کھانے کے بعد اس نے باکسنگ کی تربیت حاصل کرنی شروع کر دی۔ رات دن۔ صبح شام۔ اس کے سامنے بتاتے ہیں کہ وہ پاگلوں کی طرح صحت کر رہا تھا۔ ٹریننگ لے رہا تھا۔ بس سنک سوار ہو گئی کہ ہر حال میں اپنی توہن کا بدلہ لینا ہے اور صرف چار مہینوں کے بعد اس نے چیمپئن کو دھچک کر رکھ دیا۔ بہت بری طرح مارا۔ اس کے بعد بے چارہ چیمپئن کالج چھوڑ کر ہی چلا گیا۔“

”تو یہ شہر ایسا آدمی ہے۔“
 ”ہاں ایسا ہی ہے۔ بس جو بھی دھن سوار ہو جائے۔ میرے لیے دھن سوار ہوئی تو اس نے اپنے آپ کو ڈنکی کر لیا۔ اب تمہاری دھن سوار ہوئی تو خدا جانے تمہارے ساتھ اس کا کیا رویہ ہو۔“
 ”میں اب بری طرح گھبرا گئی تھی۔“ تو بتاؤ، کیا کروں؟“
 ”میرا خیال ہے کہ اس کے سامنے مت آیا کرو۔“ رتنا نے کہا۔ ”ادھر ادھر ہو جایا کرو۔“

”لیکن کب تک۔ ہم ایک ہی کالج میں ہیں۔ ہمارا سامنا تو ہوتا رہتا ہے۔ کیوں نہ پرہیز سے اس کی شکایت کر دی جائے۔“

”یہ اور بھی زیادہ خطرناک ہو جائے گا۔“ رتنا کچھ سوچ کر بولی۔ ”اول تو ایسی شکایت کچھ ہو گئی نہیں۔ اگر پرہیز نے اسے کالج سے نکال بھی دیا تو وہ تمہارے لیے اور زیادہ خطرناک ہو جائے گا۔ تم کالج سے باہر تو نظر آ سکتی ہو۔“
 ”یاد ہے میں کس پکڑ میں پھنس گئی۔“ میں نے کہا۔ ”میں تو یہاں سیدی طرح اپنی پڑھائی کرنے آئی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہاں اس قسم کے بندے سے سابقہ ہوگا۔“
 ”ایسا کرو۔ تم کم از کم اپنے گھر والوں کو بتا دو۔“ رتنا نے مشورہ دیا۔

”اس سے کیا ہوگا۔ وہ بے چارے تو پریشان ہو جائیں گے۔“

”پریشان تو ہوں گے لیکن کسی وقت تمہارا ساتھ بھی دے سکتے ہیں۔ اگر ان کے علم میں یہ سب ہوگا تو وہ احتیاطی

نہاں کر سکیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ تم کو اکیلا کالج آنے یا جانے نہ دیں۔ یا ان کے ذہن میں کوئی اور بات ہو۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ معاملہ واقعی سیریس ہے۔“
 ”ظاہر ہے۔ میں نے بھی اس کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ تم اگر چاہو تو کالج والوں سے معلوم کر سکتی ہو۔“

”مجھے معلوم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو خود اس کی حرکتیں دیکھ چکی ہوں۔“
 ”رہنا کا مشورہ بہت بہتر تھا۔ اسی لیے میں نے پہلی فرصت میں گھر والوں کو بتا دیا۔ اسی تو یہ سننے ہی واہیلہ کرنے لگی تھیں۔“ ارے لعنت مجھ پر ایسے کالج پر۔ کم بخت پاگل آدمی ہے، وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔“
 ”ایسے لوگوں کا جنون بہت خطرناک بھی ہوتا ہے اور بہت فائدہ مند بھی۔“ ابو نے کہا۔

”فائدہ مند کس طرح ہوتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”دیکھو، اس قسم کے لوگ یا تو اپنے آپ کو برادر کر لیتے ہیں یا پھر ان کا جنون انہیں بہت بڑا آدمی بناتا ہے۔“ ابو نے کہا۔ ”یا تو دنیا کو سنوار دیتے ہیں۔ یا کالڈے ہیں۔“
 ”مجھے تو وہ بگاڑنے والا معلوم ہوتا ہے ابو۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے اس سے خوف محسوس ہونے لگا ہے۔ کہیں کوئی پریشانی نہ کمزری کر دے۔“

”تم اپنے استادوں سے بات کرو۔“ ابو نے مشورہ دیا۔ ”اگر ان سے بھی بات نہیں بن سکی تو پھر کالج چھوڑنا پڑے گا۔“

”آپ بھی یہی کہہ رہے ہیں۔“
 ”ہاں بیٹا۔“ ابو نے ایک گہری سانس لی۔ ”میں ایسے کئی جنونیوں کو دیکھ چکا ہوں۔ یہ بہت کمزیا لوگ ہوتے ہیں اور بہت بڑے لوگ بھی ہوتے ہیں۔“

”ابو، یہ متضاد باتیں کیسے ہو سکتی ہیں؟“
 ”وہ اس طرح اگر جنونی کمزیاں پر اتر آئے تو وہ دوسروں کو اور خود کو برادر کر کے رکھ دیتا ہے۔ اس میں انتقامی جذبہ ہوتا ہے۔ قتل، تیزاب گردی وغیرہ کے واقعات اسی جنون کے نتیجے میں ہوتے ہیں۔ ایک بیماریا تک ضد اس کے اعصاب پر سوار ہو جاتی ہے۔“

”اور ایسا آدمی بڑا کس طرح ہوتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”وہ اپنے جنون کا رخ کسی بڑے مقصد کی طرف موڑ

دیتا ہے۔“ ابو نے بتایا۔ ”کسی ایجاد کی طرف۔ کسی فن پارے کی طرف۔ کسی ٹارگٹ کو حاصل کرنے کی طرف اور دنیا کو بہت کچھ دے جاتا ہے۔ اب میں یہ نہیں جانتا کہ وہ لڑکا کیسا ہے۔ دیے وہ مجھے خفی جنون والا دکھائی دیتا ہے۔ یعنی انتقام لینے والا۔“

”جی ہاں ابو، وہ ایسا ہی ہے۔“ میں نے کہا۔
 ”پھر تو تمہیں بہت احتیاط کرنی ہوگی۔“
 ”اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ اس کالج سے نکالیں اس کو۔“ اسی چھٹ پڑیں۔ ”خدا جانے کل کیا ہو۔ ایسے لوگوں کا کیا بھروسہ؟“

”یہ تو ہے لیکن اتنی جلدی کالج سے نکالنا بھی مناسب نہیں ہے۔“ ابو نے میری طرف دیکھا۔ ”بیٹا، تم کو کوشش کرو کہ تمہاری شہیلی شہلا تمہارے ساتھ ہی رہے۔“

”ہاں، ابو وہ بے چاری تو میرے ساتھ ہی رہتی ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”لیکن اب وہ بھی خوف زدہ رہنے لگی ہے۔“
 ”دیکھو، میں دو چار دنوں میں بھاگ دوڑ کرے کسی اور جگہ ایڈمیشن کی کوشش کر لیتا ہوں۔“

دوسرے دن کالج پہنچی تو وہاں یہ خبر ملی کہ ہمیں ہاس بے بکنگ پر جانا ہے۔ صرف دو کلاس جاری ہیں۔ یعنی ایک میری کلاس اور دوسری اس شہر کی کلاس۔

”نہیں، یاد رہے، میں تو نہیں جاؤں گی۔“ میں نے شہلا سے کہا۔

”وہ کیوں؟“
 ”تم کو تو معلوم ہے کہ وہ پاگل میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔ کالج کے احاطے میں تو شاید اسے اتنا موقع نہ مل سکا ہو۔ ہاس بے جیسی جگہ جا کر تو وہ بہت کچھ کر سکتا ہے۔ سب اپنی اپنی تفریح میں لگے ہوں گے۔ ہماری طرف کون دھیان دے گا۔“

”میری جان، اب اس کے خوف سے تو تم زندگی بھر کچھ نہیں کر سکتیں۔“ شہلانے کہا۔ ”ہمت کرو۔ وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ بہت سے لوگ ہوں گے۔ پھر میں تمہارے ساتھ ہی رہوں گی۔ دیکھتی ہوں وہ کیا کرتا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے اس کے ہمت دلانے پر ہامی بھری۔ ”اوکے، میں بھی چل رہی ہوں۔“
 دوسری صبح تین بسوں میں یہ ہفتا گاتا ہوا قافلہ ہاس بے کی طرف روانہ ہو گیا۔ سب کے سب بہت خوش گوار موڈ میں تھے۔

قرض

محترم ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم

عامر کی زندگی کے حالات ہر ایک کے لیے سبق آموز ہیں۔ انسان جو ہوتا ہے وہی کافتا ہے۔ عامر نے جوانی کے زعم میں یہ نہیں سوچا کہ وہ کس راستے پر بڑھ رہا ہے۔ اس تباہی کے راستے پر جب وہ بہت دور نکل گیا تب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

زویا اعجاز
(لاہور)

وہ دونوں ایک بلند دیوار کے پاس کھڑے تھے۔ کلمے پانچوں والی پتلون اور سگریٹ میں لمبوں وہ چہرے بشرے سے کسی اچھے گھر کے سپوت معلوم ہوتے تھے۔ چہرے پر پھیلے ہلکے روئیں عہد شباب کی آمد کا غنیمت دے رہے تھے۔ ان کی سانولی رنگت کسی اندرونی جوش سے تیار رہی تھی اور تنفس بے ربط تھی۔

”ایک بار پھر سوچ لے یار! مجھے تو یہ کام بہت مشکل دکھائی دیتا ہے۔“ ”اور دیوار کی بلندی نظروں سے ناپ کر

میں کچھ دیر تک سن پڑی رہی۔ ذہن میں آنکھیاں سی چلی رہی تھیں۔ ایک دھندلا کھاتا جو آہستہ آہستہ صاف ہو رہا تھا۔ یاد آنے لگا کہ ہم سب ہاگس بے پکنک پر گئے تھے۔ سمندر ہمارے سامنے تھا۔ ہم اس کو دیکھ کر بے قابو ہو کر آگے بڑھتے چلے گئے۔

میں اور شہلا بہت آگے نکل آئے تھے۔ پھر اچانک کیا ہوا کہ میں ڈوبنے لگی۔ میں نے شہلا کی چیخ سنی۔ میں نے خود کو سمندر کی گرفت سے نکالنے کی کوشش کی۔ لیکن سمندر مجھے اپنی آغوش میں لے چکا تھا۔ میں ڈوبنے لگی۔ ڈوبنے لگی اور اسی وقت کسی نے میرے بال پکڑ کر مجھے کھینچنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ مجھے اس کا ہوش نہیں رہا تھا اور اب ہوش آیا ہے تو میں شاید کسی اسپتال میں ہوں اور سب لوگ میرے گرد جمع ہیں۔

میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو ڈاکٹر نے منع کر دیا۔ ”نہیں ابھی نہیں۔ ابھی آرام کرو۔ ابھی کمزور ہو۔ ایک آدھ دن میں یہ کمزوری ختم ہو جائے گی۔“

اس وقت میں نے دیکھا کہ مجھے ڈرپ بھی لگی ہوئی تھی۔ مجھے صرف یہ جاننا تھا کہ مجھے بچانے والا کون تھا۔ میں نے ان سبوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”میں تو ذوقی جا رہی تھی۔ پھر کس نے میرے بال پکڑ کر کھینچا تھا؟“

”شہم نے۔“ شہلا نے بتایا۔

”ہاں، وہی جنونی، اسی نے تمہیں ڈوبنے سے بچایا ہے۔“ شہلا نے کہا۔

”اور وہ خود؟“ میں نے پوچھا۔ ”وہ کہاں ہے؟“

”خسوس کہ تمہیں بچاتے ہوئے وہ ڈوب گیا۔“

”ڈوب گیا۔ یعنی اس نے جان دے دی۔“

”بیٹا۔“ اس بار ابو مخاطب ہوئے۔ ”میں نے تم سے کہا تھا

ناکریے لوگ اپنی ذہن اپنی ضد کے پکے ہوتے ہیں۔ اس شخص

پر تمہیں بچانے کی ذمہ داری ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی جان پر کھیل

کر تمہیں بچالیا۔ یہ جنونی لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں بیٹا۔ یا تو

دوسروں کی زندگی ختم کر دیتے ہیں یا اپنی زندگی ختم کر لیتے ہیں۔

اس جنونی نے اپنی زندگی ختم کر لی۔“

برسوں گزر گئے ہیں۔ لیکن میں اس جنونی کو بھلا نہیں

سکتی۔ وہ ابھی بھی یاد آتا ہے اور میں جب سوچتی ہوں کہ ایسے

لوگ کتنے عظیم ہوتے ہیں۔ کتنے بڑے ہوتے ہیں۔

یہ اتفاق تھا کہ شہم بھی ہماری بس میں تھا۔ اس نے ایک بار میری طرف دیکھا تو تھا۔ پھر مجھے نظر انداز کر کے اوردوں سے بات کرنے لگا۔

کالج کی لائف بھی کیا ہوتی ہے۔ ہم پریکٹیکل لائف اور بے فکر کی لائف کے درمیانے پر کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک قدم کا فاصلہ ہوتا ہے۔ ایک قدم آگے بڑھا کر ہمیں عملی زندگی کا آغاز کر دیتا ہوتا ہے۔ اسی لیے بے فکر کی جو لحاظ مل جائیں وہ بہت غنیمت ہوتے ہیں۔

ہم ہنسنے لگے ہوئے ہاگس بے پکنک گئے۔ لڑکے لڑکیوں نے پکنک کے لحاظ سے ڈرینک کر رہی تھی۔ سب کچھ بہت خوش گوار اور خوب صورت تھا۔

کسی نے ملاج دی۔ ”چلو، پانی میں چلتے ہیں۔“

استاد روکتے رہ گئے۔ لیکن ایسے سوچ پر کون سنتا ہے۔

ہم لڑکیوں نے شلواروں کے پانچے اوپر کیے اور پانی میں گھس

پڑیں۔

سمندر کی اپنی الگ کشش ہوا کرتی ہے۔ اس کا پانی

آگے بڑھتے رہنے کی تحریک دلاتا رہتا ہے۔ آگے اور آگے۔

میں اور شہلا دوسری لڑکیوں سے آگے نکل آئی تھیں۔

ذرا فاصلے پر لڑکوں کا گروپ تھا جو تیراکی کی مہارت دکھانے کی

کوشش کر رہا تھا۔

ہم بہت آگے نکل آئے تھے اور اسی وقت ایک تیز لہر

نے مجھے اور شہلا کو جدا کر دیا۔ میرا ہاتھ اس کے ہاتھ سے

چھوٹ گیا۔

مجھے شہلا کی چیخ سنائی دی۔ مجھے صرف اتنا ہی یاد

ہے۔ اس کے بعد میں جیسے پانی میں اترتی چلی گئی۔ مجھ میں اتنی

ہمت نہیں تھی کہ میں کسی کو اپنی مدد کے لیے پکار سکتی۔

پانی نے مجھے اندر اتارنا شروع کر دیا تھا۔ مجھے اپنے

بازوؤں میں سیٹھ رہا تھا۔ میری سانسیں بند ہونے لگی تھیں۔

صرف اتنا احساس تھا کہ پانی اور بھی بھر گیا ہے۔

اور اچانک صرف اتنا احساس ہوا کہ کسی کے مضبوط

ہاتھوں نے مجھے بالوں سے پکڑ کر کھینچنا شروع کر دیا ہے۔ اس

کے بعد کوئی ہوش نہیں رہا۔

جب ہوش آیا تو میں کسی اسپتال کے بیڈ پر تھی۔ میرے

گھر والے میرے پاس تھے۔ کالج کی پرنسپل تھیں۔ شہلا بھی۔

دو سب رو رہے تھے۔

مجھے آنکھیں کھولنے دیکھ کر سب خوش ہو کر چلا اٹھے۔

ای نے پیار کرنا شروع کر دیا۔

”جب یہاں تک چلے آئے ہیں تو اس سے آگے کیا مشکل ہے بھلا؟ تو خواہ مخواہ بزدل نہ بن!“ عامر نے اسے گھر کا۔

”یہ اتنی بڑی دیوار تھی نظر نہیں آ رہی کیا؟ کہیں خود کو پرہیز تو نہیں سمجھ بیٹھا ہے؟“ انور نے قہقہہ لگایا۔

”اس کا بھی حل موجود ہے میرے پاس۔ میں نے کبھی مکی گولیاں نہیں کھیلیں۔“ وہ احماد سے کہتا ہوا اس دیوار کی دہائی جانب بڑھ گیا۔

اس نے اچھر اچھر نظریں گھمائیں اور دہائی جانب بڑھ گیا۔ انور کی نظریں اس پر مچی ہوئی تھیں..... عامر ایک ٹوٹی پھوٹی ریڑھی کے پاس رکا بھر دے..... ریڑھی کو کھینچتے ہوئے واپس آ گیا۔

”یہ لے لو گولیاں مسئلہ حل!“ عامر نے اطمینان سے کہتے ہوئے اپنی دریافت کردہ ریڑھی بڑی مہارت سے دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی۔ اگلے ہی لمبے وہ اس پر پاؤں جما کر دیوار کی منڈ پر پہنچ گیا۔

”اوئے..... اوئے..... ہوئے..... جلدی کر انور! کیا کمال نظارے ہیں احرار؟“ وہ بھٹکتے اپنے جوش پر قابو پاتے یولا۔

اس کی پکار پر لپک کہتے ہوئے انور نے بھی اس کی تقلید کی اور منڈ پر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

پہلے وہ دونوں مین گیٹ پر پہنچے تھے۔ وہاں ان جیسے ان گنت مرہضان عشق پہلے سے موجود تھے۔

دھکم پیل اور ہڑبوک کی اطلاع اسکول ہیڈ مسٹر نیس کو مل چکی تھی اسی لیے انہوں نے مقامی پولیس کی مدد لے لی تھی لیکن عامر نے ایسے موقع کے لیے ایک متبادل راہ پہلے ہی تلاش کر رکھی تھی۔ اس نے انور کا ہاتھ تھاما اور مقامی جانب سے اس ’مہبت‘ میں داخلے کے منصوبہ پر فوری عمل کر ڈالا۔

”مجھ کہہ رہا تھا تو! یہاں تو واقعی کمال کے نظارے ہیں۔“ انور نے دیوار پر پہنچ کر اس کے کندھے پر دھپ لگائی تھی۔

”لیکن میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔“ عامر نے آنکھیں سکیڑ کر کہا۔

”کہیں اندر جانے کا خیال تو نہیں چل رہا تیرے دماغ میں؟“ وہ سر ہٹاتے ہوئے پوچھ کر بھی پیاسے لوٹ جائیں تو کیا ”دریا کے کنارے پہنچ کر بھی پیاسے لوٹ جائیں تو کیا

”اب یہاں سے کیسے اترے گا نیچے؟“ انور نے نعم رضامندی سے استفسار کیا۔

”بس دیکھا رہا۔“ وہ چپکلی کی طرح منڈ پر سے چٹ گیا اور بچتے ہوئے دیوار کی بائیں جانب گھوم گیا۔

یہاں اسکول کا گراؤنڈ تھا اور گراؤنڈ میں لگے ہوئے بیڑ کی شاخیں دیوار تک پہنچ رہی تھیں۔ عامر نے درخت کی شاخوں کو تھام لیا اور احتیاط سے قدم جھاتا اسکول کی سرزمین تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کی دلیری نے انور کے ارادوں کو بھی مجبور کیا اور اگلے دس منٹ میں وہ بھی ہانپتا کانپتا اس بیڑ کے نزدیک موجود تھا۔

اپنے تحریک پر بحال کرتے ہوئے انھوں نے چٹون کی جب میں موجود کبھی نکال کر بال درست کیے اور شرٹ چٹونوں میں اڑتے ایک طرف چل دیے۔

اب ان کے ذہن میں کوئی بھی خصوصی منصوبہ نہ تھا۔ صحت مخالف کی فطری کشش اور ہم جوتی سے مغلوب ہو کر وہ کشاکش کشاں ان رنگینیوں کی جانب بڑھتے جا رہے تھے۔ لڑکیوں کی نظروں میں حیرانی ستائش کے لے چلے جذبات انھیں ہواؤں میں اڑانے لگے۔

اسی بے دھیانی اور عالم دہوشی میں وہ گراؤنڈ میں موجود اسٹائر کی طرف نکل آئے۔ ہر سو ریشی بال لگائی عارض مشابہ الامعاء وجود اور کنارے میں والی موجود تھیں۔ وہ عالم حیرت میں کھڑے حیناؤں کو دیکھ رہے تھے کہ کسی نے گدی پر زور دار پھیر سید کیا۔

”اوئے! تم لوگوں کی جرات کیسے ہوئی اعدا آئے کی؟“ ایک پولیس اہلکار نے دھاڑتے ہوئے کہا۔

”وہ..... ہم..... میں..... احرار.....“ عامر اس اچانک افتاد پر بوکھلا گیا اور فرار کے لیے رست تلاش نہ کیا۔ مگر ان اہلکاروں کی گرفت میں دونوں ہی چل کر رہ گئے۔ انھیں علم ہی نہ ہوسکا تھا کہ ان کی آمد کی اطلاع پر ہیڈ مسٹر نیس نے فوری طور پر ایکشن لیتے ہوئے مرکزی گیٹ پر موجود پولیس کو اندر بلا لیا تھا۔

”مرد دیکھو ذرا ان کی اور حرکتیں دیکھو اوئے بے شرمو! تمھارے گھروں میں ماں بیٹیں نہیں ہیں کیا؟“ گرفت صورت سپاہی نے انور کو ایک زوردار پھیر سید کیا۔

”غلطی ہو گئی جناب! اب چھوڑ دیجیے..... آئندہ کبھی ایسا کرتے نظر آئے تو جو چور کی سزا دے گا۔“ عامر نے التجا

”ناں پتر ناں! ایسے کیسے چھوڑ دیں۔ تمھاری اس ذہانت اور دلیری نے تو ہمارا دل موہ لیا ہے۔ اب ذرا ہمیں بھی مہمان نوازی کا موقع دو ناں۔“ فزہی بال اہلکار پھنکارے ہوئے یولا۔

اس اسکول میں اس کی جینی بھی میٹک کی طالبہ تھی۔ اس لیے وہ انھیں کوئی رعایت دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ انور اور عامر کے بشرے سے اک ذرا بے چینی جھلکی لیکن شرمندگی یا خوف کا اب بھی کہیں مشاہدہ نہ تھا۔

”لے چلو انھیں باہر گاڑی میں۔ آج ان کی یہ ہیرو کیری تاک کے درختے نہ نکال دی تو نام نہیں میرا۔“ فزہی بال کا ٹیبل نے اپنے ساتھی سے کہا۔

وہ انھیں کار سے گھنٹے ہوئے گیٹ کے پاس موجود گاڑی میں لے گیا۔ ان کی ہیٹ کدائی دیکھ کر وہاں موجود دیگر لڑکے کھسک گئے۔ کرخت صورت پولیس اہلکار نے ان دونوں کی کمر پر اپنے بھاری بھر کم بوٹ سے ٹھوکر رسید کی اور اپنی معیت میں قریبی قہاندہ دانہ ہو گیا۔

☆☆☆

”برے پھنسے ہیں اس بار تو!“ انور نے دھیرے سے کہا۔

”ارے تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ ہم نے کوئی قتل نہیں کیا ناں کسی کا؟ یہ لوگ خواہ مخواہ اپنے گھر بنانے کے لیے ہمیں لے آئے ہیں۔ چھوڑ دیں گے خود ہی تھوڑی دیر میں۔“ عامر بے نیازی سے یولا۔

”گھروالوں کو کیا منہ دکھائیں گے؟ انھیں بھی خبر تو مل ہی گئی ہوگی۔ جب ہمیں تحیث کر گاڑی میں ڈالا جا رہا تھا تو میری نظر ظہور پر پڑی تھی۔ وہ بھی وہیں جھوم میں موجود تھا؟“

”کون گھومو؟؟ وہ جہل اسٹور والے کے بیٹے کی بات تو نہیں کر رہا تو؟“ عامر کی پیشانی چمن آلود ہوئی۔

”ہاں بالکل وہی، اس کے باپ کے اسٹور پر حملہ کے سببی افراد آئے ہیں۔ اب تک اس نے خوب ڈھنڈورا پیٹ دیا ہوگا ہماری گرفتاری کا۔“ انور نے دانت پیسے۔

”تو اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے؟ ہم بھی چال اس پرالت دیں گے کہ وہ گھر لڑا اسکول کے باہر کیا کر رہا تھا اس وقت؟“ وہ اطمینان سے یولا۔

”تجربہ بھی ذہانت کا جواب نہیں۔“ انور کی بات پر وہ بے ساختہ مسکرا اٹھا۔

”دھکر نہ کر، یہ چھوٹے موٹے واقعات تو مرد کی زندگی کی شان ہوتے ہیں۔ مستقبل میں ایسے تجربات ہمیں سنبھال کر چلنا سیکھائیں گے۔“ عامر نے دلاس دیا اور نور بے فکر ہو گیا۔ ان دونوں کی عمر سولہ سال تھی۔ چھری جسامت سانولی رنگت اور چمکے و جاذب نظر نقوش سینے اوڑھنے کا جلیقہ بھی انھیں خوب تھا۔ جدید ترش خراش گئے لمبوسات ان کی خوبصورتی کے لیے ہمیشہ بوس ثابت ہوتے۔ پڑھائی لکھائی سے قطع تعلق کو ایک زمانہ بیت چکا تھا۔ آوارہ گردی میں خاصا ملکہ حاصل تھا۔

وہ دونوں بیک وقت چچازاد و خالہ زاد بھائی تھے۔ سوئے اتفاق گھر بھی ایک ہی محلہ میں تھے۔ انور عامر سے محض ایک ماہ چھوٹا تھا لیکن عادات و اطوار میں وہ بالکل جڑواں بھائی معلوم ہوتے تھے۔ ان کے تمام تر منصوبہ جات ہمیشہ کامیابی سے ہمکنار ہوتے تھے لیکن اس بار انھیں پہاڑ تلے آ گیا تھا۔

حوالات کے ٹھنڈے فرش پر پاؤں پارسے وہ اطمینان سے خوش گیموں میں مصروف تھے کہ انھیں اسی کرخت صورت اہلکار کا چہرہ ملاخوں کے پار دکھائی دیا۔

”مہبت ڈھیٹ اور عادی مجرم معلوم ہوتے ہو۔ ورنہ یہاں پہنچ کر تو بڑے بڑوں کا پتا پانی ہو جاتا ہے۔“ اس نے تحیر سے انھیں گھورتے ہوئے کہا۔

”نہیں جناب! ہم یہاں پہلی دفعہ ہی آئے ہیں۔ آپ کچھ کرم فرمائی کر دیں ہم پہ آپ کے اس احسان کی ہر قیمت ادا کرنے کو تیار ہیں ہم۔“ عامر نے احتیاط سے چار ڈالا۔

”اچھا! کیا قیمت ادا کر سکتے ہو؟“

”جو آپ چاہیں، ہم مہیا کر دیں گے۔“ انور نے فوراً کہا۔

”فی الحال تو تمھیں خیا صاحب نے طلب کیا ہے۔ پہلے انھیں محنت کو پھر بات کرنا مجھے سے۔“ وہ مسمیٰ خیزی سے یولا۔

”لو جی! ایک اور خیا، ابھی تو پہلے والے سے بڑی دقت سے رہائی ملی تھی۔“ عامر نے ہونٹ کھڑے۔

اس اہلکار نے ان کی تن ترانوں پر حریف دھیان دینے بغیر حوالات کا دروازہ کھولا اور ایک باہر پھر کار سے گھٹیا ہوا بٹلی کمرے میں لے گیا جہاں ایک میز کے عقب میں بھاری بھر کم خیا چہرے پر خوشنود اور درخشش لیے ان کا انتظار تھا۔

”یہ کیسے سربئی! آپ کے سبکی اندازے درست

تھے۔ بہت ہی ڈھیت ہے جیسا ہیں یہ۔“ اس نے دلوں کی گلدی پر دو ہاتھوں سے بیک وقت زوردار پھرسید کیے تو وہ بلبلانے لگے۔

”ہم نے کوئی قتل یا ڈکیتی تو نہیں کی خیا صاحب! جو ہم سے یہ سلوک ہو رہا ہے۔ یہ تو قانون کے خلاف ہے۔“ انور سے برداشت نہ ہوا۔

خیابان جھلکے سے اٹھا اور اس کا چہرہ اپنے ہاتھ میں جکڑ لیا۔ ”اب تو ہمیں قانون سکھانے کا نفعہ نامحقق! لگتا ہے قتلوں کا کچھ زیادہ ہی شمار چڑھا ہے اس نفعے سے دماغ پر، انہی علاج کیے دیتا ہوں تیرا۔“ وہ اس کے ہمراہ اسٹائل اور طیلے پر چوٹ کرتے ہوئے بولا۔

انور کے نقوش معروف بھارتی اداکار رمن سے بہت مشابہہ تھے اور اس شبیہ کو حریہ پڑا نہ بٹانے کے لیے وہ ہمیشہ اپنے بال بھی اسی کی طرح بتاتے رکھتا۔

خیابان کے اشارے پر مشتاق نے انھیں بالوں سے دبوچ کر فرش پر پھینکا اور ٹھوکر دوں کی زد میں رکھ لیا۔ کچھ دیر بعد وہ پیر وئی سمت سے درمیانی عمر کے ایک شخص کو لے آیا جس کے ہاتھ میں ایک مشین دیکھ کر وہ قدرے حوش ہو گئے۔

اس نے آن کی آن میں مشین ان کے سروں پر پھیر کر انھیں صفا جٹ کر دیا۔ یہ سزا جسمانی تکلیف سے کہیں سوا گئی۔ ”آجندہ کسی بھی لڑکی کے بالے میں نفی سوچ ذہن میں لانے سے پہلے مجھے اور اپنے اس انجام کو یاد کر لینا اور دعا کرنا کہ دو بار وہ بھی مجھ سے سامنا نہ ہو ورنہ تمھاری مردانگی کے نشان ہی نیست و نابود کر دوں گا۔“ خیابان نے پتھار تے ہوئے انھیں مشتاق کے حوالے کر دیا۔

☆☆☆

عامر اور انور پر اگر پولیس کی جانب سے جسمانی تشدد ہوتا تو انھیں ایسی اذیت نہ ہوتی لیکن بالوں سے محرومی کا کرب حد سے سوا تھا۔ نیم شفاف سران کے لیے تو ہیں اور رسوائی کی زندہ علامت بن گیا تھا۔

وہ بیسویں صدی کے ایسے نوجوان تھے جو نامحسوس طریقہ سے مسایہ ملک کے رنگوں میں ڈھل چکے تھے۔ تو سے کی رہائی ابھی تو آزادی کی میں تھی اور یہ وہ وقت تھا جب دو سال قبل ایک طرف تو سیاہی کیوں سے پر ایک بہت بڑی تبدیلی رونما ہوئی تھی تو دوسری جانب عوام کی ذاتی زندگی میں بھی ماضی جیسا ظہور آتا ہو جانے لگا تھا۔

کچھ عرصہ پہلے ٹیلی ویژن کی نشریات کا آغاز دو پہر تین

بجے کے بعد ہوا کرتا تھا۔ انٹینا کا رخ تبدیل کیے وہ درودوں میں نیون کر کے بھارتی قتلوں اور چڑ پار کے خوب حیرے لیا کرتے۔ عوام الناس میں سادگی و محبت کم ہی تھی لیکن ابھی فلم نہیں ہوئی تھی۔ صنف مخالف کے لیے دیکھی وکٹوش بڑھنے لگی تھی اور یو جی بھی کیوں؟ وکٹوش رعنائی کے وہ دیکر پہلے تو چلن کی اوٹ میں ڈوب چوں کے جھروکے سے اپنی جھلک دکھاتے تھے مگر اب یہ تنکھات فٹم ہو گئے تھے۔ پہلے ہیل کزنز سے پردہ کا رواج ختم ہوا۔ نظریں اب باضابطہ طور پر چار ہوشیہ ڈل ایک بیٹھی سی تال پر دھڑکتے اور درج و کتب میں سیانے نئے چھڑ جاتے۔ بنت خوا اب پوشیدہ سر بستہ راز نہ رہی تھی۔ وہ تو ایک کھلا خزانہ بننے لگی تھی جس کی ایک جھلک سے اسے تصویر کرنے کے جذبات چل جاتے۔ اس تصویر کا اثر سب سے پہلے ڈل کلاس طبقے نے قبول کیا۔

اس تبدیلی کا اصل آغاز عامر کے گھر میں ہی دی آؤ کی آمد سے ہوا تھا۔ سینما کی بڑی اسکرینوں پر اپنے من پسند فلمی ستارے دیکھنے والوں کے لیے یہ جو بڑے ڈراما گارڈین بہت پرکشش تھی۔ ان کے لیے سب سے زیادہ حیران کن امر یہ ہوتا تھا کہ من پسند مناظر و گانے فارورڈ اور ریورس کر کے جتنی بار چاہے دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس شیطانی چرخ کا جو بھی مالک بنتا رشتہ دار و احباب بہت اہتمام سے مبارکباد دینے پہلے آتے۔ مہمان نوازی کے تقاضے بھاتے ہوئے انھیں کوئی نہ کوئی ویڈیو کیسٹ بھی دکھائی جاتی اور یہ کیسٹ اگر پیرہٹ بھارتی فلم ہوتی تو میر زبان کی شان و وقار میں کمی چاند لگ جاتے۔

مادھوری سری دیوی زچھا آیتھ را جیش کھنا اور بچے دت کو اسکرین پر اپنی اسٹون کا ترجمان بنے دیکھ کر وہ لاشعوری طور پر اپنی ذات کے لیے انہی امور کے متقاضی ہونے لگتے۔ اور پھر نظروں کا دائرہ اپنے کزنز، محل داروں سے وسیع تر ہوتا ہوا گزرا اسکول اور کالج تک جا پہنچتا۔

لڑکیاں بھارتی ہیروز کی طرح رنگ برنگے لباس چولی گھا کرے پہننے کی مجاز تو نہ تھیں لیکن وہ اپنا سنگھار کیمسو اور ناز و انداز میں انہی کی نقالی کرتیں۔ اور ہر لڑکے، وہ تو ازلی آزاد فطرت تھے۔ جنہا کا استقبال بھی اسی دور میں مروج ہوا۔ کھلے رنگوں والی شرٹس گردن سے نیچے جمولے بال گھلے میں لٹکتی ایک آدھ جین صنف مخالف کی نظروں میں ستائش اور پسندیدگی کے جذبات عیاں کرنے لگتی۔ رو مانس روٹی بنزری ترکاری جیسی ضرورت بننے

لگا۔ مدھ بھرے نقموں کے ریلے بول دلی جذبات کو گویائی دینے کا بہترین ذریعہ تھے اور خوشبوؤں میں بے کاغذ پر حال دل بیان کر کے عہد دیان کے سبھی مراحل طے کر لیے جاتے۔ انور اور عامر بھی تھیں کہ زد میں آئے ایسے ہی ایک گھرانے کے ہونہار نہ پھوٹتے تھے۔ تبدیلی کا زہر گلوں میں مکمل طور پر سرایت کر چکا تھا اور اب جذبات کو بھی اپنی تسکین بہر صورت دے کر رہی۔

☆☆☆

”کر دی خوار اپنے باپ دادا کی عزت؟ لے آئے تمھ اپنی بے حیائی کا!“ اس رات عامر کے گھر میں داخل ہوتے ہی ماں نے توپوں کا رخ جس کی طرف موڑ دیا۔ ”تھوڑی سی حیا کر لے عامر! اب تک تو میں تیری ان حرکتوں پر پردہ پوشی کرتی آئی ہوں مگر اب گھر میں تیری بھالی آنے والی ہے، میری ناک نہ کھو ادیتا برادری میں۔“

”اب میں نے کیا کر دیا ہے؟ خوا خواہ ہی میرے پیچھے پڑی رہتی ہو۔“ وہ ہزاروں سے بولا۔

”نہ میرا بیٹا! تو نے تو بھی کچھ کیا ہی نہیں، مکہ مدینہ سے حج کر کے آیا ہے تاں جو بے ہال کئے پڑے ہیں۔“

”وہ تو بس میں کسی دوست سے ایک شرط ہار گیا تھا تو بالوں کی قربانی دینی پڑی۔ گھر کی کمیٹی ہے پھر سے بڑھ جائیں گے۔“ اس نے مشکل اپنا پیچہ متوازن رکھا۔

”اچھا! تیری دوستیاں تقانوں میں کب سے ہو گئیں؟ پشیمان کے لڑکے نے سارے محلے میں خبر نشر کر دی ہے۔“ وہ طیش میں آگئی۔ ”مخلوں میں ملنے والی شہرت ایک تمغہ کی طرح ساری عمر ماتھے کا جموہر بنی رہتی ہے۔ ہم نہ مکھوں کے وقت سے یہاں رہے چلے آئے ہیں۔ آئندہ بھی یہیں رہتا ہے۔ یہی چمن رہے تو کوئی نہیں آئے گا اس دلہیز پر رشتہ کے لیے۔ پڑھائی لکھائی میں بھی تیرا دماغ چلا نہیں، بس یہ شیطانیات سوچتی رہتی ہیں۔“

”اب بس بھی کر دیں امی! آپ کو تو بس بہانہ چاہیے ہوتا ہے مجھے لکچر دینے کا۔“ وہ فن میں کرتا جھٹ پر چلا گیا۔ بلیقے تفکرات میں گھر کی محن میں موجود چار پائی پر ڈھلے گئی۔ ایک سال قبل بیوی کے اسے بہت سی الجھنوں میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس کا شو پر شاہر بہت سختی ایماندار اور صاف گو انسان تھا جس کا روزگار مرکز پر چر ہے پر ایک ذاتی چائے خانے سے وابستہ تھا۔ دو بیٹوں اور ایک بیٹی کی کفالت بہت احسن طریقہ سے ہوتی رہی۔ سب سے بڑی بیٹی جیل کی شادی

کا فریضہ اس نے اپنی زندگی میں ہی ادا کر دیا تھا۔ بڑے بیٹے جیل کو بھی خاصی بھاگ دوڑ سے ایلو پھی میں سینٹل کروا دیا۔ جیل طبعاً سنجیدہ حراز، حساس انسان تھا جس کی زندگی کا محور والدین اور بہن بھائیوں کی خوشیاں تھیں۔

شاہر کو زندگی مہلت دیتی تو وہ عامر کو بھی کوئی معقول روزگار فراہم کر دیتا۔ اپنے اس بیٹے کے پڑھائی میں بھی ذہن، نفی سوچوں اور رجحانات کا انداز وہ بہت پہلے لگا چکا تھا۔ ایسی طرز فکر کا حامل انسان اپنے ساتھ خود سے وابستہ رشتوں کے لیے بھی تباہی و بربادی ہی پیدا کرتا ہے لیکن دل میں اٹھنے والا ہلکا ہلکا جھلکا درد اس کے لیے ایک ہارٹ ایک کی صورت میں موت کا پیامبر بن گیا اور اولاد کی زندگی سنوارنے کی تمام تر ذمہ داری بلیقے کے کندھوں پر ڈالے وہ خاک اڑھ کر سو گیا۔

شوہر کی کمی محسوس کرتی بلیقے اپنے خیالات کی رو سے کال بیل کی آواز سن کر چوکی۔ وہ غم حال و بدو سے اپنے چہل چلنی بھی اسی اور درد ازہ مکمل دیا۔ اس کے سامنے پہنچی بہن اور پورانی راشدہ انور کے ہمراہ وہ جو گئی۔ ان دونوں بیٹیوں میں نقوش کی مماثلت کے علاوہ انور و عامر کا درجہ بھی مشترک تھا۔ راشدہ کا خاندان عرصہ دراز سے بسلسلہ روزگار مہتمل میں قیام تھا۔ سال بھر کے بعد اسے صرف ایک ماہ کی چھٹی لٹی۔ باپ کی غیر موجودگی میں انور کو سڑکیں تاپنے اور ویڈیو کیسٹ دیکھنے کے سوا کچھ بھی نہ سوچتا تھا۔

”اس وقت خیر سے آتا ہوا راشدہ؟“ بہن کی آنکھوں میں دیرانی اور وحشت کے ڈیرے بلیقے کو حریہ دہک گئے اور وہ اسے لیے محن میں چلی آئی۔

”آپا! میں تو بہت پریشان ہو گئی ہوں اس لڑکے کے ہاتھوں۔ آج یہ جو نیا کارنامہ سرانجام دے کر آئے ہیں! اشتقاق کو کلم ہوا تو مار مار کر اس کی جڑی اجڑا دیں گے۔“

”اشفاق تو پھر بھی اس کوئی اور کری دکھا کر جامد میں لا سکتا ہے۔ میں دکھائی دیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ جیل کو دو سال بعد پہنچی لٹی ہے اور وہ بھی ایسا بھلا ماس ہے کہ بھائی کو اپنی کمال کی جوتیاں پہنانے کو تیار رہتا ہے۔ ماتھے پر کوئی جھکن لائے بغیر اس کے فرمائش پوری کر دیتا ہے کہ اسے باپ کی کمی محسوس نہ ہو لیکن یہ ماتھے سے اٹھتا جا رہا ہے۔“

”میں نے تو سوچ لیا ہے آپا! اس کا شادی کارڈ بننے ہی اشتقاق کے پاس بجوا دوں گی اسے۔ میں مزید رکھوائی نہیں کر سکتی اب۔ آپ بھی جیل سے بات کر کے دیکھنا۔“

وہ دونوں سر جوڑے مختلف منصوبہ بندی میں مشغول تھے اور ان کے ٹھکانے سے بے نیاز عوام اور اوجھڑت پر بیٹھے اپنا دکھ بدن اور اندرونی چوڑوں سے ابھی نہیں دباتے مشاق اور ضیاء کو کون سے میں کن تھے۔

☆☆☆

راشدہ اور بقیس نے از سر نو ہمت پیدا کی اور بیٹوں کو راہ راست پر لانے کے لیے انہیں نئی ذمہ داریوں میں الجھانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ شاکر کے چائے خانے کو اس کے ایک قریبی دوست ماجد نے بہت محنت سے سنبھال کر ایک چھوٹے سے ہوٹل کا درجہ دے دیا جہاں وہ گھر میں بنے سالن وغیرہ بھی رکھ لیتا۔ صبح اور دوپہر کے اوقات میں یہاں بہت رش رہتا۔ مزدور برادری سے تعلق رکھنے والے افراد ان ذائقہ دار کھانوں کے بہت رسیا تھے۔ وہ نہایت ایمان داری سے آمدن کا ایک مخصوص حصہ شاکر کے گھر پہنچاتا۔

بقیس اس روز اپنی فریاد لیے ماجد کے پاس پہنچ گئی۔
”میں بیوہ عورت ہوں بھائی ماجد! اس کا سنا بن جھن جاتے تو بے ایمانی کی جھلکی دیکھ سکتے تھے۔ یہ سب سے پہلے گھر میں موجود اولاد کا رنگ روپ اور کردار بگاڑتی ہے۔ عوام کو اپنے ساتھ مصروف کر لیں، جگہ پر بہت بڑا احسان ہوگا۔“

”مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے بہن! اس کا رد بار میں محنت اور سرمایہ کاری شاکر ہی کی ہے۔ اس کی اولاد کا کتن اڈل ہے۔ اگر زندگی بے وفا نہ نہ کرتی تو وہ جیل کی طرح انہیں بھی رکھ کر ہی نہ مانتا۔“

”بہن! دو چار سال کی بات ہے بھائی! پھر اسے بھی جیل کے پاس ہی بچھاؤ کی۔ تب تک اس پر سختی کی بہت ضرورت ہے۔“

”تم بالکل فکر نہ کرو! اللہ بہتر کرے گا۔ اسے کل ہی سے بھیج دیتا۔“

بقیس مطمئن ہو گئی اور گھر واپسی سے قبل راشدہ کے پاس چلی گئی۔
”کوئی مل تلاش کیا اور کے لیے۔“
”جی آئی! اس کے لبا کا خط ملا تھا کل۔ انھوں نے اپنے واقع کار کا بتایا ہے جو زمانہ مردانہ کپڑوں کا بہت ماہر روزی ہے۔ اور کو کسی کی شاکر دی میں دے آئی ہوں۔ کوئی ہنر تو سیکھ لے گا یہ۔“

وہ دونوں ہی اپنے اس دور دوسرے نجات پر بہت سرور تھیں اور اس سے بھی خوش آئند بات یہ تھی کہ عوام اور انور بلا

چوں چاہی اس نئی ڈیوٹی کے لیے رخصتی ہو گئے تھے۔ راشدا اور بقیس کو عاؤں کی قبولیت کا یقین ہو چلا تھا لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ کھانے میں ہونے والی مار پیٹ کے نتیجہ میں وہ شخص وقتی دباؤ کا شکار تھے۔ انھوں نے ہمیشہ ظلموں میں ہیر و معزات کو اپنی خوشی اور جسامتی طاقت کے ذمہ میں محنت ترین تشدد برداشت کرتے دیکھا تھا لیکن اب خود یہ پڑی اس افاد کے ساتھ ہی انہیں آنے وال کا بھلا معلوم ہو گیا تھا۔
وہ غم روزگار کی اس نئی مصروفیت میں الجھ تو گئے تھے لیکن دل و دماغ میں رنج بس چکی آوارگی کو بھی اپنے اخراج کا رستہ درکار تھا جو قدرے تھل سے ہی کسی لیکن انھوں نے تلاش کر لی۔

☆☆☆

”میں نماز کے لیے جا رہا ہوں عاصم! جماعت کا وقت نکل جائے گا۔ تم بھی چلے چلو ساتھ ہی۔“ ماجد نے اپنا معمول کا فقرہ دہرایا۔

”نہیں چا چاچی! آپ چلے جائیں، میں یہاں سنبھال رہا ہوں۔“ عاصم نے بھی اپنا مخصوص جواب دیا۔

اسے ماجد کے ساتھ ہو کر کام سنبھالنے چاہا ہو چکے تھے اور اپنے برتاؤ، سنجیدگی اور ذمہ داری سے اس نے بہت اچھا تاثر قائم کر دیا۔ ماجد کی صحت اور تھکاک کو دیکھتے ہوئے عاصم نے اسے دوپہر کے بعد کچھ وقت آرام کی غرض سے گھر رہنے کا مشورہ دے دیا جو معمولی سی بہن و پیش کے بعد اس نے تسلیم بھی کر لیا۔ اب یہ صورت حال کچھ یوں ہوئی کہ ظہر کی نماز کے بعد ماجد دو گھنٹے گھر میں گزار لیتا۔ تاہم وہ عاصم کو اپنے ساتھ مسجد چلنے کے لیے مدعو ضرور کرتا اور عاصم ہمیشہ پہلو بھا لیتا۔

”نماز بھی تو ضروری ہے ناں بیٹا! دنیاوی کاروبار تو چلے ہی رہے ہیں۔“

”ہو کی ضروری..... مجھے کیا علم؟؟ مجھے نماز نہیں آتی۔“ عاصم نے بھی کل کر بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

”کک..... کیوں؟ کیا شاکر نے بھی نہیں کہا تم لوگوں سے؟“ ماجد ہکا بکا تھا۔

”ابا پی تو بس روزی روٹی کمانے میں الجھے رہے تھے، ای جی پہلے سختی سے بھیج دیا کرتی تھیں لیکن میں اور انور ایک دو سپاروں سے آگے نہیں بڑھ پائے تھک آکر مولوی صاحب نے ہمیں پڑھانے سے انکار کر دیا۔“

ماجد اس انکشاف پر تاسف سے سر ہلا کر رہ گیا اور خاموشی سے رخصت ہو گیا۔

اس کی روانگی کے فوری بعد عاصم ہوٹل کے عینی جانب بڑھ گیا جہاں ایک گودام نما انتہائی مختصر کمرہ موجود تھا۔ یہاں پائے بنانے کے لیے اضافی سامان وغیرہ رکھا جاتا تھا۔ اس نے فوراً ایک بدرنگ چوٹی دروازہ کھول دیا۔ پانچ منٹ سے جی کم دروازے میں اس کا گھر مقصود اسی دروازے سے اندر داخل ہوتا دکھائی دیا۔

وہ ایک کسٹن اور بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ کالج کے سفیر یونیفارم میں بیٹوں اس کی دلکشی و رعنائی آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی۔ مذکورہ کالج اسی چوراہے سے بائیں جانب ایک مرکزی سڑک پر واقع تھا۔ صبح اور دوپہر کے اوقات کار میں وہاں لڑکیوں کا اکثر جھوم رہا تھا جس میں سے اکثریت تو اپنے بھائیوں یا والدین کی زیر نگرانی ہوتی لیکن کچھ پری پیکر ایسی بھی نظر آتیں جو ٹوٹیوں کی صورت میں اکیلی اپنی درگاہ جایا کرتیں۔ اسی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عاصم نے اپنی خوبصورت اور مستقل حرمانی کے ترش کے چند تیر آزمائے اور عاصم نے اس لڑکی کو اپنا اسیر کر لیا۔

پہلے پہل معاملات تو محض نظروں کے تبادلے اور اشارے کنایوں تک ہی محدود رہے لیکن پھر ایک روز بہت کر کے اس نے عاصم کو فنی انداز سے لبریز خط پہنچا دیا۔ عاصم بھی جانے کب سے اپنے دل میں پرواؤں جیسی چاہت کے جذبات لیے سرگرداں تھی۔ وہ مکمل طور پر عاصم کے حرم میں جکڑتی چلی گئی۔

اس روز وہ عاصم کے بے حد اصرار پر اس چھوٹے سے ہوٹل کے عقب میں واقع قدرے سسٹان اور ویران گلی میں کھلنے والے گودام کے دروازے سے اندر چلی آئی۔ عاصم کا دل بیٹوں اچھل رہا تھا۔ صنف نازک سے یوں بالمشافہ ملاقات اس کے لیے ایک انوکھا تجربہ تھا۔ عاصم کا بھی کم دیش یہی حال تھا۔ تاہم دونوں ہی نے اپنے جذبے پر بند باندھے رکھے اور وعدوں و وعود پر ایمان کے ایک نئے سفر پر روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

اب ذرا انور کا حال ملاحظہ ہو.....
اس نے بھی دانشمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے اپنے پیٹے کے تمام تر اسرار و رموز سیکھنے کا آغاز کر دیا۔ چھ ماہ میں وہ کپڑوں کی کٹائی کا خاصا ماہر بن چکا تھا اور آثار بھی ظاہر کرتے تھے کہ وہ ملائی بھی بہت جلد سیکھ لگا۔ یہ وہ وقت تھا جب یونیسکس کا رواج ابھی عام نہ ہوا تھا۔

خود نمائش کے ذمہ میں جلتا جگمات ماہر روزیوں سے سلوائے گئے کپڑے پہننے کو ہی ترجیح دیا کرتیں۔ اس ٹیلرنگ شاپ پر بھی ایسی ہی خواہش کی آمد ہوا کرتی تھی۔ انور کے نقوش و جامات اور بے خوف انداز انہیں بے حد بھاپکے تھے۔ وہ آئے روز ٹیلر ماسٹر سے الجھتے لگتیں۔

”ماسٹر جی! مجھے گھر میں بہت ہی مصروفیات گھیرے رہتی ہیں۔ میں باقاعدگی سے اپنے کپڑوں کا ٹاپ دینے نہیں آ سکتی۔“

”تو ہم کوئی تبادلہ رستہ نکال لیتے ہیں بیگم صاحبہ! آپ ٹھہر کر رہیں۔“ اوجیز عمر ٹیلر ماسٹر اپنی اس مستقل روزی میں غفل پڑتے دیکھ کر بوکھلا جاتا۔

”ایسا ہو سکتا ہے کیا ماسٹر جی؟“ وہ بھولپن سے استفسار کرتیں۔

”بالکل ہو سکتا ہے جی! آپ کو جب بھی ضرورت پیش آئے ڈرائیور کو بھجوا دیا کریں۔ میں اس سے لڑکے کو روانہ کر دوں گا۔ یہ ٹاپ وغیرہ لے لیا کرتے گا۔“

”بھتر ہے! اگر تبادلہ راہ میسر آجائے تو ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے بھلا؟“ ان کی نیم رضامندی ماسٹر جی کی رکی ہوئی سانس، بحال کر دیتی۔

انور ان خواہش کے لیے جیلے ہانوں اور سوچ و فکر سے لاعلم نہیں تھا۔ وہ اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہوتے ہوئے جوش اور اعتماد سے اس نئی ڈیوٹی پر روانہ ہوتا۔ اس کی پانچوں اگلیاں سبھی میں اور سرگڑای میں تھا۔

مردوزن کی قربت کے اسرار و رموز سے آشنا ہوتے ہی وہ وحشت کے جنگل میں سر ہٹے روزی چلا جا رہا تھا۔

☆☆☆

عوام اور انور کی ملاقاتوں میں اب پہلی باقاعدگی نہیں رہی تھی لیکن ہفتہ وار جمعی کی شام وہ ہمیشہ ملنے اپنے اس نئے سفر کی داستانیں الہ دوسرے کے گوش گزار کرتے۔ اسی دنوں ٹیلر جی ایونگجی سے دو ماہ کے لیے پاکستان آ گیا اور گھر میں اس کی شادی کے ہنگاموں نے ایک نئی مصروفیت پیدا کر دی۔

ٹیلر کی بیوی ان کے دور کی رشتہ دار تھی اور مکمل طور پر ایک گھرانہ کی شہر پرستی اس کی نگاہ میں پڑی تھی۔ کم فرائی سے باعث حراج میں بے پروائی کا عنصر بھی شامل تھا۔ ٹیلر کے سامنے اس کا چہرہ گنار بن جاتا۔ وہ شوہر کے گرد پروانہ وار گردش کرتی۔ اس کی چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا

موسم گرما کی طویل دوپہروں کا ساسی..... خوشگوار تحریروں سے ماحول 2017ء کا دل خوش کن پاکیزہ

پاکیزہ

رفعت سراج و شیریں حیدر کے خوب صورت ناول انوکھے موڑ پر

سحر ساجد کے قلم سے ایک اچھوتی تحریر من جاں بازم

سیمارضا ردا نے دیکھے کچھ نئے باب اپنے من ناول ہم کو عبث بدنام کیا میں

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کا پُر نور مضمون اللہ اور اس کا نور

شوہر کی دنیا سے اجنبی، اجو بھائی کرتے ہیں کچھ انکشافات پاکیزہ کے مہمان میں

ناہید سلطانہ اختر کی تحریر

رسانی نارسائی میں انوکھی محبت

کا قصہ بہت ہی پُر اثر انداز بیاں کے ساتھ

نور

نیلم احمد بشیر، بشری سیال اور غزالہ عزیز کی نئی تحریریں

اور

عقیلہ حق، عذرا آفتاب، فرح طاہر فریدی، سسرین جمیل سیال،

سیما بنت عاصم و دیگر ہر ماہ میں نیا نیا ایسا ہی بے حد عمدہ کہانیاں

ماہ جون کی مناسبت سے دل پذیر سلسلے، دل کداز شاعری، پرکشش کارزار اور خوش ذائقہ تراکیب صرف آپ کے لیے

گھر میں کچھ قہر راتی کام کا آغاز ہو گیا۔ مکان مالک بذات خود مزدوروں کی عمرانی کے لیے محبت پر موجود رہتا اور اس کی معافی نگاہوں سے عمار کی سرگرمیاں پوشیدہ نہ رہ سکیں۔ چند روز بعد وہ خاموشی سے دوپہری کے وقت ماحول کے گھر جا پہنچا اور اس کے خوب لے لے۔

”تم نمازی پر بیٹھ کر انسان ہو ماحول! لیکن اپنے اس ہوش کی آڑ میں یہ کیا غلاطت پھیلا رہی ہے تم نے؟“

”کیسی نامعقول باتیں کر رہے ہو سفیان! میرے ہوش پر ہر چیز حفظان محنت کے اصولوں کے عین مطابق اور حلال ہوتی ہے۔“ ماحول نے الجھ کر کہا۔

”میں اس بات نہیں کہہ رہا، شکر کا لڑکا اکثر ہوش کے پھیلے کمرے میں لڑکیوں کو گھسائے رکھتا ہے۔ جب سے

میرے مکان کی تعمیر شروع ہوئی ہے، میں آئے روز یہی بے حیائی دیکھ رہا ہوں۔ اور تم کہتے ہو سفیان علم ہی نہیں۔“

”گھر میں تو روزانہ اس وقت آرام کی غرض سے گھر آ جاتا ہوں۔ وہاں صرف عمار ہی ہوتا ہے۔“

”عمار کے سابقہ کارنامے بھی کسی سے ڈھکے چھپے تو نہیں ہیں۔ پھر اس قدر اعتبار کی کیا وجہ ہے؟“

”مجھے اس کے مرحوم باپ کی دوستی اور مردوت نے مجبور کر رکھا ہے سفیان! لیکن تم آئندہ جب بھی ایسا ہوتے دیکھو اپنے ساتھ کچھ اور عمدہ داروں کو بھی لیے وہاں پہنچ جانا اور اسے خوب چار چوٹ لگا نا اس کے گھر والوں کو میں خود ہی سفیان لوں گا۔“ ماحول نے سنجیدگی سے کہا۔

عمار کی بد قسمتی بھی ان دنوں غالباً عروج پر تھی۔ اس کی ملاقات اگلے ہی روز نازنین سے طے تھی۔ سفیان نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور چند با اثر افراد کے ساتھ اسے رکھنے ہاتھوں پکڑ کر کسی بھی صفائی کا موقع دیئے بغیر اس کی رحلتی شروع کر دی۔ سفیان ایک کونے میں چادر سے منہ چھپائے قہر قہر کا پتلی نیلے کے پاس کیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھ کر دیکھ کر لیکن انتہائی سخت لہجہ میں کہہ رہا تھا۔ ”جب ایک لڑکی گھر سے باہر قدم نکالتی ہے تو وہ اکیلے نہیں ہوتی، اس کے ہمراہ والدین کی تربیت و اعتبار بھائیوں کا مان اور بہنوں کی عزت بھی ہوتی ہے۔ یہاں اس کمرے میں تم نے ان سب کو داغدار کر دیا ہے۔ میں نہیں جانتا تم کس گھرانے سے تعلق رکھتی ہو لیکن آج یہاں تمہاری موجودگی ان سب کی زندہ درگور بن چکی ہے۔“

”مم..... مجھے معاف کر دیں انکل! پلیز مجھے نکالیں

خیال رکھیں۔ جیل بھی اپنی اپنی ٹولی بیوی کی محبت میں سرشار رہتا تھا۔ گھر میں ایک روٹی اور چھل پھل کا ساں رہنے لگا۔ بقیہ اس صورت حال سے بہت خوش تھی لیکن وہیں ایک فرد ایسا بھی تھا جو ان دونوں کے ناز و انداز دیکھ کر بے وجہ حسد میں جھلا ہو رہا تھا۔

یہ عمار تھا۔ عورت اب اس کے لیے سرپرست راز تو رہی نہ تھی اس لیے بڑے بھائی اور بھائی کی نظروں میں محکمیتی محبت ہم آہنگی اسے بیزاری میں جھلا کرنے لگتی۔ تہینہ کا وجود اپنے سامنے دیکھ کر اس کا ذہن بری طرح سلگنے لگتا۔ کچھ ہی عرصہ میں اس نے گھر کا کام کاج اپنے ذمہ لے لیا۔ عمار پہلے پہل تو ممبر سے برداشت کرتا رہا لیکن پھر ایک روز وہ بے اختیار بول اٹھا:

”امی! مجھے کھانا آپ خود ہی دیا کریں۔ اسے مت بھیجا کریں۔“

”لیکن کیوں؟ میری بوڑھی بیویوں میں اب اتنا دم نہیں رہا بیٹا!“

”تو پھر میری بھی شادی کر دیں۔ لیکن اس کو میری نظروں سے دور رکھا کریں۔“ اس نے اپنی سفینیاں بچھ لی۔

”تم اپنے ہوش و حواس میں نہیں لگتے کس بل بوتے پر کروں شادی تمہاری؟ پہلے چار پیسے تو جوڑ لو۔“ بقیہ بھی ضبط کوٹھن بھی۔ ”اور بڑی بھانج سے بات کرنے کا یہ کون سا انداز ہے؟“

اس نے ایک جلتی ہوئی نظروں میں کھڑی تہینہ پر ڈالی اور میر کوٹھو کا روتا ہا ہر نگل گیا۔

☆☆☆

عمار اپنے مطالب کے بوجھ پھن سے خود بھی آگاہ تھا اور انی الوقت ماں اور بھائی کے اختیارات کے سامنے بے بس بھی۔ لیکن ایک در ایسا بھی تھا جہاں تمام تر اختیار اسی کے بس میں تھے۔ وہ لڑکیوں سے میل ملاقات کے سلسلے میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے لگا۔ پہلے پہل تو صرف عاصم ہی اس سے ملنے آیا کرتی تھی مگر اب اس فہرست میں مدیحہ، عرش اور نازنین کا اضافہ بھی ہو گیا۔ ہول کا گودام نما کمرہ ان ملاقاتوں کے لیے بہترین بن جائے پناہ تھی۔ عمار کی مثال اس وقت اس کی بہتر کی مانند ہو چلی تھی جو خطرات کو اپنے سامنے دیکھ کر بھی آنکھیں میچے رہتا ہے۔ اس کا خیرہ میٹنگ پوائنٹ انکی بے احتیاطیوں کے سبب طشت از باہم ہو گیا۔

اس جگہ میں لگاؤ کا گھر ہی واقع تھے اور انہی دنوں ایک

سفیان نے ایک دزدیدہ نظر عامر

☆☆☆

”میرے بیٹے پر غلط الزام لگایا گیا ہے بھائی
ماجد! وہاں کوئی لڑکی برا آدمی نہیں ہوئی بعد میں۔“

آجہہ چند روز میں ضابطہ کی کھردھائی کے بعد شاکر کی آخری نشانی بھی ماحد کی تحویل میں دے دی گئی۔ جمیل نے اس رقم اور اپنے دیگر اثاثہ جات سے ایک جنرل اسٹور کھولنے کا فیصلہ کر لیا۔ تقیس نے اس فیصلہ پر بہت ناک بھوں چڑھائی۔ وہ اب بھی یہی چاہتی تھی کہ دو دوس بیٹے بیرون ملک منتقل ہو جائیں لیکن جمیل اس بار ڈٹ گیا۔

ماہنامہ سرگزشت

”انور کے باپ نے اسے عمان بلوانے کا بندوبست کر لیا ہے۔ کچھ عرصہ بعد وہ راشدہ کو بھی ساتھ لے جائے گا اور یہیں میری اولاد اپنا جما جیسا کام خراب کرنے پر غمی ہے۔“ بلقیس سخت آزرہ تھی۔

میں اس ہلے ماں اور بھائی کے تحفظات سے بے نیاز
عامر اپنی جڑوں کی دہائی دیتا انور کے ساتھ گھگھو میں گن تھا۔
”قطعی تیری جیسی ہے عامر! کیا ضرورت تھی تجھے اس
قدر بے احتیاطی کی۔“

”مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آرہی۔ پہلے مجھے جیل بھائی اپنے پاس بلوانے کے بہلاوے دیتے رہے اور اب یہاں اسٹور کھول کر بیٹھ گئے ہیں۔“

”یہ تیرے ہاتھوں کو کیا ہو گیا ہے انور؟ رکیں اس قدر ابھرا کی ہیں۔“ وہ تشویش سے بولا۔

☆☆☆

جون 2017ء

اس قلیل عرصہ میں اس کی جسمانی حالت ناقص
 شناخت ہو چکی تھی۔ سیاسی مائل رجحان اور ہونٹ پچکا ہوا
 چہرہ آنکھوں کے گرد گہرے حلقے اور استخوانی جسم دیکھ کر وہ بھی
 افسوس مند ہوا تھا۔

”پر دیس کی سخت تھیلنا آسان تھوڑی ہوتا ہے خالہ! اب کچھ عرصہ یہاں رہوں گا تو خود ہی بہتر ہو جاؤں گا۔“ وہ انھیں دلا سوتا عام سے لٹنے چل دیا۔

”کیا مسئلہ ہے انور؟ تو اس قدر بھجا بھجا کیوں ہے؟ اور آج تیرے ہاتھ میں سگریٹ بھی نظر نہیں آ رہی۔“ اسے اچھٹا ہوا۔

”سک..... کیا مطلب ہے تیرا؟“ عامر مشدد رہتا۔
 ”آخری درجے کا کینسر ٹھیکس ہوا ہے مجھے۔ اور ڈاکٹر
 کہتے ہیں کہ میرے پاس وقت اب بہت کم ہے لیکن تم کسی
 مت ہانا گھر میں ورنہ میری ماں یہ صدمہ برداشت نہیں
 بائے گی۔“

231

لیکن دلا سے علاج ادویات اور دوا عا میں اپنا تا میر کھو
چکی تھیں۔ تین ہی مہینوں میں زندگی کی اسٹون خواہشات
سے لبریز لذت کے پیچھے سر ہٹ بھاگتا اور ایک رات
خاموشی سے اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گیا۔ راشدہ کی آہ و بکا
اس روز آسان کا کب کبچ سفر کر رہی تھی لیکن سے دم موت اس
بائیں سالہ جوان کو اپنے گھٹنے سے کئی سمورت بھی رہا لی۔ دینے
کی مجاز نہ تھی۔

☆☆☆

اس کی انجیدگی اور حرج میں منہمک اور کچھ کرنا نہ پھر کر رہے نہ تھے۔ اس نے بیٹے کی شادی کرنے کے لیے کمر کھالی لیکن دوشی اور شادی میں رقتماں دہری طعن ایک بدصورہ حقیقت فراموش کر بیٹھی۔ مامر کے لیے دہمی جانے والے لڑکیوں کے والدین جب بات چیت پر جانے کے لیے تھے تو اس کے کراڑ اور دشمنان ماضی کے منہمک کارنامے سن کر معذرت کرنے میں ہی بہتری سمجھتے۔

جون 2017ء

بھرتے۔ جمیل کا ضلع ختم ہونے لگا تھا اور ایک روز وہ بلیس سے اٹھ پڑا۔ "میری مائیں تو عامر کے لیے کسی نچلے طبقہ یا ذرا کم روز کی تلاش کریں! اب تک بیسیوں خاندان تو چھان چکی ہیں آپ۔ لیکن کوئی فائدہ ہوا کیا؟"

"کم رو کیوں تلاش کروں؟ میرا بیٹا شکل و صورت میں بھرا ہے ہیرا..... میں اس کے ساتھ یہ زیادتی نہیں ہونے دوں گی۔"

"مرد کی شکل و صورت کون دیکھتا ہے ماں جی؟ کمائی اور کردار دیکھے جاتے ہیں اور ان دونوں ہی صورتوں میں وہ زبرد بننا زیرو ہے۔ کمائی کے سلسلہ میں تھوڑی تہذیبی اب آئی ہے لیکن جن ماں باپ نے اپنے جگر کا ٹکڑا ایسا ہوتا ہوا وہ ہر طرح کی چھان چھک کے بعد ہی فیصلہ کرتے ہیں۔" جمیل کی آواز بلند ہوئی۔

"آپ تو میرے جیسے جانے کوئی بنا رکھائے بیٹھے ہیں مجھ سے۔ میری زندگی تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی آپ نے۔" عامر اس کی آواز سن کر وہیں چلا آیا۔

"میں نے تمہاری زندگی بربادی یا خود تمہاری حرکات نے؟" جمیل صدمہ مچھڑے لہجے میں بولا۔

"میں نے ایسا کیا انوکھا کر دیا ہے؟ ساری دنیا قحط کرتی ہے۔ پہلے مجھے خواہ مخواہ اتنے سال بیرون ملک سیٹل کرنے کے بہلاوے میں رکھا آپ نے، اور اب الکی کو یہ پٹیاں پڑھا رہے ہیں۔" اس کے لہجے میں کھوئی نفرت اور پیش پر تاسف سے سر ہلاتا جمیل خاموشی سے اٹھ گیا۔ بلیس کے چہرے پر بھی بہت اذیت سمٹ آئی۔ اس نے کئی روز سے اپنے ذہن میں پینے والے ایک خیال کو کلی جامہ پہنانے کا فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

اگلے چند روز گھر میں راوی چھین کھتا رہا۔ بلیس عامر کے لیے اپنے پیچھے بھائی کی بیٹی کا ہاتھ کاٹنے کی خواہشمند تھی لیکن جمیل اس فیصلے سے متفق نہ تھا۔

"خوشیہ ایک پڑھی لکھی اور با شعور لڑکی ہے ماں جی! لیکن معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ عامر کی بھی طرح اس کے لائق نہیں۔ آپ کا یہ قدم بنے بنائے رشتوں میں دراڑ پیدا کر دے گا۔" اس نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

"میرا بھائی مجھے انکار نہیں کرے گا اور شادی کے بعد تو اچھے اچھوں کی کاپی لپٹ جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے عامر بھی سدھر جائے گا۔ میں آج شام ضرور جاؤں گی اگر کم کے گھر اور

رشتہ لے کر ہی اٹھوں گی۔" بلیس ٹرامید تھی۔

لیکن اس کی نوبت ہی نہ آ سکی۔ اسی سہ پہر عامر جب اپنی ورکشاپ سے گھر آیا تو اس کے ساتھ ایک نسوانی وجود کچھ کرکھی سٹھڑ رہے۔

"یہ کسے اٹھائے ہو اپنے ساتھ تم؟" جمیل نے گرج کر کہا۔

"یہ میری بیوی ہے، نسرین۔ ابھی ابھی مسجد کے امام صاحب نے نکاح پڑھایا اور آج سے یہ اسی گھر کا فرد ہے۔"

عامر نے اطمینان سے جواب دیا۔

"شرقاہ کا یہ طریقہ نہیں ہوتا عامر! کہ کسی بھی راہ چلتی لڑکی کو بیوی بنائے گھر لے آئیں۔ خاندان برادری والوں کو کیا جواب دیں گے ہم؟" تہینہ نے بے چینی سے ہاتھ ملے۔

"نہیں ہوں میں شریف، یہ سدا تو صرف آپ کے شوہر نامدار کے پاس ہے۔ خاندان نماداری کی مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ نسرین سے اگر کسی نے اچھے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔" وہ بدلی لہجے سے بولا۔

"یہ لڑکی تیرے لیے مناسب نہیں بیٹا! میں تو تیرا رشتہ خواہ....." بلیس کی بات مکمل ہونے سے قحط ہی جمیل نے اس کا ہاتھ بکرا کر دیا۔ اس کی جہانگیرہ نظروں نے نسرین کے چہرے پر ہرے اور انداز و اطوار سے اس کی فطرت کا اندازہ لگا لیا تھا۔

"میں تمہاری اس شادی کو کبھی حلیم نہیں کروں گا۔ میری نظروں سے دور ہو جاؤ ورنہ آج میں ہر لحاظ بھول جاؤں گا۔" جمیل کی تیوریوں پر عمل دیکھ کر عامر نے ایک طنزیہ مسکراہٹ اچھائی اور نسرین کے ہمراہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ رات ان بھی کے لیے بہت بھاری تھی۔ جمیل اس دیدہ دلیری اور دھٹائی پر بہت طیش میں اور عامر کو گھر سے بے دخل کرنے کے درپے تھا لیکن بلیس نے اپنا دوپٹا اس کے قدموں میں بچھا دیا۔

"وہ ناوانا ہے، کم عقل ہے لیکن میرے جگر کا ٹکڑا ہے اس کی غلطی کی سزا مجھے مت دو۔" وہ بگڑنے لگی۔

"یہ کیا کر رہی ہیں ماں جی آپ! وہ تڑپ اٹھا۔" نسرین اس گھر کے لیے غلطی موزوں نہیں۔ اس کے انداز کا چلتن چلن واضح بتاتا ہے کہ اس میں گھر جوڑ کر رکھنے والے کوئی گن نہیں۔ ایسی عورتیں سلیس اجازت دیتی ہیں۔" جمیل نے اپنے خدشات بیان کیے۔

"میں عامر کو سمجھا لوں گی لیکن خدا ارادہ میرے بیٹے کو مجھ سے الگ مت کرنا۔"

"ٹھیک ہے ماں جی! لیکن ہم لوگ اس سے کوئی تعلق داری نہیں رکھنا چاہتے، اس سے کہہ دیجیے گا کہ اپنا بار اپنی خانہ الگ کر لے۔" جمیل نے ایک گہری سانس بھری۔

حسب سابق ان سب کی پریشانی اور خدشات سے بے نیاز عامر اپنی نئی ٹوبلی بیوی کی ناز برداری میں مگن تھا۔ اسے اپنے اس انتہائی قدم کا رتی بھر بھی افسوس نہ تھا۔ نسرین سے اس کی ملاقات ایک ماہ قبل ہی ہوئی تھی۔ وہ اس کی ورکشاپ کے مقابلے و بائیں ایک میڈیکل سنٹر پر ادویات خریدنے کی غرض سے آتی تھی۔ اس کے نقوش میں جاذبیت اور سراپا میں بھرپور کشش تھی۔ اب تک عامر کی زندگی میں آنے والی لڑکیوں میں وہ سب سے منفرد تھی۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی سکتی تھی۔

اس کا تعلق نچلے طبقہ کے ایک ایسے خاندان سے تھا جہاں جہالت اور کم عمری کا دور دورہ تھا۔ والدین بچپن میں ہی وفات پا چکے تھے اور اب وہ اپنے تین بھائیوں اور ان کے بچوں کی ایک فوج کے ساتھ رہتی تھی۔ تعلیم اور شعور سے وہ کوسوں دور تھی۔ ہاں گھر سازی جوڑو اور دوپٹے دوپانچ کرنا اسے خوب آتا تھا۔ عامر کا گھر کھڑا کھڑا بہترین لباس اور جاہت اس کے لیے کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے اہل و عیال اپنے طبقہ میں ہی رشتہ تلاش کریں گے اور پھر جلد ہی وہ بھی بچوں کی ایک فوج میں گھری کھائستی ہانپتی کا پتی کچی تنگ و تاریک گھر میں خون تھوکی مر جائے گی۔ عامر کی پیش قدمی کا اس نے بہت مہارت سے جواب دیا اور بالآخر شادی کرنے میں کامیاب ہوئی۔ سسرال میں آمد ہوتے ہی اسے بہت سازگار ماحول میسر آ گیا وہ اس کاؤڈ پر اپنی مرضی کے اسٹروکس کھینچنے کے لیے مکمل تیار تھی۔

"ہم جلد ہی الگ گھر لے لیں گے۔ بس کچھ عرصہ برداشت کر لو ان سب کو۔" عامر کے الفاظ نے اسے اپنے خیالات سے چونکا دیا۔

"کوئی بات نہیں جی! وہ ہمارے بڑے ہیں، وقتی طور پر ناراض ہیں۔ میں انھیں ثابت کروں گی کہ آپ کا انتخاب غلط نہیں ہے۔ ہم یہیں رہیں گے۔" وہ مسکرا کر بولی۔ اس کے ذہن میں پروردہ منصوبہ جات کی عامر کو بالکل بھگ نہ تھی۔ وہ اپنے سسرالیوں سے مکمل خراج وصول کرنے کے بعد ہی علیحدہ ہونا چاہتی تھی۔

☆☆☆

مورت اگر تعلیم یافتہ ہو تو ایک مہتاب کی مانند اپنے گھر میں ٹھنڈک بھری چاندی ہر سونے بکھر دیتی ہے لیکن یہی مورت جب علم کی روشنی سے محروم ہو تو اپنے نقش کے لیے باوجود مسموم ثابت ہوا کرتی ہے۔ اس کی جہالت سورج کی تپش کی مانند رشتوں کو کھلا دیتی ہے۔ بلیس کا خاندان بھی اسی تپش کی زد میں آ گیا تھا۔

نسرین نے اپنی موروثی بے حسی اور کم عمری کا مظاہرہ بہت جلد شروع کر دیا۔ تہینہ اور جمیل سے اسے خصوصی ہیر تھا۔ ان کی گھر میں اہمیت سے حسد میں بھی ہرگز رتے دن کے ساتھ بے حد بے حساب اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ دانستہ طور پر انھیں زنج کر کے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتی۔ شوہر کا ذہن وہ پہلے ہی مکمل طور پر اپنے قابو میں کر چکی تھی۔ وہ اس کی ہر فرمائش پوری کر دیتا لیکن پھر اس نے ایسا مطالبہ کیا کہ گھر میں ایک مہرہ بھر بے سکونی کی فضا پیدا ہوگئی۔ عامر نے بیوی کی خواہش پوری کرنے کے لیے ڈش اینڈا نصب کر دیا۔ جمیل اور تہینہ نے اس بات پر غاسی لے لی۔

"اس شیطانی چڑھو کی میرے گھر میں کوئی جگہ نہیں ہے عامر! ایسی بے احتیاطیوں کے نقصان ہم انور اور تمہاری صورت میں پہلے ہی اپنی استطاعت سے زیادہ بھگت چکے ہیں۔ اب میں اپنے بچوں کے لیے بھی وہی ماحول پیدا نہیں کرنا چاہتا۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں عامر! ذرا قحط سے سوچو۔ گھر میں ایسی خرافات کی گنجائش نہیں۔ بچوں کے خام ذہن ان باتوں کے اثرات بہت جلد قبول کرتے ہیں۔" تہینہ نے بھی قحط لے لیا۔

"اپنی اولاد کو سنبھالنا آپ کا دور دوسرے ہے۔ یہ ڈش اینڈا اب کسی صورت نہیں لوٹایا جائے گا۔" نسرین نے بھی ہٹ دھرمی دکھائی۔

طویل بحث و مباحثہ کے باوجود عامر اور نسرین اپنے موقف سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھے۔ ٹھک ہار کر جمیل نے خاموشی اختیار کر لی۔ وقت اسی طرح گزر رہا تھا کہ رشتوں پر تلخ نقوش چھوڑتے گزرتا چلا گیا۔ بیٹے کی پیدائش کے بعد نسرین کا کردار اور طفلانہ مزید آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ اولاد کی ذمہ داری کے باوجود ان کی سوچ و خیالات میں سروسن فرق نہ آیا۔

تہینہ کے سمجھانے بھانے پر جمیل نے اپنے پورشن میں

دوسری جانب نسرین عامر کے کندھے پر سر رکھے زارو قطار دوڑی تھی۔

”تمہیں وہ معاملہ محلہ کی کونسل میں نہیں لے کر جانا چاہیے تھا۔ کم از کم میرا انتظار تو کر لیتی۔ میری عزت دو کوڑی کی کردی تھی۔“ وہ دھڑکی سے بولا۔

”تو کیا چپ چاپ آپ کے بھائی کے ہاتھوں لٹ جاتی۔ اور کیوں بھول رہے ہیں کہ آپ کی والدہ محترمہ نے بھی اسی مردود کا ساتھ دیا ہے۔ میں آخر کرتی تو کیا کرتی؟“ وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔

”امی نے میرے ساتھ ہمیشہ یونہی نا انصافی کی۔ اگر انور آج زندہ ہوتا تو مجھے اس جہنم سے آزادی دلا چکا ہوتا۔“ عامر اب بھی اسی لکھ میں جتا تھا۔ ”خیر! ایک دمڑی بھی نہیں چھوڑوں گا میں۔“

بلیس کا اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا۔ عامر نے گھر اور جزل اسٹور میں اپنے شرعی حصہ کا مطالبہ کر دیا۔ جمیل نے اس کی یہ خواہش بھی پوری کر دی اور ایک ہفتہ بعد وہ اپنے سرکاریوں کی مدد سے اسی علاقہ میں ایک گھر خرید کر منتقل ہو گیا۔ روائی سے قبل بلیس نے ان دونوں کو اپنے پاس بلوایا اور تم آنکھوں سے صرف ایک ہی بات کہہ سکی۔ ”تو نے ساری زندگی مجھے بہت ستایا عامر! لیکن میں ہمیشہ تیرا دم بھرتی رہی۔ اب بھی تیرے لیے کوئی برا خیال بھی ذہن میں لاتے میرا کچھ گناہ جاتا ہے۔ کیا کروں؟ ماں ہوں ناں۔۔۔۔۔۔ آج بھی یہی دعا کروں گی کہ کتاب الہی کی جو بے حد تیری بیوی نے کی ہے اس کے قرض کی ادائیگی سے قبل ہی تائب ہو جائے۔“

”آپ ہمیشہ سے جمیل ہی کی ماں تھیں۔ اور اب بھی اسی کا یقین کر کے بیٹھی ہیں۔ مجھے ان منافقانہ دعاؤں کی ضرورت نہیں۔“ وہ بدلتی سی لہجہ سے کہہ کر اٹھنے لگے۔

☆☆☆

”کیا بات ہے؟ آپ اتنے کم گو کیوں ہو گئے ہیں؟ کہیں گھر والوں سے علیحدہ ہو کر آپ چھپتا تو نہیں رہے؟“ نسرین نے اس رات زچ ہو کر پوچھا۔ ”نئے گھر میں آمد کے بعد عامر کی مصروفیات بہت بڑھ گئی تھیں۔ اس کے اطوار میں بھی واضح رکھائی نظر آتی۔“

”میں بھولنا بھی چاہوں سب تو تم مجھے کسی نہ کسی بہانے پھر سب کچھ یاد کروا دیتی ہو۔“ اس نے بڑاری سے کہا۔ ”میں اس وقت صرف حمزہ کے تعلق سوچ رہا ہوں۔“

”حمزہ کو کیا ہوا؟ وہ ٹھیک تو ہے۔“

”وہ ٹھیک نہیں ہے نسرین! کوئی نہ کوئی مسئلہ ضرور ہے اسے۔“ حمزہ کے سچوں سے بہت خاک کھاتا وہ۔ ”اُمیں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچائیاں نظر آتی ہیں۔“ وہ تشویش سے بولا۔ ”اسے ذرا پیار سے بات کرو کہ کیا خوف ہے اسے؟“

”کوئی خوف نہیں ہے اسے۔ بس اپنے تایا زاد رشتہ داروں کے اثرات ہیں اس کے دماغ پر۔ وہاں بھی سب مجھ سے انتظار کرتے ہیں کہ حمزہ ان سے مکمل متا کیوں نہیں۔“ وہ بے پروائی سے بولی۔

”خیر! اب میری مصروفیات بھی یونہی بڑھتی رہیں گی۔ پہلے تو گھر کا خرچ تقسیم ہوتا تھا اب مجھے ہی دیکھنا ہے سب کچھ۔ اس لیے میری روٹیں پر زیادہ خرچ کرنے کی ضرورت نہیں۔ حمزہ پر حریہ توجہ دو اور فرصت ملے تو اپنے گھر چلی جایا کرو۔ میری طرف سے کوئی بندش نہیں لیکن مجھ سے آئندہ یوں باز پرس مت کرنا۔“ اس نے متنبہ کیا۔

”ٹھیک ہے نہیں کروں گی۔“ جیسے آپ خوش رہیں!“ اس نے بے نیازی سے کہا۔ عامر کی ان مصروفیات سے اسے شیراز سے تعلقات میں استواری حریہ آسان نظر آنے لگی۔

نسرین کو اب مکمل آزادی میسر آ چکی تھی۔ حمزہ کو ایک ٹیوشن سینٹر روانہ کرنے کے بعد وہ بھی کسی تکلی سے ملنے یا بازار جانے کا بہانہ کر کے شیراز سے ملنے چل دیتی۔ وہ اس کی بھالی کا کرن تھا لیکن اس کی کم ہمتی اور بزدلی کے باعث یہ رشتہ کسی منطقی انجام تک نہ پہنچ سکا تھا۔ دوسری جانب عامر نے بھی مصروفیات کی آڑ میں اپنی سابقہ سرگرمیاں بحال کر دیں۔ وہ بھی ایک مکمل کھلاڑی بن چکا تھا۔ حمزہ کی پرورش کسی خود رو پودے کی طرح ہو رہی تھی۔ اسے والدین میں سے کسی کی بھی توجہ حاصل نہ تھی۔ انھوں نے اس کی تعلیمی ضروریات اور دیگر خواہشات پوری کرنے کو ہی تربیت گردان لیا تھا۔ نتیجہ وہ اپنے خول میں سمیٹ چلا گیا۔ اسکول اور ٹیوشن سینٹر سے فراغت کے بعد وہ خالی گھر میں پھولا یا پھرتا۔ یہ تو ہوتا ہی تھا اس نے پاک کتاب جو اٹھائی تھی۔ اللہ کے ہاں دیر سے اندامیر نہیں۔

وقت بہت تیزی سے گزرتا رہا۔ حمزہ اب مکمل اسکول کا طالب علم تھا لیکن اس کی شخصیت میں اعتماد بھی کمی نہ چھپ سکا۔ اسے ہمیشہ اپنی داد کی محبت اور تایا زاد بہن بھائی کے ساتھ

گزاراقت یاد آتا مگر والدین نے انتہائی سختی سے اسے کسی بھی ملاقات سے روک رکھا تھا۔

زندگی ایک لگے بندھے معمول پر چل رہی تھی۔ پھر ایک روز ایک حادثے نے غلام پیدا کر دیا۔ نسرین پاؤں پھسلنے کے سبب سیز میوں سے گری اور ریزہ کی ہڈی میں چوٹ کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے صاحب فراش ہو گئی۔ بلیس کو جب اس حادثہ کا علم ہوا تو وہ بیٹے اور پوتے سے ملاقات کے لیے خود کو روک نہ پائی۔ گھر کی حالت تپٹ ہو چکی تھی۔ عامر سرسری سلام دعا کے بعد درکشاپ روانہ ہو گیا۔ اور حمزہ ماں کو داد کی کھلانے کے بعد باورچی خانہ میں جوئے برتن بیٹھنے کے لیے دادی کو بھی اپنے ساتھ وہیں لے آیا۔

”کیسے ہوا یہ سب بیٹا! علاج کہاں کر رہا ہے ہو؟“ ”انسان جب اپنی استطاعت سے بڑھ کر بھاگ دوڑ کرنے لگے تو قدرت کا خود کار نظام یونہی حرکت میں آیا کرتا ہے دادی!“ حمزہ غلام کی مس کادیدہ نکتے کو دیکھنے لگا۔ ”میرا بیٹا اتنی بڑی باتیں کب سے سیکھ گیا؟“ وہ اس کے ہاتھ بڑی محبت سے اپنے لبوں سے لگا کر بولی۔

”جب والدین کی بجائے تربیت کا بیڑہ زمانہ اٹھالے تو یونہی سب کچھ سکھا دیتا ہے۔“ ”حمزہ! کیا تو یہاں خوش نہیں ہے؟“ بلیس نے اس کے بالوں پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

”یہاں سب بہت کندھے ہیں دادی! ماموں ان کے بیچ محلہ دار رہے۔ اچھے لوگ نہیں ہیں۔ ہر وقت کیمبل پر گندی قلمیں دیکھتے۔ تاش کھیلنے اور گلی گولچ کرتے رہتے ہیں۔ خدا جانے اتنا اچھا علاقہ اور ماحول چھوڑ کر اس بدبودار جگہ پر کیوں آ گئے تھے پاپا۔“ ”مجھے وہ گھر اور آپ سب بہت یاد آتے ہیں۔“ ”ایسی باتیں نہیں کرتے بیٹا! اللہ سے اچھائی کی توقع رکھو۔ نسرین بھی ٹھیک ہو جائے گی جلد ہی۔“

”ڈاکٹر زاب کسی معجزہ کے منتظر ہیں۔ ماما کا چھلکا دھڑ گھٹنے سڑنے لگ گیا ہے۔ پاپا اور ماما میں روز بحث ہوتی ہے۔ آپ ہمیں واپس بلوایا لیکن جائیزا میں یہاں نہیں رہتا چاہتا۔“

”جمیل اور تینہ کبھی راضی نہیں ہوں گے کہ تم ہمارے ہاں رہو لیکن تمہارا جب بھی دل چاہے ملنے آجایا کرو ہم بھی تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔ اور میں تو صرف دعا ہی کر سکتی ہوں کہ پروردگار تم لوگوں پر آسائیاں فرمائے۔“ وہ پوتے کی گھمیری حالت دیکھ کر خود بھی رونے لگی۔

نسرین اپنی معذوری کے بعد شوہر کی بے رخی دیکھ کر جینے کی ہر قسماں کھوجی تھی۔ نفس کے پیچھے بھاگ دوڑ کرتی ہوئی تو عامر کے بعد حمزہ کی منتشر ذہنیت اور خوفزدہ شخصیت دیکھ کر اسے اپنے ماضی کی کوتاہیوں کا شدت سے احساس ہونے لگتا۔

”حمزہ! اب مجھ پر ایک احسان کر دو۔ اپنی دادی اور تایا کے پاس لے چلو مجھے۔ میں ان سے معافی مانگنا چاہتی ہوں ورنہ موت بھی مجھ پر برہمن نہ ہوگی۔“ ”میں کوشش کروں گا۔“

”تم اتنے کم گو کیوں ہو حمزہ؟ پہلے تو بہت خوش باش رہتے تھے۔“

”آپ دونوں کے یہاں منتقل ہونے کے فیصلے نے مجھے بہت تنہا کر دیا۔ کاش میرا کوئی بہن بھائی ہی ہوتا۔ لیکن چھوڑیں اب ان باتوں کو دہرانے سے کیا حاصل؟“ اس نے سیرپ کا ڈھکن بند کرتے کہا۔

”عامر بھی بہت مصروف ہو گئے ہیں۔ ہمارے پاس بیٹھنے ہی نہیں۔“

”وہ ہمیشہ سے ہی ایسے تھے۔ آپ نے نفس اب لیا ہے اور اپنی بیماری سے قبل آپ کا وقت بھی تو بازاروں اور اپنی سبیلیوں کے ساتھ بیتا تھا۔ گھر میں میرے ساتھ کیسا سلوک ماموں زاد کر رہے ہیں آپ نے بھی توجہ دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔“ وہ جی سے کہتا باہر چلا گیا اور نسرین اپنی آجیناک سوچوں میں گھری بے بسی سے رونے لگی۔

☆☆☆

”کیا بات ہے عامر استاد! آج اتنے کم کم کیوں بیٹھے ہو؟“ ”ہائیں! بیس سالہ اس لڑکے نے اپنے ہاتھوں پر لگا کر گیس آئل ایک میلے پڑے سے صاف کرتے ہوئے بے تکلفی سے پوچھا۔

”کچھ نہیں یار! بس وی گھر کی پریشانیاں لاحق ہیں۔“ عامر کے انداز میں تھکاتھک نمایاں کی ولید نامی یہ لڑکا اس کی درکشاپ پر نیا شاکر تھا۔ جمیل سے حصہ حاصل کرنے کے بعد ہی اس نے درکشاپ خرید لی تھی اور بعد ازاں اپنی سہولت کے لیے ہڈکار لڑکے بھی بھرتی کر لیے۔ وہ ہمیشہ ان لڑکوں سے ایک مخصوص فاصلہ قائم رکھتا تھا۔ بے تکلفی کی گنجائش بھی نہ ضرورت۔ لیکن ولید میں اسے اپنی جوانی منعکس دکھائی دیتی۔ اس کے مشاغل و فطرت بالکل عام جیسے ہی تھے بلکہ کئی معاملات میں تو وہ شیطان



اسیر ذات

محترمہ عذرا رسول

سلام تہنیت

لوگ مجھے باغی کہتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ میں نہ دانستہ بغاوت کسی بے لیکن کوئی میں دل میں جہانک کر نہیں دیکھتا کہ میں کتنی مجبور بنادی گئی تھی اپنے بھائی کے لیے اتنی بڑی قربانی دی مگر اس نے بدلے میں مجھے کیا دیا؟ عارفہ

(کراچی)

”معاف کرنا بہن!“ چچی کلثوم نے کہا۔ ”مجھ کو تو کوئی ایسی اطلاع نہیں ملی۔ میں بھی آخر اسی خاندان کی ہوں۔“

”اسل میں یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔“ خالد نے کہا۔ ”عارفہ تو میری ٹھیکرے کی مانگ ہے۔“

میں ان دنوں آٹھویں کلاس میں تھی کہ چچی کلثوم میرے لیے اپنے بچے کا رشتہ لے کر آئیں۔ خالد نے سنا تو جلدی سے بولیں۔ ”کلثوم بہن! آپ کو شاید معلوم نہیں کہ عارفہ کا رشتہ بلال سے ملے ہو چکا ہے۔“

بار عاتبا نسرین کی بیماری میں اچھے کے باعث وہ بے خبر رہ گیا تھا۔ اپنے اچھے خیالات میں غلطیاں وہ ہوئی پہنچ گیا۔ یہ ایک درمیانے درجے کا ہوئی تھا جہاں نشیات اور جسم فروشی کے تمام مکروہ کام بہت منظم انداز میں ہوتے تھے۔ ہوئی کا تمام اشاف بھی اس سے واقف تھا۔

”بڑے دنوں بعد درشن کروائے عامر میاں؟“ ریسپشن پر موجود نیم شفاف سروالے ایک شخص نے اپنے گندے اور داغدار اونٹوں کی نمائش کرتے ہوئے تان لگا لی۔

”ہاں بس کچھ معروف تھا میں۔۔۔۔۔ ولید نے بچک کروائی ہے میری یہاں۔“

”وہ تمہارے مخصوص کمرے میں موجود ہے۔“ عامر متوازن چال سے دوسرے فلور کی جانب بڑھ گیا۔

”معلق تر کرنے کے لیے کچھ لاؤں صاحب!“

کمرے کا دروازہ کھولتے ہی اسے ایک ہیرے نے عقب سے صدادی۔

”ہاں! کچھ دیر بعد لے آنا۔“ اس نے رخ موڑ کر اسے کچھ ٹوٹ تھمائے اور پھر کمرے میں موجود بستر کی طرف متوجہ ہوا جہاں قابل اعتراض حالت میں نیم دروازہ وجود دیکھ کر اس کے اعصاب پر ایک بجلی گری تھی۔ اسے اپنی بصارت پر اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

اس نے بار بار سر جھٹکا لیکن منظر اب بھی وہی تھا۔ ”حمزہ! تم یہاں۔۔۔۔۔ تم یہ سب۔۔۔۔۔ کک۔۔۔۔۔ کک۔۔۔۔۔ کک۔۔۔۔۔ کیوں۔۔۔۔۔ عامر کو اپنی قوت گویائی سلب ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

حمزہ کے چہرے پر بے بسی اور اذیت کھنڈی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وحشت دہرائی اذیت بے یقینی کے کتنے ہی رنگ ہل بھر میں گھرے نظر آنے لگے۔

”میں بھی یہی سوچتا تھا۔۔۔۔۔ کہ میں ہی کیوں؟ ماموں زاد بھائیوں کی طرف سے اتھناں بلیک میلنگ یہ بدبودار زندگی میرے لیے ہی کیوں؟ لیکن آج مجھے اپنی سب الجھنوں اور اذیتوں کے جواب مل گئے ہیں۔۔۔۔۔ میں آپ لوگوں کا قرض چکارا ہوں۔“

عامر سر جھکے دیں بیٹھتا چلا گیا۔ اسے احساس ہو چکا تھا اس کے گناہوں نے اس کے پورے گھر کو لپیٹ میں لے لیا ہے۔

کے کان کھڑا تھا۔

”ارے چھوڑو استاد! ٹھیک ہو جائیں گی بھابی۔ مگر کا ہے کی کرتے ہو؟“

”ارے نہیں یار! اس کی مجھے کوئی پردا نہیں۔ حمزہ اس کی بہت اچھی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ بہت فرماں بردار اور مثالی ہے میرا بیٹا! بس اس کی پڑھائی کی فکر رہتی ہے مجھے۔“ ولید نے بھی اس کے اہلکارانہ سے بالمشافہ ملاقات تو نہ کی تھی لیکن وہ حمزہ اور نسرین سے عاتبانہ طور پر مکمل متعارف تھا۔

”کوئی بات نہیں استاد! وہ ایک سمجھدار لڑکا ہے۔ اپنے معاملات درست کر لے گا۔ ماں کی خدمت کرنے سے اجڑکا رہا ہے وہ تو۔“

”ہاں! درست کہتے ہو۔ اس نے کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں دیا مجھے۔ بہت کم گوارا اپنے آپ میں مکن رہتا ہے۔“ عامر نے کبیرے کہا۔

”استاد جی! مجھے آج جلدی جانا ہے، بہت ضروری کام ہے، کل اور ٹائم لگا دوں گا۔“ ولید نے کان کھجائے ہوئے چالپوسی کی۔

”معلوم ہیں مجھے تیرے سب ضروری کام، ایک شرط پر جلدی جانے دوں گا میرا بھی کوئی بھلا کرو آج۔“ عامر نے ہائیں آکھ دہائی۔

”ارے ہاس! اس میں کیا مشکل ہے بھلا؟ لیکن میری بھی ایک بات مانو۔ آپ ہمیشہ ضمن کڑائی کھاتے ہیں آج ذرا بیف کھا کے دیکھیے۔ مارکیٹ میں ایک بہت زبردست اضافہ ہوا ہے اگر مرضی ہو تو اس کی بچک کروادوں؟“

”جیس صاف سمجھتا تو ہے ناں؟“ وہ نیم رضامند تھا۔

”خاندانی ہے، خوبصورت بھی ہے، بس ہماری خوش قسمتی سمجھیے کہ اس کی لالچی میں پہلی ہی مرتبہ یو بی بی اور تب سے اسے بلیک میل کر رہے ہیں۔“

”میرا اشتیاق پورا ہوا ہے ہوتی۔“

”ایک گھنٹے بعد امیر کے ہوئی میں پہنچ جائے گا۔ میں اب چلتا ہوں۔“ وہ عاتبانہ انداز میں کورٹس بجالاتا روانہ ہو گیا۔

عامر نے منتشر سامان سمیٹا اور وہیں ایک بھٹی کمرے میں موجود اپنا ایک صاف چڑا نکال کر پھینک لیا۔ ولید کی باتوں نے اسے بے حد سستی اور محسوس میں جلا کر دیا تھا۔ مارکیٹ میں کبھی بھی لڑکی کی آمد کی اسے فوری خبر ہو جایا کرتی۔ اس

یہ تو میرے لیے بھی اطلاع تھی کہ میرا اور بلال کا رشتہ طے ہو چکا ہے۔ اتنی بڑی بات خالہ نے اب تک مجھ سے کیوں چھپائی؟ مجھے بلال ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ مجھے ابو پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ اگر ایسی کوئی بات تھی تو مجھے بتانا چاہیے تھی۔ میں ڈرانگ روم کے دروازے پر کھڑی تھی۔ اندر جانا ہی چاہتی تھی کہ چچی کلثوم اور خالہ کی باتیں سن کر رک جاتی تھی۔

”اے بہن، تو ہمیں کیا علم غیب ہے۔“ چچی کلثوم نے کہا۔

”نہیں تو سہی۔“ خالہ نے کہا۔ چچی کلثوم شاید جانے کو کھڑی ہو گئی تھیں۔ میں تیزی سے پیچھے ہٹ گئی۔ ”چائے پی کر جائیے گا۔“

”ارے، چائے کا کیا ہے۔“ چچی کلثوم نے کہا۔ ”کوئی تکلف تھوڑی ہے، اپنا گھر ہے۔ پھر لی لوں گی۔ اصل میں اشتقاق کے لبا آنے والے ہوں گے۔ پھر بھی فرصت سے آؤں گی۔“ چچی کلثوم نے کہا اور باہر نکل آئیں۔ وہ اپنی چادر سنبھالتی ہوئی وہاں سے چلی گئیں۔

مجھے چچی کلثوم بھی ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔ ان کا بیٹا اشتقاق البتہ لکھا ہوا لڑکا تھا۔ وہ راشد بھائی اور بلال کا ہم عمری تھا اور ان دونوں میں بڑھ رہا تھا۔

میں بہت چھوٹی تھی جب اسی کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس وقت شاید میری عمر تین سال تھی۔ راشد بھائی مجھ سے تین سال بڑے تھے۔ اسی کے انتقال کے بعد ہم دونوں کی دیکھ بھال خالہ ہی نے کی تھی۔ ہم دونوں بہن بھائی کی وجہ سے ابو نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ خالہ کا گھر نزدیک ہی تھا۔ اسکول سے واپسی کے بعد ہم دونوں خالہ کے گھر چلے جاتے۔ وہاں کھانا وغیرہ کھاتے، پھر اپنے گھر آ جاتے۔ خالہ ہم دونوں بہن بھائی کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ وہ مجھے اپنی بیٹی صائرہ سے بڑھ کر چاہتی تھیں۔ راشد بھائے بھی وہ بہت محبت کرتی تھیں۔ ہمیں انہوں نے بھی ماں کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔

اب اچانک مجھے علم ہوا کہ میری منگنی بلال سے ہو چکی ہے تو اس خبر سے مجھے دھچکا پہنچا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں ابو سے بات کروں گی۔ میں جانتی تھی کہ ابو میرے ساتھ زبردستی نہیں کریں گے۔ بلال خاصا وجیہ تھا۔ خوش لباس بھی تھا اور باتیں بھی بہت کرتا تھا۔ اسی وجہ سے مجھے کئی لڑکیاں اس پر مرنے لگی تھیں اور وہ کسی کو باپوں نہیں کرتا تھا۔ اس کی یہی عادت مجھے نا پسند تھی۔ اس کے علاوہ اس میں اور بھی بہت سی خامیاں تھیں۔ وہ سگریٹ تو خیر پیتا ہی تھا، جوا بھی کھیتا تھا اور

میں نے اڑتی اڑتی خبر سنی تھی کہ وہ شراب بھی پینے لگا ہے۔ خالہ کے لاڈ پیار اور خالو کی عدم توجہی سے وہ بالکل مجڑو گیا تھا۔

شام کو ابو آئے تو میری پریشانی خود یہ خود ختم ہو گئی۔ ابو کو کھانا دینے کے بعد خالہ نس کر بولیں۔ ”آج بہن کلثوم آئی تھیں اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر۔“

”پھر؟“ ابو... کھانا کھاتے رک گئے۔ میں اس وقت کچن میں تھی۔ کچن کی ایک کھڑکی لاؤنچ میں بھی کھلتی تھی اس لیے مجھے ان کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

”پھر کیا۔“ خالہ نس کر بولیں۔ ”میں نے کہہ دیا کہ عارفہ کا رشتہ تو برسوں پہلے بلال کے ساتھ طے ہو چکا ہے۔“

”لیکن آپ آتے ہیں اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولا؟“ ابو نے کہا۔

”جھوٹ نہ بولتی تو کیا کرتی؟“ خالہ نے جواب دیا۔

”وہ تو مجھے خاں کر عارفہ کے پیچھے پڑی ہیں۔“

جواب میں ابو نے کیا کہا، میں نے یہ سننے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ میرے ذہن سے بہت بڑا بوجھ چکا تھا۔ میں اپنے کمرے میں پہنچی تو میرا ذہن بہت ہلکا ہلکا ہو چکا تھا۔ دوسرے دن میں اسکول سے واپسی پر خالہ کے گھر پہنچی تو بلال گھر پر تھا۔ میرے ساتھ بیٹا بھی تھے۔ خالہ نے ہم دونوں کو کھانا دیا تو بلال بھی وہیں آ گیا۔

”یار! تم بھی اپنا کھانا لے آؤ۔“ بیٹا نے اس سے کہا۔

”کیا یہاں بیٹہ کرنا ہمارے نوالے گن گئے؟“

”فکرت کرو، میں تمہارے نوالے نہیں منگواؤں گا۔“

بلال نس کر بولا۔ ”صائرہ میرا کھانا لارہی ہے۔“

”یار! میرا تیرا کیا ہوتا ہے۔ تمہیں کھانا ہے تو ہمارے ساتھ ہی کھاؤ۔“

اس وقت صائرہ کھانے کی ٹرے لے کر آ گئی۔ وہ ٹرے بلال کو دے کر جانے لگی تو بیٹا نے کہا۔ ”صائرہ تم ہی کھانا کھا لو۔“

”میں کھانا کھا چکی ہوں۔“ صائرہ نے کہا اور وہاں سے چلی گئی۔

میں جانتی تھی کہ وہ بیٹا کو پسند کرتی ہے لیکن بیٹا اس پر کوئی توجہ نہیں دیتے تھے۔ وہ تو بس ہر وقت پڑھنے ہی میں مگن ہوتے تھے۔ وہ مجھے جنون کی حد تک چاہتے تھے اپنے جب خرچ سے میرے لیے جیڑیں لے کر آیا کرتے تھے۔ ہم لوگ کھانا کھا کر گھر پہنچے ہی تھے کہ چچی کلثوم آ گئیں۔

بیٹا نے انہیں سلام کیا تو وہ بولیں۔ ”بیٹے رہو، خوش رہو۔“

”آپ کیس ہیں چچی؟“ بیٹا نے پوچھا۔

”میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔“ پھر شکایتی انداز میں بولیں۔ ”بیٹا میں تو اپنی محبت سے مجبور ہو کر تمہارے گھر چل آئی ہوں۔ تم تو کسی ہمارے گھر آ کر جھانکتے ہی نہیں۔“

”چچی، آپ تو جانتی ہیں کہ امتحان سر پر ہیں۔ سارا وقت تو پڑھائی میں لگ جاتا ہے۔“

”اے بھائی بس رہنے دو۔“ چچی نے کہا۔ ”اشتقاق بھی ہر وقت کتاب کی کیزا بٹا رہتا ہے۔ پڑھائی کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ انسان اپنے خوشی رشتوں سے ہی آنکھیں پھیر لے مگر تم لوگ ہمیں اپنا جھگڑے کی عیب ہو۔ تمہارے باوا تو بڑے بڑے فیصلے خاموشی سے کر لیتے ہیں۔“

”ارے چچی غصہ مت کریں۔ میں آپ کے گھر ضرور آؤں گا۔“ بیٹا نے کہا۔ پھر مجھ سے بولے۔ ”جاء عارفہ، چچی کے لیے شربت بنا کر لا۔“ پھر وہ نس کر چچی سے بولے۔ ”چچی یہ بتائیے کہ ابو نے کون سا ایسا فیصلہ کر لیا جو آپ کو بھی معلوم نہیں ہے۔“

میں تیزی سے کچن کی طرف روانہ ہو گئی۔ میں جانتی تھی کہ چچی اب کیا کہنے والی ہیں۔

”اے میاں، بیٹے یا بیٹی کی شادی کوئی چھوٹی بات تو نہیں ہوتی۔ تمہارے باوا نے عارفہ کی منگنی چھپ چھپاتے بلال کے ساتھ کر دی۔ میاں! ہم تو خوش ہونے والوں میں سے ہیں۔ ماجد بھائی نے ہمیں اس قابل ہی نہیں سمجھا۔“

”چچی یہ آپ سے کس نے کہا کہ عارفہ اور بلال کی منگنی ہو چکی ہے؟“ بیٹا اچانک سمجیدہ ہو گئے۔

”ارے بیٹا یہ بات تو مجھے تمہاری خالہ نے خود بتائی ہے۔“

”خالہ نے بتائی۔؟“ بیٹا کی آواز میں حیرت تھی۔

”یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم کہ عارفہ کی منگنی ہو چکی ہے۔ میں ابو سے پوچھوں گا کہ یہ منگنی کب اور کہاں ہوئی؟“

”ضرور پوچھنا بیٹا۔“ چچی نے کہا۔ ”میں جھوٹ تو نہیں بول رہی ہوں۔“

ان کے جانے کے بعد بیٹا بھی گھر سے نکل گئے۔ مجھے ان سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ رات میں انہیں سنبھائی کہ خالہ نے ان سے جھوٹ بولا تھا۔

ابو شام کو گھر آئے تو بہت تھکے تھکے تھے۔ انہوں نے آتے ہی پوچھا۔ ”راشد کہاں ہے؟“

”بیٹا اپنے کسی دوست کے گھر گئے ہیں۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

اسی وقت بیٹا آ گئے۔ وہ چند لمبے تک ابو کو دیکھتے رہے، پھر بولے۔ ”ابو! عارفہ کی منگنی آپ نے بلال سے طے کر دی اور مجھے اس کی اطلاع بھی نہیں ہے۔“

ابو نے چونک کر بیٹا کی طرف دیکھا اور بولے۔ ”تم سے کس نے کہا؟“

”اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ مجھے کہاں سے معلوم ہوا۔ میں تو یہ پوچھ رہا ہوں کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟“ بیٹا نے تلخ لہجے میں کہا۔

”راشد!“ ابو نے درشت لہجے میں کہا۔ ”اپنا لہجہ درست کرو۔ تم کس انداز میں بات کر رہے ہو؟ اول تو ایسی کوئی بات نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو میں تمہیں جواب دہ نہیں ہوں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ آپ اس نکلے، آوارہ گرد بلال کے ساتھ عارفہ کی شادی کر دیں گے۔ اس لیے کہ آپ اس کے باپ ہیں لیکن۔“

”راشد!“ ابو جھج کر بولے۔ ”اپنی زبان کو لگام دو۔ تمہاری اتنی جرات ہوئی کہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھ سے جواب طلب کر سکو۔“

”عارفہ میری بہن ہے اور۔۔۔۔۔“

”بس اب بکواس بند کرو۔“ ابو نے ان کی بات کاٹ دی۔ ”اور عارفہ کی گھر چھوڑو۔ وہ میری بیٹی ہے۔ تم سے زیادہ مجھے اس کا خیال ہے۔“

”آپ کو خیال ہوتا تو آپ بلال جیسے آوارہ اور بد معاشرے اس کا رشتہ طے کرتے؟“ یہ کہہ کر بیٹا اپنے کمرے میں چلے گئے۔

پھر کئی روز اسی کشیدگی میں گزر گئے۔ ابو نے بیٹا سے بات کرنا چھوڑ دی تھی۔ انہیں اس بات کا صدر تھا کہ بیٹا نے ان سے اتنی کٹانیت کی تھی۔ مجھے خود بھی افسوس تھا کہ میری وجہ سے بات اتنی بڑھ گئی تھی۔ حالانکہ بات تو کچھ ہی تھی۔

بیٹا نے اب خالہ کے گھر جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہ مجھے بھی وہاں نہیں جانے دیتے تھے۔ خالہ نے کئی دفعہ بیٹا سے پوچھا بھی کہ تم نے آنا کیوں چھوڑ دیا ہے لیکن بیٹا نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔

اس دن بیٹا گھر میں داخل ہوئے تو خلاف معمول بہت خوش تھے۔

”کیا بات ہے بھیا؟“ میں نے ہنس کر پوچھا۔ ”آج آپ بہت خور نظر آ رہے ہیں؟“

”ہاں عارفہ بات ہی کچھ ایسی ہے، بات نہیں بلکہ باتیں۔“ وہ مسکرا کر بولے۔

میں ان کی بات پر الجھ کر رہ گئی۔ میں نے کہا۔ ”بھیا آپ کیا کہہ رہے ہیں، میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آ رہا ہے۔“

”عارفہ، میں نے لندن کے ایک کالج میں داخلے کی درخواست بھیجی تھی۔ وہاں میرا داخلہ ہو گیا ہے۔ میں اگلے ہفتے لندن جا رہا ہوں۔“ پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولے۔

”دوسری بات یہ کہ تیری مگنی کی اطلاع غلط تھی۔ ابو نے تیری مگنی بلال کے ساتھ نہیں کی ہے۔“

”میں نے تو کئی مرتبہ آپ کو بتانے کی کوشش کی لیکن آپ تو کوئی بات سنتے ہی نہیں تھے۔“ میں نے کہا۔

”عارفہ تو مجھے جان سے زیادہ پیاری ہے۔ میں یہ بات برداشت نہیں کر سکتا۔“ پھر وہ چوک کر بولے۔ ”ابو کہاں ہیں مجھے ان سے بھی معافی مانگنی ہے۔ تو بھی ابو سے میری سفارش کر دیتا۔“

ابو برآمدے میں بیٹھنے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ وہ اچانک اٹھ کر ہمارے سامنے آ گئے۔

ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر بھیا بھی رونے لگے اور میں بھی آنسو بہانے لگی۔ پھر بھیا دوڑ کر ان سے لپٹ گئے اور بولے۔ ”ابو میں نے آپ کا بہت دل دکھایا ہے۔ پلیز مجھے معاف کر دیں۔“

”اتنا بڑا ہو کر روتا ہے۔“ ابو نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

”مجھے تو اس بات کی بہت خوشی ہے کہ تو عارفہ کے سلسلے میں اتنا جذباتی ہے۔“ پھر وہ ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ ”چل! یہ آنسو پونچھ لے اور مجھے یہ بتا کہ تجھے لندن کب جانا ہے؟“

بھیا روتے روتے مسکرانے لگے۔

اس دن ہم تینوں نے بہت دنوں بعد اکٹھے کھانا کھایا۔ کھانا کھاتے ہوئے بھیا نے بتایا کہ وہ ایکس تاریخ کو لندن جائیں گے۔ ان کی تمام کتابیاں مکمل تھیں۔

آخر ایک دن بھیا لندن روانہ ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں انہیں کتنا چاہتی تھی۔ ابو بھی کئی دن تک اداس رہے۔

بھیا ہر دوسرے تیسرے دن لندن سے فون کرتے تھے اور گفتگوں باتیں کرتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ وہ بہت زیادہ

معروف ہو گئے۔ اب انہیں روزانہ فون کرنے کا وقت نہیں ملتا تھا۔ وہ پندرہ بیس دن میں ایک مرتبہ کال کر لیا کرتے تھے۔

ان دنوں موہا ل فون نہیں تھا اور لینڈ لائن کے فون بھی بہت کم گھر میں ہوا کرتے تھے۔ شروع میں تو بھیا سے بات کرنے کے لیے شیخ صاحب کے گھر جانا پڑتا تھا۔ ابو سے ان کی دوستی تھی اس لیے وہ ہمیں اپنا ٹیلی فون کرنے کی اجازت دے دیتے تھے۔

شیخ صاحب سرکاری فلکی دار تھے اور خاصے خوش حال تھے۔ ان کی ایک بیٹی شبنم میری ہم عمر تھی، بیٹا مسعود بھیا سے ایک دو سال بڑا ہو گا۔ ان کے دو بیٹے بہت چھوٹے تھے اور پرائمری میں پڑھتے تھے۔

بھیا سے فون پر بات کرنے اکثر میں ہی جاتی تھی۔ ابو تو بہت کم ان کے گھر جایا کرتے۔ شیخ صاحب کے گھر جاتی تو مسعود بھانے بھانے سے وہیں منڈلاتا رہتا۔ مجھے دیکھ کر بے وجہ مسکراتا اور شانہ کو اکثر گھسے پنے لپیٹنے سنایا کرتا۔ شبنم کی آڑ میں دراصل وہ مجھے لپیٹنے سنایا کرتا تھا۔ اس کے لپٹوں اور چھوڑے مذاق پر مجھے ہنسی کی بجائے غصہ آیا کرتا تھا۔ کبھی وہ شبنم کے لیے کولڈ ڈرنک لے آتا، کبھی آکس کریم لانا تھا۔ گویا میری وجہ سے شبنم پر عتاب تھیں۔

ایک دن شبنم نے کہہ ہی دیا۔ ”کیا بات ہے مسعود بھائی آج کل آپ مجھ پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہیں۔“

”کیا اس لیے پہلے میں تجھے آکس کریم نہیں کھلاتا تھا یا سو سے لے کر نہیں آتا تھا؟“ مسعود منہ بنا کر بولا۔

میں نے مسعود سے کہا۔ ”مسعود بھائی! مجھے اس چنورین کا کوئی شوق نہیں ہے اس لیے میرے لیے کچھ مت لایا کریں۔“

مسعود کھانا ہوا کر وہاں سے چلا گیا۔

مجھے اب اس چنورین کے لڑکے سے چڑھ گئی تھی۔ میرے آنے کا وقت ہوتا تو وہ سب کام چھوڑ جھاڑ کر میرے سر پر مسلط ہو جاتا۔ مجھ سے ٹھیک طرح فون پر بات بھی نہیں ہوتی تھی۔

پھر ابو نے بھاگ دوڑ کر کے گھر میں فون گلوایا تو میری جان اس عذاب سے چھوٹ گئی۔ اس کے بعد مسعود ایک دو دفعہ بھانے بھانے سے ہمارے گھر بھی آیا لیکن میں اس کے سامنے نہ آئی۔ ایک دفعہ میں اسکول سے واپس آ رہی تھی کہ بس اسٹاپ کے نزدیک مجھے مسعود نظر آیا۔ وہ موٹر سائیکل پر تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میرے پیچھے لپکا اور میرے نزدیک آ کر بولا۔

”عارفہ! میری ایک بات.....“

”مسعود بھائی پلیز۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

”لوگ دیکھ رہے ہیں۔“ مجھے تماشائیت بتائیں۔ ”یہ کہہ کر میں آگے بڑھ گئی۔

وہ بھی ایک ڈھیت تھا۔ موٹر سائیکل لے کر وہ میرے سامنے آ گیا اور بولا۔ ”عارفہ، صرف ایک منٹ میری ایک بات سنی جاؤ۔“

”مسعود بھائی!“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ”میرا راستہ چھوڑیں۔“

”عارفہ، میں.....“

”کیا بات ہے؟“ پشت سے مجھے کسی کی آواز سنائی تھی۔ ”کیوں انہیں تنگ کر رہا ہے؟“

میں نے گھوم کر دیکھا وہ محلے کا ایک بدنام لڑکا منیر تھا۔ مجھے مسعود پر بے تحاشہ غصہ آیا۔ کم بہت خود تو بے عزت ہو ہی رہا تھا مجھے بھی سر عام تماشائیتا تھا۔

منیر نے دوسری مرتبہ بلند آواز میں کہا۔ ”راستہ چھوڑ دے! ان کا روزنامہ تیری اداوار دست کر دوں گا۔“

مسعود نے جلدی سے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور وہاں سے چلا گیا۔

”آپ شاید اسی محلے میں رہتی ہیں؟“ منیر نے یوں کہا جیسے پہلی دفعہ مجھے دیکھ رہا ہو۔ حالانکہ وہ بھی آتے جاتے مجھے گھورتا تھا۔ آج اس کم بخت مسعود کی وجہ سے منیر کو بات کرنے کا موقع بھی مل گیا تھا۔

”آپ پریشان نہ ہوں، آئیے میں آپ کو گھر چھوڑ دوں۔“ منیر نے میرے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

”میں چلی جاؤں گی۔ آپ زحمت نہ کریں روزانہ اسکی ہی جاتی ہوں۔“

”آجیہ اگر کوئی بھی آپ کو پریشان کرے تو مجھے بتائیے گا۔“

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے چلتی رہی۔

منیر کچھ دور تو میرے ساتھ چلا لیکن جب میں نے اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا تو واپس چلا گیا۔ مجھے وہ رہ کر مسعود پر غصہ آ رہا تھا۔ میرا دل تو یہ چاہتا تھا کہ چپل اتار کر اس کے سر پر ایسی بے بھاد کی برساؤں کہ سارا عشق ہوا ہو جائے لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں خود تو تماشائی ہی لیکن مجھے والے مار مار کے مسعود کا بھرکس نکال دیتے۔ لڑکیوں کے طرف دار تو ہر جگہ موجود ہوتے ہیں جو ان کی خوشنودی کے لیے

بروقت مرنے مارنے کو تیار رہتے ہیں۔ پھر میری ذہنی رو بھیا کی طرف چلی گئی۔ بھیا کو ٹیلی فون کرنے ہی کے لیے تو میں شیخ صاحب کے گھر جاتی تھی۔

وہ تو غنیمت ہو کر ابو نے فون گلوایا۔

اب جب سے فون لگا تھا بھیا کے فون آنا کم ہو گئے تھے۔ مجھے ان پر بھی جھنجھلاہٹ ہوتی تھی کہ انہیں میرا اور ابو کا خیال ہی نہیں ہے۔ ایسی بھی کیا معصروفیت کہ آدمی بات کرنے کو پانچ منٹ بھی نہ نکال سکے۔

ابو مجھے سمجھاتے تھے کہ راشدا اپنی پڑھائی میں مصروف ہو گا تو تم تو جانتی ہی ہو کہ پڑھائی میں مصروف ہو کر وہ کھانا پینا بھی بھول جاتا ہے۔

پھر رفتہ رفتہ بھیا کی کالز آنا حریہ کم ہو گئیں۔ اب وہ ایک ڈیڑھ مہینے بعد دو چار منٹ بات کر لیا کرتے تھے۔ ان کے اس رویے سے ابو بھی پریشان تھے لیکن وہ مجھ پر ظاہر نہیں کرتے تھے۔

میں دل ہی دل میں کراہتی رہتی تھی لیکن کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ دو چار دفعہ میں نے خود بھی ان سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن ان سے بات نہ ہو پائی۔ کبھی وہ کمرے میں نہیں ہوتے تھے۔ کبھی فون ریسیور کرنے والا مجھے ہولڈ کر کے خود غائب ہو جاتا تھا اور میں پاگلوں کی طرح ریسیور کان سے لگا کر بیٹھی رہتی تھی۔

آخر میری بھی اپنا آڈھے آئی اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب میں انہیں خود کال نہیں کروں گی۔ نہ ان کا فون آنے پر کسی قسم کی کوئی شکایت کروں گی۔

دیکھتے ہی دیکھتے پانچ سال بیت گئے۔ میں نے اس دوران میں بی ایس سی کر لیا۔ اب میں ایم ایس سی کی تیاری کر رہی تھی۔

ایک دن ابو کو ڈاک کے ذریعے ایک خط موصول ہوا۔ وہ خط بھیا کا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ میں نے انجینئرنگ کا ڈپلوما کرنے کے بعد یہاں ملازمت کر لی ہے۔ پہلی تنخواہ ملنے پر ڈرافٹ بھیج رہا ہوں۔ اس میں سے پانچ ہزار عارفہ کے لیے ہیں۔

ابو تو خط پا کر نہال ہو گئے۔ مجھے بھی بہت خوشی ہو رہی تھی کہ بھیا نے نہ صرف اپنی تعلیم مکمل کر لی بلکہ وہ جاب بھی کرنے لگے تھے۔ ان کی جاب بہت اچھی تھی کیوں کہ پہلی تنخواہ پر انہوں نے ابو کو بیس ہزار روپے بھیجے تھے۔ بیس ہزار کی رقم اس وقت خاصی ہوتی تھی۔ بھیا کا فون مہینے میں ایک آدھ

باری آتا تھا۔ میں ان سے کہتی کہ آپ کی تعلیم مکمل ہوگئی ہے تو پاکستان لوٹ آئیں۔ یہاں بھی آپ کو اچھی ملازمت مل جائے گی۔

وہ جواب میں کہتے تھے کہ بس کچھ عرصہ جاب کر کے پیسے جمع کروں، پھر پاکستان آکر ملازمت کی بجائے کاروبار کروں گا۔

مجھے یوں ہی باتوں میں بہلا پھسلا کر انہوں نے دو سال حریہ گزار دیے۔

میں نے ایم ایس سی کر لیا اور جاب کے لیے بے وقت جگہ درخواستیں بھیج دیں۔ مجھے ملازمت کی ضرورت تو نہیں تھی لیکن میں گھر میں پڑے پڑے ہو گئی تھی اس لیے خود کو مصروف رکھنے کے لیے ملازمت کرنا چاہتی تھی۔

جلدی مجھے ایک کالج میں ٹیچر شپ کی آفر ہوئی تو میں نے وہ آفر قبول کر لی۔

مجھے ملازمت کرتے شاید تین مہینے ہوئے تھے کہ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف سے بھیا کی آواز سن کر میں خوش ہو گئی۔

میری بات سن کر ابوبھیا لاؤنج میں نکل آئے۔

”کیسی ہے موٹی؟“ بھیا نے فس کر کہا۔ میں بچپن میں بہت موٹی تھی اس لیے بھیا اکثر چڑانے کے لیے مجھے موٹی کہا کرتے تھے۔

”میں اب اتنی موٹی نہیں ہوں بھیا۔“ میں نے فس کر کہا۔ ”اب تو میں بہت کسم اور اسارت ہو گئی ہوں۔“

”چھان۔“ بھیا نے کہا۔ ”تو میرے کمرے کی صفائی تو کرتی ہے نا؟“

”آپ کو اپنا کرایوں یاد آگیا بھیا؟“ میں نے کہا۔ ”آپ کے کمرے کی صفائی تو میں روزانہ کرتی ہوں اور آپ کی چیزیں جوں کی توں رکھی ہوئی ہیں۔“

”تو پھر تیار ہو جا، میں پرسوں رات کی فلاح سے پاکستان آرہا ہوں۔“ بھیا نے کہا۔

”کک..... کیا کہا آپ نے؟“ میں نے بے یقینی سے پوچھا۔ میرا دل مارے خوشی کے زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

”میں نے کہا ہے کہ میں پرسوں پاکستان آرہا ہوں، کیا تو اب بہری بھی ہو گئی ہے؟“ بھیا نے قہقہہ لگا کر کہا۔

”اچھا کس وقت آئیں گے؟“ میں نے پوچھا۔ ”میری فلاح رات کو بلکہ صبح چار بجے کراچی پہنچے گی۔“

پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولے۔ ”ابو کہاں ہیں؟ اگر گھر پر ہیں

تو میری بات کر ان سے۔“

میں نے ریسیور ابوبھیا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ابو بھیا کافون ہے، بات کر لیں۔“

ابو، بھیا سے بات کرنے لگے اور میں بھیا کے کمرے کی طرف بھاگی۔ میں نے ایک ہفتے سے کمرے کی صفائی نہیں کی تھی۔ کمرے کی صفائی کر کے میں ڈرائنگ روم اور لاؤنج کی صفائی میں لگ گئی۔

ابو مسکرا کر بولے۔ ”عارف بیٹی، ایسی بھی کیا بدحواسی، راشدا آج تو نہیں آرہے؟“

”ابو پرسوں میں وقت ہی کتنا ہے؟ آپ جانتے ہیں کہ بھیا کو گندگی سے چڑ ہے۔“

میں نے بھیا کے کمرے کے ساتھ ساتھ پورے گھر کو آئینے کی طرح چکچکا دیا۔ بھیا کا پسینہ مٹا، تو رمداد کا جڑکا حلوا تیار کرنے میں آدھا دن لگ گیا۔ پھر میں ایئر پورٹ جانے کو تیار ہونے لگی۔ میں یوں تیاری کر رہی تھی جیسے کسی شادی میں جا رہی ہوں۔ ابو نے ایک دین والے سے کہہ دیا تھا۔ وہ وقت سے پہلے آگیا۔

اس دن سردی بہت شدید تھی۔ ابوبھیا سا بخار بھی ہو گیا تھا اس لیے میں نے اصرار کر کے ابوبھیا کو گھر پر آرام کرنے کو کہا اور خود خالہ بلال اور ان کی بیٹی کے ساتھ ایئر پورٹ روانہ ہو گئی۔

ایئر پورٹ پر بھات بھات کے لوگ تھے۔ جانے والوں کو ان کے عزیز و اقارب الوداع کہہ رہے تھے اور آنے والوں کے استقبال کے لیے لاؤنج کی رینگ کے ساتھ سرایا انتظار بنے کھڑے تھے۔

بھیا کی فلاح آج بھی تھی اور مسافر باہر آرہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے بھیا نظر آ گئے۔ وہ پہلے سے زیادہ صحت مند، خوش لباس اور وجہ لگ رہے تھے۔ وہ سامان سے لدی پسندی ٹرائی وکھلتے ہوئے باہر آرہے تھے۔

پھر بلال کی نظر ان پر پڑی تو وہ مجھ سے بولا۔ ”عارف وہ دیکھ راشد۔“

میں نے بھیا کو آواز دی۔ ”بھیا۔“

بھیا نے مجھے دیکھا اور بے اختیار مجھے گلے لگاتے ہوئے بولے۔ ”ارے موٹی تو تو واقعی بہت اسارت ہو گئی ہے۔“ پھر وہ خالہ بلال سے ملے، پھر ان کی نظر خالہ کی بیٹی صائمہ پر پڑی۔ وہ سبھی کئی ایک طرف کھڑی تھی۔ بھیا مسکرا کر بولے۔ ”صائمہ کیسی ہو تم؟“

”میں..... ٹھیک ہوں۔“ صائمہ نے نظریں جھکائے

جھکائے جواب دیا۔

اچانک میری نظر بھیا کے پیچھے کھڑی ایک انگریز لڑکی پر پڑی۔ وہ بہت غور سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ ایئر پورٹ پر کئی غیر ملکی لڑکیاں اور مرد بھی تھے اس لیے میں نے اس لڑکی کو نظر انداز کر دیا۔

اچانک بھیا بولے۔ ”عارف یہ ”میری“ ہے۔ تمہاری بھالی۔“

بھیا کے الفاظ سن کر میرے کانوں میں ایسا جھنکا ہوا جیسے کوئی شیشہ زوردار آواز کے ساتھ ٹوٹ گیا ہو۔ میں نے بھیا کی طرف بے یقینی سے دیکھا اور یوڈائی۔ ”بھالی؟“

بھیا اس انگریز لڑکی سے مخاطب ہوئے۔ ”میری، یہ میری پیاری بہن عارفہ ہے۔“

”ہیلو!“ میری نے میری طرف ہاتھ بڑھایا تو میں نے بے ہوشی سے تمام لیا۔

مجھ سے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا دو بھر ہو رہا تھا۔ میری حالت دیکھ کر بھیا نے مجھے سہارا دیا اور بولے۔ ”ارے تیرا جسم تو برف کی طرح سرد ہو رہا ہے۔ چل گھر چل..... یہاں بھی بہت سردی ہے۔“ وہ مجھے سہارا دے کر ایئر پورٹ سے باہر آئے۔

واپس میں میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ میری کچھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے اب کیا کرنا چاہیے؟ میں جانتی تھی کہ ابوبھیا اس بات کا شدید صدمہ ہوگا۔ وہ تو بھیا سے نہ جانے کیا کیا امیدیں لگائے بیٹھے تھے۔

میں راستے پھر خاموش رہی۔ خالہ اور صائمہ بھی بت بنی بیٹھی تھیں۔ صرف بھیا اپنی بیوی سے کچھ کسم پکسم کر رہے تھے۔ وہ ان کی کئی بات پر فس بھی دیتی تھی۔

ہم گھر پہنچے تو ابوبھیا انتظار بنے دروازے کے نزدیک ہی کھڑے تھے۔ اٹلائی کھنٹی سننے ہی انہوں نے دروازہ کھول دیا۔

بھیا وین سے اتر کے ان سے لپٹ گئے۔ فرمائش سے ابوبھیا آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بھیا کی چپہ چپہتے ہوئے بولے۔ ”بہت دن لگا دیے بیٹا۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ تو وہاں سے انجینئرنگ کی ڈگری لے کر واپس آیا ہے۔“ بولتے بولتے معائن کی نظر میری پر پڑی تو وہ خاموش ہو گئے۔

بھیا نے بھی ان کی خاموشی کو محسوس کر لیا اور آہستگی سے بولے۔ ”ابو یہ میری ہے، آپ کی بہن۔“

”بھو؟“ ابو نے حیرت سے دہرایا۔

”جی ابو، آپ کی بہن۔“ بھیا نے کہا۔ ”میں نے ایک سال پہلے میری سے شادی کر لی تھی۔ میں آپ کو بتانا چاہتا تھا لیکن موقع ہی نہ ملا۔“

ابو تو یوں گم گم کھڑے تھے جیسے ان کے جسم میں جان ہی نہ ہو۔ پھر وہ اچانک فرش پر گر پڑے۔

میں نے کچھ کر ابوبھیا کو سہارا دینے کی کوشش کی لیکن وہ بے ہوش ہو چکے تھے۔ پھر بلال اور بھیا نے مل کر ابوبھیا کو اٹھایا اور اسی دین میں لٹا دیا جس میں ہم ایئر پورٹ سے آئے تھے۔

ابو یہ صدمہ برداشت نہ کر سکے تھے اور انہیں دل کا دورہ پڑ گیا تھا۔

انہیں آئی سی یو میں منتقل کر دیا گیا اور ہم اس رات ہی رات میں اسپتال کے کورڈور میں کھڑے تھے۔ اسپتال میں اس وقت میرے علاوہ بلال اور بھیا بھی تھے۔ ان کی انگریز بیوی نے اسپتال آنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا کہ آئندہ چوبیس گھنٹے ابوبھیا کی دیکھ رہی ہیں۔ اگر انہیں ہوش آگیا تو ان کی زندگی کی امید کی جاسکتی ہے۔

میں روز درود کر ابوبھیا کی صحت یابی کے لیے دعائیں مانگ رہی تھی لیکن بھیا کچھ شرمندہ شرمندہ نظر آرہے تھے۔

”ابوبھیا کو دل کی بیماری کب سے تھی عارف؟“ بھیا نے مجھ سے پوچھا۔

”ابوبھیا کو دل کی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”انہیں آج پہلی دفعہ دل کا دورہ پڑا ہے۔“ پھر میں نے سر دھجے میں کہا۔ ”آپ جانا چاہیں تو چلے جائیں۔ آپ لمبا سفر کر کے آئے ہیں مجھے ہونے ہوں گے۔ یوں بھی یہاں رہ کے آپ ابوبھیا کے لیے کیا کر سکتے ہیں بھیا؟“

”تو کہنا کیا چاہتی ہے؟“ بھیا نے ہنسا کر کہا۔ ”کیا ابو کا رشتہ تجھ سے ہی ہے، میرا ان سے کوئی رشتہ نہیں ہے؟“

”لگتا تو ایسا ہی ہے۔“ میں نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔ ”اگر آپ کی نظروں میں رشتوں کی کوئی اہمیت ہوئی تو یوں خاموشی سے شادی نہ کر لیتے۔“ میری آواز بگڑنے لگی۔

”عارف تیرا مطلب ہے کہ ابو میری بیوی.....“

”میرا کوئی مطلب نہیں ہے بھیا۔“ میں نے کہا۔ ”میں صرف یہ کہہ رہی تھی کہ آپ لمبا سفر کر کے آئے ہیں مگر جا کر آرام کریں۔“

وہ رات میں نے اسپتال کے لاؤنج میں گزار دی۔ صبح ڈاکٹر نے ہمیں خوش خبری سنائی کہ مریم کی حالت

جاسوسی ڈائجسٹ سیلی کیشنز

جاسوسی ڈائجسٹ سیلی کیشنز

ایک ادارہ چار ماہانہ مطبوعات

دنیا بھر میں

خدمات

اور مطبوعات

کی مدد و تشہیر کے لیے



جہاں جہاں اس کی آواز گونجتی ہے وہاں ہے رسالہ جاسوسی کی جگہ

63-3 نیوز ایڈیشن ڈسٹری بیوٹنگ ایجنسی کے ذریعے

انہوں نے واپس آکر میری سات پشتوں پر احسان کیا ہے۔
”آپ یہاں نہ ہی آتے تو اچھا تھا۔“ میں نے سر دھجے
میں کہا۔ ”آپ کو تو اس گوری چڑی والی سے شادی کرنے کی
پڑی تھی۔ اگر آپ ابو سے شادی کی اجازت لینے تو ابو آپ کو
منع تو نہیں کرتے۔“

”ایسی کیا آفت آگئی ہے میری شادی سے؟“ بھیا کو
ایک دم غصہ آگیا۔
”آفت آگئی ہے۔“ میں نے بھی جج کر کہا۔ ”آپ کی
وجہ سے ابوی یہ حالت ہوئی ہے ورنہ انہیں تو بھی دل کی تکلیف
تھی ہی نہیں اور..... آپ کی میری کو اتنی بھی تیز نہیں ہے کہ وہ
ابوی حراج پر ہی کر لیتی۔ نہ جانے کس خاندان کی ہے۔“
”عارف!“ بھیا جج کر بولے۔ ”تمیز سے بات کرو۔
میری تمہاری بھالی ہے۔“
”ادبہ بھالی ہے، اس کی حرکتیں تو بھابیوں والی نہیں
ہیں۔“

”اچانک میری اوپر سے نیچے آگئی اور بولی۔“ عارف تم کیا
بکواس کر رہی ہو، اتنی اردو تو میں بھی سمجھ لیتی ہوں تم مجھے گالیاں
دے رہی ہو۔“ وہ جج کر انگریزی میں بولی۔
”شٹ اپ!“ میں نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔
”بکواس تو تم کر رہی ہو۔“
”راشد یہاں سے ابھی چلو، میں اب اور زیادہ ذلت
برداشت نہیں کر سکتی۔“

”عارف!“ بیانیہ درشت انداز میں کہا۔ ”میری سے
معافی مانگو۔“
”میں اس سے معافی مانگوں گی، اس سے۔ معافی تو
آج تک میں نے بھی آپ سے بھی نہیں مانگی۔“ میں نے
میری کو سانے کے لیے انگلیں میں کہا۔ ”اور میں نے کیا کیا ہے
جس کی معافی مانگوں، جتنی بات ہوئی ہے آپ کے سامنے ہی
ہوئی ہے، کیا اپنی بیوی کی طرح آپ کو بھی اردو نہیں آتی؟“
میں نے پھر انگریزی میں کہا۔

”راشد!“ میری جج کر بولی۔ ”یہاں سے ابھی اور اسی
وقت واپس چلو۔ میں اب یہاں ایک لمحے کو نہیں ٹھہر سکتی۔“
”کیا تم پاگل ہو گئی ہو میری۔“ بھیا اس پر الٹ پڑے۔
”میرا باپ شاید بیمار ہے اور تمہیں جانے کی پڑی ہے۔“
”باپ بیمار ہے؟“ میری گلا پھاڑ کر بولی۔ ”اس کی دیکھ
بھال کے لیے یہاں ڈاکٹر آئے ہیں، تمہارا سر دھتے دار ہیں اور یہ
تمہاری لاڈلی بہن ہے۔“

اب خطرے سے باہر ہے۔
”جج مچ خالہ اور ساتھ ہمارے لیے ناشتا لے کر آگئی
تھیں۔ ہم نے اسپتال کے لان میں بیٹھ کر ناشتا کیا۔ پھر خالہ
نے مجھ سے کہا۔“ عارف بیٹا، بھالی صاحب کی حالت اب
باشا اللہ خطرے سے باہر ہے تو بھی گھر جا کر کچھ دیر آرام
کر لے۔“

میں نے انکار کرنا چاہا لیکن خالہ نے اصرار کر کے مجھے
گھر بھیج دیا اور بولیں کہ تو بھالی صاحب کی فکر مت کر، میں اور
ساتھ یہاں موجود ہیں۔ بھیا اور بلال صبح واپس چلے گئے
تھے۔

میں گھر پہنچی تو گھر میں بالکل سناٹا تھا۔ شاید بھیا اور ان
کی چینی بیوی ابھی تک سو رہی تھی۔ میرا بھی جوڑ جوڑ دکھ رہا
تھا۔ میں نے پہلے اپنے کالج فون کر کے اپنی غیر حاضری کی
اطلاع دی۔ پھر بستر میں گھس گئی۔

میری آنکھ مٹی کی توال کھاک گیارہ بج رہی تھی۔ میں
جلدی سے اٹھی منہ پر پانی کا چھینٹا مارا، کپڑے بدلے اور
اسپتال کے لیے روانہ ہوئی۔

خالہ اور ساتھ وہیں تھیں۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی
کہا۔ ”اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ بیٹا، بھالی صاحب کو ہوش
آگیا۔ ان کی حالت خطرے سے باہر ہے لیکن وہ ابھی آئی سی
یو میں ہیں۔ ڈاکٹر کی کونڈر نہیں جانے دے رہے۔“
”میں ڈاکٹر سے بات کرتی ہوں۔“ میں وارڈ کی طرف
بھاگی۔ میری خوشامدیں کرنے پر ڈاکٹر نے صرف اتنا کیا کہ
مجھے ششے کے دروازے سے ابوکو دیکھنے کی اجازت دے دی۔
ابو کی حالت قدرے بہتر تھی اور وہ اس وقت سو رہے تھے یا ممکن
ہے غنودگی میں ہوں۔

پھر پانچ دن تک میرا زیادہ وقت اسپتال میں گزرا۔ ابو
کی حالت بہت بہتر تھی۔ اس دوران بھیا بھی اسپتال میں
رہے لیکن میں نے ان سے کوئی بات نہیں کی۔ ان کی بیوی نے
اس وقت بھی اسپتال آنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔
پانچویں دن ابو گھر آگئے۔ وہ بھیا سے بات نہیں
کر رہے تھے۔

اس دن شام کو بھیا نے مجھ سے کہا۔ ”عارف میں واپس
لندن جا رہا ہوں۔“

”مجھ سے کیا کہہ رہے ہیں؟“ میں نے سچ لہجے میں
کہا۔ ”میں آپ کو روک تو نہیں سکتی نا۔“
”میں یہاں آکر پچھتا رہا ہوں۔“ بیانیہ یوں کہا جیسے

”میری پلیز!“ بیانی نے درشت لہجے میں کہا۔ ”میں یہاں موجود ہوں تو باپ کی دیکھ بھال کرنا میرا فرض ہے تم اپنے کمرے میں جاؤ۔“

”تمہیں اتنی ہی فکر ہے راشد تو اپنے باپ کو کسی نرسنگ ہوم میں داخل کرادو۔ ہر مہینے اخراجات کئے پیسے بھیجتے رہنا۔ میں یہاں۔۔۔۔۔“

”میری!“ بیانی چیخ کر بولے۔ ”اپنی بکواس بند کرادو اور اوپر جاؤ۔“

”تم یہاں رکتا چاہتے ہو تو ضرور رکو۔ میں آج ہی واپس جاؤں گی۔ تم بڑھے کے مرنے کا انتظار کرتے ہو۔“

”میری، اپنی زبان کو لگام دو۔ یہ برطانیہ نہیں پاکستان ہے، سمجھیں نا ڈکٹ لاسٹ۔“

میری چیختی لگی۔ ”اس بڑھے کی خاطر تم میری انسٹ کر رہے ہو راشد۔ یہ بڑھا بیک زندہ کیوں ہے؟“

اجا یک بیانی کا ہاتھ کھوا اور زانے سے میری کے منہ پر پڑا۔ میری ہٹا کھڑی کبھی بیانی کو دیکھ رہی تھی کبھی نہیں۔ پھر وہ جنونی انداز میں بیانی کی طرف بڑھی اور ان کا گریبان پکڑ لیا۔

”یو بلڈی انڈین۔۔۔۔۔ یو لیکن! تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا بھڑا!“

اس نے بیانی کی شرت تار تار کر دی۔

بیانی نے ٹیش میں آکر میری کو چند چمچر حویہ رسید کر دیے۔ پھر اسے لاتوں اور گھونٹوں سے مارنا شروع کر دیا۔

مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں آگے بڑھ کے بیانی اور میری کے درمیان آگئی اور بیانی کے ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرنے لگی۔

”میرے سامنے سے ہٹ جا عارف۔“ بیانی نے قہر آلود لہجے میں کہا۔ ”میرے سامنے اس نے میرے باپ کو برا بھلا کہا۔“

”اسے چھوڑیں بیانی۔“ میں نے کہا۔ ”کسی کمزور عورت پر ہاتھ اٹھانا بہادری نہیں ہے۔“

بیانی چیخے ہٹ گئے۔ میں نے میری کو فرش سے اٹھایا اور سہارا دے کر اوپر لے جانے لگی۔

وہ مسلسل بک بک کر رہی تھی۔ ”میں تم سب کو جھڑپی لگوادوں گی۔ تم کالے لوگ کیا سمجھتے ہو، میں بے بس ہوں، میرا سفارت خانہ تمہاری حکومت کی ایسی کی تھی کر دے گا۔“

میری کی حالت اس وقت بہت خراب تھی۔ اس کے گالوں پر چمچروں کے نشان تھے۔ اس کے چہرے کی جلد بعض جگہ سے پھٹ گئی تھی اور اس میں سے خون چھلک رہا تھا۔ میں

اسے کمرے میں لے گئی اور بیڈ پر بٹھانے کے بعد نشو و پیر سے اس کے چہرے اور ہڈیوں سے بہتا ہوا خون صاف کرنے لگی۔

میری کو اچانک پھر غصہ آگیا۔ وہ چیخ کر بولی۔ ”میں تم سب کو سلاخوں کے پیچھے بھجواؤں گی۔“ وہ مجھے قہر آلود نظروں سے گھور کر بولی۔ ”دفع ہو جا یہاں سے کتیا۔“ اس نے بیڈ سے اٹھ کر اچانک مجھے دھکا دیا۔

میں اس کے لیے ہڈی طور پر تیار نہیں تھی اس لیے لڑکھڑا کر کمرے سے باہر جا مری۔ میری جنون کی حالت میں کمرے سے باہر نکل آئی اور لاتوں سے مجھے مارنے لگی۔ میں سنبھل کر ابھی تو اس نے اچانک پوری قوت سے مجھے دھکا دیا۔ میں اچھل کر زینے پر گر کر اور سیز میوں سے لڑھکتی ہوئی نیچے آگری۔ میری کمر اور سر میں زبردست چوٹ آئی تھی۔

پھر بیانی چیختی ہوئے میری کی طرف بڑھے۔ ”عارف!“

اس کے بعد میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ مجھے ہوش آیا تو میں اپنے بستر پر تھی۔ میرے نزدیک صائبر اور خالد بیٹھی ہوئی تھیں۔ گھر میں عجیب طرح کا سا نا تھا۔

میں نے قہمت زدہ لہجے میں خالد سے پوچھا۔ ”مجھے کیا ہوا ہے خالد؟“

”تو پھل کر سیز میوں سے گر گئی تھی بیٹا۔“ خالد نے مجھ سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ مجھے یاد آگیا کہ میں میری کے کمرے میں تھی، پھر اس نے مجھے مارنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس نے مجھے دھکا دے دیا۔ میں سیز میوں پر گر گئی تھی اور لڑھکتی ہوئی نیچے آگئی تھی۔ پھر بیانی میری طرف لپکے تھے اور۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔

میں اچانک اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میرے سر میں شدید دھمک ہو رہی تھی۔ مجھے زور کا پکڑ آیا اور میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

”لیکن یہ عارف۔“ خالد نے کہا۔

”بیانی کہاں ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”راشد اپنے کمرے میں ہے۔“ خالد نے جواب دیا۔

وہ مسلسل مجھ سے نظریں چراتی تھیں۔

”آپ مجھ سے کیا چھپا رہی ہیں خالد؟“ میں نے کہا۔

”تم بتاؤ صائبر۔“ میں نے صائبر سے پوچھا۔

اس نے کچھ کہنا چاہا پھر نظریں جھکا دیں۔

میں گھبرا کر کھڑی ہوئی۔ مجھے ایک مرتبہ پھر زوردار پکڑ

آیا۔ میں نے دیوار کا سہارا لے لیا ورنہ میں فرش پر گر جاتی۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے عارف تم آرام کرو۔“ خالد نے کہا۔

میں نے اسے سامنے سے ایک طرف دھکیلا اور ابو کے کمرے میں پہنچی۔ ابو بیڈ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر رونے لگے۔

میں بری طرح گھبرا گئی اور بولی۔ ”کیا ہوا ابو؟“ ابو نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے اسے مرتبہ بلند لہجے میں پوچھا۔ ”بتائیے نا ابو کیا ہوا ہے۔ آپ رو کیوں رہے ہیں؟“

”عارف بیٹی۔“ ابو نے گلو کیر لہجے میں کہا۔ ”وہ۔۔۔۔۔ راشد۔۔۔۔۔“

”کیا ہوا بیانی؟“ میں نے تڑپ کر پوچھا۔

میں اس وقت یہ بھی بھول گئی تھی کہ بیانی نے ابو کی مرضی کے بغیر شادی کر کے ہمارا دل دکھایا ہے اور یہ کہ میں ان سے کبھی بات نہ کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ میں یہی بھی بھول گئی کہ ان کی بیٹی نے مجھے بے دردی سے مارا ہے اور سیز میوں سے دھکا دے کر میری جان لینے کی کوشش کی ہے۔

میں نے چیخ کر کہا۔ ”بتائیے نا ابو کیا ہوا ہے؟“

”مجھے کچھ نہیں ہوا۔“ اچانک بیانی کمرے میں داخل ہوئے۔ ”ابو، میں پولیس کو اطلاع دے رہا ہوں۔“

”پولیس!“ میں نے الجھ کر کہا۔ ”کیا بتائیں گے آپ پولیس تو؟“

”جی کہ میں نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا۔“ بیانی نے ہڈیانی لہجے میں کہا۔

”تسک۔۔۔۔۔ کیا۔۔۔۔۔ قتل۔۔۔۔۔“

”ہاں بیٹا!“ ابو ایک مرتبہ پھر رونے لگے۔ ”رشتوں نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا ہے۔“

”کیوں؟“ میں نے الجھ کر پوچھا۔

”اس نے جب تجھے سیز میوں سے دھکا دیا تو راشد جنون کے عالم میں اوپر پہنچا اور۔۔۔۔۔“ ابو پھر رونے لگے۔

”ابو پلیز آپ رو نہیں مت ورنہ آپ کی طبیعت پھر بگڑ جائے گی۔“ یہ کہہ کر میں ابھی اور بد وقت تمام اوپر پہنچی۔ میرے سر کی تکلیف اچانک بڑھ گئی تھی۔

کمرے میں میری غیر فطری انداز میں فرش پر پڑی تھی۔

اس کے سر سے خون بہہ کر فرش پر پھیل گیا تھا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ خون بیانی نے میری وجہ سے

کیا ہے۔ وہ آج بھی میری تکلیف برداشت نہیں کر سکتے۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا بیانی اور اوزے کے درمیان ہی کھڑے تھے۔

معا میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔ بیانی کو بچانے کا فیصلہ۔ ”بیانی آپ نے کیسے مارا ہے میری کو؟“

بیانی نے حیرت سے مجھے دیکھا، پھر کچھ سوچ کر بولے۔

”ماربل کی اس ایٹل ٹرے سے۔“ فرش پر بھاری بھر کم ایٹل ٹرے پڑی تھی۔

میں نے لپک کر وہ ایٹل ٹرے اٹھا لی۔ اسے اپنے دوپٹے سے اچھی طرح صاف کیا اور بولی۔ ”یہ کٹل آپ ٹخنوں بلکہ میں نے کیا ہے۔“

”عارف۔۔۔۔۔ ذرا۔“ بیانی نے رک رک کر بے چینی سے پوچھا۔ ”یہ۔۔۔۔۔ تو کیا۔۔۔۔۔ کہہ رہی ہے۔۔۔۔۔ گڑیا؟“

”میں وہی کہہ رہی ہوں جو مجھے کہتا چاہیے۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے آپ کی زندگی بہت عزیز ہے بیانی، بس اب کچھ مت کہیے گا۔ یہ قتل میں نے کیا ہے۔ میرا اور میری کا بھڑا ہوا۔ اس نے ٹیش میں آکر مجھے مارا بیٹا، ابو کا گریبان دیں، انہیں خوب برا بھلا کہا۔ وہ آپ کو بھی گایا دیں دے رہی تھی۔ وہ مجھے بہت بے رحمی سے مار رہی تھی۔ میں نے اپنی جان بچانے کے لیے ماربل کی یہ ایٹل ٹرے اٹھا لی اور میری کے سر پر دے ماری۔ میری تہوڑا کر فرش پر گر گئی تو میں خوف زدہ ہو کر کمرے سے بھاگی۔

مجھے یہ خوف تھا کہ میری مجھے دوبارہ مارنا شروع کر دے گی۔ گھبراہٹ میں سیز میوں پر میرا پاؤں پھسلا اور میں لڑھکتی ہوئی نیچے آگری، پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔ مجھے ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ میری ضرب سے میری مر چکی تھی۔“

”لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔“ بیانی جذباتی ہو گئے۔ اپنی جان بچانے کے لیے میں تیری جان داؤ پر نہیں لگا سکتا۔“

”بیانی پلیز۔“ میں نے کہا۔ ”اب اس بات کا فیصلہ ہو چکا ہے کہ قتل میں نے کیا ہے۔“ میں نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ ”آپ پولیس کو کٹلی فون کریں۔“

”نہیں میں نہیں کر سکتا۔“

”بیانی آپ کو میری قسم، اپنی مری ہوئی ماں کی قسم، زیادہ بحث مت کریں اور پولیس کو بلا لیں ورنہ میں بھی ایٹل ٹرے اپنے سر پر مار کے اپنی جان دے دوں گی۔“

ابو اس وقت تک اپنے کمرے میں بیٹھے رہے۔ وہ اوپر آنا چاہتے تھے لیکن خالد اور صائبر نے بہ مشکل تمام انہیں روکا۔

ڈاکٹر نے تیز تیز چلنے اور سڑکیاں چڑھنے سے بہت سختی کے ساتھ منع کیا تھا۔

اس وقت تک خالد بھی اوپر آچکی تھیں۔ ابو کے پاس صائمہ تھی۔

جب انہیں میرے فیصلے کا علم ہوا تو وہ بوکھلا کر پولیس۔

”عارف! تو اپنی جان کیوں مشکل میں ڈال رہی ہے راشد تو.....“

”خالد آپ چاہتی ہیں کہ میں اپنی جان بچاؤں اور بس یا

کی جان داد پر لگا دوں؟“

بسیا دور ان میں پتھر کے بت کی طرح ساکت اور جامد کھڑے تھے۔

”خالد آپ ابو کو کتنی طور پر تیار کریں ورنہ پولیس کو دیکھ کر انہیں شک لگے گا۔“

بھیانے پولیس کو ٹیلی فون کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد پولیس آگئی اور مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ پولیس نے آگنٹ یعنی وہ ایش ٹرے بھی قبضے میں لے لی۔

پھر سات مہینے تک مقدمہ چلتا رہا اور کورٹ نے اس قتل کو حادثہ قرار دے کر مجھے صرف پانچ سال کی سزا سنائی۔

دوسرے ہی مہینے مجھے ابو کے انتقال کی خبر ملی۔ ابو کی موت پر مجھے ایک دن کے لیے گھر جانے کی اجازت مل گئی۔

میں بسیا سے پلٹ کر اس بری طرح روئی کہ وہاں موجود لوگوں کے بھی آنسو بہہ نکلے۔ بلال تو یوں بنگ بنگ کر رہا تھا کہ جیسے اس کے سگے باپ کا انتقال ہوا ہو۔ بسیا بہت ضبط سے کام لے رہے تھے۔

ایک دن وہاں گزرنے کے بعد میں دوبارہ جیل پہنچ گئی۔

جیل میں سوائے بلال کے مجھ سے ملنے کوئی نہیں آتا تھا۔ میں نے خود ہی سب لوگوں کو منع کر دیا تھا۔

میں چونکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی اس لیے مجھے قیدی عورتوں کو پڑھانے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ دوسرا سال ہی گزرا تھا کہ اچھے چال چلن کے باعث میری سزا میں چھ مہینے کی تخفیف کر دی گئی۔

اس شام بلال مجھ سے ملنے آیا۔ وہ بہت اداس اور دل گرفتہ لگ رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ بسیا مکان بچ کر دوبارہ لندن چلے گئے۔

میرے دل کو دھچکا سا لگا۔ جس بھائی کی خاطر میں نے اتنی بڑی قربانی دی، اپنی زندگی تباہ کر لی اس نے میری داہنی کا انتظار بھی نہ کیا۔ وہ جاتے وقت مجھ سے مل تو سکتا تھا لیکن وہ

نہیں آیا۔

اس دن مجھے پھر بسیا سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ وہ خود غرض انسان میرا سنا بننے کی بجائے میرے سر کی چھت تک بچ گیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ ابھی جیل سے نکلوں اور راشد کو ہلاک کر دوں۔

ایک سال بعد نیک چال چلن کے باعث میری سزا میں پھر چھ مہینے کی تخفیف کر دی گئی۔

حرید چھ مہینے گزرے تھے کہ حکومت بدل گئی۔ نئے وزیراعظم نے ان لوگوں کی سزا معاف کر دی جن کی قید کی مدت دو سال یا اس سے کم تھی۔

یوں مجھے جیل سے رہائی کا پروانہ مل گیا۔

میں خالد کے گھر پہنچی تو وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

”عارف! کیا تم..... لیکن تمہاری سزا تو.....“

”ابھی پانی تھی“ میں نے ان کا جملہ پورا کر دیا۔

”لیکن مجھے رہائی مل گئی ہے۔“ میں خالد سے پلٹ کر رونے لگی لیکن یہ خوشی کے آنسو تھے۔

”میری خواہش تھی کہ اب اس شخص کو جو میرا بھائی کہلاتا ہے اپنے ہاتھوں سے قتل کر دوں، چاہے مجھے اس کے لیے لندن ہی کیوں نہ جانا پڑے۔“

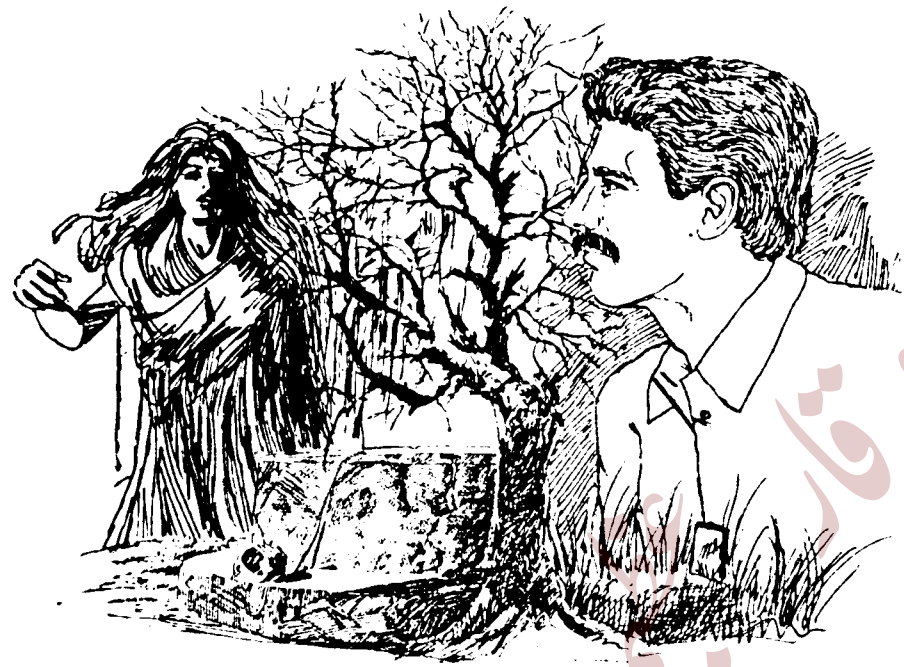
”بلال ہر قدم پر میرے ساتھ تھا۔ اس نے کہا کہ میں کسی نہ کسی طریقے سے راشد کو یہاں بلانے کی کوشش کروں گا۔ اگر وہ یہاں نہ آیا تو پھر ہم لندن چلیں گے۔ اسے زندہ تو میں بھی نہیں چھوڑوں گا۔“

میں نے ایک پرائیویٹ فرم میں جاب کر لی۔ سرکاری ملازمت تو اب مجھے مل نہیں سکتی تھی۔

کچھ دن کے بعد میں نے بلال سے شادی کر لی۔ مجھے حالات کی ستم ظریفی پر ہنسی آتی تھی۔ اس بلال کی خاطر راشد نے ابا سے گستاخی کی تھی۔ وہ بلال کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ اب میں ہر وہ کام کرنا چاہتی تھی جو راشد کو ناپسند ہو۔

بلال کی شخصیت تو بالکل ہی بدل گئی تھی۔ اس نے سارے برے کام چھوڑ دیے تھے اور اب ایک مل میں ملازمت کر رہا ہے۔

میں بھی ان دنوں کے جمیلوں سے اکٹا چکی ہوں اور سکون قلب کے لیے اللہ سے لو لگا لی ہے۔ میں ہر دم ایک ہی دعا کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ کسی بھی لڑکی کا مقدر مجھ جیسا نہ بنائے، کسی کو مجھ جیسا بے غیرت، خود غرض اور کینہ بھائی نہ ملے۔



گمشدہ

محترم معراج رسول
السلام علیکم

ارسال کردہ سچ بیانی میں کہیں بھی میں نے اپنی طرف سے کچھ بھی شامل نہیں کیا ہے۔ یقین کریں یہ بالکل سچا واقعہ ہے۔

اجمل
(ہارا چنار، کے پی کے)

میں یہ کہانی یقین اور بے یقینی کے درمیان لکھ رہا ہوں۔

کیا کسی کے ساتھ ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ لیکن میرے ساتھ ایسا ہوا اور سب کچھ گزر جانے کے بعد بھی مجھے احساس نہیں ہوا کہ کیا واقعی کچھ ایسا ہی تھا۔

میں اپنی کہانی کہاں سے شروع کروں۔ جہاں سے شروع کرنا چاہتا ہوں۔ وہیں سے ایک اور سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

میں نے مجھ کو کا سڑ کیا ہے۔ جی ہاں۔ محبت کبھی کبھی تیز رفتار سواری کی طرح ہو جاتی ہے جو اپنے ساتھ ساتھ بہانے لیے جاتی ہے۔ راستے میں طرح طرح کے مناظر آتے ہیں لیکن محبت کی گاڑی پر سوار مسافر کو یہ مناظر اپنی طرف متوجہ نہیں کر پاتے۔

میں محبت مگر کے جنگلات میں لکڑیوں کا ٹھیکدار تھا۔ باقاعدہ لائسنس یافتہ۔ ایک بات بتا دوں، میں نے کبھی کوئی کام غیر قانونی نہیں کیا۔

ہر ٹھیکدار کے لیے ایک خاص حد مقرر تھی۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ مجھے خود جنگلات میں جا کر کام کی نگرانی کرنی پڑتی تھی۔ ورنہ عام طور پر میرے کارندے ہی یہ کام کیا کرتے تھے۔

اچھا خاصا کام تھا۔ اچھی خاصی زندقہ گزر رہی تھی۔ شہر میں اپنا ایک قلعہ تھا۔ ایک گاڑی تھی۔ بینک بلیٹس تھا۔ شادی نہیں ہوتی تھی۔ البتہ میرے ساتھ میری ماں اور چھوٹا بھائی اکٹل رہتے تھے۔ میرا نام اجمل ہے۔ بس ہم دو ہی بھائی ہیں۔

زندگی میں محبت نام کی ایک چیز آئی تو کبھی لیکن بہت مختصر عرصے کے لیے۔ اس لیے یہاں اس کا ذکر ہی فضول ہے۔ اس کہانی کی ابتدا اس دن سے ہوتی ہے جب میں اپنے کام کی نگرانی کے لیے جنگلات کی طرف گیا تھا۔

میں نے شاید یہ نہیں بتایا ہے کہ اس جنگل میں ایک چھوٹا سا ریٹ ہاؤس بھی تھا جو ٹھیکداروں اور جنگلات کے مہدیداروں کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔

اس ریٹ ہاؤس میں محمد حسین نام کا ایک چوکیدار بھی تھا جس کا کوارٹر ریٹ ہاؤس کے عقب میں بنا ہوا تھا۔ میں جب بھی جاتا تھا محمد حسین خدمت گزار میں کوئی کسر اٹھانے نہیں رکھتا تھا۔

بارش کے دن تھے۔ میں عام طور پر ایسے موسم میں جنگل کی طرف جانے سے گریز کرتا ہوں لیکن ان دنوں کچھ ایسا کام آؤ کہ مجھے جانا پڑ گیا تھا۔

محمد حسین کو میں نے پہلے سے اطلاع دے رکھی تھی۔ اس لیے اس نے میرے لیے میرا پسندیدہ کرا صاف کرادیا تھا۔ اس شام بھی بنگی بارش ہو رہی تھی۔ محمد حسین نے بہت خوش دلی سے استقبال کیا تھا۔

”تم ٹھیک تو ہو محمد حسین۔“ میں نے پوچھا۔ میں اس کے لیے شہر سے مضامین لیتا گیا تھا۔ وہ بہت شوق سے مضامین لکھتا تھا۔ اسی لیے میں جب بھی جنگلات کی طرف جاتا۔ اس کے لیے ضرور لے لیتا تھا۔

”ہاں صاحب، سب ٹھیک ہے۔ مہربانی آپ کی۔“ میں نے مضامین کا ڈاہاس کی طرف بڑھا دیا۔ ”یہ لو، اپنا تحفہ۔“

وہ مضامین لے کر خوش ہو گیا تھا۔ ”آپ کی بڑی مہربانی جی۔“

”یہ بتاؤ، یہاں کے حالات تو ٹھیک ہیں نا؟“

”ہاں ویسے تو سب ٹھیک ہیں۔ لیکن کچھ دنوں سے ایک بھیڑیا اس طرف آنے لگا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”بھیڑیا؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔ ”لیکن محمد حسین، ان علاقوں میں تو بھیڑیے نہیں ہوتے۔“

”بھئی تو حیرانی کی بات ہے صاحب، ہر دوسرے تیسرے دن میرا مطلب ہے رات کے وقت سامنے آ کر دوڑتا رہتا ہے۔“

”کوئی نقصان تو نہیں پہنچاتا؟“

”نہیں صاحب، اس سے ابھی تک کوئی نقصان تو نہیں پہنچا ہے۔ ویسے بھی رات کے وقت ہم دروازے بند رکھتے ہیں۔“

”ریٹ ہاؤس میں تو لوگ رکتے ہوں گے۔“

”ہاں، صاحب آپ تو جانتے ہیں، کوئی نہ کوئی آتا ہی رہتا ہے۔ لیکن کبھی اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔“

”تو پھر چھوڑو اس کو۔ بس اپنی جگہ بچتا رہو۔“ محمد حسین کے ساتھ اس کی ایک بیوہ جو ان بیٹی بھی رہا کرتی تھی۔ اس کے شوہر کا کبھی حادثے میں انتقال ہو گیا تھا۔

کھانا اور ناشتا وغیرہ وہی بنایا کرتی تھی لیکن میں نے اسے آج تک نہیں دیکھا تھا۔

جنگل میں کام ہی کیا تھا۔ کام صبح سے شروع کرتا تھا۔ اسی لیے جلد ہی کھانا کھا کر بستر پر لیٹ گیا۔ رات دس بجے کے قریب بارش تیز ہو گئی۔

دینے آیا تھا بتانے آیا ہوگا۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ ایک لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔

ایک جھٹکا سا تھا۔ اتنی رات گئے۔ اس جنگل اور اتنی تیز بارش میں کسی اجنبی لڑکی کی آمد حیران کن ہی ہو سکتی تھی۔ وہ بھیجی ہوئی تھی۔ خوب صورت لڑکی تھی۔ بارش کے قطرے اس کے خوب صورت بالوں اور گالوں سے ہوتے ہوئے اس کے لباس پر گر رہے تھے۔ اس کے جسم پر لباس بھی

مقانی تھا۔

”کون ہو تم؟“ میں نے پوچھا۔

”میں بھیجی ہوئی ہوں۔“ اس نے کہا۔ اس کی آواز بھی بہت خوب صورت تھی۔

نہ جانے کیا معاملہ تھا اتنی رات گئے کسی اجنبی لڑکی کا کمرے میں آ جانا حیرت کی بات تھی۔ ایک لکڑی بچکانے کے بعد میں نے اسے اندر آنے کی اجازت دے دی۔

وہ اندر آ گئی۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ اس روشنی میں اس کا سراپا اب واضح طور پر سامنے آ گیا تھا۔ احساس ہوا کہ وہ ایک دلکش لڑکی ہے۔ سفید لباس میں اس کا بیگ ہوا جسم بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔ نہ جانے وہ کون سی اور کیوں آئی تھی میرے پاس۔

میں نے ایک طرف رکھا ہوا تو لیا اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”یہ لو، اپنے آپ کو خشک کرلو۔ ورنہ بیمار پڑ جاؤ گی۔“

”نہیں میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”میں تمہارے پاس ایک کام سے آئی ہوں۔“

اسی وقت ایک آواز سنائی دی۔ میں کرتی ہوئی بھیڑیے کی آواز۔ شاید یہ وہی بھیڑیا تھا جس کے بارے میں محمد حسین نے بتایا تھا۔ وہ مجھے پکار رہا تھا۔ ”صاحب، صاحب۔“

محمد حسین کی آواز سن کر وہ لڑکی چونکی ہو گئی۔ ”بابا آ رہا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اس کو میرے بارے میں کچھ مت بتانا۔“

اتنا کہہ کر وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ کمرے سے باہر اندھیرا تھا۔ وہ اسی اندھیرے کا حصہ بن گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد محمد حسین ایک ٹارچے لیے ہوئے داخل ہوا۔

”کیا ہوا صاحب، دروازہ کیوں کھلا ہے۔ روشنی کیوں ہو رہی ہے؟“

میں نے بتانا چاہا کہ کیا ہوا تھا کہ پھر اس لڑکی کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ بابا کو مت بتانا۔ وہ یقیناً مجھ سے کراچی ہو گی اسی لیے میں نے کہا۔ ”بابا، بھیڑیے کی آواز اُن کی تو

میں نے سوچا کہ دروازہ کھول کر دو کچھ لوں۔“

”نہیں صاحب، ایسا کبھی مت کرنا۔ یہ جنگلی جانور ہوتے ہیں۔ ان کا کیا بھروسہ ہوتا ہے۔ وہ بھیڑیا بہت دنوں کے بعد روایا ہے صاحب۔ آپ دروازہ بند کر لیں۔ میں جا رہا ہوں۔“

وہ مجھے کچھ ہدایات دے کر چلا گیا۔ بھیڑیا بھی اب نہیں رو رہا تھا۔ میں نے دروازہ بند کیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ بہت دیر تک میں اس کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔

محمد حسین کی بیٹی کے ساتھ ایسی کون سی رابلم آگئی تھی کہ وہ اس طرح رات کو اٹھ کر میرے پاس چلی آئی تھی جبکہ وہ مجھے جانتی بھی نہیں تھی۔

ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنے باپ سے میرا تذکرہ سن رکھا ہو۔ اس کے علاوہ تو اس سے اور کوئی تعلق نہیں تھا۔ خبر کسی نہ کسی طرح نیند آئی تھی۔

صبح دروازے پر دستک سے آنکھ کھلی۔ محمد حسین میرے لیے ناشتا لے آیا تھا۔ اس کے ساتھ جائے بھی تھی۔ فارغ ہو کر میں باہر آیا۔ بارش رک گئی تھی۔ جنگل بہت ٹھنڈا لگتا تھا۔

پرنندوں کی چپکارس ہر طرف گونج رہی تھیں۔ ذرا سی دیر میں ساری کوفت جیسے ختم ہو گئی تھی۔ حذر دور آ گئے تھے۔ ان کے ساتھ حد بھر کی مصروفیت رہی تھی۔

اندھیرا ہونے کے بعد ریٹ ہاؤس واپس آ گیا۔ محمد حسین نے میرے لیے چائے کے ساتھ ساتھ پراٹھے بھی تیار کر رکھے تھے۔

ہم بہت دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ اس وقت بھی یہی سوچا کہ اس کی بیٹی کے بارے میں معلوم کر لوں۔ پھر اس لڑکی کی بات یاد آئی۔ اسی لیے کچھ نہیں پوچھ سکا۔

اس رات بھی ایسا ہی ہوا۔ اس رات بارش نہیں ہوئی تھی۔ لیکن بارہ ساڑھے بارہ بجے بھیڑیے کے رونے کی آواز نے مجھے جگا دیا تھا۔

میں نے اٹھ کر کمرے میں روشنی کم کر دی۔ بھیڑیے کی آواز نے نیند غائب کر دی تھی۔ اس رات بھی دروازے پر دستک ہونے لگی کل رات کی طرح۔

میں نے جا کر دروازہ کھول دیا۔ محمد حسین کی بیٹی دروازے پر کھڑی تھی۔ آج وہ مجھ کے سے بھی زیادہ خوب صورت دکھائی دی۔ خدا جانے اس کے ساتھ کیا معاملہ تھا کہ وہ

جون 2017ء

گزشتہ دوراتوں سے میرے پاس آ رہی تھی۔
”میں اندر آ جاؤں؟“ اس نے پوچھا۔
”دیکھو، تمہارا اس طرح آنا اچھا نہیں لگتا۔“ میں نے کہا۔

”کیوں؟“
”تم محمد حسین کی بیٹی ہو۔ وہ ایک شریف آدمی ہے۔ اسے یہ دیکھ کر دکھ ہوگا کہ اس کی بیٹی رات کے وقت کسی اجنبی کے کمرے میں ہے۔“
”تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں محمد حسین کی بیٹی ہوں؟“ وہ ایک عجیب لہجے میں بولی۔
”کیوں؟ کیا تم اس کی بیٹی نہیں ہو؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

اس دوران وہ میری اجازت کے بغیر نہ صرف اندر آ چکی تھی بلکہ اس نے دروازہ بھی بند کر دیا تھا۔
”تو پھر تم کون ہو؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔
”ایک مظلوم۔“ وہ کمرے میں آ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ ”مظلوم ہوں میں۔ اور تم سے مدد مانگنے آئی ہوں۔“
”بتاؤ، میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟“
”سپیل یہ بتاؤ، میں کیسی ہوں؟“

وہ کھڑی ہوئی۔ اس وقت وہ کسی خوب صورت پیشنگ کی طرح دلکش دکھائی دے رہی تھی۔ آج وہ پوری طرح میرے سامنے تھی۔ اپنی رعنائیوں کے ساتھ۔
”بتاؤ نا، میں کیسی ہوں؟“ اس نے دوبارہ پوچھا۔
”تم بہت خوب صورت اور دلکش ہو۔“ میں نے اس کی تعریف کی۔

”کیا میں اس لیے ہوں کہ کوئی مجھے ٹکڑے کر کے پھینک دے؟“ اس نے کہا۔ ”کوئی بہت بے رحمی سے مار دے مجھے؟“
”نہیں تو۔ تمہارے ساتھ ایسا سلوک نہیں ہونا چاہیے۔“

”تو پھر وہ لوگ مجھے کیوں مارنا چاہتے ہیں؟“ اس نے کہا۔ ”میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کرنا چاہتے ہیں۔“
”تم کن لوگوں کی بات کر رہی ہو؟“

”وہی جو میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”میں اسی لیے تو تم سے مدد مانگ رہی ہوں۔“
”کون لوگ ہیں وہ۔ کہاں رہتے ہیں اور خود تم کون ہو؟“

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی۔ اسی منوں بھیڑے کے روئے کی آوازیں آنے لگیں۔ اب شاید وہ روزانہ آنے لگا تھا۔ اس آواز کون کر رہی تھی۔ ”مجھے ڈر لگا ہے اس سے۔“ اس نے کہا۔ ”میں جا رہی ہوں۔“
”غمر ہو، کہاں جا رہی ہو۔ وہ تمہیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔“

”نہیں، میں دوسری طرف سے نکل جاؤں گی۔“ اس نے کہا۔ ”وہ مجھ تک پہنچ نہیں سکے گا۔“
وہ دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ محمد حسین کی بیٹی کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اتنی خاموشی سے میرے کمرے میں آنا، پھر تیزی سے باہر نکل جانا، ظاہر ہے کہ وہ بھیڑیے کی لگا ہوں سے بچ کر اپنے کوارٹر میں گئی ہوگی۔

شاید اسے یہ اندیشہ ہوگا کہ اس کا بابا بھیڑے کی آواز سن کر کوارٹر سے باہر نہ نکل آئے۔ اسی لیے وہ فوراً چلی گئی تھی۔ لیکن کیوں؟ وہ یہ کیوں کیوں کھیل رہی تھی؟ اس نے یہ کیوں کہا تھا کہ کچھ لوگ اسے مار دینا چاہتے ہیں۔ اس کے ٹکڑے کر دینا چاہتے ہیں۔ اگر یہ کسی قسم کا مذاق تھا تو وہ پھر ایسا مذاق میرے ساتھ کیوں کر رہی تھی۔

میں نے کمرے کی لائٹ بند کی اور بستر پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر کے بعد نیند آ گئی۔ صبح دستک کی آواز سے آنکھ کھل گئی تھی۔ دروازہ کھولا تو ایک لڑکی ہاتھ میں ٹرے لیے کھڑی تھی۔

”آج بابا کچھ بیمار ہیں صاحب، اس لیے میں ناشتا لے کر آئی ہوں۔“

”لیکن تم کون ہو؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔
”چوکیدار محمد حسین کی بیٹی ہوں جی۔“ اس نے بتایا۔
میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ یہ وہ لڑکی تو ہرگز نہیں تھی جو رات کے وقت میرے پاس آیا کرتی تھی۔ وہ تو کوئی اور تھی۔

محمد حسین کی بیٹی گرچہ جوان ہی تھی لیکن وہ ایک عام سی عورت تھی۔ اس میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی جبکہ رات کو آنے والی لڑکی ہر لحاظ سے مختلف تھی۔

خدا جانے کیا پھر تھا۔ ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ محمد حسین کی اور بھی بیٹیاں ہوں۔ اس نے صرف ایک بیوہ بیٹی کا ذکر کیا تھا جو اس وقت ناشتے کی ٹرے لے کر میرے سامنے کھڑی تھی۔
”اسے کا شکر یہ ادا کر کے اس سے ٹرے لے لی۔“

ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر میں محمد حسین کے کوارٹر کی طرف چلا گیا۔ تاکہ اس کی خیریت دریافت کر سکوں۔
اس کو ہلکا سا بخار ہو گیا تھا اس نے پوچھا۔ ”صاحب! آپ کو ناشتا تو وقت پر مل گیا تھا نا؟“
”ہاں ہاں، وقت پر مل گیا تھا۔ محمد حسین یہ بتاؤ تمہاری کتنی بیٹیاں ہیں؟“

”صرف ایک ہے صاحب۔“ اس نے کہا۔ ”آپ کو بتایا تھا نا، وہ جو بیوہ ہے۔ جو آپ کا ناشتا لے کر گئی تھی۔ لیکن آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں صاحب؟“
”یوں ہی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اچھا اب میں چلا ہوں، شام تک واپس ہوگی۔“

شام کو واپس آ کر کہاں کہ جب فارغ ہوا تو اس وقت تک اندھیرا ہو گیا تھا۔ یہاں کرنے کے لیے اور کوئی کام ہی نہیں تھا۔ اسی لیے کھانے سے فارغ ہو کر کچھ دیر تک محمد حسین سے کپ شپ کرتا۔ اس کے بعد سو جاتا۔
رات کا کھانا محمد حسین خود ہی لے کر آیا تھا۔

”اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟“ میں نے پوچھا۔
”ٹھیک ہوں صاحب، اسی لیے تو آ گیا ہوں۔“ اس نے بتایا۔ پھر کچھ رک کر بولا۔ ”صاحب، آپ نے یہ کیوں پوچھا تھا کہ میری کتنی بیٹیاں ہیں۔ کیا کوئی بات ہو گئی ہے صاحب؟“

”نہیں تو۔“ میں نے محمد حسین کو بتانا مناسب نہیں سمجھا۔ ”بس یوں ہی پوچھ لیا تھا۔“

”صاحب! وہ چاروںوں سے وہ بھیڑیا روزانہ آنے لگا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”پہلے بھی آتا تھا لیکن روزانہ نہیں۔ دوسرے تیسرے دن۔ لیکن اب تو روزانہ آتا ہے۔ خدا خیر کرے۔ خطرناک جانور ہے صاحب، ڈری لگا رہتا ہے۔“
”ہاں یہ بات تو ہے۔ خیر، سوچتا ہوں اس کا کیا بندوبست کیا جائے۔“

کچھ دیر بعد وہ برتن وغیرہ لے کر چلا گیا۔ کچھ دیر کے بعد میں بھی بستر پر لیٹ گیا تھا۔ وہ محمد حسین کی بیٹی نہیں تھی تو پھر کون تھی۔ اس جھگ میں تو اس پاس کوئی آبادی بھی نہیں پھر وہ کہاں سے آئی تھی؟ اور کیوں آئی تھی؟

اس رات وہ پھر آ گئی۔
وہ بارہ کے بعد ہی آیا کرتی تھی لیکن اس رات خلاف معمول بھیڑیے کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ صرف دستک ہو گئی تھی۔ وہ دروازے پر کھڑی تھی۔

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے براہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

برسر کا نیڈا آئرن پیل اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کتنی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجتا شروع کر دیں گے۔

آپ کی طرف سے پلائے جانے والے پتے پر بھیج سکتے ہیں

یہ دن ملک سے قارئین صرف وہ سنز یونین یا مٹھی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر ہماری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: عمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

021-35802551 فون 021-35805313 فکس

اسی لباس میں۔ اسی پوری دل کشی کے ساتھ۔

میں نے ایک طرف ہٹ کر اندر اسے راستہ دے دیا۔ وہ کرسی پر آکر بیٹھ گئی۔ اس رات میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں اس کا راز معلوم کر کے رہوں گا۔ آنکھ بچولی کے اس محفل کو ختم ہو جانا چاہیے تھا۔

”سنو، آج تم اپنے بارے میں بتاؤ گی۔“ میں نے کہا۔ ”سب کچھ۔“

”میں اسی لیے تو آئی ہوں۔“ وہ میرے سے بولی۔ ”اور آج تمہیں میری مدد بھی کرنی ہے۔“

”وہی تو پھر ہاں کہہیں کیسی مدد چاہیے۔“

”تم مجھے دفن کرو۔“ اس نے کہا۔

”کیا؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا کہہ دی ہو، کہیں دفن کرو دو؟“

”ہاں دفن کرو۔“ اس نے کہا۔ ”جہیں خدا کا واسطہ۔ مجھے دفن کرو۔ مجھے کوئی دفن نہیں کرتا۔ تم ہی کرو۔ تمہاری مہربانی ہوگی۔“

”سنو، تم شاید اپنے ہوش میں نہیں ہو۔ بہتر یہی ہے کہ تم اپنے گھر جاؤ۔“

”میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ میرا گھر وہی قبر ہوگی جس میں تم مجھے دفن کرو گے۔“

”دیکھو، تم ایسی باتیں کرو گی تو میں ڈر کر بے ہوش ہو جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

”نہیں، خدا کے لیے نہیں۔“ اس نے اپنے ہاتھ جوڑ لیے۔ ”پہلے بھی کچھ لوگ اسی طرح ڈر کر بھاگ گئے تھے۔ انہوں نے مجھے دفن نہیں کیا۔ بہت دنوں بعد تم آئے ہو۔ اگر تم نے بھی میری بات نہیں مانی تو نہ جانے کب تک بھٹکتی رہوں گی۔“

”واہ۔“ میں ہنس پڑا۔ ”تم تو اس طرح کہہ دی ہو جیسے تم..... کوئی روح ہو۔ جو بھٹکتی پھر رہی ہے۔ بالکل غلوں کی طرح۔“

”ہاں، میں مر چکی ہوں اور بھٹکتی پھر رہی ہوں۔ یقین نہیں آتا نا۔“ اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ ”لو، اسے چھو کر دیکھو۔“

میں نے اس کے بڑے ہوئے ہاتھ کو چھوا اور ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گیا۔ وہ ہاتھ خندا تھا۔ اتنا خندا کہ غیر فطری محسوس ہو رہا تھا۔ ایسی خندا کا احساس مجھے پہلے کبھی نہیں ہوا ہوگا۔

میں سن ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ کیسی کہانی تھی۔ کون تھی یہ لڑکی۔ شاید لاش ہی تھی۔ زندہ انسان کا جسم اتنا غیر فطری طور پر خندا ہو ہی نہیں سکتا۔

میں بری طرح خوف زدہ تھا۔ ریڑھ کی ہڈی تک میں خوف کی لہر نے اتر کر پورے جسم کو کر دیا تھا۔

”تم بھی خوف زدہ ہو گئے۔“ اس نے کہا۔ ”تم بھی میرا کام نہیں کرو گے؟ کیا مجھے کسی سکون نہیں ملے گا؟“

بہت مشکل سے میں نے اپنے اوسان کو قابو میں کیا۔ وہ چاہے جو بھی ہو، اس نے اب تک مجھے نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ بلکہ مجھے مدد کی درخواست کر رہی تھی۔

”بتاؤ، میں کس طرح تمہیں دفن کر سکتا ہوں؟“ میں نے پوچھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس وقت میری آواز کانپ رہی تھی۔

اسی جنگل میں ایک پرانا کنواں ہے۔ صدیوں پرانا۔ اس کے پاس گرد گد کا ایک بہت بڑا درخت ہے۔ میری لاش اسی درخت کے پاس پڑی ہوئی ہے۔ اس کو دفن کرو۔ بس میں تم سے یہی چاہتی ہوں۔“

مجھے ایک بات یاد آگئی۔ ”دیکھو، اگر تم واقعی مر چکی ہو۔ ایک بھٹکتی ہوئی روح ہو تو پھر یہاں کے چوکیدار کو بابا کیوں کہا تھا؟“

”اس لیے کہ میں یہاں مدد مانگنے کئی بار آ چکی ہوں۔“

اس نے بتایا۔ ”پہنچاتی ہوں اس کو۔“

”لیکن تمہارا نام کیا ہے؟“

”اب تو کوئی نام نہیں ہے، جب زندہ تھی اس وقت صنفی کہلاتی تھی۔“ اس نے بتایا۔ ”اب بتاؤ، کیا میرا کام کرو گے؟“

”کیا میں کسی اور کی بھی مدد لے سکتا ہوں؟“ میں نے پوچھا۔ ”یہ کام مجھے اکیلے کرنا پڑے گا؟“

”تم جس کی بھی مدد لے سکتے ہو لے لینا۔ مجھے تو بس سکون چاہیے۔ بہت بے حشری ہو رہی ہے میری لاش کی۔ جنگلی جانور اسے لوچے رہے ہیں۔ حالانکہ اب کچھ بھی نہیں بچا پھر بھی۔“

”ٹھیک ہے، میں تمہارا یہ کام کروں گا۔“ میں نے ایک عزم کے ساتھ کہا۔

”پھر مجھے سکون مل جائے گا، اب میں چلتی ہوں۔“

میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کمرے سے باہر نکل اور اندر میرے میں نہیں غائب ہوئی۔ پتا نہیں میں کوئی خواب

دیکھ رہا تھا یا یہ سب کچھ حقیقت تھی۔

مجھے کبھی حقیقت اور وہ ہے کی سرحدیں ایک دوسرے کے اتنی قریب آ جاتی ہیں کہ کچھ بھی پتا نہیں چلے۔ اس رات جو کچھ اس لڑکی نے بتایا تھا اگر وہ سچ تھا تو پھر واقعی بہت حیرت انگیز تھا۔

ظاہر ہے اس رات بہت دیر تک مجھے نیند نہیں آ سکی تھی۔

دوسری صبح محمد حسین ہی میرے لیے ناشتا لے کر آیا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے محمد حسین سے پوچھا۔ ”یہ بتاؤ، کیا اس جنگل میں کوئی پرانا کنواں بھی ہے؟“

”ہاں صاحب، وہ جہر جھاڑیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کی دوسری طرف ایک میدان ہے۔ وہ کنواں اس میدان میں ہے لیکن اس طرف کوئی جاتا نہیں ہے۔“

”وہ کیوں؟“

”صاحب کہتے ہیں کہ اس طرف ایک روح بھٹکتی رہتی ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”بہت سے لوگوں نے دیکھا ہے اس کو۔“

”کس کی روح؟“ میں نے پوچھا۔

”کیا بتاؤں صاحب، بہت پرانی کہانی ہے۔ کچھ لوگوں نے ایک لڑکی کا خون کر کے اس کی لاش کنویں میں پھینک دی تھی۔ بہت دنوں پہلے کی بات ہے۔ شاید اس وقت میں بچ تھا۔“

”کیا نام تھا اس بے چاری کا؟“ میں نے پوچھا۔

”صنفی نام تھا صاحب، میں نے اسے بچپن ہی سے یہ کہانی سن رکھی ہے۔ وہ بہت خوب صورت لڑکی تھی۔“

میں ابھی ہوئی نگاہوں سے محمد حسین کی طرف دیکھتا رہا۔ صنفی، یہی نام اس لڑکی نے بھی بتایا تھا۔ میرے خدا، یہ سب کیسا عجیب تھا۔ کیا وہ واقعی اپنی قبر کے لیے بھٹکتی پھر رہی تھی۔

”بات کیا ہے صاحب، آپ اس کے لیے کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

”محمد حسین، میں جو کچھ کہوں کیا جہیں اس پر یقین آجائے گا؟“

”کیوں نہیں آئے گا صاحب۔“

”محمد حسین، اس لڑکی کی روح میرے پاس آتی ہے۔“

میں نے بتایا۔

”کیا؟“ محمد حسین کا تو رنگ ہی اڑ گیا تھا۔ ”یہ آپ کیا

سبح کی تلاش

حبیب اللہ کلانی کا کل کے نزدیک ”شمالی“ کے رہنے والے تھے۔ وہ تاجک برادری سے تعلق رکھنے والے اور اپنے علاقے کی بااثر شخصیت تھے۔ اس وقت (1929ء) میں افغانستان پر امان اللہ کی بادشاہت تھی۔ امان اللہ مغربی ثقافت سے بہت متاثر تھے۔ یہ وہی زمانہ تھا جب ترکی میں اتاترک مغربی اصلاحات و ثقافت نافذ کرنا چکے تھے۔ امان اللہ نے بھی انہیں نافذ کرنا چاہا۔ ترک عوام نے چار و ناچار حکومتی اقدام قبول کر لیے لیکن افغان عوام اپنی اسلامی اقدار کے سامنے سیدہ پھر ہو گئے۔ کامل میں افغانی ریشم کی لہر اُٹھی اور آٹا فانا تمام ملک اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ امان اللہ کی فوج کا ایک بڑا حصہ بھی اس کا ساتھ چھوڑ گیا۔

جلد ہی یہ طوفان ”شمالی“ تک پہنچ گیا۔ افغانی ہمیشہ سے قبائل اور گروہوں کی صورت میں رہے اور اپنے سردار یا چڑکے کا فیصلہ مانتے ہیں۔ یہ صورت حال اب تک برقرار ہے۔ شمالی میں حبیب کلانی اپنے قبیلے کا ایک مضبوط اور بہادر سردار تھا۔ تمام متحارب گروہ اپنے سرداروں کی سرکردگی میں بادشاہ امان اللہ کے خلاف متحد ہو گئے۔ جب حالات قابو سے باہر ہونے لگے تو امان اللہ اپنا تخت اپنے بھائی عنایت اللہ کے سپرد کر کے کامل سے فرار ہو گیا۔ کچھ روایات کے مطابق ان متحارب گروہوں کے سرداروں کی طرف سے نئے بادشاہ عنایت اللہ کو خط بھیجا گیا کہ یا تو وہ امان اللہ کی نافذ کردہ نام نہاد اصلاحات واپس لے لے یا پھر جنگ کے لیے تیار ہو جائے۔ وہ خط کے جواب میں تخت ہی سے دست بردار ہو گیا۔ ان متحارب گروہوں میں سب سے مضبوط سردار حبیب اللہ تھے لہذا منتقد طور پر انہیں حکومت کے لیے منتخب کیا گیا۔ حبیب اللہ بادشاہت کے نظام کے خلاف تھا اس لیے اس نے خادم الدین رسول اللہ نازی حبیب اللہ کو ہلاک کر دیا۔ بعد ازاں نازی شاہ نے طاقت اٹھائی کہ حبیب اللہ اور ان کے ساتھیوں نے حکومت چھین لی۔ ان پر بغاوت اور ان کے الزامات لگا کر پھانسی دے دی اور تمام باغیوں سمیت ایک گڑھ میں جھینکوا دیا۔

مرسلہ: خلیب اللہ۔ پشاور

ایک موقع

جناب مدیر اعلیٰ
آداب عرض

میں سرگزشت ہنر شوق سے پڑھتا ہوں۔ پڑھتے ہوئے ہی مجھے یہ خیال آیا کہ مجھے بھی لکھنا چاہیے۔ اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد آیا تو اسے میں نے لکھ لیا اگر آپ کو پسند آجائے تو اسے بھی شامل اشاعت کر لیں۔

محمد محسن
(لاہور)



متین نے مجھ سے بے چینی سے ہاتھ ملے ہوئے کہا ”بھئی... ہمیں پانچ سو روپے کی اضطرورت ہے۔“
”ہمیں؟... یعنی تمہیں؟“ میں نے سچ کی۔
”میں نے غلطی سے مجھے دیکھا۔“ یہ دوستی میں میرا تیرا کام کیے کئی سال ہو گئے تھے۔ مکمل والوں اور خاندان والوں

کھڑے تھے جن کو اس نے کبھی پہن رکھا ہوگا۔ ایک ڈھانچا تھا۔ جس کے بازو اور پیروں کی ہڈیاں شاید جنگلی جانور چبا گئے تھے۔

محمد حسین نے بلند آواز میں کلمے کا ورد شروع کر دیا۔ حضرت کا مقام تھا۔ انسان بھی کیا ہوتا ہے۔ جب وہ زندہ ہوگی تو کئی انگلیوں سے بھری ہوئی ہوگی۔ کیسی کیسی خوب صورت خواہشات اس کے ساتھ ہوں گی۔ لیکن اب وہ کہانی کچھ بھی نہیں۔

اس کا کاسہ سر پہنچ چک کر کہہ رہا تھا۔ ”میں بھی کبھی کسی کا سر پر غرور تھا۔“

ہم نے جلدی جلدی اپنا کام شروع کر دیا۔ پہلی بار ایسا معاملہ درپیش ہوا تھا۔ پہلی بار کسی کی قبر کو دی پڑ رہی تھی۔ اور وہ بھی اس کی جس کو اس دنیا سے گزرے برسوں ہو چکے تھے۔ کیسی عجیب بات تھی۔

مٹی زیادہ سخت نہیں تھی۔ اسی لیے ہم نے ایک گھنٹے میں ایک قبر کو دی لی تھی۔ محمد حسین کام کے دوران کلمے کا ورد کیے جا رہا تھا۔

قبر مکمل ہو گئی تو ہم نے اس کی باقیات مع چوڑیوں کے اس قبر میں ڈال کر اس کو پتھروں سے اور مٹی سے بھر دیا۔ نشان کیا ہونی چاہیے۔ وہ بے چاری تو بے نشان ہو گئی تھی۔ ہم بہت دیر تک وہاں کھڑے ہو کر فاتحہ خوانی کرتے رہے۔ اس کی روح کے سکون کے لیے دعائیں مانگتے رہے، پھر واپس چلے آئے۔

وہ رات بہت بے چینی کی تھی۔ ایک خدشہ لگا ہوا تھا کہ شاید وہ آجائے۔ شاید آجائے۔ لیکن وہ نہیں آئی۔ میں حریہ چار دن اسی ریسٹ ہاؤس میں رہا تھا۔ لیکن وہ دوبارہ نہیں آئی۔ شاید اس کی روح کو سکون مل چکا تھا۔ وہ اپنی منزل تک پہنچ چکی تھی۔

کئی برس گزر گئے۔ لیکن یہ سب کچھ یاد ہے۔ مجھے۔ اور میں یہ کہانی لکھتے ہوئے سوچ رہا ہوں کہ اس زندگی میں بھی کیسے کیسے بید ہوا کرتے ہیں۔

میرا تو اب اس طرف جانا نہیں ہوتا۔ محمد حسین کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔ لیکن اگر آپ میں سے کوئی اس طرف جانے اور پرانے کوئیں کے پاس برگد کے سائے تلے اس کی قبر دکھائی دے جائے تو ایک بار وہ فاتحہ ضرور پڑھ لے۔

خدا ہم سب کو ایسی آزمائشوں سے محفوظ رکھے۔ آمین۔



کہہ رہے ہیں صاحب؟“
پھر میں نے محمد حسین کو ساری کہانی سنا دی۔ وہ بے چارہ بہت دیر تک اپنے کانوں کو ہاتھ لگا کر اللہ، اللہ کرتا رہا تھا۔

”محمد حسین، اس نے مجھے بتایا ہے کہ اس کی باقیات کنویں کے پاس ایک درخت کے نیچے بھری ہوئی ہیں۔ وہ ایک مسلمان اور مظلوم لڑکی تھی محمد حسین۔ اس کی روح بے چین ہو رہی ہے۔ اس نے ہم سے مدد مانگی ہے۔ اب یہ ہمارا فرض بنتا ہے کہ اس کو اس کی قبر دے دیں۔ یہ ثواب کا کام ہوگا۔“

”ہاں صاحب۔ یہ واقعی ثواب کا کام ہوگا۔ اللہ اس کی مغفرت کرے اور اس کی روح کو سکون مل جائے۔ ہم چلیں گے صاحب۔ میں گیتی اور چھاؤں بھی لے لوں گی۔“

”ہاں، صاحب، اس کو نہیں بتاؤں گا۔ اچھا ہے صاحب۔ یہ نیکی کا کام جتنی جلدی ہو جائے۔ آپ تیار ہو جائیں صاحب، میں ابھی آتا ہوں۔“

محمد حسین پندرہ منٹ ہی میں واپس آ گیا۔ وہ اپنے ساتھ قبر کو ہونے کے لیے گیتی اور کدال وغیرہ بھی لیتا آیا تھا۔ میں نے وہ دن اس لڑکی کی بے چین روح کے لیے وقت کر دیا تھا۔ آج مجھے اپنے کام پر نہیں جانا تھا۔ راستہ واقعی بہت دشوار تھا۔ کانٹے دار جھاڑیوں سے بھرا ہوا۔ محمد حسین نے بیلے لے رکھا تھا جبکہ کدال میرے پاس تھا۔ ہم اب ہی دو اوزاروں سے جھاڑیاں صاف کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔

پھر ایک ایسی جگہ آ گئے جہاں وہ پرانا کواں موجود تھا۔ وہ تو خجائے کب کا خشک ہو چکا ہوگا۔ اس کے آس پاس بھی کانٹے دار جھاڑیاں تھیں اور دیگر پودے تھے۔

بہت ہی پرہیز مقام تھا۔ جیسے ہم بھوتوں کی بھری میں آ گئے ہوں۔ اس دور کے کسی پڑھنے والے کو یہ سب بہت عجیب لگ رہا ہوگا۔ کچھ دنوں میں پڑ گیا تھا۔ آج کل ایسی باتیں کہاں ہوتی ہیں۔ لیکن آج کل بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بہت سوں کو ان واقعات کا سامنا نہ کرنا پڑا ہو۔ جس درخت کی شانہ ہی اس لڑکی کی روح نے کی تھی، وہ اس کوئیں سے ذرا فاصلے پر تھا۔

برگد کا ایک پرانا اور عظیم الشان درخت جس کی مہیب واڑھیاں نیچے کی طرف لٹک آئی تھیں اور درخت کے آس پاس کچھ چیزیں بھری ہوئی تھیں۔

سونے کی دو عدد چوڑیاں تھیں۔ اس لباس کے

کی متین کے بارے میں مشترکہ رائے تھی کہ انہوں نے اتنا ہوشیار بچہ آج تک نہیں دیکھا تھا۔ اس کی ہوشیاری کا ایک ثبوت یہ بھی تھا کہ اس نے دوستی کے لیے مجھے منتخب کیا جس کے بارے میں مجھے اور خاندان والوں کی مشترکہ رائے تھی کہ انہوں نے مجھ سا وہ بچہ نہیں دیکھا۔ جب میں دوسری کلاس میں تھا تو ہماری ہائی جین کی ٹیچر نے ہمیں پڑھاتے ہوئے کہا۔ ”بعض بیماریاں موروثی ہوتی ہیں کیونکہ ان بیماریوں کے جین ہمارے اندر ہوتے ہیں۔ جیسے شوگر اور دل کے امراض۔ کچھ بیماریاں بچپن میں لاحق ہو جاتی ہیں جیسے پولیو اور پھلوں کا وائرس۔“

تو مجھے جو بیماری بچپن میں لاحق ہو گئی تھی اس کا نام متین تھا۔ نام سے ایسا لگتا تھا جیسے وہ کوئی بیماری بھرم آدمی ہو جس کی دونوں طرف لگتی ہوئی لمبی سوجھیں ہوں۔ لیکن حقیقت میں متین دلا سا اور کسی قدر لباڑا تھا جو صرف تیرہ سال کا تھا لیکن اس کے سر میں بڑے آدمیوں کی سی چالاکی بھری ہوئی تھی اور یہ چالاکی اگلے کو بے تاب رہا کرتی تھی اس لیے ہر وقت کسی نہ کسی فکر میں رہا کرتا تھا۔ میں اس سے صرف ایک سال چھوٹا تھا لیکن چالاکی کے معاملے میں خاصا چھوٹا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہ لیا جائے کہ میں کوئی اتحق لڑکا تھا۔ اس کے برعکس میں اپنی عمر کے دوسرے لڑکوں سے ہوشیار تھا۔ ہاں متین کے سامنے غفلت کتب تھا۔

متین مجھ سے ایک سال بڑا تھا لیکن اسکول میں وہ مجھ سے دو درجے آگے تھا اور وہ آٹھویں کلاس میں پہنچ گیا تھا جب کہ میں ابھی چھٹی کلاس میں تھا۔ وہ پڑھنے میں بہت تیز تھا اور اس وجہ سے اساتذہ کا منظور نظر تھا۔ میں اوسط درجے کا طالب علم تھا جو مشکل سے کسی کی نظر میں آتا ہے۔ یہی حال بچوں میں مقبولیت کا تھا۔ متین کی چالاکیوں کی وجہ سے اسے اسکول کے سارے بچے اچھی طرح جانتے تھے کیونکہ وہ کبھی نہ کبھی اس کی چالاکی کا نشانہ بن چکے تھے۔ جب کہ مجھے میں فی صد یہ بھی نہیں جانتے تھے اور میں فی صد بھی اس لیے جانتے تھے کہ میں متین کا دوست مشہور تھا۔

متین ہمارے گھر کی پیچھے والی گلی میں رہتا تھا لیکن اس کے مکان کی پشت ہمارے مکان کی پشت سے ملی ہوئی تھی اس لیے ہم آسانی سے ایک دوسرے سے مل سکتے تھے بلکہ یہ کہنا درست ہو گا کہ دوستی کے بعد میں ہر وقت متین کو دستاویز رہتا تھا۔ صرف بیک یا رڈ میں آکر مجھے پکارنا پڑتا تھا۔ متین میں ایک خوبی اور تھی۔ اسے اپنے اہلک کی بہت فکر

رہا کرتی تھی۔ اس کی ذات پر کسی وجہ سے حرف آئے یہ اسے کسی صورت گوارا نہیں تھا چاہے اس کے لیے اسے کوئی بھی قربانی کیوں نہ دینی پڑے اور عام طور سے یہ قربانی مہری صورت میں ہوتی تھی۔

جب متین نے مجھے دوستی کے لیے منتخب کیا تو اس نے اسی وقت طے کر لیا تھا کہ ہمارا نفع نقصان مشترک ہو گا۔ اس نے وضاحت کی۔ ”آدی کو دوستی میں نفع نقصان نہیں دیکھنا چاہیے صرف دوست کو دیکھنا چاہیے۔“

اس کی بات عملی طور پر یوں درست ثابت ہوئی تھی کہ اسے کبھی نقصان کا منہ نہیں دیکھا پڑا تھا اور جیسے مجھے اس کی دوستی میں نفع کم نصیب ہوا تھا۔ بہر حال بعض بیماریوں کی طرح دوستی بھی ایک ہمیشہ رہنے والی چیز ہے چاہے آپ اسے پائیداری کیوں نہ کرتے ہوں۔ جیسے لوگ سچ کافی کے عادی ہو جاتے ہیں یا شرابی ہو جاتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں یہ ان کو نقصان کرتی ہے۔

میں اور متین متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کا باپ کارپینٹر تھا اور میرا باپ ایک کارخانے میں مشین میں تھا۔ ہماری مائیں گھریلو عورتیں تھیں۔ میری دو چھوٹی بہنیں اور ایک بڑا بھائی تھا۔ متین کا ایک چھوٹا بھائی اور دو بڑی بہنیں تھیں۔ ہم متوسط سے ملاتے میں رہتے تھے جہاں بچوں کے لیے کھیل کے میدان کم تھے اس لیے ہم اپنے گھروں کے سامنے بڑی سڑکوں پر کھیلنے تھے۔ البتہ جیسے ہی کوئی پولیس کار نظر آتی ہم سڑک سے ہٹ کر فٹ پاتھ یا گھر کے لان میں آ جاتے۔ بڑک پر کھینا جرم تھا اور پولیس ان بچوں کے ہاں باپ کو پکڑ کر لے جاتی تھی جو سڑکوں پر کھیلنے تھے۔ ہم صبح اسکول جاتے، دوپہر تک واپس آتے، کھانا کھاتے اور ہوم ورک کر کے کھیلنے کے لیے باہر نکل جاتے اس وقت ہماری مائیں صبح سے کام کر کے کھانے کے بعد اپنے بیڈروم میں بے خبر سو رہی ہوتی تھیں اور بہن بھائی اپنے مشاغل میں مصروف ہوتے تھے اس لیے ہمیں روکنے والا کوئی نہیں ہوتا تھا۔

مجھے اور متین دونوں کو روزانہ ایک روپیہ جیب خرچ ملتا تھا جو دو سال پہلے تک ہمارے لیے کافی ہوتا تھا لیکن اس کے بعد بالکل ناکافی ہو گیا تھا اس لیے ہم نے اپنے اپنے گھروں میں گزارش کی کہ ہمارے جیب خرچ میں اضافہ کیا جائے لیکن یہ درخواست بعض دلائل کے ساتھ رد کر دی گئی۔ اوک تو ایک روپیہ بالکل کافی ہوتا ہے۔ دوسرے اگر ہمارے جیب خرچ میں اضافہ کیا گیا تو دوسرے بہن بھائیوں کے جیب خرچ میں

اضافہ کرنا پڑے گا یوں ڈیڑی پروزانہ کم سے کم چار روپے کا اضافی خرچ پڑ جائے گا جو مجھے میں ایک سو میں روپے بنا ہے اور یہ خاصی موٹی رقم ہوتی ہے۔ تیسرے ہم دونوں دس سال سے اوپر ہو چکے تھے اس لیے ہمیں اضافی اخراجات پورے کرنے کے لیے خود بخود کچھ ہاتھ پاؤں ہلانے چاہئیں۔

درخواست کی نامنظوری کے بعد ہم باہر ملے تو ہم نے تبادلہ خیال کیا تھا کہ اضافی اخراجات کس طرح پورے کیے جائیں۔ یہ بتانا تو میں بھول گیا کہ ہم اپنا جیب خرچ مل کر خرچ کرتے تھے۔ یعنی اس سے کوئی ایک ہی چیز لیتے تھے اور اسے آپس میں بانٹ لیتے تھے۔ جیسے میکس چاکلیٹ ایک روپے میں نہیں آتی تھی۔ جو مجھے خاص پسند نہیں ہے لیکن متین کو بہت پسند ہے اس لیے ہم یہ چاکلیٹ لیتے ہیں اور بیچ جانے والے پیسوں سے میری پسند کی کوئی چیز لی جاتی ہے۔ اب اتنے کم پیسوں میں بھلا کیا آتا ہے؟ اس لیے مجبوراً مجھے پاپ کورن یا معمولی چیزوں پر گزارا کرنا پڑتا تھا۔ ہاں چاکلیٹ میں سے مجھے تھیں فی صد مل جاتا تھا۔

اس طرح متین کو چیز برگر اور کولڈ ڈرنک پسند تھی لیکن یہ دونوں چیزیں منجھی آتی تھیں۔ اسکول میں یہی چیز اچھی لگتی تھی۔ مجھے چیز برگر پسند نہیں ہے البتہ مجھے کولڈ ڈرنک اچھی لگتی ہے۔ یوں مجھے برگر کا کچھ حصہ ملتا تھا لیکن کولڈ ڈرنک میں آدھی مجھے متین کو دینی پڑتی تھی۔ اس وقت اسے مسادات کا اصول یاد آ جاتا تھا۔ ان دو مشاغل سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ متین ہماری دوستی کو کس طرح اپنے حق میں استعمال کرتا تھا۔ بہر حال مجھے اس سے اتفاق کرنا پڑا تھا کہ ایک روپے روزانہ میں اب ہمارا گزارا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے ہمیں مزید رقم حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔

خاصے غور و فکر کے بعد بھی ہمارے ذہن میں کوئی ایسی ترکیب نہیں آتی جس سے اضافی آمدنی بنا سکی محنت کے حاصل کی جائے۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ ہم دونوں ہی اعلیٰ درجے کے کام چور تھے۔ درنہ ایسی مثالیں موجود تھیں کہ ہماری عمر کے لڑکے گھروں میں اخبار ڈال کر روزانہ پندرہ بیس روپے کمایا کرتے تھے۔ لیکن ہمارے معمولات میں جو وقتی ملازمت کی بھی گنجائش نہیں تھی۔ اخبار ڈالنے کے لیے ہمیں روزانہ پانچ بجے اٹھ کر جانا ہوتا اور اس کے بعد اسکول بھی جانا ہوتا۔ جب کہ ہم دونوں ہی رات دیر سے سونے والے تھے۔ اتنی صبح اٹھنا ہمارے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ پھر اسکول سے آکر ہم آرام کرتے تھے۔ ہوم ورک کرتے تھے

اور شام کو کھیلنے جاتے تھے۔ یہ کام بھی لازمی تھا۔ اگر کہیں جو وقتی ملازمت کر لیتے تو ہمارا کھیل کا وقت ختم ہو جاتا۔ سورج غروب ہونے کے بعد ہمیں گھر سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہے اس لیے ہم زیادہ سے زیادہ بجک یا رڈ میں مل سکتے ہیں۔ اور یہاں ہمارے لیے سوائے باتیں کرنے کے اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے اپنی مرضی سے گزارنے کے لیے ہمارے پاس شام کے کبھی اوقات ہوتے تھے اور ہم ان کی قربانی دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ یہ فیصلہ ان چند فیصلوں میں سے تھا جو میں نے اور متین نے مل کر کیے روزانہ عام طور سے فیصلہ سازی متین کا کام تھا اور مجھے صرف اس کے کیے فیصلے پر عمل کرنا ہوتا تھا۔

اس لیے اضافی آمدنی حاصل کرنے کا مسئلہ بدستور موجود رہا تھا۔ آخر ہم نے چند چھوٹے موٹے کاموں سے اضافی آمدنی حاصل کرنا شروع کی۔ ایسے کام تھے جو ہمیں ہفتے میں ایک دو بار کرنے پڑتے تھے اور ان سے ہماری سرگرمیوں پر اثر نہیں پڑتا تھا۔ جیسے سائے والے علاقے میں جا کر کسی کے باغ کی صفائی کر دینا یا کسی کی گاڑی دھونا۔ یہ ایسے کام تھے جو مستقل نہیں کرنا پڑتے تھے اور ان سے ہمیں ہفتے میں دس پندرہ روپے اضافی مل جاتے تھے۔ ویسے ہمارے اخراجات صحت مندانہ تھے یعنی ہمیں نوٹروکولن کی طرح سگریٹ بان، گولکا استعمال کرنے کا شوق نہیں تھا۔ ایک بار متین نے سگریٹ کا تجربہ کیا تھا اور ایک کش لینے کے بعد اس کی جو حالت ہوئی تھی۔ اس کے بعد اس نے فیصلہ کر لیا کہ ہم کبھی سگریٹ استعمال نہیں کریں گے۔ ظاہر ہے اس میں میں بھی شامل تھا۔ اس کے علاوہ بھی ہمیں کوئی بری عادت نہیں تھی۔ ہمارے زیادہ تر اخراجات کھانے پینے سے متعلق ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ ہمیں ٹرین میں سفر کا شوق تھا۔ کیونکہ کسی بھی اسٹیشن پر اترتے وقت ہم وہاں سے ایسی بہت ساری چیزیں بیچ کر لیتے تھے جو پہلے سفر کرنے والے مسافر چھوڑ کر جا چکے ہوتے تھے۔ ان میں اخبارات، رسالے، کتابیں، مچس کے کچھ کھائے پکٹ اور اسی طرح کی چیزیں ہوتی تھیں۔

کچھ دن پہلے ہمیں ایک قیمتی چھڑی ملی تھی اس کا مالک یقیناً اسے ٹرین میں بھول گیا تھا۔ آجوں سے بنی یہ چھڑی خاصی قیمتی تھی اور ہم چاہتے تو کسی کو آسانی سے اسے بیس بیس روپے میں بیچ سکتے تھے۔ عجیب بات بھی ہم نے آج تک کبھی کوئی چیز بے ایمانی

یاد دھوکے بازی سے حاصل نہیں کی تھی۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ ہم دونوں ہی مذہبی سوچ رکھنے والے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ خاص طور سے ستین اس معاملے میں بہت جذباتی تھا اور اسے صحیح و غلط کی بہت فکر لگی رہتی تھی۔ اس لیے جب ہمیں اضافی آمدنی کی ضرورت ہوتی تھی تب بھی ہم کسی غلط طریقے سے کمانے کے بارے میں نہیں سوچتے تھے۔ اس معاملے میں ستین کا فیصلہ بالکل واضح تھا۔

”جورقم ہمارے لیے جائز نہیں ہے وہ ہمارے لیے نہیں ہے۔“ اس کا فیصلہ کس طرح ہو گا کہ فلاں رقم ہمارے لیے جائز ہے یا نہیں۔“ ”بہت آسانی سے۔“ اس نے کہا۔ ”جورقم کسی کا حق مار کر اور کسی کی مرضی کے بغیر حاصل کی جائے وہ حرام ہے۔“ یوں یہ طے ہو گیا تھا کہ ہم کوئی رقم غلط طریقے سے حاصل نہیں کریں گے چاہے ہمیں اس کی تھی ہی ضرورت کیوں نہ ہو۔ ستین کا کہنا تھا کہ اگر خدا نے ہمارے مقدر میں کوئی رقم لکھ دی ہے تو اسے غلط طریقے سے کمانے کے بجائے ہمیں صبر سے کام لینا چاہیے اور انتظار کرنا چاہیے کہ وہ رقم درست طریقے سے ہمارے پاس آئے۔ اگر وہ ہمارے مقدر میں ہے تو ضرور آئے گی۔ خدا کے معاملے میں ستین کا اعتقاد بہت پختہ تھا۔ اس کا یقین بھی متزلزل نہیں ہوتا تھا۔

اس روز وہ بہت ضرورت مند تھا حالانکہ اس نے مجھے بھی شامل کر لیا تھا لیکن اصل میں تو مجھے علم ہی نہیں تھا کہ اسے کس چیز کے لیے پانچ سو روپے درکار ہیں۔ میں نے پوچھا۔ ”تم نے بھی میکی شاپ پڑا کھایا ہے؟“ میکی شاپ ہمارے گھر سے کچھ دور تھی۔ وہ پڑا بنانے کا ماہر تھا۔ لیکن اس کے بنائے پڑے بڑے مہنگے ہوتے ہیں اور ہم نے ایک بار بھی اس کی دکان سے پڑا لینے کی بہت نہیں کی۔ البتہ ہمیں حسرت ضرور تھی کہ ہم یہاں سے ایک بار پڑا لے کر کھائیں۔ میں نے خشکی سے اسے دیکھا۔ ”جب تم کو معلوم ہے کہ میں نے بھی پڑا نہیں کھایا تو پھر پوچھ کیوں رہے ہو؟“

”کیونکہ دو دن کے لیے صرف پانچ سو میں مل رہا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں یہ سن کر اچھل پڑا تھا کیونکہ میکی پڑا آٹھ سو سے کم کا نہیں ہوتا ہے اور پانچ سو کا مطلب تھا وہ مفت ہی مل رہا ہے۔ میں نے بے چینی سے کہا۔ ”دانی؟“

”اگر تمہیں یقین نہیں آ رہا تو میرے ساتھ چلو میں تم کو اس کی دکان پر لکھا دکھا دیتا ہوں۔“ ”نہیں مجھے تمہارا یقین ہے لیکن ایسا تو نہیں ہے کسی نے شرارت کی ہو یا تم پندرہ کو پانچ سو سمجھے ہو؟“ ”میں نے خوب غور سے پورے دس منٹ تک اس اشتہار کا معائنہ کیا تھا اور پھر بھی یقین نہیں آیا تو اندر جا کر پوچھا تھا اس نے بتایا کہ پڑا پانچ سو کا ہے لیکن صرف دو دن کے لیے اس کے بعد بھی پڑا آٹھ سو میں دستیاب ہوگا۔“

”یہ تو زبردست پیش کش ہے۔“ میں نے جوش و خروش سے کہا۔ ”اسی کے لیے پانچ سو درکار ہیں۔“ ”میرا مسئلہ کیا۔“ اور یہ بہت بڑا مسئلہ ہے۔“ ”دیکھو ہمارے پاس دو دن ہیں۔ ہم دونوں دو دو جمع کر لیں تو یہ ہو جائے گا چار سو اور پھر صرف ایک سو کا مسئلہ رہ جائے گا۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مسئلہ ایک کا نہیں بلکہ تین سو کا ہو گا کیونکہ ایک ہفتے کے لیے میرا جیب خراب رہا ہے۔“ ”جب خرچ بند ہے۔“ ستین نے دھکی لہجے میں کہا۔ ”لیکن کیوں؟“ ”کیونکہ میں ایک بار پھر میٹرس کے ٹیسٹ میں نفل ہو گیا ہوں۔“ میں نے متانت سے جواب دیا۔ ”تم جانتے ہو اگر دس میں سے سات سو مالوں کا جواب نہ دیا جائے تو اسے نفل شمار کرتے ہیں۔ میں نے صرف چھ کے درست جواب دیئے تھے۔“

”ستین نے کہا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھا۔ اسی وجہ سے تم سے کہا ہے دھیان لگا کر پڑھا کر دو۔“ ”اب تو جو ہونا تھا ہو گیا۔“ ”تم اپنی اسی سے اپیل۔“ ”اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ جب خرچ ابڑے پیتے ہیں ای نہیں دیتی ہیں۔“

”ستین سوچ میں پڑ گیا اور اس نے خامی دیر کے بعد کہا۔ ”ہمیں بہر صورت پانچ سو حاصل کرنے ہیں۔“

”وہ کیسے؟“ میں نے اعتراض کیا۔ کیونکہ ایک اتوار والا دن ہی ہوتا تھا جب مجھے صبح جی بھر کر سونے کا موقع ملتا تھا۔ ”بس مجھے یقین ہے خدا نے کہیں نہ کہیں سے ہمارے لیے پانچ سو کا بندوبست کیا ہوگا۔“ مجھے معلوم تھا کہ میں انکار نہیں کر سکتا تھا اور ایسے ہی مواقعوں پر مجھے ستین سے دوستی چھلکی تھی۔ مجھے بھی پان پڑا پسند تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ میں اس کے لیے اپنی اتوار کی نیند قربان کرنے کے لیے تیار ہوا جاؤں۔ اگر مجھے ستین کے علاوہ کوئی یہ بات کہتا تو میں ہرگز نہ مانتا۔ بادل ناخواستہ میں نے اس سے کہا۔ ”صبح کب نکلنا ہے؟“

”ناشتا کرتے ہی۔“ ”ٹھیک ہے۔“ میں نے سکون کا سانس لیا۔ ستین نے وقت نہیں دیا تھا اور ناشتا میں گیارہ بجے سے پہلے نہیں کرتا تھا اس لیے سونے کا موقع موجود تھا میں نے دل میں دعا بھی کی کہ ستین کا دھیان اس طرف نہ جائے لیکن وہ ستین ہی کیا جس کا دھیان ان باتوں کی طرف نہ جائے جن کا تعلق میرے سکون اور چین سے ہوتا ہے اس نے کہا۔ ”اور ہاں ناشتہ سات بجے کر لیتا۔“

”سات بجے۔“ میں کر رہا۔ ”اتوار والے دن ہمارے ہاں ناشتا اتنی جلدی بنتا ہی نہیں ہے۔“ ”کوئی بات نہیں تم آٹھ بجے آ جانا۔“ ستین نے گویا وقت طے کر دیا۔ ”ممکن ہے ہمیں اتنی جلدی کوئی کام مل جائے کہ ہم پڑا سے اصل ناشتہ کریں۔“ اتوار کی صبح میں آٹھ بجے ناشتے کے لیے آیا تو ای حیرت سے بے ہوش ہونے لگی تھی۔ ”یہ صبح تم ہو؟“ ”جی ای اور جلدی ناشتا دیں مجھے ابھی جانا ہے۔“ ”کہاں؟“ ”اسی نے میز پر ناشتا لگاتے ہوئے کہا۔“ ”میرا اور ستین کا کہیں جانے کا ارادہ ہے۔“ میں نے کہا اور جلدی جلدی تو سن لگنا شروع کر دیے اور کھڑا ہو گیا۔ حسب توقع ستین سخت بے تابی اور کڑی قدر غصے میں میرا انتظار کر رہا تھا اس نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔

”تم پورے آدھا گھنٹا دیر سے آئے ہو۔“ ”سواری۔“ میں نے بات بڑھنے سے پہلے ختم کر دی۔ ”اب یو لو کیا کرتا؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”کل میرا اس کی طرف سے گزر ہوا تھا وہ خود باغ کی صفائی کر رہی تھی۔“ ”اچھا سمنڈر۔ اس کا باغ تو بہت گندا ہو رہا ہے اس میں سو کے پتوں کا ڈھیر لگ گیا۔“ ”اس کی وجہ یہ ہے کہ سمنڈر کا دھننے سے ان کا گھر بند ہے۔ ان کا بڑا بیٹا ان کے باغ کو پانی دیتا ہے لیکن وہ یقیناً صفائی کے عوض ہمیں کوئی معاوضہ نہیں دے گا۔“ ”تب ممکن ہے آصف کو اپنی کار وصولی ہو؟“ آصف ایک شوقین مزاج اور نازک اندام نوجوان تھا اس کا باپ کیونکہ ایک کامیاب انشورنس ایجنٹ تھا اس لیے اس نے آصف کو ایک بہترین اسپورٹس کار دلوا دی تھی۔ اسے چلانا جتنا مشکل کام تھا اس کی صفائی اس سے بھی زیادہ مشکل کام تھا کیونکہ اس کا بڑا بیٹا کچھ زیادہ ہی ایروڈائنامک تھا۔ میں نے ستین سے اتفاق کیا اور ہم آصف کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ لیکن جب ہم وہاں پہنچے تو زیو خود ہی اپنی کار دھور رہا تھا اور اس نے ہمیں کہا۔ ”دفع ہو جاؤ تم نے پچھلی بار اس کے الیکٹریک سسٹم کو گلیا کر دیا تھا۔ اس کا مرکز کی نظام ہی جام ہو گیا تھا اور اسے کھلوانے میں میرے دو سو روپے خرچ ہو گئے۔“ باتوں کا تو ہم پر اتنا اثر نہیں ہوا تھا لیکن جب وہ باپ لے کر جھانڈا انداز میں ہماری طرف بڑھا تو ہم نے وہاں سے بھاگ نکلنے میں عافیت سمجھی تھی۔ اس کے بعد ہم ایک گھنٹے میں ان تمام جگہوں پر گئے جہاں ہمیں کام اور اس کے بدلے کم سے کم پانچ سو ڈالنے کا امکان تھا۔ لیکن ہر جگہ ہمیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ تھک ہار کر ہم ایک پارک میں آ بیٹھے تھے۔ ستین نے مایوسی سے کہا۔ ”گلتا ہے آج ہمارے نصیب میں کہیں سے بھی رقم نہیں ہے۔“

”اور کیا بااوجہ صبح کی نیند غارت کی۔“ میں نے منہ لٹکا کر کہا۔ ”اس وقت میں گرم بستر کے مزے لے رہا ہوتا۔“ ”خیر اب ایسا بھی نہیں ہے کہ ہم بالکل ہی ناکام رہے ہیں۔“ ستین نے جلدی سے کہا۔ ”ابھی صرف گیارہ بجے ہیں اور ابھی ہمارے پاس سارا دن ہے۔“

”یہ سن کر میری جان نکل گئی تھی کہ ستین کا ارادہ سارا دن کام کرنا کر کے تھا۔“ اب کام کہاں ملے گا جہاں جہاں سے ملتا تھا ہم نے بخش کر لی تھی۔

ہے جہاں کے بارے میں اس نے سوچا ہی نہیں ہوتا ہے۔
 "لیکن اکثر اوقات انسان کو وہاں سے بھی کام نہیں ملتا
 جہاں اس کا اس نے سوچا ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہمیں نہیں ملا۔ اس
 لیے ہمیں مزید وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنے گھروں کا
 رخ کرنا چاہیے۔ کم سے کم میں اتنی دیر کے لیے گھر سے
 غائب نہیں رہ سکتا تم جانتے ہو آج کل میں دیسے ہی زیر
 غائب ہوں۔"
 "اچھا ایک بے بچہ تک کوشش کرتے ہیں۔" متین نے
 جلدی سے کہا۔ "اگر اس وقت تک کام نہیں بنا تو بے شک ہم
 واپس گھروں کو چلیں گے۔"
 میں نے سوچا اور مان گیا۔ "لیکن اب کیا کیا
 جائے؟"

"میرا خیال ہے ہمیں الگ الگ کوشش کرنی چاہیے
 ممکن ہے اس میں کسی کی قسمت کھل جائے۔ تم اسی جگہ کام
 تلاش کرو میں سڑک پار جاتا ہوں وہاں کام مل سکتا
 ہے۔" متین نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد
 میں نے اپنے کمرے کا ارادہ کیا لیکن پھر بیٹھ گیا۔ مجھے کسل مندی آ رہی
 تھی جو مجھے جلدی اٹھنے کا فطری نتیجہ تھی۔ پھر دھوپ بھی مرے
 وارمھی اس لیے میں نے سوچا کچھ دیر اور سوتا لیا جائے۔
 اگرچہ میں متین کی طرح ذہنی نہیں ہوں لیکن میں نے اس
 وقت اس بات پر یقین کر لیا کہ اگر آپ کے نصیب میں کوئی
 چیز لکھی ہے تو وہ آپ کو ضرور ملے گی چاہے آپ اس کے لیے
 کوشش کریں یا نہ کریں۔ یہ سوچ کر میں پارک کی بج پر بیٹھا
 رہا۔

میں دھوپ کے مرے لے رہا تھا اور میری آنکھیں بند
 تھیں کہ اچانک کوئی چیز مجھ سے ٹکرائی میں نے آنکھ کھول کر
 دیکھا تو ایک بڑی پیاری سی اور بالکل برف کی طرح سفید
 پھولے بالوں والا بلا میرے پیروں کے پاس بیٹھا تھا اور
 بڑے پیار سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے پہلی بار دیکھا
 تھا۔ اس کے باوجود وہ مجھ سے فری ہو رہا تھا۔ مجھے اچھا لگا تو
 میں نے اسے اٹھا کر گود میں بٹھالیا۔ وہ بوں سکون سے میری
 گود میں بیٹھ گیا جیسے میرا پالتو بلا ہو اور میں اس کے نرم ملائم
 بالوں پر ہاتھ بھرنے لگا۔ یہ یقیناً کسی کا پالتو تھا۔ مجھے یاد آیا
 کہ اس علاقے میں خالذ بیدہ بیلیوں کی شوقین ہے اور وہ اسی
 پارک کے پاس رہتی ہے۔ مجھے لگا کہ یہ اسی کا بلا تھا۔ جو
 گھر سے بھاگ کر یہاں آ گیا تھا۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ بلا
 اصل میں کسی اور کا ہو۔ میں کچھ دیر انتظار کرتا رہا کہ بلے کا

مالک خود آجائے، مگر جب خاصی دیر گزرنے کے بعد بھی کوئی
 نہیں آیا تو میں نے مایوسی سے اسے بچے اتارنے کا ارادہ
 کیا۔ اسی لمحے میں نے خالذ بیدہ کو پارک میں داخل ہوتے
 دیکھا۔

"لو رہ خوردار۔" میں نے بلے سے کہا۔ "تمہارا اصل
 مالک آ گیا ہے۔"
 خالذ بیدہ آس پاس دیکھ رہی تھی یقیناً اسے اپنے بلے
 کی تلاش تھی۔ لیکن میں نے اسے متوجہ کرنے کی کوشش نہیں
 کی۔ انجان بنا بیٹھا رہا۔ پھر خالذ بیدہ نے بلے کو دیکھا اور
 لپک کر آئی۔ اس نے پاس آ کر پر شوق نظروں سے بلے کو
 دیکھا اور بولی۔ "واہ کتنا خوب صورت اور اچھی نسل کا بلا
 ہے۔"

میں حیران ہوا یعنی یہ بلا اس کا نہیں تھا تو پھر وہ کسے
 تلاش کرتی آئی ہے۔ اس نے خود ہی وضاحت کر
 دی۔ "میری ایک چھوٹی پونی نسل کی بلی گھر سے غائب ہے
 میں اسے تلاش کر رہی ہوں۔ سرنگی رنگ ہے اور آنکھیں سرخ
 رنگ کی ہیں۔ کیا تم نے اسے دیکھا ہے؟"
 "نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں نے اسے نہیں دیکھا
 ہے۔"

"اچھا۔" اس نے مایوسی سے کہا۔ "اگر تمہیں کہیں نظر
 آئے تو مجھے بتانا میں سامنے والے گھر میں رہتی ہوں۔" اس
 نے اپنے گھر کی طرف اشارہ کیا۔
 "میں جانتا ہوں آپ بے فکر ہیں میں نے اگر آپ
 کی بلی کو دیکھا تو آپ کو ضرور بتاؤں گا۔"

وہ جانے کے لیے مڑی لیکن پھر کچھ سوچ کر رک گئی۔
 "بیٹے کیا تمہارا اس بلے کو فروخت کرنے کا ارادہ ہے؟"

"کیا آپ اسے لینا چاہتی ہیں؟"
 "ہاں میں اسے لینا چاہتی ہوں۔" اس نے بے تابی
 سے کہا۔ "اس کے بدلے تم کیا لو گے؟"
 "پانچ سو۔" میں نے کہا۔

اس کا منہ کھل گیا تھا۔ "کیا پانچ سو؟ لگتا ہے تم اس کی
 اصل قیمت سے نا آشنا ہو۔ یہ کم سے کم پچاس ہزار کا بلا ہے۔"
 میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں جناب... مجھے صرف
 پانچ سو درکار ہیں۔"

"تم شاید سمجھ نہیں رہے ہو اس کی اصل قیمت پانچ
 ہزار سے کہیں زیادہ ہے۔"
 "ممکن ہے ایسا ہی ہو۔"

"تم اس کے کتنے لو گے؟"

"پانچ سو۔" میں نے پھر کہا۔ "میں اس سے زیادہ
 نہیں لوں گا۔"

خالذ نے پرس نکالا اور اس میں سے مگن کر ایک ایک سو
 کے پانچ نوٹ میرے حوالے کیے اور بلا لینے کے لیے ہاتھ
 آگے بڑھا دیے۔ یہ شریف بلا یعنی آسانی سے میرے پاس
 چلا آیا تھا اتنی ہی آسانی سے اس کے پاس چلا گیا۔ اس نے
 بازوؤں میں لے کر سرور انداز میں اسے سہلایا اور خوش خوش
 وہاں سے چلی گئی۔ اب میرے پاس پانچ سو تھے۔ یعنی جتنی رقم
 ہمیں درکار تھی وہ مل گئی تھی۔ اب مجھے یہاں سے چل دینا
 چاہیے تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں میرا دل نہیں مان رہا تھا۔ میں
 نے ایک کام کر لیا تھا اور اب مجھے لگ رہا تھا کہ میں نے ٹھیک
 نہیں کیا تھا۔

متین اکثر مجھ پر جھٹکتا تھا۔ اور وہاں جو خلیے میں منتا تھا وہ
 آکر میرے گوش گزار بھی کر دیا کرتا تھا۔ ایک بار اس نے
 وعظ میں سنا کہ انسان جب کوئی غلط کام کرتا ہے تو خدا کی
 طرف سے اسے طانی کا ایک موقع دیا جاتا ہے۔ یہ موقع
 لازمی ملتا ہے یہ شرط کہ انسان ذرا مبر سے کام لے اور انتظار
 کرے۔ مجھے متین کی یہ بات یاد آئی اور میں نے فیصلہ کیا
 کہ مجھے اسی جگہ بیٹھ کر موقع کا انتظار کرنا چاہیے۔ وقت آہستہ
 آہستہ گزرتا گیا اور ایک دن بھی گیا۔ یعنی متین کے آنے کا وقت
 ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر متین آ گیا تو اس کا مطلب ہے
 اس معاملے میں میری کوئی خطا نہیں ہے۔

لیکن متین کی آمد سے پہلے ایک جوان عورت پارک
 میں آئی۔ اس نے لباس بھی ایسا پہن رکھا تھا جس میں وہ
 زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔ وہ بے قراری سے چاروں طرف
 دیکھ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا وہ کسی کو تلاش کر رہی ہو اور جب
 اس سے مبر نہیں ہو سکا تو اس نے بلند آواز سے پکارنا شروع
 کر دیا۔

"پوسی... پوسی... تم کہاں ہو... میں پہلے ہی پریشان
 ہوں مجھے اور پریشان مت کرو۔"

میں نے سوچا کہ یہ پوسی کون ہے اس کا بچہ ہے۔ وہ
 شاید ستائیس اٹھائیس برس کی مٹی اور اس کا اتنا بڑا بچہ بالکل ہو
 سکتا تھا جو پارک میں آکر کم ہو جائے۔ وہ پکارتی ہوئی میری
 طرف آئی اور پھر اس نے مجھ سے کہا۔ "لو تم نے پوسی کو
 کہیں دیکھا ہے؟"

"یہ پوسی کون ہے؟" میں نے اب سے پوچھا۔

"پوسی میرا بلا ہے سفید رنگ کا اور سرخ آنکھوں والا۔
 وہ بہت خوب صورت ہے۔"

"یقیناً ہوگا۔" میں نے اس سے اتفاق کیا۔ یقیناً وہ
 اس بلے کی بالکل مٹی جیسے میں نے خالذ کے ہاتھ فروخت کر دیا
 تھا۔ "کیا وہ کم کیا ہے؟"

"ہاں کئی گھنٹے سے غائب ہے اور میں پانچوں کی طرح
 اسے تلاش کر رہی ہوں۔" وہ روٹا ہوا ہوئی۔

"میڈم آپ کی حالت دیکھ کر انفسوس ہو رہا ہے اگر
 آپ کہیں تو میں اسے آپ کے لیے تلاش کروں۔"

"کیوں نہیں تم میری مدد کر کے مجھے اپنا شکر گزار پاؤ
 گے۔" وہ میرے براہ منہ بیٹھ کر بیٹھ گئی۔

"میڈم میں اسے تلاش میں بھاگ دوڑ کروں گا اور
 میرا وقت اور محنت لگے گی کیا مجھے اس کا کوئی معاوضہ ملے
 گا؟"

"کیوں نہیں تم جو ہمارے گھر میں جہیں دوں گی۔" اس
 نے زور دھڑ سے یقین دلایا۔

"جو میں مانگوں؟" میں نے تصدیق چاہی۔
 "ہاں جو تم مانگو۔"

"تب میں آپ کا بلا تلاش کرنے کے عوض پانچ سو
 لوں گا۔"

"صرف پانچ سو..... اپنے پیارے پوسی کو تلاش
 کر کے لانے پر میں تم کو ایک ہزار دوں گی۔"

یہ سنتے ہی میں کھڑا ہو گیا۔ "تب آپ یہاں آرام
 سے بیٹھیں میں اسے آس پاس کی گلیوں میں تلاش کرتا ہوں۔"

عورت وہیں بیٹھی رہی اور میں سفید حائل کے گھر آیا۔
 کال بلی بجانے پر خالذ نے خود دروازہ کھولا۔ میں نے ان کو
 دیکھتے ہی کہا۔ "خالذ میں آپ سے بلا لینے آیا ہوں۔ یہ اپنے
 پانچ لیں اور بلا میرے حوالے کر دیں۔"

"کیا؟" وہ چلا اٹھی۔ "میں کیوں بلا تمہارے حوالے
 کروں میں اسے تم سے خرید چکی ہوں۔"

"آپ کو وہ بلا دینا ہوگا۔" میں نے کہا۔
 "ہرگز نہیں.... میں نے تمہاری منہ مانگی قیمت جہیں
 ادا کر دی تھی اور اب وہ بلا میرا ہے اور اگر اب تم بچتار ہے ہو
 کر تم نے کم قیمت لی ہے تو یہ تمہارا قصور ہے میں نے تم کو
 خبردار کر دیا تھا کہ اس سے زیادہ قیمت کا بے جوتم طلب
 کرے ہو لیکن تمہارا اصرار پر میں نے پانچ سو میں اسے



تیرا بھائی

جناب ایڈیٹر سرگزشت

سلام مسنون

میں اس بار جو رواد بیان کرنے جا رہا ہوں یہ بھی سو فیصد سچ ہے۔ سولجر بازار کے پرانے رہائشی اس کہانی سے واقف ہوں گے۔ یہ بھی میں صرف اس لیے اپنے الفاظ میں بیان کر رہا ہوں کہ بڑبولا پن کیسے خفوق میں مگرا دیتا ہے۔ محمد امجد (کراچی)

ولی دادا ہمارے محلے کے ایک دلچسپ کردار ہیں۔ انہوں نے زندگی کے اتنے تشب و فراز دیکھے ہیں کہ ان پر پورا ٹول کھا جاسکتا ہے۔ میں بھی ان کے پاس بیٹھ جاتا ہوں اور ان کے تجربات سنتا رہتا ہوں۔ مجھے بہت کچھ حاصل ہوا ہے۔ اس کردار کے بارے میں بھی ولی دادا ہی نے بتایا تھا۔ بہتر یہی ہے کہ اس کردار کے بارے میں آپ خود ولی دادا کی زبانی سن سکیں۔ ”میاں کیا بتاؤں کیا بندہ تھا وہ۔ دبا پتا دھان پان

”آپ بے فکر رہیں میں آپ کا نام نہیں لوں گا۔“ میں نے اس کے پانچ سا اے واپس کیے۔ ”اس صورت میں خود میں بھی جھنسا جاؤں گا۔“ میں بلا لے کر پارک میں داخل ہوا تھا کہ وہ عورت بلے کو میری گود میں دیکھنے ہی اچھل کر کھڑی ہو گئی اور پھر اس نے جھٹ کر بلا لے لیا اور اسے بے تحاشہ پیار کرنے لگی۔ وہ اسے بار بار سینے اور اپنے گالوں سے لگاتی تھی۔ ”اوہ..... مائی پوسی مائی ڈیئر۔“

مجھے اس وقت بلے پر بہت رشک آیا تھا۔ اپنی خوشی پر قابو پاتے ہوئے عورت نے فکرا آئیر لہجے میں کہا۔ ”میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔“

”یہ احسان نہیں ہے میڈم۔“ میں نے متانت سے کہا۔ ”میں نے معاوضے کے لیے یہ کام کیا ہے۔“ ”اوہ ہاں تمہارا انعام۔“ اس نے جلدی سے اپنے پرچے سے مجھے دس نوٹ سو سو کے نکال کر دیے۔ ”اس کے باوجود میں تمہاری شکر گزار ہوں۔“ اس نے کہا اور میرے گال پر پیار کر کے لبراتی ہوئی اپنے بلے سمیت وہاں سے چلی گئی۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اگر وہ مجھے ہزار نہ بھی دیتی تب بھی میں دس بار پوسی کو تلاش کر کے انے کو تیار ہو جاتا۔

اسی لمحے تین پارک میں داخل ہوا اور اس کی صورت بتا رہی تھی کہ اسے نہ تو کہیں کام نانا ہے اور نہ ہی پانچ سو۔ جب کہ میری جیب میں پورے ہزار تھے جس سے دو عدد پڑا آسکتے تھے۔ جس طرح میں نے جان لیا تھا کہ تین ناکام رہا ہے اسی طرح اس نے میری صورت دیکھ کر جان لیا کہ میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ لپک کر میرے پاس آیا۔

”تو تم نے پانچ سو حاصل کر لیے۔“

”ہاں اور اب ہم پڑا لے سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ آدھے گھنٹے بعد ہم پان پان کے مزے اڑا رہے تھے اگرچہ پڑا میں سے بڑا ٹکڑا زمین کے حصے میں آیا تھا لیکن میں نے اس کا بالکل برائ نہیں مانا تھا۔ ایک تو اس لیے کہ میری جیب میں مزید پانچ سو موجود تھے اور میں ایک پورا پڑا اکیلے کھا سکتا تھا۔ دوسرے میں تین کی اس بات کا قائل ہو گیا تھا کہ اگر آپ کے نصیب میں کچھ ہے تو خدا اسے درست طریقے سے حاصل کرنے کا ایک موقع ضرور دیتا ہے۔

خرید لیا اور اب اس کے لیے تم مجھے مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتے۔ یہ میرا ہونچکا ہے۔ میں اس کے بدلے اب تم کو مزید ایک روپیہ بھی نہیں دوں گی۔“

”یہ بات نہیں ہے۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”اصل بات یہ ہے بلا میرا نہیں ہے اس کا مالک کوئی اور ہے۔“ خالہ کا منہ لٹک گیا تھا۔ ”مالک کوئی اور ہے تب تم نے اسے کیسے سچ دیا؟“

”میں نے بیچا نہیں تھا اسے آپ نے خریدا تھا۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔ وہ اچھل پڑی۔

”کیوں کرتے ہو تم..... تم نے اسے بیچا تھا جب کہ یہ تمہارا مالک نہیں ہے۔“

”یہ درست ہے لیکن اسے آپ نے خود خریدا تھا یا چاہا تھا۔ یاد ہے میں نے ایک بار بھی اسے بیچنے کی بات نہیں کی تھی۔ آپ نے خود پاس آ کر اسے خریدنے کی بات کی تھی اور پھر میرے پانچ سو طلب کرنے پر مجھے رقم دے کر اسے لے لیا تھا۔“

خالہ نے غور کیا اور بات اس کی سمجھ میں آنے لگی۔ ”پھر یہ تمہارے پاس کیسے آیا اور کیا اسے سچ کر تم نے بد دیا ہے نہیں؟“

”یہ پارک میں خود میرے پاس آ گیا تھا اور میں نے غلط حرکت کی ہے لیکن اسے بد دیا ہی نہیں کہہ سکتے کیونکہ مجھے معلوم ہی نہیں تھا اس کا مالک کون ہے اور کوئی ہے بھی یا نہیں۔ اس لیے پانچ سو لے کر میں نے اسے آپ کے حوالے کر دیا۔“

”اب تم کیا چاہتے ہو؟“ اس نے پوچھا حالانکہ میں نے آتے ہی اسے بتا دیا تھا کہ میں بلا واپس لینے آیا ہوں۔

”اس کا اصل مالک آ گیا ہے اور مجھے بلا اس کے حوالے کرنا ہے۔“

”میں اسے خرید چکی ہوں اور اب اسے تمہارے حوالے کیوں کروں؟“

”اگر آپ نے اسے میرے حوالے نہیں کیا تو میں واپس جا کر مالک کو لے آؤں گا اور اسے بتاؤں گا کہ اس کا بلا آپ کے پاس ہے۔ آگے آپ خود سمجھ دار ہیں۔“ خالہ نے کچھ دیر سوچا اور سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے میں بلا تمہیں لا دیتی ہوں لیکن اس معاملے میں کسی طرح بھی میرا نام نہیں آنا چاہیے۔ اگر تم نے مجھے ملوث کرنا چاہا تو میں صاف انکار کر دوں گی۔“

سا۔ لیکن پورے سولجر بازار میں اپنے بھائی کے مل پر اکرنا پھرتا تھا۔

اس کا نام راشد سمجھ لیں۔ اس کا بڑا بھائی خالد محلے کا بد معاش تھا۔ اول درجے کا چھری باز۔ کئی بار جیل جا چکا تھا۔ محلے بھر میں اس کی دھماک تھی۔

جبکہ راشد اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ صرف خالد کے مل پر دادا گیری کیا کرتا۔ اور دادا گیری ہی کیا بس کسی ہوٹل سے چائے پی ٹی، کسی طوائی سے دو چار سموسے لے لیے۔ بس اس سے زیادہ اس میں نہ صلاحیت تھی اور نہ ہی ہمت تھی۔

لیکن اس کے کردار کی سب سے دلچسپ بات اس کی شہتی تھی۔

نہیں بھی اس زمانے میں اپنے ہاتھ پیر نکالنے لگا تھا۔ ایک سر ساز کرنے جایا کرتا۔ ابھی خاصی جان بچی ہوئی تھی لیکن مجھ میں بزرگوں کی سکھائی ہوئی تہذیب موجود تھی۔ کسی محفل میں جاتا تو سر جھکا کر بڑوں کی باتیں سنتا۔ اسی لیے لوگ مجھے پسند بھی کرتے تھے اور مجھ سے شفقت کا اظہار بھی کرتے۔

راشد بھی ایسا ہی تھا۔ اس کی بیٹھک ایچھے کے ہوٹل میں ہوا کرتی۔ ایچھے خود کسی زمانے میں بد معاش رہ چکا تھا لیکن اب ہوٹل چلا رہا تھا۔

راشد کے ارد گرد اس کی باتیں سننے والے بیٹھا کرتے۔ جن کے لیے راشد کی باتیں حیرت انگیز تھیں۔ میں نے پہلی بار راشد کی لٹری ان اسی محفل میں سنی تھی۔

کوئی بتا رہا تھا۔ راشد دادا (یاد رہے کہ راشد کو بھی دادا ہی کہا جاتا تھا) کل جوڑیا بازار کا ایک سٹارٹ کیا۔ پورے دو لاکھ چلے گئے اس کے۔ (اس زمانے کے دو لاکھ بہت ہوا کرتے تھے)۔

”ہاں معلوم ہے مجھے۔“ راشد دادا نے کہا۔ ”اب تم لوگ تو کل کے لوٹے ہو، تمہیں کیا بتاؤں بس یہ مجھ کو کہ اس میں تیرے بھائی کا ہاتھ ہے۔“

”کیا کہہ رہے ہو دادا؟“

”ہاں، بہت سمجھایا تھا اس کو کہ دیکھ سونے میں ملاوٹ مت کیا کرادو یہ جو مجبور عورتیں مجبور میں اپنے گہنے لے کر تیرے پاس آتی ہیں، ان کی مجبوری سے فائدہ مت اٹھا۔ ان کو پورے پیسے دیا کر لیکن وہ کہاں سننے والا۔“

”لیکن دادا اس کو تو ڈاکوؤں نے لوٹا ہے۔“

”اے بتایا کہ اس میں تیرے بھائی کا ہاتھ ہے۔“ راشد بولا۔ ”اس کے ہوش ٹھکانے آ گئے ہوں گے۔“

اس وقت مجھے بھی یقین ہو گیا تھا کہ شاید ایسا ہی ہوا ہو۔ اس سٹار کی دکان راشد دادا ہی نے لٹا دی ہو۔ لیکن بعد میں پتا چلا کہ یہ تو اس کی عادت تھی۔

ایک دن کسی نے اس سے کہا۔ ”راشد دادا، ملیر میں دو گردو پوں میں گولیاں چل گئی ہیں۔ دو آدمی مر گئے ہیں۔“

”ہاں، ہاں، جانتا ہوں میں۔“ راشد دادا نے کہا۔

”اور یہ بھی سن لو کہ اس میں تیرے بھائی کا ہاتھ ہے۔“

”لیکن دادا، دونوں میں فساد کرانے سے تمہیں کیا ملا؟“

”اے دونوں بد معاش ہیں۔ محلے کے غریبوں پر ظلم کرتے ہیں۔ پولیس کے قابو میں بھی نہیں آ رہے تھے۔ ابھی اتنا سمجھ لو کہ دونوں کے درمیان جھگڑا کرانے میں تیرے بھائی کا ہی ہاتھ ہے۔ اب ٹھنڈے پڑ گئے ہیں۔ دونوں طرف کا ایک ایک بندہ لپک گیا ہے۔ اب بیٹوں تک اس علاقے میں سکون رہے گا۔“

تو ایسے تھے۔ راشد دادا۔

شاہی نہیں ہوئی تھی۔ ماں باپ تھے۔ جو راشد اور خالد دونوں کی جان کو روکا کرتے۔ یوں سمجھ لیں کہ راشد اگر زبانی بد معاش تھا تو خالد محلی بد معاش۔ اس نے واقعی کئی وارداتیں کی تھیں۔ محلے میں بھی اور محلے سے باہر بھی۔

جبکہ راشد کا کام صرف اتنا تھا کہ شام ہوتے ہی ایچھے کے ہوٹل میں آکر بیٹھ جاتا اور اپنے دوستوں کو اپنی کہانیاں سنایا کرتا۔

اس کے بیان کے مطابق دنیا کے بڑے بڑے واقعات میں اسی کا ہاتھ ہوا کرتا تھا۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں اپنے سر کو جھٹک کر کہا کرتا۔ ”اب تمہیں کیا بتاؤں۔ وہ جو چین کے صدر کے ساتھ جو چمکے ہوا ہے۔ اس میں بھی تیرے بھائی کا ہاتھ ہے۔“

”لیکن راشد دادا چین کے صدر سے تمہارا کیا تعلق؟“ کوئی کہتا۔

”یہی تو تم لوگوں کو نہیں معلوم۔“ اس کے ہونٹوں پر ایک معنی خیزی مسکراہٹ نمودار ہو جاتی۔ ”یہ خفیہ معاملات ہیں اور ایسے معاملات ہر جگہ نہیں بتائے جاتے۔“

ایک بار کراچی میں فٹ بال میچ کے دوران جھگڑا ہوا گیا۔ اس جھگڑے نے جب شدت اختیار کر لی تو کئی دکانیں

اور ایک بس بھی جلادی گئی تھی۔

اس وقت بھی راشد دادا نے یہی فرمایا۔ ”اے، اب تم لوگوں کو کیا بتایا جائے۔ ہر طرف جاسوس پھیلے ہوئے ہیں۔ اس لیے کچھ بتاتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے لیکن بس اتنا سمجھ لو کہ اس میں تیرے بھائی کا ہاتھ ہے۔“

”لیکن دادا، اگر تمہارا ہاتھ ہے تو پھر دکانوں کو جلانا تو کوئی اچھی بات نہیں ہوئی نا۔“

”اے اس پر تو میں بھی بہت ناراض ہوا تھا۔“ راشد دادا نے کہا۔ ”سمجھایا بھی تھا لیکن لوگ جب سڑکوں پر آ جاتے ہیں تو پھر کسی کی نہیں سننے۔“

”یہ بھی اس کی باتوں میں بہت گہرائی بھی ہوا کرتی۔ وہ کہا کرتا۔“ اے تم لوگ ایک بات جان لو۔ یہ جو انسان ہوتا ہے نا، اس کی دو گلی پالسی ہوتی ہے۔“

”وہ کیسے راشد دادا۔“

”تم کسی سے بات کر دو ایسا لگے گا جیسے اس سے زیادہ شریف آدمی آج تک پیدا ہی نہیں ہوا لیکن وہ ہی بندہ جب سڑک پر اپنے آدھیوں کے ساتھ ٹکڑا ہے نا تو اس کی فطرت ہی بدل جاتی ہے۔ وہ پھر بھی مارتا ہے۔ دکانیں بھی جلاتا ہے اور گولیاں بھی چلاتا ہے۔“

(راشد دادا نے کئی گہری بات کہہ دی تھی کہ انفرادی نفسیات سمجھ اور ہوا کرتی ہے اور اجتماعی نفسیات سمجھ اور ہوتی ہے۔ اپنے رویوں سے پھر کر انسان بھیڑ بن جاتا ہے اور رویوں میں شامل ہو کر شیر ہو جاتا ہے)

اس وقت تک میں بھی راشد دادا سے بے تکلف ہو چکا تھا۔ فٹ بال والے والے واقعات کے بعد مجھے ایک شرارت سوجھی۔

شام کا وقت تھا۔ راشد دادا وقت سے پہلے ہوٹل میں آکر بیٹھ گیا تھا جبکہ میں اپنے پلان کے وقت پہلے سے بیٹھا ہوا تھا۔

راشد دادا مجھے دیکھ کر خوش ہو گیا تھا۔ ”کیا بات ہے ولی، آج تو بہت جلدی آ گیا۔“

”ہاں دادا۔“ میں اس کے ساتھ جا کر بیٹھ گیا۔

”ہات ہی کچھ ایسی ہے کہ میں نے سوچا تمہیں بتا دوں۔“

”ہاں بتا کیا بات ہے؟“

”دادا! وہ جو روڈ پار پان کا کھوکھا ہے نا۔ میں وہاں کھڑا تھا۔ مجھ سے کچھ دور تین آدمی کھڑے تھے۔ وہ آٹھس میں ہاتیں کر رہے تھے۔ ان کی باتیں میں نے سن لیں۔“

”اچھا، کیا کہہ رہے تھے؟“

اور تنقید کی بات کریں تو یہ سوال لازمی ہو جاتا ہے کہ شمس الرحمن فاروقی، گوہی چند نارنگ، جمیم خٹکی کے بعد کی نسل کہاں ہے؟ ابوالکلام قاسمی سے سولہا بخش تک کچھ اور نام شامل کر لیں تو یہ نسل بھی بزرگ ہو چکی ہے۔ فاسانے میں اقبال مجید سے لے کر حسین الحق، سلام بن رزاق اور ابرار مجیب، مصفیٰ رحمانی تک، یہاں زیادہ تر پچاس کی عمر سے آگے کے افسانہ نگار ہیں، یہ کراڈاں بھی گزر گیا تو کیا اردو ادب کا سفر ختم ہو جائے گا؟ اس سوال پر غور کرنا ضروری ہے۔ شمس الرحمن فاروقی، گوہی چند نارنگ، جمیم خٹکی کے معیار اور قد کا کوئی نام ہمارے سامنے نہیں۔ ہمارے بعد دور تک ایسی خاموشی کا بغیرا ہے۔ میں فکشن کا آدمی ہوں اس لئے در فکشن کی بات کر لوں، پاکستان میں کئی نام ہیں جو سٹارڈ کرتے ہیں۔ میزور، احتشام، عین علی، اقبال خورشید، عابد ارباب، فیس بک پر بھی کہانیاں لکھنے والے بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ ہندوستان میں نئی نسل سے ہاشم خان کا نام احترام سے لے سکتا ہوں۔ ہاشم کی دو کہانیوں نے سٹارڈ کیا، ”ایک کہانی کشمیر کے بیک گراؤنڈ میں تھی۔“ ہاشم کی خوبی ہے کہ وہ بیانیہ کے درمیان سے زیریں لہروں کو براہِ مد کرتے ہیں۔ یہ جو زیریں لہریں ہیں۔ یہ ہمیں علامت بن جاتی ہیں، ہمیں فکشن کی شکل میں ہوتی ہیں۔ قاسم مغل، راجا یوسف، شہناز رحمن، فائق احمد، آدم شیر، ہافلک، کئی نام ایسے ہیں جو تیزی سے راست بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر یہ سوال اہم ہے کہ ان کی شناخت کب بنے گی؟ دراصل فائدہ غائب ہو گئے۔ ان پر لکھنے والے نہیں رہے، یہ ایسا ہے۔ فیس بک کی کہانیوں کو شامل کریں تو ہمارے پاس ناموں کی کمی نہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی نام ایسا نہیں جسے مستند، بڑے ناموں میں شمار کیا جاسکے؟ ایسا اس لیے بھی ہے کہ نئے فکشن کا مطالعہ کرنے والے گنتی کے چند نام ہیں۔ ہمارے یونیورسٹی کے پروفیسر اور نقاد ان میں سے بیشتر ناموں سے واقف نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اب ان ناموں کو بھی سامنے لائے جائے ابرار مجیب، مصفیٰ رحمانی، عین علی، میزور، احتشام، جمیل حیات، اقبال خورشید، صائمہ شاہ وغیرہ کی ایسے نام ہیں جن میں زبردست تنقیدی صلاحیتیں موجود ہیں۔ اب ایسے لوگوں پر گفتگو کرنے کا وقت آچکا ہے۔ اقباس: یہ آخری کارواں نہیں ہے، از مشرف عالم ذوقی

جیسی کرنی

محترم مدیر
السلام علیکم

عرصہ بعد ایک سچ بیانی بھیج رہا ہوں۔ یہ سچ بیانی شعبہ کی ہے جس کی زندگی جہنم بن چکی ہے۔ اس نے جو کچھ کیا وہ اس کے سامنے آگیا ہے اور اب وہ دن رات رو رو کر اپنی غلطی کو یاد کر کے اپنی عقل کو کوس رہی ہے۔

محمد عارف قریشی
(کوئٹہ)

”شمینہ! تمہیں شاید اس کا علم نہ ہو کہ میں نے صرف اس بچے کے لیے دوسری شادی کی ہے۔ مجھے اپنے لیے بیوی سے زیادہ اس کے لیے ماں کی ضرورت تھی۔ سو اگر تم میرے دل کی جگہ بنا چاہتی ہو تو اس کی ماں بن کر دکھاؤ۔“



”یہ اذان راشد دادا ہی دے رہا تھا۔“

”کیا؟“ میں یہ سن کر حیران رہ گیا تھا۔

”ہاں، یار! پولیس والوں سے چھوٹ کر راشد دادا کی تو دنیا ہی بدل گئی۔ تم کو تو معلوم ہے کہ مسجد کا وضو خانہ خراب ہو گیا تھا۔ تو راشد دادا نے اپنے پیسوں سے وضو خانہ بنوا دیا ہے۔ بالکل فرسٹ کلاس۔ اس کے بعد مسجد کا مؤذن گاؤں چلا گیا تو راشد دادا نے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ اب وہی اذان دیا کرتا ہے۔“

”یارو، وہ میں تو بل کر رہ گیا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”راشد دادا سے ملنے کو دل چاہ رہا ہے۔“

”تو چلو، وہ مسجد میں ہی ہوگا۔ ہم بھی وضو کر کے نماز میں شامل ہو جائیں گے۔“

”ہم چاروں مسجد کی طرف چل دیے۔ سب سے پہلے ہم نے وضو خانے کا رخ کیا تھا۔ وضو خانے کی تو اب صورت ہی بدل گئی تھی۔

پورے وضو خانے میں چمکتی ہوئی ٹائلز لگی ہوئی تھیں۔

ننگے بھی سب نئے ہو رہے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ وضو خانے کو دیکھ کر ہی دل خوش ہو گیا تھا۔

وضو کر کے ہم نے بھی نماز پڑھ لی۔ نماز سے فارغ ہوئے تو شاکر نے کہا۔ ”آجھے راشد دادا سے ملواتا ہوں۔“

راشد دادا کو دیکھ کر میں حیران ہی رہ گیا۔ اب اس کے چہرے پر ہلکی داڑھی تھی جو بہت ہلکی لگ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ مجھ سے لپٹ پڑا تھا۔

ڈھیر سی باتیں تھیں۔ جو اس سے کرنی تھیں۔ لیکن مجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کیا کہوں، پھر میں اس سے صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ ”راشد دادا، مسجد کا وضو خانہ تو بہت زبردست ہو گیا ہے۔“

”ہاں یار۔“ راشد دادا مسکرا دیا۔ ”ابے اس میں بھی تیرے بھائی کا.....“ وہ بولتے بولتے رک گیا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”رک کیوں گئے دادا، تم شاید پہلی بار بچ کہہ رہے تھے کہ اس میں تمہارا ہاتھ ہے۔ اب یہ ہاتھ اب ہی کاموں کے لیے سلامت رہیں گے دادا، میرا دل کہہ رہا ہے۔“

ولی دادا نے اپنی کہانی ختم کر دی۔ اور میں ایک بار پھر معاشرے کے کرداروں میں الجھ گیا تھا۔ ایسے اور نہ جانے کتنے ہوں گے۔

انہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے راشد دادا کو قابو میں کر لیا۔ وہ پولیس کے آدمی تھے اور حیدرنگڑ کے کسٹل کی سن سن لیتے پھر رہے تھے کہ بد قسمتی سے انہوں نے راشد دادا کی کن ترانیاں سن لیں اور اسے اٹھا کر لے گئے۔

ہم لوگ تو راشد دادا کو یوں پکڑے ہوئے دیکھ کر ادھر ادھر ہو گئے تھے۔ ایک آدمی دوڑا ہوا راشد دادا کے بھائی خالد کو بتانے چلا گیا تھا۔

وہ بھی راشد دادا کی ایسی باتوں سے ناراض ہوا کرتا۔ ”ابے دیکھ لیتا تیری یہ کیو اس کی دنی تھے اندر کروا دے گی۔“

لیکن راشد دادا کہاں ماننے والا تھا۔

خالد نے راشد دادا کو چمروانے کے لیے بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ پولیس والوں نے انہیں بھی بھڑکارا تھا۔

پورا محلہ اس بات کی گواہی دینے کو تیار تھا کہ راشد دادا تو ایک چڑیا بھی نہیں مار سکتا۔ آدمی کا ٹل تو بہت دور کی بات ہے۔ لیکن پولیس کہاں سنتی ہے۔ اس نے مار مار کر راشد دادا کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔

پھر یہ ہوا کہ میں کسی کام سے لاہور چلا گیا۔ کسی کی شادی تھی۔ مگر وہ اب بھی گئے تھے۔ ہماری دہائی ایک مینے کے بعد ہوئی تھی۔

مجھے راشد دادا کی فکر تھی کہ اس بے چارے کے ساتھ کیا گزری ہوگی۔ میں نے شام کو ہونٹ کا رخ کیا۔ جہاں ہم سب بیٹھا کرتے تھے۔

مجھے دیکھ کر سب چمک اٹھے تھے۔ سب باری باری گلے ملنے لگے۔

”ابے لاہور میں اتنے دن لگا دیے۔“ شاکر نے شکوہ کیا۔

”بس یار، مہمان داری کچھ زیادہ ہی ہو گئی تھی۔“

اتنی دیر میں بڑوں کی مسجد سے مغرب کی اذان ہونے لگی۔ ہم سب تھیل کر بیٹھ گئے۔ ہماری روائتوں میں کم از کم اتنا تو ہے کہ جب اذان سنائی دیتی ہے تو ہم تھیل کر بیٹھ جاتے ہیں۔ چاہے مسجد جائیں یا نہ جائیں۔

اذان ختم ہوئی تو میں نے راشد دادا کا پوچھا۔ ”یار، ہمارے راشد دادا کا کیا حال ہے۔ چھوٹے یا نہیں چھوٹے؟“

”ولی! تم نے ابھی اذان ہی نہیں سنی؟“

”ہاں سنی تو ہے تو پھر؟“

اس وقت میں جلد عروسی میں بیٹھی ہوئی ان کا انتظار کر رہی تھی کہ سلیم اسے اٹھائے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور یہ کہتے ہوئے اسے میری جموی میں ڈال دیا تھا۔ مجھے اس وقت ان کی یہ حرکت بہت بری لگی اور یہی وہ پہلی وجہ تھی جو میرے دل میں سلیم کی نفرت کا بیج بوئی۔

”تو کیا اس گھر میں میری کوئی حیثیت نہ ہوگی؟ جب تک اس بلوگڑے کی ماں بن کر نہ رہوں میں جو اس گھر کی مالک بن کر آئی ہوں۔ میرا یہاں کوئی حق نہیں۔ کیا تمام عورتیں اپنے گھروں میں اسی طرح مشروط زندگی گزارتی ہیں۔ بھلا یہی کوئی بات ہے کہ کل شادی ہوئی ہے اور آج بیچے پالنے لگ جاؤ۔ دو چار دن تو مکمل کھیلنے کے لیے ہونے چاہئیں۔“ میں نے سوچا۔

لیکن اسی لیے مجھے خیال آیا کہ اگر میں نے اپنے شوہر کے اس حکم کی تعمیل نہ کی تو یہ ران پاٹ یہیں دھرے رہ جائیں گے جو میرے شوہر کی ثروت مندی کے باعث مجھے حاصل ہونے والے تھے۔ چنانچہ میں نے نہ چاہے ہوئے بھی سلیم کی پردوش و تربیت کی ذمہ داریاں اپنے اوپر لے لیں۔

اگرچہ سلیم کے لیے ایک آیا بھی موجود تھی لیکن میرے شوہر مجھے اس کی ماں بنانے پر مصر تھے جو مجھ پر بھی۔ میں ان کے سامنے سلیم کو اٹھائے پھرتی۔ اس کی بلائیں لیتی بلکہ بوسے تک لے ڈالتی لیکن یہ سب کچھ چونکہ ان کے دکھاوے کے لیے تھا سو جو جی وہ گھر سے باہر جاتے میں سلیم کو آیا کی جموی میں ڈال دیتی کہ بے کوئی اور مصیبت کسی اور کے سر ہو۔ لیکن آیا نہ معلوم کس نہی کی پیرا ہوئی تھی کہ اس نے بھی ایک لمحے کے لیے بھی سلیم سے بیزاری کا اظہار نہ کیا تھا۔ میں کئی دفعہ سوچتی کہ وہ سلیم کو جتنا پیار کرتی ہے شاید اس کی حقیقی ماں بھی نہ کرتی۔ اس موقع پر میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا لیکن میں یہ کہہ کر اسے چپ کر ادیتی کہ ”وہ اس بات کی تو نحوہ لیتی ہے۔“

وقت کے ساتھ ساتھ میرے دل میں سلیم کی نفرت کا پودا پروان چڑھتا رہا اور پھر اس دن تو یہ نفرت اپنی انتہا کو پہنچ گئی جب میں نے ایک بچے کو ختم دیا۔ ڈیوری سے فارغ ہو کر میں اسپتال سے واپس آئی تو آیا سلیم کو اٹھائے ہوئے برآمدے میں کھڑی تھی۔ میں جیسے ہی قریب آئی اس نے کلک کلک کر میری طرف اپنے دونوں بازو پھیلائے لیکن میں اس کے جذبات سے بے نیاز پاس سے گزر کر اندر داخل

ہوئے گی۔ میرے شوہر نو مولودھم کو اٹھائے ہوئے میرے پیچھے آرہے تھے۔ غالباً انہوں نے سلیم سے میری بے پرواہی کو محسوس کر لیا۔ انہوں نے پیار اور غصے کے ملے جلے لہجے میں آواز دے کر مجھے کہا۔ ”غمینہ! سلیم کو پیار نہیں کرو گی؟“ اور تب میں نہ چاہے ہوئے بھی اسے اپنی ہاتھوں میں لینے پر مجبور ہو گئی۔

میں چونکہ اپنے شوہر کی نافرمانی کی مرکب ہونا نہیں چاہتی تھی۔ سو ان کی موجودگی میں سلیم کی تواضع میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتی۔ لیکن یہ ناخوشگوار فرض مجھے زیادہ دیر تک انجام نہ دینا پڑتا کیونکہ میرے شوہر کا روبرو کے سلسلے میں اکثر شوہر سے باہر رہنے اور اب تو میرا اپنا بچہ بھی ہو گیا تھا۔ پھر کسی دوسرے کے بچے سے لپٹنے چھٹنے کی کیا ضرورت تھی۔ بہر حال میری نفرت و دھکار کے باوجود بچہ مجھے ماں سمجھتے ہوئے عمر کی منزل میں طے کرنے لگا۔

وہ اندازاً گیارہ سال کا ہو گا کہ ایک روز اچانک آیا بھاگی بھاگی میرے پاس آئی اور کہنے لگی۔ ”بیگم صاحبہ! سلیم میاں کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے، وہ اپنی ٹانگ پکڑ کر بہت رو رہے ہیں۔“

میں سلیم کے کمرے میں گئی تو وہ بار بار اپنی ٹانگ کے نیچے حصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رو رہا تھا۔ میں نے اس کی ٹانگ پکڑ کر ادھر ادھر سے دیکھا۔ ایک جگہ زخم کا چھوٹا سا نشان تھا جس سے تھوڑا تھوڑا خون بہہ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“ اس نے بتایا۔ ”پتا نہیں مجھے کسی شے نے کاٹ لیا ہے۔“

میں نے اپنے اندازے کے مطابق آیا سے کہا۔ ”کسی کیزے کو ڈسے نے کاٹا ہے۔ کوئی خطرے والی بات نہیں۔ اتھار دم میں ڈیول رکھا ہے وہ لاکر ڈرا لگا دو۔“ اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔

لیکن ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ آیا پھر دوڑی دوڑی آئی اور کہنے لگی۔ ”سلیم میاں کی طبیعت زیادہ خراب ہوتی جا رہی ہے جی! خدا کے لیے کسی ڈاکٹر کو بلاوائے۔“ اس کا اترا ہوا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ سلیم کے لیے کتنی پریشان ہے لیکن خدا جانے میرے اندر کی عورت کہاں مر گئی تھی مجھے اس کی حالت پر کوئی رحم نہیں آ رہا تھا۔ بہر حال میں نے آیا کے اصرار پر ڈاکٹر کو بلا بھیجا۔ ڈاکٹر نے سلیم کا معائنہ کرنے کے بعد بوڑھے توشیش ٹانک لہجے میں کہا۔

”آپ نے مجھے بلانے میں بڑی دیر کر دی۔ اس وقت آپ کے بچے کی زندگی سخت خطرے میں ہے۔ میں دوا بھجواتا ہوں۔ مجھنے کے وقت سے اس کی چار خوراکیں اسے پلائیے شاید افادہ ہو جائے ورنہ اسے اسپتال لے جائیے گا۔“

ڈاکٹر بڑے تعجب سے مجھے دیکھنے لگا۔ شاید میرے چہرے پر پریشانی کے آثار تلاش کر رہا تھا۔ وہ یقیناً سوچ رہا ہو گا کہ یہ کیسی ماں ہے جسے اپنے بچے کی تکلیف کا کوئی احساس نہیں۔ میں نے بھینپ کر اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اسی لمحے آیا نے اس سے سوال کیا۔ ”ڈاکٹر صاحب! سلیم میاں کو ہوا کیا ہے؟“

”تعجب ہے آپ لوگوں کو اب تک پتا نہیں چلا اسے سانپ نے ڈسا ہے۔“ ڈاکٹر نے کہا تو آیا کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ میں خود بھی لرز گئی اور پریشانی کے عالم میں ڈاکٹر سے کہا۔ ”براؤ کرم جلدی دوا لی بھجوائیے۔“ اور وہ ملازم کو ساتھ لے کر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد ملازم دوا لی لے کر واپس آیا تو آیا نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے شیشی لے لی اور پہلی خوراک سلیم کے صحن میں اڈھل دی۔

سلیم کی حالت واقعی اس وقت خطرے سے خالی نہ تھی۔ آیا بار بار اس کے اوپر جھک کر اسے ہلانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن وہ خاموش تھا۔ ادھر میرے ذہن میں خیالات کا ایک جھگڑا چل رہا تھا۔ میں باہر آئی اور لان میں ٹھیلنے لگی کہ اچانک میرے دماغ میں ایک بھیا تک سوچ وارد ہوئی۔

اگرچہ یہ خیال مجھے اس سے پہلے بھی کئی بار آیا تھا کہ اگر سلیم نہ ہوتا تو کتنا اچھا تھا۔ میرے خاندان کی ساری جائیداد سلیم کے حصے میں آتی۔ اب نصف تو یہ لے جائے گا اور آج جب کہ سلیم بستر مرگ پر تھا اس شیطانی خیال نے ایک مرتبہ پھر میرے وجود کا احاطہ کر لیا۔ ”سلیم سے جان چمڑانے کا اس سے اچھا موقع پھر کب ملے گا؟ کیوں نہ اسے موت کے منہ میں جانے دیا جائے۔ پھر میرے بیٹے کو ساری جائیداد کا وارث ہونے سے کوئی روک نہیں سکے گا۔“ میں نے اپنے آپ سے کہا اور پھر چند لمحوں میں اس پر عمل درآمد کا فیصلہ کر لیا۔

میرے شوہر اس روز بھی شہر سے باہر تھے۔ اس وقت

ایک بار مجاز کے پردوس میں چوری ہوئی۔ نشتیں کے لیے پولیس وغیرہ آئی، سارے محلے والے جمع ہو گئے۔ اس واردات کے موقع پر لوگ اپنی اپنی رائے دے رہے تھے۔ صاحب خانہ بے چارے بہت پریشان تھے۔ مجاز نے ان بے چاروں سے اظہارِ افسوس کیا۔ اس کے بعد آپ صاحب خانہ کو جمع سے الگ لے گئے اور بہت ہی رازدارانہ انداز میں سوکھا سامنہ بنا کر بولے۔ ”بھئی ہونہ ہو مجھے تو یہ کسی چوری حرکت معلوم ہوتی ہے۔“

مرسلہ: سید معصوم رضا۔ لاہور
ایک دفعہ ریڈیو پر پروگرام کے بعد جب روشن آراہ بیگم اسٹوڈیو سے باہر آ رہی تھیں تو شعبہ موسیقی کے ایک پروگرام پر ڈیوٹر وافر عقیدت سے آگے بڑھے اور ہاتھ تمام کر عرض کیا۔ ”بیگم صاحبہ! سبحان اللہ آپ بہت اچھا گاتی ہیں۔“ روشن آراہ بیگم نے ایک معصوم سی مسکراہٹ کے ساتھ اس عقیدت مند کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”آپ کو آج پتا چلا ہے!“

مرسلہ: سید معصوم رضا۔ لاہور
رات کے دس بجے تھے۔ میں سلیم کے کمرے میں گئی تو آیا بدستور اس پر بھی ہوئی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ”تم اپنے کوارٹر میں جا کر سو جاؤ۔ سلیم کے پاس میں بیٹھوں گی۔“ اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا اور انکار میں سر ہلا دیا۔ مجھے اس کی اس حرکت پر بہت غصہ آیا اور میں نے درشت لہجے میں دوبارہ اسے حکم دیا۔

”سنائیں تم نے، رات کو اس کے پاس میں رہوں گی۔ تم جا کر سو جاؤ۔“ ”بیگم صاحبہ! سلیم میاں سخت آتلیف میں ہیں۔ میرا جی ان کو چھوڑ کر جانے کو نہیں چاہتا۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”میں اس کی ماں نہیں کیا؟ تم مجھ سے زیادہ اس کی بہرہ ور ہو؟“ میں نے سختی سے کہا تو وہ سسکتی ہوئی باہر چلی گئی۔ میں نے ایک نظر سلیم کی طرف دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا زہر بتدریج اپنا اثر دکھا رہا ہے کیونکہ اس کا جسم نیلا پڑتا شروع ہو گیا تھا۔ مجھے اس پر پیارا آتے آتے رہ گیا۔ میں اٹھ کر باہر آئی اور اپنے عمل کے نتائج پر غور کرنے لگی۔ دل د



آئیڈیل

محترم مدیر اعلیٰ
السلام علیکم

اس کہانی کے مرکزی کردار سے میری ملاقات ٹرین میں ہوئی، تھی دوران سفر اس نے جو روداد سنائی وہ مجھے سرگزشت کے لیے موزوں لگی۔ یہ ان لڑکیوں کے لیے سبق آموز تحریر ہے جو آئیڈیل کے لیے اپنا سب کچھ کھو دیتی ہیں۔

مظہر سلیم
(رحیم یار خان)

یہ آنسو بھی بڑے عجیب ہوتے ہیں خوشی دہی کے فرق کو
ہی نہیں سمجھتے۔ جہاں جذبہ انہما کو پہنچتے ہیں چمک پڑتے
ہیں۔
دو سال کی بددلی کے بعد رافدہ میرے سامنے آئی تو
خوشی سے میری آنکھیں چمک پڑیں۔ ”کیسی ہو تم؟“ میں نے
سرتاپا اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
رافدہ نے اپنا بچہ بیڑ پر لٹا دیا جو اس کے کانڈھے پر سر
رکھے سو گیا تھا۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ؟ کیا حالت کر

دماغ میں خاصی دیر کی جنگ کے بعد بالآخر فیصلہ میرے حق
میں ہوا اور پھر پہلی خوراک کے بعد دوا کی ایک بو بھی میں
نے سلیم تک نہیں پہنچنے دی۔ صبح میں نے ساری شیشی کھڑکی
سے باہر اٹھیل دی۔

اس رات میں سو تو نہ سکی سلیم کے کمرے میں آتی
جاتی رہی۔ صبح اس کے کمرے میں گئی تو آیا موجود تھی۔ نہ
جانے وہ کس وقت کی آئی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے
پہلا سوال دوا کی شیشی کے بارے میں کیا۔ میں نے صاف
جھوٹ بول دیا ”وہ تو میں نے ساری دوا پلا دی تھی۔“
وہ میری طرف مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے سلیم

کے گالوں پر چھپایاں دینے لگی اور اسے سلیم سلیم کہہ کر بکارنے
لگی لیکن میری بدبختی میری توقع سے پہلے کام کر چکی تھی۔
اب وہاں سلیم نہیں بلکہ اس کا خاموش جسم پڑا تھا۔ جیسے ہی آیا
کو اس کا احساس ہوا وہ چیخ مار کر اٹھ کھڑی ہوئی اور ہلک
ہلک کر رونے لگی۔ میں نے اپنے چہرے کو رنجیدہ بناتے
ہوئے اسے گلے لگا لیا اور کہا۔ ”رو نہیں بہن! اللہ کی یہی
مرضی تھی۔ جاؤ تو کمرے کو اس کے ابا کو تار دے آئے۔“

تار (ٹیلی گرام) تو اسی وقت دے دیا گیا مگر میرے
شوہر وقت پر نہ پہنچ سکے۔ ان کے آنے سے پہلے سلیم کو قبر میں
اتار دیا گیا۔ دیر بھی خاصی ہوئی تھی اور میں بھی یہی چاہتی تھی
کہ جتنی جلدی ہو سکے اسے لوگوں کی نظروں سے چھپا دیا
جائے کیونکہ جس وقت بھی کوئی اس کے قریب آتا مجھے ایک
انجانا خوف گھیر لیتا۔

میرے شوہر رات گئے مگر پہنچے اور اسی وقت قبرستان
جانے پر اصرار کرنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا انہوں نے
سلیم کی موت کو بڑی شدت سے محسوس کیا ہے۔ ان کا چہرہ
آنسوؤں سے تر تھا اور آنکھیں سوچی ہوئی۔ پہلے تو میں ان
کی یہ کیفیت دیکھ کر ڈر گئی کہ کہیں وہ سلیم کی اچانک وفات
کی ذمہ داری مجھ پر نہ ڈال دیں، کہیں انہیں حقیقت کا
ادراک نہ ہو جائے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے رقت آمیز
لہجے میں کہا۔

”میں نے تو سلیم کی جان بچانے کی بڑی کوشش کی
لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا وقت پورا ہو چکا تھا۔“ اور
سکپاں لینے لگی۔

میرے شوہر کہہ رہے تھے۔ ”خدا کی رضا یہی تھی۔
اس میں تمہارا کیا قصور ہے۔“ اور مجھے یقین ہو گیا کہ انہیں
مجھ پر کوئی شبہ نہیں۔

لی ہے تم نے اپنی؟“ اس نے سر سے پاؤں تک مجھے دیکھا۔
 ”کیوں؟ کیا ہوا ٹھیک تو ہوں میں۔“ میں نے اس کا
 ہاتھ پکڑ کر مصروف پر بٹھا دیا۔ ”مسئلہ سے کب آئیں؟ اطلاع
 لکھی نہیں دی آئے کی۔“

”ایک ہفتہ ہو گیا ہے آئے ہوئے، یقیناً ناٹو ہماری آمد
 کے بعد گھر میں مہمانوں کی آمد شروع ہوئی وقت یہی نہیں مل رہا
 تھا تمہارے پاس آنے کا اور ویسے بھی میں تمہیں سر پرانز دینا
 چاہتی تھی۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

”ہم باتیں کر رہی تھیں کراہی؟ آگئیں۔“ آپا رافدہ بیٹی
 آئی ہے۔“ ای رافدہ کو دیکھ کر خوش دلی سے بولیں۔ ”کیسی ہو
 بیٹا؟“

”اللہ پاک کا بڑا کرم ہے آئی! آپ کیسی ہیں؟“
 رافدہ نے کہا۔

”رب کریم کا شکر ہے میں بھی ٹھیک ہوں۔“ اسی
 سامنے بڑے صوفے پر بیٹھے ہوئے بولیں۔ بڑوں سے سالن
 یکے کی محک اٹھی تو مجھے اگائی آگئی میں اٹھ کر دواش تین کی
 طرف بھاگی اور تے کر دی۔

رافدہ اٹھ کر میرے پاس آگئی۔ ”کیا ہوا تجھ؟“ اس
 نے میری پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

اس کے سوال کے جواب میں میں چپ رہی مگر اس کے
 منہ دھو کر اس کی طرف دیکھتی رہی، وہ میرا ہاتھ پکڑ کر صوفے
 تک لے آئی۔ ”اب میں تجھے کتنی تھاری آنکھوں کے گرد حلقوں
 کا سبب کون سا ماحول رہا ہے؟“ اس کے لہجے میں شوخی آگئی۔

”تیسرا شروع ہوا ہے۔“ میں شرم سے ہیر بھونکی بن گئی۔
 ”اچھا لڑکی تم باتیں کر دو میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔“

ای کچن کی طرف چلی گئیں۔
 ”ماشاء اللہ بہت بہت مبارک ہو، دلہا بھائی کا سنا وہ
 کیسے ہیں؟“

میں چپ رہی۔ رافدہ نے اپنا سوال دہرایا۔ میں کچھ دیر
 اس کی طرف دیکھتی رہی پھر پلٹ کر بولی۔ ”چنانچہ۔“
 ”کیا مسئلہ؟“ رافدہ چل پڑی پھر میرے پاس آکر
 میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تجربہ تھاری آنکھوں کی
 کمی بہت کچھ کہہ رہی ہے، لیکن میں تم سے سنتا چاہتی ہوں کہ
 ان خوبصورت آنکھوں میں آنسوؤں کے اسباب کیا ہیں؟“

میں رافدہ کے گلے گلے کر رونے لگی، وہ کافی دیر مجھے
 تھکیاں دیتی رہی، جب دل کا غبار پلکا ہو گیا تو میں نے
 کہا۔ ”میں پرسوں تمہارے ہاں آؤں گی تمہیں سب تفصیل

سے بتاؤں گی۔“
 ”اچھا ٹھیک ہے لیکن پلیز تم اپنا خیال رکھو۔ ایسی
 حالت میں کسی بھی قسم کی پریشانی تمہارے اور بچے کے لیے
 نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔“ اس نے میرا ہاتھ چومتے ہوئے
 کہا۔

وہ مجھے تسلی دلا سے دے کر اور چائے پی کر چلی گئی اور
 میں یادوں کی گیندوں پر چلتی ہوئی باسی میں چلی گئی۔

میرا گھر اپنا چار افراد پر مشتمل تھا۔ ای، ابو میں اور میرا
 چھوٹا بھائی زین جو مجھ سے دو سال چھوٹا تھا۔ ابوی بچوں کے
 کھلونے بنانے کی ایک چھوٹی سی فیکٹری تھی۔ عزیز رشتہ
 داروں میں ہمارا اکھرا نامب سے زیادہ خوشحال تھا۔ میری ایک
 ہی دوست تھی رافدہ، بہت پیاری اور ہنس کھ۔ کالج ہو یا کالج
 کی کینٹین۔ شاپنگ سینٹر ہو یا بیٹی پارک، جیتا بازار، کوئی فکشن
 ہو یا پارٹی۔ میں اور رافدہ ہر جگہ ایک انگوٹھی میں جھینے کی طرح
 جڑی رہتی تھیں۔ شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا تھا کہ ہم میں سے کوئی
 ایک اپنا ذاتی کام کسی ایک کنبیلی کے بغیر مجبوراً کرتی ہو۔ ورنہ
 کوشش دونوں کی یہی رہتی تھی کہ ہمارا کام اسی وقت تکمیل کو
 پہنچے جب ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر نکلیں یا شورے کے
 لیے سر جڑ کر بیٹھیں۔

ہم دونوں الگ الگ محلوں میں رہتی تھیں لیکن ایک ہی
 کالج میں پڑھتی تھیں اور ایک ہی کلاس میں بیٹھتی تھیں۔ ہم
 ایک جیسے ہی لباس پہنتے اور کھانے پینے خریداری کے معاملے
 میں بھی ہم خیال تھے۔ دونوں کی خواہش بھی یکساں تھی کہ کاش
 ایسا ہو جائے کہ ہماری ڈولیاں اور جنازے ایک ہی دن گھر
 سے نکلیں بلکہ ہم فن بھی ایک ہی قبر میں ہوں۔

لیکن اس بات پر بھی ہم متفق نہیں ہوئے کہ ہم دونوں
 کا شوہر بھی ایک جیسا ہی ہو بلکہ اپنے اپنے جیون سامی کے
 بارے میں مختلف رائے رکھتی تھیں۔ مجھے پان کھانے والے
 ہماری بھر کم اور کالے کلوئے مردوں سے سخت نفرت تھی۔ میرا
 خیال تھا کہ بڑی تو عمر دونوں کی وجاہت پر بدنام داغ ہے۔ اور
 اس پرستار زبان سے نکلیں دانت اس کی بدصورتی میں اضافہ
 کرتے ہیں۔ بس میں تو چاہتی تھی درمیانہ قد ہو، رنگت بالکل
 صاف نہ ہو تو کم از کم گندی ضرور ہو اور نین نقش ایچے ہوں۔ مجھا
 بالکل نہ ہو۔ ایسا تھا میرا آئیڈیل۔ ایسی خوبیاں میں اپنے
 شریک سفر میں دیکھنا چاہتی تھی۔

رافدہ ذرا شاعرانہ خیالات کی مالک تھی اس کا کہنا
 تھا۔ ”مرد ایسا ہو کہ عورت سے قد میں چھوٹا نہ نلے۔ مردانہ

وجاہت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہو۔ ٹائٹس اتنی لمبی نہ ہوں کہ
 اونٹ یاد آجائے اور دانت اتنے بڑے نہ ہوں کہ ہانگی نظروں
 کے سامنے جھومنے لگے بلکہ ایک دم سفید، انار کے دانوں کی
 طرح جڑے ہوئے ہوں۔ ہمدرد ہو کر کے کام کاج میں ہاتھ
 بنانے والا ہو۔ ایسا نہ ہو کہ سر میں درد ہمارے ہو اور چائے
 اسے چاہیے۔ صبح صبح بچوں کو تیار کر دوا دے۔ کبھی کبھار چادر
 کچلے غلاف وغیرہ تبدیل کر دوا دے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ طبیعت
 خراب ہو تو کھانا اگر نہ بنا سکے تو ہو سکے سے لانے پر مت نہ
 بنائے۔ اگر یہ خوبیاں ہوں تو معمولی شکل و صورت والے سے
 بھی جمنا کر لوں گی۔“

غرض ہم دونوں نے اپنے اپنے آئیڈیل بنا رکھے
 تھے۔ آئیڈیل تراشنے میں فی دی ڈراموں اور فلموں کا بھی
 بہت بڑا ہاتھ تھا۔ وجہ ترین تو جوانوں سے اداکاری کرانے
 والے ہم جیسی لڑکیوں کے دل میں آئیڈیل کا جنون بھرتے
 ہیں۔ میں بھی ایک لڑکی ہوں اسی لیے میں نے آئیڈیل کے
 بھوت کوسر پر سوار کر لیا تھا۔

جہاں میری ہوتی ہے وہاں پھر تو آتی ہی رہے ہیں۔
 رافدہ کے گھر پہلا ہی پتہ ایسا آیا کہ نشا نہ ٹھیک ٹھیک لگا۔
 منزل میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو رافدہ اپنے آئیڈیل میں دیکھتی
 تھی۔ اچھا کھانا پیتا تھا اس کا سر پر یہ کہ اس کا مسئلہ میں
 اپنا کاروبار تھا۔ وہ صورت و شکل آن بان وجاہت میں کسی
 ریاست کے شہزادے سے کم نہیں تھا۔ گویا رافدہ کو اس کے
 خوابوں کی تعبیر مل گئی اور چٹ مگنی، پٹ بیاہ کے صداق اس
 کی شادی ہو گئی۔

رافدہ خوشی سے پھولے نہیں سارے تھی۔ میں بھی اپنی
 دوست کی خوش قسمتی پر نازاں تھی اسی خوشی میں نہ جانے کتنی بار
 رافدہ کی قسمت پر رشک کرتے ہوئے بنی سنوری دلہن کو اپنی
 ہاتھوں میں جکڑ کر اس کے دولہا کی تقریروں کے پلے بانعہ
 دیتے۔

میں وقتے وقتے سے دلہا کے خدو خال، شانہ و قار اور
 برأت کی آمد کا آنکھوں دیکھا حال سرگوشی کے انداز میں رافدہ
 کے کانوں میں پھونکتی رہی۔ ایک تو دلہن اس پر میرا انداز بیاں،
 سرخی اس کے گالوں میں ایسی سائی کہ تمام رعنائیاں شرابا کرہ
 نکلیں اور پھر اپنی خوش قسمتی پر ناز کرتے ہوئے، رافدہ، میری
 دوست مجھے تنہا چھوڑ کر مسئلہ چلی گئی۔

ایک وہی میری دوست تھی، کسی اور سے ایسی قربت
 نہیں تھی اس لیے میں اس کی کثرت سے محسوس کرنے لگی

تھی۔ یوں بھی اس کے جانے کے بعد میں نے خواب دیکھنے
 کی عادت بنالی تھی۔ ہر وقت خوابوں کے درمیان گھری رہتی
 تھا اس کے سیلاب ہر وقت مجھے اپنے ہماؤں میں رکھتے۔
 میں سوچتی وہ بھی کیا دن ہوں گے جو سارے کے
 سارے میرے اپنے ہوں گے۔ راتیں جواں ہوں گی اور
 تنہائیاں دل کے پہلا دے کا سامان ہوں گی۔ ہر ساعت پر
 صرف میری اجارہ داری ہوگی اور زندگی میں رنگ اترا نہیں
 گے۔

پھر ایک دن میرا بھی رشتہ آگیا۔ میں نے اکثر عزیزوں
 سے سنا تھا کہ طارق بہت بااخلاق اور اچھی خصلتوں کا مالک
 ہے لیکن اڑتے اڑتے یہ خبر بھی مجھے تک پہنچی کہ ادا ہی ہر دم اس
 کے چہرے پر گہرے ہادوں کی طرح چھائی رہتی ہے۔ چپ
 نے ایک دم اسے مٹی کا دھو بٹا دیا ہے۔ میں نے کئی بار سوچا کہ
 آخر اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے آخر ایسا کون سا غم ہے؟ کہیں یہ
 شادی طارق کی مرضی کے خلاف تو نہیں ہو رہی؟ کہیں ایسا تو
 نہیں کہ اس کے دل پر کوئی اور لڑکی راج کر رہی ہو؟ اس کے
 والدین اپنی پسند اپنا حق اس غریب کے ارا مانوں کا خون کر
 کے اس پر مسلط کر رہے ہوں اگر ایسا ہوا تو شادی تو ہو ہی
 جائے گی لیکن میں حقیقی خوشیوں سے ہمیشہ کے لیے محروم
 رہوں گی۔ میں نے اس خدشہ کا اعتراف ہی کیا۔ اسی نے
 ایک دن باتوں باتوں میں طارق کے چہرے پر چھائی مردنی
 کا ذکر اس کے والدین سے کر ہی دیا۔ جواب میں طارق کی
 والدہ نے کہا۔ ”یہ بات ہم نے بھی محسوس کی ہے جب طارق
 سے پوچھا تو اس نے کہا یہ گھرانا اور تصویر میں دکھائی جانے
 والی لڑکی اسے اتنی پسند آئی ہے کہ اس پسند نے خوف کو ختم
 دے دیا ہے کہ کہیں یہ رشتہ ٹوٹ نہ جائے اور کوئی بات
 نہیں۔۔۔۔۔۔ اگر خدا خواستہ کوئی اور بات ہے بھی تو ہماری
 ہونے والی شوخ و چنچل اور پیاری سی بہو اس شہید کی کیاری
 میں خوشیوں کے پھول کھلا دے گی۔“

عورت ٹھہری تقریروں کی بھوک، شوخ و چنچل وغیرہ جیسے
 القاب اپنے بارے میں سے تو میرے تمام دوسرے بھاپ کی
 طرح اڑ گئے اور جو یہ کہنا کہ میں اپنے سرالیوں کی تنہا
 ضرور پوری کروں گی۔
 میں ہر روز اسے کمرے میں آکر طارق کی تصویر دکھاتی،
 ہر زاویے سے دیکھتی پر کبھی رہتی۔ تصویر میں وہ عمر میں مجھ سے
 تھوڑا سا بڑا لگتا تھا۔ نین نقش بھی اچھے لگ رہے تھے۔
 قد و قامت اور جسم کے سائز کا اندازہ تصویر چھوٹی ہونے کی وجہ

سے نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ایک پاسپورٹ سائز کی تصویر تھی جس میں صرف چہرہ اور سینے کا کچھ حصہ نظر آتا تھا۔ آنکھیں سمجھوری سمجھوری تو نہ تھیں لیکن بال جلتے تھے۔ گھٹنر والے نہ سکی سائڈوں سے خم کھائے ہوئے تھے۔

”بہی جناب! کبھی تو ایسا موقع فراہم کریں کہ میں جناب کا دیدار کر سکوں صرف دیدار یا یہ دیدار پھر شادی کے بعد ہو گا۔ بڑے کھنور ہیں جی.....“ میں تصویر سے ہاتھیں کرنے لگتی۔ میرا بس چلتا تو میں اس خواہش کو کھر کے افراد کے سامنے رکھتی کہ ایک بار صرف ایک بار میری قسمت کے اس خریدار کا کھنوا دکھا دیں۔ میرے دوسوں اور در بدر بھگتی سوچوں کو وہ راستہ مل جائے جو میرے آئیڈیل کی طرف جاتا ہے پھر جب جاہن شادی کر دیں۔ لیکن میں ایسا صرف سوچ سکتی تھی کہ نہیں سکتی تھی کیونکہ ہمارے معاشرے کے اکثر گھروں نے بعض معاملات میں عورت کو صرف سوچنے تک محدود کر دیا ہے اور کنواری لڑکی پر کچھ زیادہ ہی زبان بندی کا قانون نافذ ہے۔ معنی ہونے چہ ماہ گزر گئے اور میں چاہے ہوئے بھی بھگتیر کو بند نہ کر سکی۔

وقت کے پاؤں میں بیڑیاں کون ڈال سکا ہے وہ تو بڑھتا ہی رہتا ہے اور بڑھتے بڑھتے وہ گھڑی بھی لے آیا جب ہر لڑکی کی طرح مجھے بھی بائبل کے گھر کو خیر آباد کہنا پڑا۔

بیلے کی کلیوں سے بنی ہوئی جھاروں اور گلاب سے ڈھکی جی معطر بیج کے حوالے کر کے مجھے سب لڑکیاں اور افراد خاندانی دہلی گئی کے ساتھ ایک ایک کر کے کھسک گئے۔ مجھے ایسا لگا جیسے جاتے جاتے سب بھی کہہ گئی ہوں کہ کوسنجالو یہ رات..... ہر لڑکی کی زندگی میں ایسی رات آتی ہے جہاں دنیا کے نظرات اور غم خود بخود بخود متعین ہو جاتے ہیں صرف خوشیوں کی سکرانی رہ جاتی ہے۔ ارمان سرگوں ہو کر عزم بھاللاتے ہیں اور یہی وہ رات ہوتی ہے جہاں عورت اپنے گوبر غر شرط طور پر اپنے سر کے تاج پر لٹاؤتی ہے بلکہ لٹاتی رہتی ہے کہ یہی میرا محافظ بھی ہے سکران بھی اور مجازی خدا بھی۔ لیکن یہاں معاملہ آئیڈیل کا بھی تھا۔ ایسا شوہر جس کا خواب میں نے جوانی کی سرحد پر قدم رکھتے ہی دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

دروازے کی چڑچڑاہٹ اور قدموں کی چاپ نے طارق کی آمد کا اعلان کیا۔

چہ ماہ کی کر دوشیں یعنی منظر پر خواہش میری آنکھوں سے باہر نکلنے کے لیے تڑپ تڑپ ہی گئی۔ سوچا ایک نظر تو کچھ لوں کہ وہ کیسے لگ رہے ہیں؟ کسی ظلم کے ہیرو کی طرح یا کسی

شہزادے کی طرح۔ میں نے پگھلیں اٹھانا چاہیں لیکن ایسا لگا جیسے جیاد اور شرم من من کے پھرن کر پگھلوں پر براہمن ہو گئے ہوں پگھلیں اٹھانے نہ آئیں۔ وہ میرے سامنے بیٹھ گئے لاجت اور شرمناہٹ سے میں اپنے آپ میں سکڑتے سکڑتے چھوٹی موٹی بن گئی، نگاہیں ایک بار پھر پگھلوں کا نقاب اٹھانے کے لیے بے چین ہو گئیں لیکن پھر اٹھتے اٹھتے قلاب کی لپیٹ میں آکر کاپی نہ گئیں۔

”آداب۔“ طارق نے بہت ہی آہستگی سے کہا۔ گھونگھٹ کی اوٹ میں، میں شرم سے سرخ ہو رہی تھی۔

”مجھے طارق شہزاد کہتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کو نچر کہتے ہیں، جواب بچہ طارق بن گئی ہیں۔“

طارق نے میرا نام اس انداز سے لیا کہ میں زیر لب مسکرا دی۔

وہ کچھ دیر چپ رہے۔ لمحوں پہ لمعے ڈھیر ہوتے رہے ہرگز تامل دل کی دھڑکنوں کو زیر و زبر کر رہا تھا۔

ان کی آواز ایک بار پھر میری ساعت سے ٹکرائی۔ ”اب ہم اسے جتنی نرے نہیں کر زبان ہم کھائی سے پرہیز کرے اور نگاہیں شرمناہٹ کا بہانہ بنا کر پگھلوں کے شامیانے میں قید کر لی جائیں۔“

میں نے دل ہی دل میں طارق کے لہجے کی شائستگی اور شاعرانہ انداز گفتگو کی تعریف کی لیکن جیتنے اپنے بچوں میں ایسا جکڑا کہ میں خواہش کے باوجود بھی خود کو اس حصار سے باہر نہ نکال سکی۔

”اچھا تو میں چلتا ہوں۔“ اچانک میری نظریں انہماکی قوت کے ساتھ اوپر اٹھ گئیں اور طارق کی باچھیں کل گئیں۔ ”یہ کیا۔“ اچانک میرے ذہن کو جھٹکا لگا۔ طارق اپنی آواز کے برعکس بے ہتکم اور بے ڈول سا تھا سراسر میرے آئیڈیل کی ضد۔ ایک نظر صرف ایک نظر سے میرے آئیڈیل کا بت دھڑام سے زمین پر آگرا۔ میرے ارمان و احساسات کا آئینہ کچھ کچھ کچھ ہو کر بد نما کسی پیش کرنے لگا۔ طارق سانولی رنگت کا ایک عام سا آدمی تھا۔ جس کے چھوٹے قد پر موٹا پابہت بڑا لگ رہا تھا۔

جو تصویر مجھے دکھائی گئی تھی، سامنے کھڑے آدمی کا چہرہ پینک دہی تھا لیکن تصویر میں چہرہ صاف تھا بال سلیقے سے بنے ہوئے تھے لیکن جو آدمی میرا شوہر بن کر آیا تھا اس کی رنگت گہری سانولی اور بال بے ترتیب سے تھے۔ ”انتا بڑا دھوکا۔“

میرے ذہن میں دھماکا سا ہوا۔ یعنی تصویر کو فوٹو شاپ میں صاف کیا گیا تھا؟

خوشیوں سے لبریز اور اربانوں سے بھی میری زندگی میں آئی اس رات نے مجھے لرزا کر رکھ دیا۔ میں اندر ہی اندر زور سے چنکی۔ ”نہیں نہیں میرے خوابوں کو اتنی بد نما تعبیر نہیں مل سکتی۔“

میری ذات میں اتنی ٹوٹ پھوٹ ہوئی کہ شب عروسی کبرام میں تبدیل ہو گئی۔ شوہر کی آمد پر طلوعِ صبح کی طرح جو مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی اب ان ہونٹوں پر غلام غم کی داستان مرتب ہو گئی۔ آنسوؤں نے تمام دلوں کو تازیوں کی طرح ٹھنڈا کر دیا تھا۔ وہ شہزادہ نہ جانے کہاں کھو گیا جس کی آواز ساتوں میں رس گھول رہی تھی۔ سوچیں، تھوڑا دیر میں میرے ذہن پر بڑی طرح برسنے لگیں۔ سہاگ رات ہے یہ؟ نہیں نہیں، یہ تو خیر شوہنشاں ہے اور مجھے ایک دیے کی صورت ٹوٹی پھوٹی قبر پر رکھ دیا گیا ہے کہ سنگلستی رہ ساری زندگی، یہی تیری قسمت ہے اور یہی ہے تیری جاہت اور خواہش کا انعام اور یہی ہے سانولی رنگت والے چھوٹے قد کے موٹے آدمی سے نفرت کرنے کی ہزا۔

پھر یہ رات مجھے مجھے بدن اور سرد و جذبات کے ساتھ بے رنگ ماحول اور وجود کی باقی خوشیوں کے ساتھ گزرنی مجھے ایسا لگا جیسے کسی جلاد نے قانونی اور شرعی پسند اڈال کر تختہ دار پر چڑھا دیا ہو۔ میں جس کی تصویر کے ساتھ تھنٹوں بیٹھ کر باتیں کیا کرتی تھی، معاملہ اب الٹ ہو گیا تھا۔ میرے زور و آواز سے زبان مل گئی تھی جب کہ میری قوت گوئی بھن گئی۔ خاموشی کو میں نے اپنا شعار بنالیا، ولیمہ والے دن ایسی چپ لگی کہ میں بت بن گئی اور پھر میں نے گوشت تھائی کو گوشت عافیت سمجھا۔ نہ کسی سے بات چیت اور نہ ہی کوئی مشغلہ۔ میرے چہرے کی درد انگیزی اور افسردہ نگاہی تمام اہل خانہ کے لیے معائنہ گئی تھی۔

میں نے بار بار سوچا کہ سسرالیوں کی اغشی ہوئی سوالیہ نظروں کا کیا جواب دوں کیسے جواب دوں؟ ”کیسے بتاؤں آئیں کہ میرے اربانوں کی برأت تو دو چار قدم بھی نہ بڑھنے پائی تھی کہ لٹ گئی۔ میرا محافظ ہی میرے نصب العین کا قاتل نکلا اور اس کے ہمنوا اور ہم کوئی اور نہیں میرے ہی گھر والے تھے کیونکہ میرے سوا سب نے تو شادی سے پہلے طارق کو دیکھا تھا۔ میں نے تو صرف تصویر دیکھی تھی اور تصویر سے اندازہ کہاں ہوتا ہے کہ بندہ گورابے یا کالا۔ آج

کل تو کمپیوٹر سے چند منٹ میں سانولے چہرے کو گورا کیا جا سکتا ہے حتیٰ کہ مہر اسٹائل تک تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ کاش..... کاش..... مجھ پر یہ ظلم کرنے سے پہلے وہ بتا دیتے کہ تصویر فوٹو شاپ پر بنائی گئی ہے تو میں جان دے دیتی لیکن ساری زندگی اس عذاب کے جال میں نہ نہ جھکتی۔ میں جتنی بھی کہ ایک بیٹی ہونے کی حیثیت سے بیٹی کی خواہش کا احترام والدین کے نزدیک کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے لیکن انہوں نے اسی پرانی روایت کو برقرار رکھا کہ والدین کا فیصلہ اہل اور افضل ہے۔ میرے ذہن میں اربانوں کی بیچ گونج رہی تھی کہ اب آکر دیکھو تمہارے اہل فیصلے نے زندہ لاش بنا دیا ہے مجھے۔ تمہارے فیصلے کی لو مجھے شمع کی طرح یوں یوں پگھلا رہی ہے اور میں ایک دن ایسے ہی ختم ہو جاؤں گی لیکن طارق کو اپنا نہ بنا سکوں گی، میں اس کی ہو کر بھی اس کے لیے غمیر ہوں۔“ میں اپنی ذات کے اندھا صبا میں بھگتی، بیچتی چلائی رہ گئی۔ طارق نے ہر ممکن طریقے سے مجھے خوش رکھنے کی کوشش کی تحائف لاتا تفریحی پروگرام بناتا لیکن میری نفرت، محبت میں تبدیل نہ ہوئی۔ میں طارق کو دیکھتی تو خود میں غیظ و غضب کے الاؤ دیکھتے محسوس ہوتے، مجھ پر ہڈیانی کیفیت طاری ہو جاتی۔ میں اس سے کہتی مجھے تمہا چھوڑ دو مجھے تنہائی چاہیے۔ جب میں نے الگ تھک رہنا ترک نہ کیا اور اسی کی چادر اتار کر نہ بھگتی تو دونوں گھروں کے افراد نے سمجھانے کی کوشش کی۔ ڈاکٹروں کو دکھایا، حزاروں پر لے جا کر جھڑپ ہو کر کرائی۔ تصویر نگار کے ڈالے گئے۔ پڑھ کر پانی پلایا گیا لیکن خاموشی کو زبان نہ ملی میری ذات میں ٹھہرے سکوت میں اچھل نہ ہوئی۔ ان کے اس عمل پر میں دل ہی دل میں مسکرائی کہ مرمجھاکی ہوئی کلی سے شگفتگی کی امید کرنا بیکار ہے۔ دم توڑتے ہوئے مریض سے سلسلہ گفتگو کی امید کیوں رکھتے ہو تم سب؟ میں بس سے مس نہ ہوئی، ایک ماہ گزر گیا۔ میں رات و دن کی تیز کھوجی تھی۔ میں اضطراب کی دلدل سے باہر نہ نکل بلکہ جھنپتی ہی رہی۔ کئی مرتبہ سوچا ایسے کب تک خاموشی کی مہر محبت کے پڑی رہوں گی۔ طارق کو آگاہ کر دینا چاہیے کہ تم خزاں ہو اور میں بہار۔ تم زوال ہو اور میں عروج، تمہارے وجود کے اندھروں میں میری آنکھوں کی روشنی فتن ہو گئی ہے۔ تم بوڑھے ہو طارق، ایک دم بوڑھے۔ اپنی ہر برات زمین بنانے سے آدمی جوان نہیں بنتا۔ جوانی کی کریمیں شکل سے پھوٹی ہیں اور تمہاری سانولی رنگت اور نائے قد نے تمہاری جوانی کو نکال لیا ہے۔ روز سوٹ بوٹ پہن کر تم اپنے چہرے کی

کا لک کو ختم نہیں کر سکتے۔ قلعے چلانے سے محروم نہیں ہو جاتی۔ بول کے درخت گلاب کے پودے میں لگانے سے خوشبو نہیں دیتے۔ میں کہتا ہوں بونے چاند کے ساتھ گزارہ نہیں کر سکتی۔ تمہارا چہرہ لمحہ بہ لمحہ میرے اراٹوں اور میرے وجود کو چھلنی کرتا ہے۔

چند دن مزید گزر گئے۔ ایک دن بازار میں شاپنگ کے دوران ایک لڑکے پر میری نظر پڑی۔ اب یہ اتفاق ہی ہے کہ جس وقت میری اس پر نظر پڑی وہ بھی میری طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ہو، ہو میرے خوابوں کے شہزادے جیسا تھا۔ میرے دل نے کہا۔ ”نجمہ یہی ہے تمہارا آنیڈیل جس کے تم خواب دیکھتی تھیں۔ یہی سوچ ہے اس سے پہلے کہ آنیڈیل نظروں سے اوجھل ہو جائے وقت کے ہاتھوں سے اپنا آنیڈیل چھین لو۔“ اچانک طارق کا خیال ذہن سے گزرا۔ ضمیر نے کہا۔ ”اب تم کسی کی منکوحہ ہو تم پر صرف تمہارے شوہر کا حق ہے۔“ دل نے کہا۔ ”طارق تمہاری جوانی کے قتل میں ٹاٹ کا بیوند ہے اسے چھوڑ دہائی پسند کا خیال رکھو۔“ ضمیر نے احتجاج کیا۔ ”نجمہ اپنے لئے مشکلات کھڑی مت کرو۔“ میں دل اور ضمیر کی جنگ میں تھمتے ہوئی تھی کہ اس کے کھٹکھٹانے سے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ وہ زیر لب مسکرا رہا تھا۔ اتفاقاً نظروں کا تصادم اور اس کی مسکراہٹ ہمیں ایک دوسرے کے قریب لے آئی۔ اس کا نام ابجد تھا۔

وہ میری زندگی میں کیا آیا میری دنیا ہی بدل گئی۔ میں ہر ہفتے اس سے ملنے جانے لگی۔ میں اس کی قربت میں اپنا آپ بھی بھول جاتی تھی۔ پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ میں نے تمام حدیں پار کر لیں پھر تو یہ سلسلہ راز ہو گیا۔

ابجد ہر ملاقات کے بعد گھر آ کر میں خاموشی اختیار کر لیتی۔ مجھے طارق سے چڑھنے لگی تھی میں اس سے نجات کے طریقے سوچنے لگی۔ کچھ سمجھ نہیں آتا تھا کہ کیا کروں ایک دن سوچے سوچے میرا ذہن بری طرح کھول اٹھا، سوچیں انگارہ بن گئیں تو میں نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ نہاہ کر سکتی تھی اور نہ ہی خودکشی تو پھر کیوں محرا نشین بن کر پڑی رہوں۔ کیوں زمانے سے کٹ کر گوشہ نشین ہو جاؤں۔ آج ہی کیوں نہ میں اس شب ظلمات کو خدا حافظ کہہ کر ہمیشہ کے لیے ابجد کا ہاتھ تمام لوں۔ ایک دن میں نے چند ضروری کپڑے اپنی میں رکھے اور چل پڑی۔ اسی کے گھر آ کر میں آزادی محسوس کرنے لگی۔ ایک دن میں ابجد سے ملنے گئی تو اس کے گھر کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے اس کے

موبائل نمبر پر کال کی تو وہ بند ملا۔ پڑوس سے معلوم کیا تو پتا چلا وہ اور اس کے گھر والے پنجاب چلے گئے ہیں۔ یہ مکان کرائے کا ہے جو انہوں نے چھوڑ دیا ہے۔ یہ سننا تھا کہ میرے ہاتھ پاؤں خنڈے ہونے لگے۔ ابجد صرف چند دن کے لیے میری زندگی میں آیا تھا۔ جگنو کی طرح چکارو شنی کا جھماکا سا ہوا اور پھر تار بگی۔ میرے اندر ایک بیج سی ابھری۔ نہیں نہیں وہ مجھے بتائے بغیر نہیں جاسکتا مجھے پکڑ سا آیا اور میں دیوار کا سہارا لے کر وہیں بیٹھ گئی۔ پڑوس کی اوچھڑ عمر عورت نے مجھے پانی پلایا، حواس بحال ہوئے تو واپسی کی راہ لی۔ وہ دن اور آج کا دن مجھے ابجد بھی نظر نہیں آیا۔

☆☆☆

میں کافی دیر تلخ و شیریں یادوں کی جھلنوں پر بھٹکتی رہی۔ گھر کی دیواروں پر شام آتی تھی اسی رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ وہ شام بھی گزشتہ بے کیف شاموں کی طرح گزر گئی۔ کھانے کا سوڈا نہیں تھا لہذا میں بغیر کھانا کھائے سو گئی۔ صبح راتھ کے گھر چلی گئی، وہ تو مجھے میرے انتظار میں بیٹھی تھی۔

”آؤ نجمہ! آؤ کیسی ہو؟“ اس نے مجھے دیکھتے ہی گلے سے لگا لیا۔

”بس جی رہی ہوں اپنی ذات کی تنہائیوں کے ساتھ۔“ میں نے افسردہ دلی سے کہا۔

”کیا ہوا نجمہ! اتنی اداس کیوں ہو؟ آج مجھے کمل کر بتاؤ سب کچھ۔“ وہ ہمارے مجھے جو کہتی تھی۔

”کیا کرو گی میرا دکھ جان کر۔“ میں نے خنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”میرا دکھ تو ہواؤں پہ لکھے گیت جیسا ہے جسے نہ کوئی سننے والا ہے نہ کوئی سمجھنے والا۔“

”پھر بھی کچھ تو بتاؤ تمہارے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔“ راتھ نے اصرار کیا۔ ”آج مجھے سب کچھ بتا دو، آج ویسے بھی گھر پر کوئی نہیں ہے سب لوگ میری نند کے گھر گئے ہوئے ہیں۔“

راتھ کے گھر زور اصرار پر میں نے اسے مختصر آتا دیا۔ وہ کچھ دیر سکتے کی کیفیت میں بیٹھی رہی پھر بولی۔ ”مجھے اسی سے تمہارے سسرال چھوڑ کر آنے کا پتا چلا تھا، لیکن آخر ایسی کیا وجہ تھی کہ تم نے اتنا بڑا قدم اٹھا لیا؟“ اس نے تنجب ہو کر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

میں کچھ دیر چپ بیٹھی رہی میری آنکھیں نم ہونے لگیں۔ ”میرا جھوٹ مجھے اس طرح ذلیل اور شرمندہ کرے گا

مجھے علم نہ تھا راتھ! ”میری آواز آنسوؤں میں بھیک مگنی۔

”کیسا جھوٹ بولا تھا تم نے؟“

”تم تو جانتی ہو کہ میں نے جیون ساتھی کے لیے کیسے مرد کا تصور رائے خوابوں میں بسایا ہوا تھا۔“ میں نے اسے بتانا شروع کیا۔ ”لیکن مجھے میرے خوابوں کی تعبیر اس کے برعکس ملی۔ طارق میرے آنیڈیل کی ضد ہے۔ وہ کسی بھی پہلو سے میرے نصب العین پر پورا اترتا تو میں اس سے نباہ کر لیتی، یاں کھائے پیلا دانت، سانسوں میں کپڑوں میں اور انگلیوں میں سگریٹ کی تباہ کو کی رچی بوند، خیر اس کا تو سدھار ممکن تھا لیکن اس کے چھوٹے قدم گھر کی سمانوئی رحمت نے میرے خوابوں کو بھروسے تلے پھل ڈالا، میرے آنیڈیل کا رقیب بنا دیا۔ طارق ہر دم مجھے زہر لگنے لگا۔ راتھ کیا صرف اچھا کامیاب ہی سب کچھ ہوتا ہے؟“ مجھ پر بڑبائی کیفیت طاری ہونے لگی راتھ نے مجھے پانی پلایا۔ میں کچھ دیر چپ بیٹھی رہی راتھ بھی چپ بیٹھی تھی شاید وہ مجھے دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع دے رہی تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے کہا۔

”وہ جب بھی میرے سامنے آتا میرے آنیڈیل کی مجھے بہت یاد دلاتی۔ میں تسطوں میں گرے لگی تھی راتھ! وہ میرے قریب آتا تو مجھے دشت ہوئی۔ میں لرزے لگتی۔ عذاب مجھ پر اترنے لگتے۔ مجھے ایسا لگتا جیسے کسی مہیا تک جنگل میں مجھے کسی خونخوار جانور کے سامنے چھوڑ دیا گیا ہو۔ مجھے سگریٹ کی متھفن سانسوں سے تپنے لگی، ابجد سے مل کر آتے ہی میری کیفیت بدل جاتی تھی اور میں طارق سے نجات کا راستہ ڈھونڈنے لگی پھر کئی دن گزر گئے سوچے سوچے پھر ایک دن ایسا خیال ذہن سے گزرا کہ مجھے دلی خوشی حاصل ہوئی۔ وہ خیال یہ تھا کہ طارق کو خود سے متفر کرنے کے لیے میں ایسا جھوٹ بولوں کہ جھوٹ ثابت بھی ہو جائے تو تب بھی مجھے طارق قبول نہ کرے۔ اسی دن میں نے امی سے چھینکتے ہوئے کہا۔ ”امی طارق اپنی پرستوں کے لیے مجھے اپنے پاس کے پاس بھیجنا چاہتا تھا اور مجھے کہتا ہے اس بات کا ذکر کرے اور سے مت کرنا ورنہ طلاق دے دوں گا۔ میں اس کی یہ گھٹیا خواہش پوری نہیں کر سکتی تھی اس لیے اسے چھوڑ کر آگئی ہوں۔“ میں نے امی کے سامنے من گھڑت جھوٹ کو آنسوؤں سے تر کر کے بتایا۔ امی کچھ دیر پھر کاہنہ بنی مجھے دیکھتی رہیں۔ تنگ کی لکیروں نے ان کے چہرے پر جال سا بن دیا۔ کچھ دیر بعد ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی ٹوٹی اور ان کے جھریوں زدہ چہرے میں گم ہو گئی۔ ماں میں وہ میری۔ اپنے فیصلے پر ندامت

اور پشیمانی کا احساس انہیں صدے سے دو چار کر گیا۔ ابوائے فیصلے پر الگ تادم تھے۔ یکے میں میرے مسلسل قیام پر لوگ طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔ امی نے ایک دن پڑوس سے کہا پڑوس نے دوسرے گھروں میں چھوٹا کاس طرح بات محلے رشتہ داروں سے ہوئی ہوئی میرے سسرال تک جا پہنچی۔ میں بھی یہی چاہتی تھی لیکن طارق نے تصدیق کی نہ تردید۔ ساس آئیں نہ سسرال نہ طلاق نامہ آیا۔ ابجد زندگی میں آیا لیکن وہ بھی بغیر بتائے نہیں چلا گیا۔ میرا دل کہتا ہے وہ آئے گا ایک نہ ایک دن ضرور آئے گا۔ اسے میری محبت سچ لائے گی۔“

”وہ اب کبھی نہیں آئے گا نجمہ!“ راتھ نے خفیف لہجے میں کہا۔ ”بہتر ہے تم اسے... بھول جاؤ، وہ اپنے مفادات کا



میں، قاری، بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک نیا اور منفرد سلسلہ باتیں بہار و خزاں کی پیش کیا جا رہا ہے جس میں ہر قاری بہن دے گئے سوالوں کے جوابات دے کر تشویلیت اختیار کر سکتی ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

تو قارئین آج ہی ماہنامہ پاکیزہ اپنے باکرے بک کروالیں

ترجمان بن کر تہاری زندگی میں آیا تھا۔ وہ ایک سایہ تھا جو تمہیں بیوقوف بنا کر وقت کی تاریکی میں گم ہو گیا۔ اب بس تم اپنے شوہر کے بارے میں سوچو، وہی تہاری پریشانی ختم کر سکتا ہے۔“ پھر سانس لے کر رافہ نے کہا۔ ”پہلی طلاق تم سے محبت کرتا ہے مجھے امید ہے وہ مجھیں معاف کر دے گا جس اب جو میں پوچھتی جاؤں مجھے وہ بتائی جاوے سب سے پہلے تو یہ بتاؤ تمہارے ساس سرکار وہ تہارے ساتھ کیا تھا؟“

”بہت ہی اچھا میری خاموشی، چڑھے پن، زیادتی اور بعض مرتبہ فیملیوں کو بھی خندہ پیشانی سے برداشت کیا انہوں نے لیکن جب میں یہاں آ رہی تھی تو صرف ساس نے مجھ سے پوچھا تھا۔“ کہاں جا رہی ہو بیوہ؟“

”اپنے گھر۔“ میں نے اختصار سے کا لیا۔

”کون سا ناگھر، کیا تمہارا کوئی دوسرا گھر بھی ہے؟“

”ہاں کے گھر جا رہی ہوں۔“

”خیر ہمیں اس قابل نہ سمجھو لیکن کیا طلاق سے اجازت لے لی تھی؟“

”میں واپس آنے کے لیے نہیں جا رہی ہوں۔“ میں نے زہر خنداؤں سے کہا تھا۔

”کیوں کیا غلطی ہوئی ہم سے؟ طلاق سے؟“ میری ساس نے حیرت سے مجھ کو دیکھا تھا۔

”غلطی میری سمجھ میں نہیں والدین کی جنہوں نے مجھے جنت سے نکال کر جہنم میں ڈھیل دیا۔“

”اگر تہاری ماں نے کہا کہ واپس جاؤ اس جہنم میں تو پھر.....“

”دنیا بہت بڑی ہے اور یہاں سے جانے کے بعد اپنی بقیہ زندگی کے بارے میں سوچنا میرا اپنا مسئلہ ہے۔“ مجھے کوفت ہوئی تھی۔

”ٹھیک ہے جاؤ لیکن یہ یاد رکھنا کہ اس گھر سے کوئی بھی نہ جائے گا جہتیں واپس لانے اور تم خود آئیں تو تہاری وہ تو قیر نہ رہے گی ہماری نظروں میں جواب بھی قائم ہے۔“ میری ساس نے منہ پھیرتے ہوئے کہا تھا۔

”میں نے کوئی جواب نہ دیا اور گھر کی دلہیز باری کر گئی۔“

”تمہارے مسلسل روکنے پن سے اتنا کہ طلاق نے کبھی ابھرنے کا ارادہ نہیں کیا؟“ رافہ نے پوچھا۔

”اب ماضی کو دہرانے کا فائدہ!“

”ہے بھئی..... وہ پرانے کا فائدہ ہے“ رافہ نے ایک

ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”میں یہ سوالات اس لیے کر رہی ہوں کہ تہاری واپسی کا کوئی راستہ نکال سکوں اور یہ راستہ اس وقت نکل سکتا ہے جب تمہارے شوہر اور سسرالیوں کے ذہن اور دل کے بارے میں مجھے کچھ علم ہو۔“

”مجھے نہیں رافہ! طلاق نے مجھے ہر کا دامن نہیں چھوڑا تحمل حراجی ان کی زندگی کا حصہ ہے۔ وہ بے انتہا قوت برداشت کے مالک ہیں، شادی کی پہلی رات.....“ رافہ کو بتاتے ہوئے ایک بار پھر میری آنکھیں اور لہجہ جھینٹے لگا۔

”جب میں نے طلاق کو دیکھا تو میرے خوابوں کا کل چٹنا چور ہو گیا میں رونے لگی، ظاہر ہے وہ میرے رونے کا سبب نہ مجھ

پائے کا اصل وجہ کیا ہے تو انہوں نے میرے سر دھکا کیا ہاتھ اپنے تجھے ہوئے ہاتھوں میں لیے ہوئے کہا۔ ”انسان پیدا ہونے کے بعد پہلا قدم دنیا میں رکھنا ضرور ہے لیکن اصل زندگی کی شروعات شادی کے بعد ہوتی ہے اور ہم اس از دوامی زندگی کی بنیاد پیارا اعتماد و قاور یقین کا گارنٹیا کر کے ہیں اور یاد رہے کہ اس محبت کی عمارت کو تعمیر کرنے والا کوئی دوسرا نہیں ہوتا ہے

سوائے میاں بیوی کے۔ میں جانتا ہوں کہ ہماری اس خوبصورت زندگی کی عمارت میں کبھی بھی نفرت دھوکا وعدہ خلافی یا چھتاوے کی کوئی اینٹ نہ لگے۔ اگر یہ آسوخوشیوں کا پیغام ہیں تو انہیں بننے دو اور اگر یہ آسواں احساس کا جواب ہیں کہ نہ جانے تمہاری عملی زندگی کیسے گزرے گی تو انہیں میں اپنے ہونٹوں سے چن کر یہ یقین دلاتا ہوں کہ میری ذات تمہارے لیے کبھی بھی چھتاوا تکلیف یا دکھ کا سامان نہیں بنے گی۔“

حیدر کچھ روز گزرنے کے بعد بھی میری خاموشی کے بادل نہ چھٹے تو ایک دن انہوں نے مجھے سانسے بٹھا کر کہا۔

”ہو سکتا ہے نجر! تمہارا کوئی ایسا ماضی ہو جسے تم اب بھی دل سے لگاؤ نہیں ہو پاتے۔ سوچتی ہو کہ کبھی مجھے علم ہوا تو تمہاری وہ وقعت نہیں رہے گی میری نظروں میں تو ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ خیال بھی تمہاری مسلسل خاموشی کی وجہ سے ذہن میں پیدا ہوا کیونکہ خاموشی کی کئی وجوہات ہیں سے ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے اگر خدا نخواستہ ایسی کوئی بات تھی بھی تو مجھے تمہارے اس ماضی سے کیا لینا تمہارا گزرا کل تمہارا تھا۔ آج

اور آنے والے کل پر پورا پورا اختیار میرا ہے۔ یہ صرف اور صرف میرے لئے ہوگا، میں تمہارے ماضی میں کبھی نہیں جھانکوں گا تم میرے آج اور آنے والے کل میں کبھی بے ایمانی نہ کرنا تو

سمجھو زندگی سنو گئی۔ لیکن اگر تم ماضی کو اپنے پاس رکھو گی زندگی سنو رہے کے بجائے ابھ جائے گی اور تم دنیاوی رنگینوں سے کٹ کر رہ جاؤ گی۔“

”طلاق کے ان خیالات نے مجھے متاثر ضرور کیا لیکن وہ اپنے لیے میرے دل میں کوئی جگہ نہ بنا سکے۔ ان دنوں احمد میرے دل و دماغ پر بری طرح چھایا ہوا تھا اور اس احساس نے مجھے میرے دل کو بری طرح جکڑا ہوا تھا کہ اپنی دوستوں سے اپنے شوہر کا تعارف کراتے ہوئے مجھے کتنی تسکین محسوس ہوئی۔ ہر بھاری چپکے چپکے کے ساتھ خزاں جیسا شوہر کیا چٹا

اس وقت تم سب کے پاس قبیلوں کی دولت ہوتی جب کہ میرے پاس غلامت کی منطقی کی سوا کیا ہوتا۔“

”نجر!“ رافہ نے فسوس کے ساتھ کہا۔ ”جب وجہ یہ مرد کے اندر کا آدمی خراب لگتا ہے تو سب آئینہ مل دھرے وہ جاتے ہیں۔ دراصل شادی سے پہلے ہم نو عمر لڑکیاں ظلموں، کہانیوں، ناٹوں اور افسانوں میں پھنسی ہیں، حقائق کو بالائے

طلاق رکھ کر کسی بھی شخصیت کو ذہن میں بٹھا کر اسے ہم اپنا آئینہ مل دھاتی ہیں جب کہ حقیقی زندگی میں شادی کے بعد شوہر کو یہ اپنا آئینہ مل دھانا پڑتا ہے اور احمد کے روپ میں بھی

تو تمہاری زندگی میں تمہارا آئینہ مل آیا تھا وہ کیا ہوا؟ کہاں گیا وہ آئینہ مل؟ نجر! خواب سارے پورے نہیں ہوتے بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ تصور حقیقت کے روپ میں نظر آتا ہے۔ اب

رہی بات ہینڈ شوہروں کی تو ہم یہ سن کر حیران ہو گئی کہ اکثر وجہ یہ مرد کاغذ کے خوشنما پھول ہیں جو دیکھنے کی حد تک خوب صورت ہوتے ہیں لیکن ان کا نہ اپنا رنگ ہوتا ہے اور نہ خوشبو

ہوتی ہے۔ میرا شوہر مجھے دنیا کا بد صورت ترین انسان لگتا ہے جسے شادی کے شروع کے دنوں میں میرے پسینے کی بدبو، عطری خوشبو لگتی تھی۔ اب عطری لگا کر سانسے آ جاؤں تو ناک مجھوں

چڑھتا ہے کہ تم سے اور کہ بہن، پیاز کی بو آ رہی ہے۔“ پھر اس نے رک کر میرے چہرے کا جائزہ لیا اور بولی۔ ”نجر! جو

ہوا اسے بھول جاؤ آگے کی سوچو، ساری ٹھکریں ذہن سے نکال دو۔ جاؤ دو تین دن خوب سوچو پھر مجھے بتانا۔ تمہاری باتوں سے لگتا ہے طلاق بھائی بہت اچھے انسان ہیں، وہ ماں جیوں گے۔ میں خود تمہارے ساتھ چل کر ان سے بات کروں گی۔

اب گھر جاؤ وقت کافی ہو گیا ہے۔“

”راؤ تم بہت اچھی ہو تمہاری باتوں سے مجھے حوصلہ ملا ہے اور جیسے کہ راہ بھی اللہ حافظ۔“ میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”خدا حافظ اپنا خیال رکھنا۔“ رافہ نے میری پیشانی

چومتے ہوئے کہا۔ شام کے کچلے اندھیرے میں، میں رافہ کے گھر سے نکل آئی۔ اس کی باتوں سے مجھے کسی قدر سکون ملا تھا تاہم ذہن سے خیالات کی بھیڑ کم نہیں ہوئی تھی۔

”طلاق کے گھر میں میری تو قیر کی گنجائش ہوگی؟ وہاں میری قبولیت کا کیا سامان ہوگا؟ کچھ بھی تو نہیں۔ میرا دل گھبرا

رہا تھا کہیں میرے سسرال بے عزت کر کے نکال نہ دیں تو پھر یہ موہوم امید بھی ختم ہو جائے گی میرے پاس بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ مختلف خیالات کی حکمران ذہن پر یلغار کر رہی تھی۔ خیالات میں گھری میں گھر کی طرف جانے والی تھی کے

موز پر کھینچی گئی۔ لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہوئی تاریکی میں اچانک ایک سایہ سایہ میرے سامنے لہرایا میں ٹھک گئی۔ سایہ چند قدم آگے جا کر پیچھے ہٹا پھر میرے قریب آ کر رک گیا۔ وقت ایک دم ختم

گیا، ایک دوسرے کے تعاقب میں بھاگتے لئے تھے ہو کر رک گئے۔ ”آ..... آ.....“ اچھتم۔ ”میں ہوتی تھی اسے دھکتی رہے گی۔“

”ہاں نجر میں۔“ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر گئی ہے دور لے جانے لگا۔ میں اس کے ساتھ نہیں جانا چاہ رہی تھی لیکن یہ

صرف میرا خیال تھا میں کوئی حراحت کوئی احتجاج نہ کر سکی۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ایک دوسرے محلے کے پتھوں بچے پارک کے قدرے دیران گوشے میں لے آیا وہ ایک فیملی پارک تھا

جس میں مقامی لوگ واک کے لیے آتے تھے۔ پارک میں لوگوں کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی۔ باقی رہ جانے والے لوگ

بھی روشوں پرواک کرتے ہوئے مرکزی گیٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اچھتم نے مجھے ایک سنگی بچہ پر بٹھا دیا۔ چند گز دور نصب الیکٹریک پول پر چلنے ہوئے بلب کی شبیلی روشنی اس کے

چہرے پر پڑ رہی تھی۔ میں تعجب ہو کر اسے دیکھنے جا رہی تھی۔ یہ وہ اچھتم ہی نہیں تھا جو میرا آئینہ مل بن کر میرے سامنے آیا

شمارہ مئی 2017ء کی منتخب بج بنایاں

ہماری پیشکش آپ کا انتخاب

☆ اول: عشق کا نام..... قیصر جمال (لندن، یو کے)

☆ دوم: ناندہ تاجہ..... زرینہ شوکت (کراچی)

☆ سوم: براؤنٹ..... نائلہ (کراچی)

☆ چوتھ: علامہ تہسینا کے لیے ایک منتخب کتبچہ

☆ ایک کتبچہ علامہ حجازی کے

تھا۔ اس وقت اس کا حلیہ خاصا دکڑوں تھا۔ اس کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ آنکھوں کے گرد حلقے تھے شیو بڑھی ہوئی تھی۔ وہ چپ چاپ نظریں جھکائے بیٹھا رہا۔ ”کیوں آئے ہو اب؟“ میں نے اسے بخوڑتے ہوئے پوچھا۔ اس نے ایک لمبے لمبے نظریں اٹھائیں اور بھر جھکا لیں۔ اس ایک جہل میں، میں نے اس کی آنکھوں میں کمی دیکھ لی۔ ساری رنجشوں کے باوجود میں تڑپ کر رہ گئی وہ درور ہا تھا، مگر کیوں؟ اس سوال کی اذیت مجھے ڈسنے لگی۔ ”امہم ترم در رہے ہو؟“ بالآخر مجھ سے ہانہ گیا۔

”مجہ تم اسے طور پر ٹھیک سوچ رہی ہو۔“ اس کی آواز ایک سسکی میں ڈوب گئی۔ ”مگر میں مجبور تھا۔“ لھائی تو قوت کے بعد اس نے کہا۔ ”میرے بھائی کو پولیس نے پکڑ لیا تھا۔ بدنامی کے خوف اور لوگوں کے طرح طرح کے سوالوں سے بچنے کے لیے میں وہ علاقہ چھوڑنا پڑا۔“ وہ ایک دم سے چپ ہو گیا۔

”کیوں کیا، کیا تھا تمہارے بھائی نے؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا پھر بولا۔

”میرے بھائی پر اس کے پاس کے قتل کا الزام ہے۔ یقین کرو! میرا بھائی بے قصور ہے۔ اس نے اپنے پاس کاش نہیں کیا۔ مجہ میں تمہیں چھوڑ کر بھی نہ جاتا، بس اچانک ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ ہم سب کو جانا پڑا۔ پلیز میرا یقین کرو، میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا مجھ! اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر نیچے زمین پر بیٹھنے ہوئے اپنی کہانیاں میرے ٹھنوں پر دکھا دیں پھر تم آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”مجہ ہم کسی اس عذاب سے نکل جائیں پھر میں تمہارے پاس آؤں گا تمہیں اپنا بنانے کے لئے، میں تمہیں اتنی خوشیاں دوں گا کہ تم اپنے سارے غم بھول جاؤ گی۔“ میرا انتظار کرتا۔ ”اس کی لہو بہ لہو گئی ہوئی آواز سسکیوں میں بدل گئی۔ میں شش و پنج میں پڑ گئی۔ وقت کے دوسرے حصے میں وہ پھر میری زندگی میں چلا آیا تھا۔ میری قوت فیصلہ مفلوج ہو گئی۔ دل سے آواز آئی۔ ”امہم مجبور ہے، تم یہ کار کی سوچو میں وقت ضائع کر کے اپنی محبت کو دھوگی اس سے پہلے کہ وہ تم سے مایوس ہو کر چلا جائے اس کا ہاتھ تم لو۔“

میرے اندر کافی دیر تک کش جاری رہی بالآخر اس کے آنسوؤں نے مجھے کمزور کر دیا۔ میں نے اپنے کپکپاتے ہوئے ہاتھ اس کے ہاتھوں پر رکھ دیے۔ اس نے سر اٹھا کر بھر پور

نظروں سے مجھے دیکھا اس کی آنکھیں تشکر کے احساس سے چمک گئیں۔ ایک دم سے وہ میرے گلے سے لگ گیا۔ ”نہو! ہم..... ہم..... میری جان تم بہت اچھی ہو۔“ خوشی کی شدت سے اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔ ”آئی لو پو نہو! آئی لو پو سو نہو!“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ دیر پیادہ میری نظروں سے مجھے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”بھائی کی ضمانت کے لیے وکیل کو کچھ پیسے دیئے ہیں میں پیسوں کا بندوبست کرنے کے لیے جا رہا ہوں۔“

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”کہاں سے پیسوں کا بندوبست کرو گے؟“

”کہیں نہ کہیں سے تو ہو ہی جائے گا اگر نہ ہوا تو مجبوراً اماں کے زور بیچتے پڑیں گے۔“ اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ”کتنے پیسے دیئے ہیں وکیل کو؟“

”فی الحال تو میں ہزار روپے کی ضرورت ہے، میں ہزار روپے وکیل کو دیتے ہیں۔“

”پانچ ہزار روپے تقیثی افسر کو دیتے ہیں تاکہ وہ بھائی پر تشدد نہ کرے۔ اور باقی کے پانچ ہزار حریف بھاگ دوڑ کے لیے رکھتے ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”امہم اگر تمہیں برانہ لگے تو میں تمہیں اتنے پیسے دے سکتی ہوں۔“ میں نے اس کے کانہ سے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”لیکن مجہ تم!“ اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ”لیکن وکیل کچھ نہیں۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”دیکھو امہم! میرے پیسے تمہاری پریشانی سے بڑھ کر نہیں ہیں اور اس مشکل وقت میں دوست ہی دوست کے کام آتا ہے۔ دیکھو اب انکار مت کرنا۔“ میری بات کے اختتام پر اس نے والہانہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”تم آہستہ آہستہ چلتے ہوئے میرے گھر کی گلی تک آؤ میں جلدی سے گھر جا کر پیسے لے آتی ہوں۔“ میں نے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور خود تیزی سے چلتی ہوئی گھر کی طرف بڑھ گئی۔ گھر پہنچ کر میں نے ادھر ادھر دیکھا لیکن سے کھپ چھٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اسی شاید رات کا کھانا بنا رہی تھیں۔ ابو آفس سے واپس نہیں آئے تھے اور زین بھی کسی بھی باہر نکلا ہوا تھا۔ میں دبے پاؤں چلتی ہوئی اسی کے کمرے میں گئی وہی ڈرائی کی دروازے سے الماری کی چابیاں نکالیں اور الماری کھول کر پانچ پانچ سو روپے کے نوٹوں کی ایک گڈی اٹھا لی میرے اعزاز کے مطابق وہ پچاس ہزار روپے کے لگ بھگ رقم تھی جو میں نے زندگی میں پہلی بار ماری کی الماری سے نکالی، یہ الفاظ دگر چوری کی تھی۔ الماری بند کر کے چابیاں وہی ڈرائی کی دروازے میں

رکھیں اور خاموشی سے باہر نکل آئی۔ رات اپنا آٹھل پھیلا چکی تھی۔ گلی میں لوگ آ جا رہے تھے لیکن ہر کوئی اپنی ذہن میں چلا جا رہا تھا۔ میں تیزی سے چلتی ہوئی امہم کے پاس پہنچ گئی وہ ایک دکان کے ساتھ بنے چبوترے پر بیٹھا ہوا تھا۔ ”آگئی تم مجہ۔“ مجھے دیکھ کر اس نے کہا۔

”ہاں آگئی..... یو پیسے۔“ میں نے نوٹوں کی گڈی اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ ”میرا بہت دل چاہ رہا تھا تمہارے ساتھ جانے کو مگر تم اس وقت کافی پریشان ہو۔ تم جاؤ!“

وہ کچھ دیر خالی خالی آنکھوں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر نظریں جھکا کر رنجی ہوئی آواز میں بولا۔ ”مجہ تم بہت عظیم ہو۔ تمہاری محبت کے سامنے میری محبت کچھ بھی نہیں ہے۔ میں زمیں پر تھا تم نے مجھے آسمان پر بٹھادیا۔ میں آؤں گا پرسوں تم ضروری تیاری کر لیتا۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا ہمیشہ ہمیش کے لیے۔“ وہ چل دیا میں بھی اس کے ساتھ ساتھ چلتے گئی وہ ایک لمبے لمبے پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”پرسوں شام سات بجے میرا انتظار کرنا۔“ وہ تیز قدم اٹھاتا ہوا ایک طرف چل دیا۔

وہ جب تک نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا میں اسے جاتا دیکھتی رہی۔ مگر گھر لوٹ آئی۔

”بہت دیر کر دی آئے میں کہاں رہ گئی تھیں؟“ اسی تشویش میں جھلا میں۔ ”وہ ای! رات فہ کے ساتھ باتوں میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا اور پھر آپ کو تو پتا ہے اس کا، آئے ہی نہیں دے رہی تھی۔“ میں نے دروغ کوئی سے کام لیا۔

”امہم چلو تم منہ ہاتھ دھو لو میں کھانا لگواتی ہوں۔“ اسی نے کہا اور کچن کی طرف چلی گئیں۔

میرا کھانے کا بالکل موڈ نہیں تھا لہذا میں نے منع کر دیا اور سونے کے لیے لیٹ گئی لیکن نیند آنکھوں سے دور تھی۔ نیند آتی بھی تو کیسے آج امہم سے ملاقات جو ہو گئی تھی۔ وہ پریشان حال ضرور تھا لیکن اس کی آنکھوں میں میری محبت کا کس جھلک رہا تھا۔ میں نہ امید کی امہم کی قربت چند دن کی مسافت پر تھی۔ کروٹ پر کروٹ بدلتے جاتے رات کے کون سے پہر میری آنکھ لگ گئی۔

صبح آنکھ شری کی آواز سے کھلی وہ ای کی آواز تھی جو زور زور سے ہوتی ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں پکراتی پھر رہی تھیں۔

”اوہو، ہوا کیا ہے کچھ بتاؤ تو سہی۔“ ابو کی آواز سنائی

دی۔

”یہ پوچھیں کہ کیا نہیں ہوا؟“ اسی خفت سے بولیں ”اوہ..... ایک تو تم بات کو لکھاتی بہت ہو۔“ ابو نے کہا۔ ”چلو بتاؤ کیا نہیں ہوا۔“

میں بھی بیٹھ سے اٹھ کر ای اور ابو کے پاس پہنچ گئی۔ ”آپ نے چند دن پہلے جو پیسے مجھے دیے تھے وہ اب میری الماری میں نہیں ہیں۔“ اسی کے چہرے سے پریشانی مترشح تھی۔

پیسوں کا سن کر میں لرز گئی۔ میں مجھ ہی تھی کچھ دن تک ای کو پیسوں کا پتا نہیں چلے گا لیکن یہاں تو دوسرے دن ہی پتا چل گیا۔ ابو بھی پریشان ہو گئے۔

”ای! آپ ٹھیک سے دیکھیں کہیں الماری کے دوسرے خانے میں نہ رکھے ہوں۔“ میں نے چہرے پر پریشانی طاری کرتے ہوئے کہا۔

”الماری کے تمام خانوں میں دیکھ لیا ہے کسی خانے میں نہیں ہیں کسی ملازم پر بھی شب نہیں کیا جا سکتا ملازموں کے جانے کے بعد میں نے پیسے دیکھے تھے اور آج صبح ان کے آنے سے پہلے میں نے دیکھا تو پیسے وہاں نہیں ملے۔“ اسی کی پریشانی سے میرا دل بیٹھا جا رہا تھا لیکن میں انہیں بتائیں سکتی تھی کہ ان کی پریشانی کی وجہ میں ہوں۔

”امہم تم پریشان مت ہو نصیب میں ہوئے تو مل جائیں گے۔ جب کسی ملازم نے نہیں بڑا توے کو گھر میں ہی ہوں گے۔“ ابو کے لہجے میں پریشانی کا تاثر تھا مگر انہوں نے اسی کے سامنے زیادہ بات نہیں کی۔

میں نے اسی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”ای! آپ پریشان نہ ہوں مل جائیں گے پیسے۔“

ای کچھ دیر تک خاموش کھڑی میری طرف دیکھتی رہیں پھر اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔ دو تین دن گھر میں کچھ آؤ گی کیفیت رہی۔ پیسے گھر میں ہوئے تو ای کو کھٹے۔ میرا ضمیر مجھے حلاوت کرتا رہا لیکن امہم کا خیال میرے ضمیر کو جھکی دے کر سٹلا دیتا۔ حریف کچھ روز گزرنے کے بعد بھی امہم نہ آیا نہ اس کی کال آئی۔ میرا ہر لمبے اس کے انتظار میں گزرتا اور اندیشوں کا بڑھتا ہوا آزار انتظار کو مشکل تر بنا رہا تھا۔ چند دن گزر گئے امہم کے آنے کی امید ہی دم توڑ گئیں۔ اس دوران رات فہ کا پیغام آیا کہ میری رات فہ کے دن قریب آ رہے ہیں میں چاہتی ہوں میری موجودگی میں تمہارا مسئلہ حل ہو جائے۔ امہم کے نہ آنے سے میں بالکل نوٹ گئی تھی اور رات فہ

کی بات سچ کئے گی تھی کہ احمد دھوکے باز ہے۔ ایک دن رافعہ خود میرے پاس آگئی۔ امی پردس کے گھر گئی ہوئی تھیں۔
”بھرا اس معاملے میں تمہاری عدم دلچسپی تمہارے حالات کو حریف سمجھیر بنا سکتی ہے۔“ وہ میرے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔
”لیکن طارق.....“

”طارق بھائی کا مسئلہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔“ رافعہ نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ”دیکھو بھرتم اپنے شوہر کی خوبیوں کو مد نظر رکھو گی تو شوہران اوصاف کے بھرمٹ میں چاند چہرہ نظر آئے گا۔ خوبصورتی کردار میں ہوتی ہے اور وہ بھی بھائی بھائی ہے۔ پختہ بھی اور خوشبودار بھی، جو تمہارے شوہر کے پاس ہے ہم سب تو دکھاوے کی زندگی گزار رہے ہیں سراپوں میں منڈلا رہے ہیں لیکن تمہارے پاس سچی زندگی اور انھوں نے محبت ہے۔ تم محبت کے اس جن کو چھوڑ کر کانٹوں بھرے راستے پر اٹھتی ہو۔ لوٹ جاؤ واپس تمہاری بھلائی کے لیے تمہارا لوٹ جانا ہی بہتر ہے۔ معافی مانگ لو اور اپنی خوشیاں دو کہ تمہارے لگائے زخم پھولوں میں تبدیل ہو کر مہک پڑیں۔“ وہ ایک چپ ہو گئی اس کا ایک ایک لفظ مجھے اپنے دل میں اترتا ہوا محسوس ہوا۔
”کس سند سے جاؤں رافو! میں نے ان پر اتنا بڑا الزام لگایا تھا۔ کیا پھر بھی وہ مجھے اپنے پاس رکھ لیں گے؟“ میں نے اندیشہ ظاہر کیا۔

”میں نے کہا ناں سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ رافعہ نے اس یقین کے ساتھ کہا کہ میں قائل ہو گئی۔
”ٹھیک ہے تو پھر کل چلتے ہیں۔“ میں نے کہا اور رافعہ کے لیے چائے بنانے لگی۔ رافعہ کچھ دیر بیٹھ کر اور چائے پی کر چلی گئی۔ اور میں سوچوں کی اونچی نیچی گینڈ پھولوں پر اترتی چڑھتی رہی۔ بس اب تو رب سے یہی دعا تھی کہ طارق مان جائیں۔ دوسری صبح امی سے رافعہ کے گھر جانے کا کہہ کر میں گھر سے نکل آئی۔ وہ میرے ہی انتظار میں بیٹھی تھی۔
”آؤ آؤ میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔“ رافعہ نے خوش دلی سے کہا۔ اس نے اپنے بیٹے کو ملایا اور ہم طارق کے گھر روانہ ہو گئیں۔

دستے میں، میں نے کہا ”میرا دل گھبرا رہا ہے کہیں وہاں ذلت نہ اٹھانی پڑے۔ میرے سوال والے بے عزت نہ کریں۔“
”تم اس کی فکر نہ کرو۔“ رافعہ نے کہا۔ ”اگر شوہر تمہارا ہے تو سارا زمانہ تمہارا ہے۔ خواہ وہ کتنا ہی خودکومت

الجھاؤ۔“

ہم باتیں کرتے ہوئے طارق کے گھر پہنچ گئے دلہیز پار کرتے ہی لان میں چائے پیتے ساس سرسبیت دیگر اہل خانہ سلام کا جواب دیتے بغیر ہی اٹھ کر اپنے اپنے کمروں میں جا گئے صرف طارق اخبار ہاتھ میں لیے پچنی پچنی آنکھوں سے دیکھتا ہوا ہٹ کھڑا ہوا۔

”طارق بھائی! میرا نام رافعہ ہے میں نجمہ کی بچپن کی دوست اور کلاس فیلو ہوں۔“ رافعہ نے اپنا تعارف کرایا۔
”اوہ...! اچھا اچھا تو آپ ہیں ان کی دوست رافعہ جو مضطرب رہتی ہیں۔“ طارق نے ایک نظر میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں طارق بھائی آپ سے صحیح پہچانتا۔“

پھر قدرے توقف کے بعد بولی۔ ”بھائی جان بلا تہدید میں یہ کہوں گی کہ آپ مجھدار، کشادہ دل اور اچھے ذہن کے مالک ہیں اور ایسے مرد نادانوں کو معاف کر دیا کرتے ہیں۔ اسے اپنی حماقت پر بڑی غامت ہے۔“ رافعہ نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن یہ ضرور کہوں گی کہ یہ بڑی اچھی لڑکی ہے بچپن سے جانتی ہوں۔ اب غلطی ہو گئی ہے اس سے یہ معافی مانگنے کے لیے آپ کے پاس آئی ہے۔ میں اتنا جانتی ہوں کہ بچپتاوے کے بعد کی ازاد دینی زندگی بڑی پائیدار محسوس اور قابل اعتبار ہوتی ہے۔ یہ خود چل کر آپ کے پاس آئی ہے تو اسے معاف کر دیں۔“

طارق نے کچھ نہیں کہا خاموشی کو اپنا تہ رکھا پھر سرگرم سلگائی دو تین بھر پور کش لیے اور بات کا رخ یہ کہہ کر موڑا کہ
”آپ جائے پیس کی یا ٹھنڈا؟“

”میں مسٹائی کھاؤں گی بھائی جان۔“ رافعہ جلدی سے بولی۔ ”لیکن اس وقت جب آپ دونوں کو ہمسرا بنا دیکھوں گی۔ میں نے محسوس کیا ہے جب سے بچپن کو اپنی غلطیوں کا احساس ہوا ہے اس کے دل میں آپ کی محبت اور بڑھ گئی ہے۔“

”محبت!“ طارق نے طرہ یہ کہا۔ ”محبت تھی ہی نہیں تو بڑھ گئی کہاں سے..... محبت کرنے والے ایسے کام کرتے ہیں؟“

رافعہ خفیف سی ہو کر رہ گئی لیکن جلد ہی خود کو سنہلایا۔
”نہیں ایسی بات نہیں طارق بھائی۔ محبت تھی، ہے اور رہے گی انشاء اللہ دراصل نجمہ نے اپنے اندر کی محبت کو زبان نہیں دی۔“

طارق کے ہونٹوں پر طرہ یہ مسکراہٹ پھیل گئی جیسے کہنا چاہ رہا ہو کہ مجھے پتا ہے یہ سفید جھوٹ ہے۔
”میں کہہ ہی گئی طارق بھائی کہ.....“

”معاف کیجیے کا قلع کلائی ہو رہی ہے۔“ طارق نے ایک دم سے کہا۔ ”مجھے اب کیا چاہتی ہے نجمہ۔“

میں نے پیش قدمی کی اور طارق کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر تم آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پلیز مجھے معاف کر دیں، میرا نہیں تو کم از کم میرے وجود میں پلنے والے ننھے سے وجود کا خیال کر لیں جو آپ کا خون ہے۔“

طارق کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا اس نے آہستگی سے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ کے نیچے سے کھینچے ہوئے کہا۔ ”مجھے خوشی ہوئی ہے یہ سن کر کہ تم ماں بننے والی ہو۔“ پھر رافعہ اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

”آپ اس وقت جائیں میں کل نجمہ کے ماں باپ کے گھر آؤں گا اور تم اپنے خاندان کے افراد کو ہاں نکال لیتا میں سب کے سامنے عزت کے ساتھ کہیں وہاں سے لاؤں گا۔ بس اب آپ لوگ جائیں۔“ یہ کہہ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

رافعہ نے میری طرف دیکھا میں نے اسے واپس چلنے کا اشارہ کیا۔ ہم ساتھ ساتھ چلتی ہوئی طارق کے گھر سے نکل آئیں۔

”میں نے تمہیں کہا تھا ناں طارق بھائی ماں جائیں گے۔“ رافعہ نے چلتے چلتے کہا۔

”ہاں تم ٹھیک کہتی تھیں میں خواہ وہ دم میں جلتا تھی۔ رافعہ تمہارا بہت شکر یہ، تم نے میرے لیے بہت کچھ کیا۔ اگر تم نہ ہوتیں تو میں طارق تک کبھی نہ پہنچ پاتی۔ اگر پہنچ بھی جاتی تو بے عزت کر کے نکالی جاتی۔“ میں نے احسان مندی کے جذبات سے مغلوب ہو کر رافعہ کو گلے سے لگالیا۔

”چلو ان باتوں کو چھوڑ دو میرے لیے یہ خوشی کی بات ہے کہ تمہارا گھر حریف اجڑنے سے بچ گیا۔“ رافعہ نے کہا۔ ”بس اب آئندہ خیال رکھنا اور اپنے شوہر کی خوشی کو مقدم سمجھنا۔“ وہ مجھے گھر چھوڑ کر دوسرے دن کا آنے کا کہہ کر اپنے گھر چلی گئی۔

سب سے پہلے میں نے وہ تمام چیزیں نظروں کے سامنے سے ہٹا دیں جن کا تعلق احمد سے تھا۔
میں اسے کسی بھی حوالے سے یاد نہیں کرتا چاہتی تھی۔ پھر میں نے وارڈروب سے اپنی شادی کے کپڑے نکالنا شروع

ڈاکٹر راشد لطیف خاں

عالمی شہرت یافتہ پاکستانی پروفیسر اور پاکستان میں نیٹ ٹیوب بے بی کے خالق۔ وہ ملتان میں رائے لطیف حسن خاں کے گھر میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ مئی 1961ء میں نیشنل میڈیکل کالج ملتان سے ایم بی بی ایس کیا۔ 1965ء میں رائل کالج آف گائنا کالوجی لندن سے امراض نسوان میں ڈپلومایا اور 1967ء میں لندن سے ایم آر سی ادجی کا امتحان پاس کیا۔ پھر ایڈنبرا کی معروف طبی درس گاہ رائل کالج آف سرجنری سے ایف آر سی ایس کی ڈگری لی۔ 1974ء میں جون ہانکٹر میڈیکل اسکول بالائی مور (میری لینڈ) امریکا نے انہیں اے ٹی ایم ایف کی اعزازی ڈگری دی اس طرح حکومت بھارت نے بھی سب سے بڑی طبی ڈگری بطور اعزاز پیش کی۔ علاوہ ازیں کالج آف فزیشنز اینڈ سرجنری نے بھی ان کی طبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں ایف آر سی بی کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ وہ علامہ اقبال میڈیکل کالج لاہور میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ پاکستان میں پہلی نیٹ ٹیوب بے بی پیدا کرنے والی ٹیم کے سربراہ ہیں یہ بے بی 2 جولائی 1989ء میں پیدا ہوئی۔
مرسلہ: نسلی ممتاز، حیات آباد

کر دیے۔ عروسی جوڑا نکال کر ایک طرف رکھا اور باقی کے کپڑے الماری میں رکھ دیے۔ میں گزرے ہوئے کل کو نکلا کر طارق کے سامنے ڈھن بن کر جانا چاہتی تھی۔ اس رات اپنے مستقبل کے بارے میں سوچتے سوچتے رات کے آخری پہر میری آنکھ لگ گئی۔ صبح اُگی نہا دھو کر عروسی جوڑا پہنا اور طارق کا انتظار کرنے لگی اس نے شام کا وقت دیا تھا میں نے اسی کو ساری بات تفصیل سے بتا دی۔ وہ ماں تھیں خوشی کے آنسو ان کی آنکھوں میں جھلکانے لگے جی کا گھر دوبارہ بس جانے کا ان کا ارمان پورا ہو رہا تھا۔ انہوں نے قریبی رشتہ داروں کو اطلاع بھجوا دی کہ شام کے وقت گھر آئیں۔ مجھے شام کا بے چینی..... سے انتظار تھا۔ جن لوگوں کو امی نے بلایا تھا ان میں میرے ایک ماموں ان کا بڑا بیٹا ایک خالہ۔ ایک ابو کے چچا زاد بھائی اور میری ایک پھوپھی شامل تھیں۔ رافعہ کو بھی

میں نے بلا لیا تھا۔ سب لوگ وقت مقررہ پر پہنچ گئے اور طارق کا انتظار کرنے لگے۔ انتظار کی کیفیت بھی تھی مبرا آما ہوتی ہے یہ اس دن مجھے معلوم ہوا۔

خدا خدا کر کے وہ گھڑی بھی آگئی جس کا مجھے شدت سے انتظار تھا۔ طارق نے گھر کے ہال کمرے میں بیٹھے افراد پر اچھتی ہوئی نگاہ ڈالی اور با آواز بلند سب کو سلام کیا اور ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ قمری جیس سوٹ میں جلیوں ایک اور شخص بھی تھا اس نے بھی سب کو سلام کیا اور ایک کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ طارق اٹھا اور معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ”ایک ضروری کام کی وجہ سے مجھے آنے میں کچھ تاخیر ہو گئی امید ہے درگزر فرمائیں گے۔“ پھر اصل مدعا کی طرف آتے ہوئے گویا ہوا۔ ”کل فجر اور ان کی دوست رافدہ صاحبہ میرے گھر آئی تھیں۔“ طارق کی تمہید نے میرے دل کی دھڑکنیں تیز کر دیں۔ وہ کسی مقرر کے بے انداز میں بول رہا تھا۔ ”مسز رافدہ منزل کا کہنا ہے کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے اور یہ اپنی غلطی پر نام ہے۔“ طارق نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ”جیس اچھی بات ہے اسے اپنی غلطی پر برداشت محسوس ہونی لیکن مجھے یاد نہیں ہے اس سے کیا غلطی ہوئی تھی۔“ پھر وہ روئے سخن میری جانب موڑتے ہوئے بولا۔ ”فخرتم سے جو غلطی ہوئی میں نے اس کے لیے تمہیں معاف کیا لیکن تمہارے ان عزیز رشتہ داروں کو بتانا چاہو گی کہ تم سے کیا غلطی ہوئی تھی؟“

وہ بات فخرتم کر کے اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ سب لوگ میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں احتساب کے کنبہ سے میں آگئی تھی۔ میں سمجھ رہی تھی طارق سب رشتہ داروں کے سامنے کوئی سوال کیے بغیر مجھے عزت سے لے جائے گا۔ لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا وہ اپنی ذلت کا بدلہ اس انداز سے لے گا۔ میں نے رحم طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھا لیکن اس کا چہرہ بالکل ساٹھا تھا۔ میری حالت یہ تھی کہ کونو تو لہو نہیں۔ میرا طلق خشک ہو گیا تھا زبانیان تالو سے چپک گئی تھی میں نے قہقہے نکلنے ہوئے طلق ترک کرنے کی ناکام کوشش کی۔ سب کی سوالیہ نگاہیں مجھے زہر میں سمجھے تیر کی طرح لگ رہی تھیں۔ میں نے سوچا وقت نے مجھے ایک امتحان میں ڈال ہی دیا ہے تو بچ بول کر اپنی جان چھڑائی جائے اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ میں نے خود کو مستحالا اور یوں شروع کیا۔ ”میں غلط ہوں مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی کہ میں نے اپنے فرشتہ صفت شوہر پر بہتان لگایا تھا کہ طارق اپنی پر موشن کے لیے

مجھے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے طارق سے اپنی جان چھڑانے کے لیے جھوٹ بولا تھا کیونکہ یہ میرے آئینہ دل کی ضد تھی۔ شادی کے پہلے دن سے ہی یہ مجھے اچھے نہیں لگے تھے۔ لیکن میرا جھوٹ مجھے اتنا رسوا کرے گا مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا۔“ میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ رافدہ اپنی جگہ سے اٹھی اور مجھے تھپکتے ہوئے کرسی پر بٹھا دیا اور مجھے پانی پلایا۔ سب لوگ ہوتن بنے مجھے دیکھتے رہے۔ طارق اپنی جگہ سے اٹھا اور بولا۔ ”میں عورت پر حکمرانی کا قائل نہیں ہوں نہ عورت کو غلام بنانا مجھے پسند ہے۔ میں نے فخر کو ہر طرح سے خوش رکھنے کی کوشش کی تھی اپنی مرضی مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر یہ میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تھی تو مجھے بتاتی میں آزاد کر دیتا۔ خیر میں نے اسے معاف کر دیا۔“ وہ کچھ دیر روک اور وہاں بیٹھے افراد کو متوجہ کرتے ہوئے بولا۔ ”اب جو بات میں کرنے لگا ہوں وہ سب غور سے سنئے گا اور اس کا فیصلہ بھی آپ لوگ کیجیے گا۔“ مجھ نے مجھے خوشخبری سنائی کہ وہاں بننے والی ہے ماں بنا رہا شادی شدہ عورت کی خواہش ہوتی ہے اور اس معاملے میں مجھ بہت خوش قسمت ہے۔ ”وہ ایک دم سے چپ ہو گیا پھر قمری جیس سوٹ میں جلیوں شخص کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ ذرا ایک منٹ کے لیے آئے گا ڈاکٹر صاحب۔“ وہ شخص بنے ڈاکٹر کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا اپنی جگہ سے اٹھا اور طارق کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ طارق نے ڈاکٹر سے کہا اب وہ رپورٹ انہیں پڑھ کر سنائیں جو آپ نے اپنی فائل میں رکھی ہوئی ہے۔“

طارق اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر نے ٹھکاندار کمرہ صاف کیا اور وہ پیر پڑھنے لگا۔ اس پیر کی رو سے طارق کسی عورت سے شادی کر کے ازدواجی تقاضے پورے کر سکتا تھا لیکن وہ کسی عورت کو ماں نہیں بنا سکتا تھا۔ میڈیکل رپورٹ کے مطابق اس میں کروموسوم کی بہت کمی تھی۔ طارق پھر اپنی جگہ سے اٹھا اور ڈاکٹر کا شکر یہ ادا کر کے میری طرف مڑا اور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے با آواز بلند بولا۔ ”جب تمہیں اس سوال کا جواب مل جائے کہ تمہارے وجود میں ملنے والا اعضا سا جو کس کا ہے تو مجھے بتائیں اگر تمہیں لے جاؤں گا۔“ اتنا کہہ کر وہ ڈاکٹر کے ساتھ چلا ہوا ہارنگل گیا۔

میرے بے ہوش ہونے سے پہلے امجد کا سراپا میری نظروں کے سامنے گھومنے لگا جس کی قربت میں، میں اپنا آپ بھی بھول جاتی تھی۔